BAHS301CCT

تاریخ ہندوستان

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط سے سولہویں صدی عیسوی کی ابتدا تک

History of India

(Mid-8th Century AD to Early 16th Century AD)

برائے

بیچلر آف آرٹس (بی۔اے۔)

(تیسرا سمسٹر)

مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی

حیدرآباد-32، تلنگانہ-انڈیا

© Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Course - History of India (Mid-8th Century AD to Early 16th Century AD)
ISBN: 978-93-95203-07-4
Edition: November 2022
Reprint: November, 2024

Publisher	:	Registrar, Maulana Azad National Urdu University, Hyderabad
Publication	:	2024
Copies	:	3300
Price	:	300/- (The price of the book is included in admission fees of distance mode students)
Copy Editing	:	Mohd. Asim, CDOE, MANUU
Title Page	:	Dr. Mohd. Akmal Khan, CDOE, MANUU
Printer	:	S.R. TOWERS (INDIA) PRIVATE LIMITED, Guntur, Andhra Pradesh

Copy Editor
Dr. Shaik Mahaboob Basha

Bachelor of Arts (B.A.)

History of India

(Mid-8th Century AD to Early 16th Century AD)

On behalf of the Registrar, Published by:

Centre for Distance and Online Education

Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (TG), India
*Director:*dir.dde@manuu.edu.in *Publication :*ddepublication@manuu.edu.in
Phone number: 040-23008314 Website: manuu.edu.in
© All rights reserved. No part of this publication may be reproduced or transmitted in any form or by any means, electronically or mechanically, including photocopying, recording or any information storage or retrieval system, without prior permission in writing from the publisher (registrar@manuu.edu.in)

مدیر اعلیٰ
(Chief Editor)

Prof. S.M. Azizuddin Husain

Former Head, Department of History & Culture
Jamia Millia Islamia, New Delhi
Maulana Azad Chair Professor
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

پروفیسر سید محمد عزیزالدین حسین

سابق صدر، شعبہ تاریخ وثقافت
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی
مولانا آزاد چیئر پروفیسر
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مدیر
(Editor)

Dr. Shaik Mahaboob Basha

Assistant Professor & Coordinator (History)
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر وکوآرڈی نیٹر (تاریخ)
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

لینگویج ایڈیٹر
(Language Editor)

Dr. Mohd Akmal Khan

Guest Faculty/Assistant Professor (Urdu)
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad

ڈاکٹر محمد اکمل خان

گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (اردو)
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مجلس ادارت

(Editorial Board)

Prof. Perwez Nazir
Centre for Advanced Studies,
Department of History
Aligarh Muslim University, Aligarh

پروفیسر پرویز نظیر
سینٹر فار ایڈوانسڈ اسٹڈیز
شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Prof. Alauddin Khan
Head, Department of History
Shibli National College, Azamgarh

پروفیسر علاؤالدین خان
صدر، شعبہ تاریخ
شبلی نیشنل کالج، اعظم گڑھ

Dr. Shaik Mahaboob Basha
Assistant Professor & Coordinator (History),
Directorate of Distance Education Maulana
Azad National Urdu University, Hyderabad

ڈاکٹر شیخ محبوب باشا
اسسٹنٹ پروفیسر و کوآرڈی نیٹر (تاریخ)
نظامت فاصلاتی تعلیم
مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

Dr. Ahmad
PGT(History), MANUU Model School,
Hyderabad

ڈاکٹر احمد
پی جی ٹی (تاریخ)، مانو ماڈل اسکول، حیدرآباد

Dr. S.M. Abul Hussain
Guest Faculty/Assistant Professor (History)
DDE, MANUU, Hyderabad

ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد د

Mr. Mohd. Aasim
Guest Faculty/Assistant Professor (History)
DDE, MANUU, Hyderabad

جناب محمد عاصم
گیسٹ فیکلٹی / اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)
نظامت فاصلاتی تعلیم، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد د

کورس کو آرڈی نیٹر

ڈاکٹر شیخ محبوب باشا

اسسٹنٹ پروفیسر (تاریخ)، مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم

مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد

مصنفین	اکائی نمبر
• ڈاکٹر سید میر ابوالحسین	اکائی 1،2،11،24
• پروفیسر ایس۔ چاندنی بی	اکائی 3،4،5،6
• جناب محمد عاصم	اکائی 7،9،10،17،18
• ڈاکٹر احمد	اکائی 12،13،14،15،16
• ڈاکٹر شیخ محبوب باشا	اکائی 19،20
• پروفیسر علاؤالدین خان	اکائی 21،22
• پروفیسر تحسین بلگرامی	اکائی 23

مترجم	
• ڈاکٹر محمد اکمل خان، شعبہ اردو، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی، حیدرآباد	اکائی 3،4

پروف ریڈرس:

اول	:	جناب محمد عاصم
دوم	:	ڈاکٹر سید میر ابوالحسین
فائنل	:	ڈاکٹر شیخ محبوب باشا

فہرست

پیغام	وائس چانسلر	7
پیغام	ڈائرکٹر	8
کورس کا تعارف	کورس کو آرڈی نیٹر	9
بلاکI	**شمالی ہندوستان 8ویں تا 12ویں صدی -I**	
اکائی1	8ویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے سیاسی حالات	13
اکائی2	راجپوت: سیاست	27
اکائی3	پال خاندان	41
اکائی4	پرتی ہار خاندان	56
اکائی5	راشٹر کوٹ خاندان	69
اکائی6	چوہان خاندان	82
اکائی7	سماج اور ثقافت	101
بلاکII	**شمالی ہندوستان 8ویں تا 12ویں صدی-II**	
اکائی8	عرب	118
اکائی9	غزنوی خاندان	133
اکائی10	غوری خاندان	153
اکائی11	ہندوستانی سیاست اور سماج پر اثرات	170

بلاکIII	دہلی سلطنت-I: سیاسی تاریخ	
اکائی12	مملوک خاندان	182
اکائی13	خلجی خاندان	199
اکائی14	تغلق خاندان	215
اکائی15	سید خاندان	232
اکائی16	لودھی خاندان	246
بلاک IV	دہلی سلطنت-II	
اکائی17	سماج اور معیشت	260
اکائی18	ثقافت	290
اکائی19	بھکتی تحریک	304
اکائی20	صوفی تحریک	319
بلاک V	دہلی سلطنت کے تحت حکومت اور نظم ونسق	
اکائی21	انتظامیہ: مرکزی حکومت	339
اکائی22	انتظامیہ: مقامی حکومت	350
بلاک VI	دکن اور جنوبی ہندوستان	
اکائی23	بہمنی سلطنت: سیاست، سماج اور معیشت	361
اکائی24	وجے نگر سلطنت: سیاست، سماج اور معیشت	377
نمونہ امتحانی پرچہ		393

پیغام

مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی 1998 میں وطنِ عزیز کی پارلیمنٹ کے ایکٹ کے تحت قائم کی گئی۔اس کے چار نکاتی مینڈیٹس یہ ہیں۔ (1)اردو زبان کی ترویج و ترقی(2)اردو میڈیم میں پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم کی فراہمی(3)روایتی اور فاصلاتی تدریس سے تعلیم کی فراہمی اور(4) تعلیم نسواں پر خصوصی توجہ۔یہ وہ بنیادی نکات ہیں جواِس مرکزی یونیورسٹی کو دیگر مرکزی جامعات سے منفرد اور ممتاز بناتے ہیں۔ قومی تعلیمی پالیسی 2020 میں بھی مادری اور علاقائی زبانوں میں تعلیم کی فراہمی پر کافی زور دیا گیا ہے۔

اُردو کے ذریعے علوم کو فروغ دینے کا واحد مقصد و منشا اُردو داں طبقے تک عصری علوم کو پہنچانا ہے۔ایک طویل عرصے سے اُردو کا دامن علمی مواد سے لگ بھگ خالی رہا ہے۔کسی بھی کتب خانے یا کتب فروش کی الماریوں کا سرسری جائزہ اس بات کی تصدیق کر دیتا ہے کہ اُردو زبان سمٹ کر چند ''ادبی'' اصناف تک محدود رہ گئی ہے۔یہی کیفیت اکثر رسائل واخبارات میں دیکھنے کو ملتی ہے۔اُردو قاری اور اُردو سماج دورِ حاضر کے اہم ترین علمی موضوعات سے نابلد ہیں۔چاہے یہ خود ان کی صحت وبقا سے متعلق ہوں یا معاشی اور تجارتی نظام سے، یا مشینی آلات ہوں یا ان کے گرد وپیش ماحول کے مسائل ہوں، عوامی سطح پراِن شعبہ جات سے متعلق اردو میں مواد کی عدم دستیابی نے عصری علوم کے تئیں ایک عدم دلچسپی کی فضا پیدا کر دی ہے۔یہی وہ چیلنجز ہیں جن سے اُردو یونیورسٹی کو نبرد آزما ہونا ہے۔نصابی مواد کی صورت حال بھی کچھ مختلف نہیں ہے۔اِسکولی سطح پر اُردو کتب کی عدم دستیابی کے چرچے ہر تعلیمی سال کے شروع میں زیر بحث آتے ہیں۔چوں کہ اُردو یونیورسٹی کا ذریعہ تعلیم اُردو ہے اور اس میں عصری علوم کے تقریباً سبھی اہم شعبہ جات کے کورسز موجود ہیں لہٰذا اِن تمام علوم کے لیے نصابی کتابوں کی تیاری اِس یونیورسٹی کی اہم ترین ذمہ داری ہے۔

مجھے اِس بات کی بے حد خوشی ہے کہ یونیورسٹی کے ذمہ داران بشمول اساتذہ کرام کی انتھک محنت اور ماہرین علم کے بھرپور تعاون کی بنا پر کتب کی اشاعت کا سلسلہ بڑے پیمانے پر شروع ہو چکا ہے۔ایک ایسے وقت میں جب کہ ہماری یونیورسٹی اپنی تاسیس کی 25ویں سالگرہ منا رہی ہے، مجھے اس بات کا انکشاف کرتے ہوئے بہت خوشی محسوس ہو رہی ہے کہ یونیورسٹی کا مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم از سر نو اپنی کارکردگی کے نئے سنگِ میل کی طرف رواں دواں ہے اور مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم کی جانب سے کتابوں کی اشاعت اور ترویج میں بھی تیزی پیدا ہوئی ہے۔نیز ملک کے کونے کونے میں موجود تشنگانِ علم فاصلاتی تعلیم کے مختلف پروگراموں سے فیضیاب ہو رہے ہیں۔گرچہ گزشتہ برسوں کے دوران کووڈ کی تباہ کن صورتِ حال کے باعث انتظامی امور اور ترسیل و ابلاغ کے مراحل بھی کافی دشوار کن رہے تاہم یونیورسٹی نے اپنی حتی المقدور کوششوں کو بروئے کار لاتے ہوئے مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم کے پروگراموں کو کامیابی کے ساتھ روبہ عمل کیا ہے۔میں یونیورسٹی سے وابستہ تمام طلبا کو یونیورسٹی سے جڑنے کے لیے صمیم قلب کے ساتھ مبارک باد پیش کرتے ہوئے اس یقین کا اظہار کرتا ہوں کہ ان کی علمی تشنگی کو پورا کرنے کے لیے مولانا آزاد اردو یونیورسٹی کا تعلیمی مشن ہر لمحہ ان کے لیے راستے ہموار کرے گا۔

پروفیسر سید عین الحسن

وائس چانسلر

پیغام

موجودہ دور میں فاصلاتی طریقۂ تعلیم کو پوری دنیا میں ایک انتہائی کارگر اور مفید طریقۂ تعلیم کی حیثیت سے تسلیم کیا جاچکا ہے اور اس طریقۂ تعلیم سے بڑی تعداد میں لوگ مستفید ہو رہے ہیں۔ مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی نے بھی اپنے قیام کے ابتدائی دنوں ہی سے اردو آبادی کی تعلیمی ضروریات کے پیش نظر فاصلاتی طرز تعلیم کو متعارف کرایا۔ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی کا آغاز 1998 میں نظامتِ فاصلاتی تعلیم سے ہوا اور 2004 میں باقاعدہ روایتی طرز تعلیم (Regular Courses) کا آغاز ہوا اور بعدازاں متعدد روایتی تدریس کے شعبہ جات قائم کیے گئے۔

ملک میں تعلیمی نظام کو بہتر انداز سے جاری رکھنے میں یو جی سی کا مرکزی کردار رہا ہے۔ فاصلاتی تعلیم (ODL) کے تحت جاری مختلف پروگرام UGC-DEB سے منظور شدہ ہیں۔ UGC-DEB اس بات پر زور دیتا رہا ہے کہ فاصلاتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات کو روایتی نظامِ تعلیم کے نصابات اور نظامات سے کماحقہ ہم آہنگ کر کے فاصلاتی تعلیم کے طلبا کے معیار کو بلند کیا جائے۔ چوں کہ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی فاصلاتی اور روایتی طرزِ تعلیم کی جامعہ (Dual Mode University) ہے، لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیے یو جی سی۔ڈی ای بی کے رہنمایانہ اصولوں کے مطابق (CBCS) Credit Based Credit System نظام متعارف کرایا گیا اور خود اکتسابی مواد (Self Learning Material) از سرِ نو، جس میں یو جی اور پی جی طلبا کے لیے چھ بلاک چوبیس اکائیوں اور چار بلاک سولہ اکائیوں پر مشتمل نئے طرز کی ساخت پر تیار کیا گیا ہے۔

مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم یو جی، پی جی، بی ایڈ، ڈپلوما اور سرٹیفکیٹ کورسز پر مشتمل جملہ اٹھارہ (18) کورسز چلا رہا ہے۔ ساتھ ہی تکنیکی ہنر پر مبنی کورسز بھی شروع کیے جا رہے ہیں۔ متعلمین کی سہولت کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں 9 علاقائی مراکز بنگلورو، بھوپال، دربھنگہ، دہلی، کولکاتا، ممبئی، پٹنہ، رانچی اور سری نگر اور 6 ذیلی علاقائی مراکز حیدرآباد، لکھنؤ، جموں، نوح، وارانسی اور امراوتی کا ایک بہت بڑا نیٹ ورک موجود ہے۔ اس کے علاوہ وجے واڑہ میں ایک ایکسٹنشن سنٹر بھی قائم کیا گیا ہے۔ ان مراکز کے تحت سرِدست 163 سے زیادہ متعلم امدادی مراکز (Learner Support Centres) نیز 20 پروگرام سنٹرس (Programme Centres) کام کر رہے ہیں، جو طلبا کو تعلیمی اور انتظامی مدد فراہم کرتے ہیں۔ مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم اپنی تعلیمی اور انتظامی سرگرمیوں میں آئی سی ٹی کا بھرپور استعمال کرتا ہے، نیز اپنے تمام پروگراموں میں داخلے صرف آن لائن طریقے ہی سے دے رہا ہے۔

مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم کی ویب سائٹ پر متعلمین کو خود اکتسابی مواد کی سافٹ کاپیاں بھی فراہم کی جا رہی ہیں، نیز آڈیو۔ویڈیو ریکارڈنگ کا لنک بھی ویب سائٹ پر فراہم کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ متعلمین کے درمیان رابطے کے لیے ای میل اور وہاٹس ایپ گروپ کی سہولت فراہم کی گئی ہے، جس کے ذریعے متعلمین کو پروگرام کے مختلف پہلوئوں جیسے کورس کے رجسٹریشن، مفوضات، کونسلنگ، امتحانات وغیرہ کے بارے میں مطلع کیا جاتا ہے۔ پچھلے دو سال سے ریگولر کاؤنسلنگ کے علاوہ ایڈیشنل رمیڈیل آن لائن کاؤنسلنگ مہیا کی جا رہی ہے تاکہ طلبا کے تعلیمی معیار کو بلند کیا جا سکے۔

امید ہے کہ ملک کی تعلیمی اور معاشی حیثیت سے پچھڑی اردو آبادی کو عصری تعلیم کے مرکزی دھارے سے جوڑنے میں مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم کا بھی نمایاں رول ہوگا۔ آنے والے دنوں میں تعلیمی ضروریات کے پیش نظر نئی تعلیمی پالیسی (NEP-2020) کے تحت مختلف کورسز میں تبدیلیاں کی جائیں گی اور امید ہے کہ یہ فاصلاتی نظام کو زیادہ مؤثر و کارگر بنانے میں مددگار ثابت ہوگی۔

پروفیسر محمد رضا اللہ خان

ڈائرکٹر، مرکز برائے فاصلاتی اور آن لائن تعلیم

کورس کا تعارف

تاریخ کا دائرہ اب دن بدن بڑھتا جارہا ہے۔ اب وہ ان پہلوؤں پر بھی تحقیق کر رہی ہے جنہیں اس سے پہلے مورخین نے نظر انداز کیا تھا اور زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ مثلاً ابتدائی دور میں تاریخ کو صرف بادشاہوں اور ان کے دربار سے متعلق سمجھا جاتا تھا اور تاریخ صرف عظیم ہستیوں کے اطراف میں گھومتی تھی۔ کلہن کے لیے تاریخ کا مطلب صرف کشمیر کے بادشاہوں اور امراء کا ذکر کرنا تھا۔ دوسری طرف مغل دور میں ابو الفضل کی تاریخ نویسی کا محور مغل بادشاہ اکبر تھا، جبکہ سلطنت سے متعلق دوسرے امور اس کے ضمن میں تھے۔ حالیہ دور میں مورخین نے سماج کے دوسرے پہلوؤں جیسے معیشت، سماج اور مذہب کو بھی تاریخ کے دامن میں جگہ دی ہے۔ ہندوستان میں نو آبادیاتی تاریخ نویسوں نے سب سے پہلے اس ضمن میں کوشش کی، لیکن ان کی اس تاریخ نویسی کا مقصد برطانوی استبداد کا تحفظ تھا۔ انیسویں صدی کے نصف آخر میں مارکسی مورخین نے تاریخ کو نو آبادیاتی چنگل سے آزاد کرایا اور حکمرانوں کے بجائے عوام کی تاریخ کو اپنی تحقیق کا مرکز بنایا۔ لیکن ان کی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ وہ تاریخ کو صرف طبقاتی کشمکش اور مادی تاریخ کے زاویہ نظر سے دیکھتے تھے۔ بعد کے ادوار میں دوسرے مورخین جیسے سبلٹرن مورخین نے تاریخ کے دائرے کو وسیع کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

تاریخ کے مضمون پر یہ خود اکتسابی مواد ”تاریخ ہندوستان: آٹھویں صدی کے وسط سے سولہویں صدی عیسوی کی ابتدا تک“ مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی میں فاصلاتی تعلیم کے بی۔اے۔ سمسٹر سوم کے طلبا و طالبات کے لیے تیار کی گئی ہے، جو 6 بلاک اور 24 اکائیوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تیاری میں UGC-DEB کے تمام احکامات اور رہنمایانہ اصولوں کا خیال رکھا گیا ہے۔ پہلے بلاک میں آٹھویں سے بارہویں صدی کے درمیان شمالی ہندوستان کے سیاسی، سماجی، ثقافتی اور مذہبی حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرے بلاک میں عربوں کے سیاسی عروج اور ان کے ہندوستان سے تعلقات کے ساتھ ساتھ غزنویوں اور غوریوں کی سیاسی تاریخ کا ہندوستانی پس منظر میں احاطہ کیا گیا ہے۔ تیسرا بلاک دہلی سلطنت کے قیام اور استحکام میں مملوک، خلجی، تغلق، سید اور لودھی خاندان کی کوششوں کا احاطہ کرتا ہے، جبکہ چوتھے بلاک میں دہلی سلطنت کے دور میں سماج، معیشت، ثقافت اور اس دور کی مذہبی تحریکوں کو زیر مطالعہ لایا گیا ہے۔ پانچواں بلاک دہلی سلطنت کے مرکزی اور مقامی نظم ونسق سے متعلق ہے اور چھٹا بلاک دکن اور جنوبی ہندوستان میں ابھرنے والی وجے نگر اور بہمنی سلطنت کے سیاسی، معاشی اور سماجی حالات کو تفصیلی طور پر بیان کرتا ہے۔

اس طرح یہ خود اکتسابی مواد آٹھویں صدی کے آغاز سے سولہویں صدی عیسوی کی ابتدا تک کے دور کا تاریخی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ مزید برآں اس عہد کے سماج، معیشت اور مذہب کے میدان میں ہونے والی تبدیلیوں سے طلبا و طالبات کو روشناس کراتا ہے۔ امید ہے کہ اس کے مطالعے سے نہ صرف متعلم بلکہ عام قاری کی بھی علم تاریخ کی بنیادی فہم میں اضافہ ہوگا ساتھ ہی مزید مطالعے کی راہ ہموار ہوگی۔

ڈاکٹر شیخ محبوب باشا

کورس کو آرڈی نیٹر

تاریخ ہندوستان

آٹھویں صدی عیسوی کے وسط سے سولہویں صدی عیسوی کی ابتدا تک

History of India

(Mid-8th Century AD to Early 16th Century AD)

اکائی 1۔آٹھویں صدی میں ہندوستان کے سیاسی حالات

(Political Conditions in India at 8th Century)

اکائی کے اجزا

1.0 تمہید

1.1 مقاصد

1.2 سیاسی صورت حال

1.3 پال خاندان

1.4 پرتی ہار خاندان

1.5 راشٹر کوٹ خاندان

1.6 سیاسی تنظیم

1.7 اکتسابی نتائج

1.8 کلیدی الفاظ

1.9 نمونہ امتحانی سوالات

1.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

1.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

1.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1.0 تمہید (Introduction)

چھٹی صدی میں آخری حصے میں گپت سلطنت کے زوال کے ساتھ ہندوستانی تاریخ کے ایک اہم دور کا خاتمہ ہو گیا۔ گپت سلطنت کے زوال کے گہرے سیاسی اثرات مرتب ہوئے۔ سب سے اہم یہ تھا کہ مگدھ جو پچھلے ایک ہزار سال سے زیادہ عرصے تک ہندوستانی سیاست کا مرکز رہا تھا، لیکن گپت سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی اس کی یہ اہمیت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور اس کی جگہ قنوج، شمالی ہندوستان کے سیاسی اقتدار کا مرکز بن کر ابھرا۔ ساتویں صدی کے آغاز مین قنوج کے تخت شاہی پر ہرش کی تخت نشینی کے ساتھ قنوج کو اس حد تک عروج حاصل ہوا کہ آئندہ مکمل ایک صدی تک تین طاقتوں نے اس پر اقتدار قائم کرنے کے لیے باہم شدید جدوجہد کی۔

کسی عظیم سلطنت کے زوال کا فوری نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اقتدار کے مختلف خود مختار مراکز اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ یہی حال گپت سلطنت کے زوال کے بعد ہوا اور ہندوستان کے طول و عرض میں اقتدار کے متعدد خود مختار مراکز قائم ہو گئے۔ ہندوستان میں یہ کثیر ریاستی نظام کی توسیع کا دور تھا۔ متعدد برائیوں کے باوجود یہ کثیر ریاستی نظام اس عہد کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی کی بنیاد تھا۔ سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اس عہد میں وسیع سماجی اور معاشی بدلاؤ بھی آئے۔ ذات پات کا نظام مزید بے لچک اور سخت ہو گیا اور سماج پہلے سے زیادہ بنیاد پرست بن گیا۔ علاوہ ازیں معیشت کے زوال کی علامتیں ظاہر ہونے لگیں اور ہر جگہ جاگیر داری یا سامنتی نظام کا بول بالا ہونے لگا۔

ہرش وردھن کے عہد حکومت تک کچھ حد تک شمالی ہند کی سیاسی وحدت قائم رہی، لیکن ہرش کی موت (647ء) کے ساتھ ہی اس کا شاہی خاندان اور ریاست دونوں ہی ختم ہو گئے اور پورے شمالی ہندوستان میں سیاسی بے یقینی کی فضا قائم ہو گئی جس کا خاتمہ صرف 1206ء میں دہلی سلطنت کے قیام کے بعد جا کر ہوا۔ اسی پس منظر میں نئے شاہی خاندانوں اور ریاستوں کو ابھرنے کا موقع ملا۔ محمود غزنوی کے حملے کے وقت ہم جن ریاستوں کو پاتے ہیں ان میں سے زیادہ تر کو اسی دور میں عروج حاصل ہوا۔ ان کی حیثیت سیاسی اندھیرے میں ٹمٹماتے چراغوں کی سی تھی۔

1.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- آٹھویں صدی عیسوی میں ہندوستان کے سیاسی حالات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- سہ طرفہ جدوجہد کے حوالے سے قنوج کی بڑھتی ہوی اہمیت بیان کر سکیں گے۔
- سہ طرفہ جدوجہد میں شامل طاقتوں کے بارے میں جان سکیں گے۔
- جنوبی ہند کے طاقتور حکمراں خاندانوں کا سرسری جائزہ لے سکیں گے۔
- سندھ میں مسلمانوں کی آمد اور اس کی فتح کے اثرات بیان کر سکیں گے۔

1.2 سیاسی صورت حال (Political Conditions)

ہرش کے کٹر مخالف اور طاقتور حریف 'ششانک' کی موت کے بعد بنگال میں لگ بھگ ایک صدی تک بد نظمی پھیلی رہی۔ کسی طاقتور مرکزی حکومت کی غیر موجودگی میں پھیلی اس بد نظمی اور افرا تفری سے تنگ آکر وہاں کے لوگوں نے 850ء کے قریب کسی گوپال نامی شخص کو اپنا حکمراں چن لیا، جو بنگال کے مشہور پال خاندان کا بانی بنا۔ وسطی اور مغربی ہند میں بھی متعدد سیاسی خاندانوں کو عروج حاصل ہوا۔ 712ء محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ کی فتح سندھ کے بعد سے سندھ عربوں کے قبضے میں تھا جن کے دو مرکز تھے ملتان اور منصورہ۔ جنوبی ہند کی حالت شمال سے یک سر مختلف تھی۔ جہاں شمال میں سیاسی بے یقینی پھیلی تھی وہیں جنوب میں طاقتور اور عظیم سلطنتوں کا عروج اسی دور میں ہوا۔ تنجاور کے عظیم چولوں کے بعد دنتی درگ کی قیادت میں راشٹر کوٹوں کو عروج حاصل ہوا جو تقریباً دسویں صدی تک نہ صرف جنوبی ہند کی عظیم طاقت بنے رہے بلکہ شمال کی سیاست میں بھی فیصلہ کن کردار ادا کیا۔ دکن میں وینگی کے مشرقی چالوکیوں کی حکومت تھی جو کہ جنوب میں سب سے زیادہ وقت تک قائم رہنے والی ریاست تھی۔ ان کے نزدیک ہی آندھرا کے شری کاکلم ضلع کے آس پاس مشرقی گنگوں کی ریاست تھی۔ جنوب بعید میں کانچی کے پلووں کے زوال کا آغاز ہو گیا تھا اور نویں صدی کے آخر تک ان کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔ پلووں کے زوال کا سب سے زیادہ فائدہ علی الترتیب پانڈیوں اور چولوں نے اٹھایا۔ راشٹر کوٹوں کے ہمعصر مغربی گنگ بھی جنوب بعید میں کافی طاقتور تھے۔

آٹھویں صدی کے وسط میں ہندوستان کے تین کونوں میں تین طاقتور شاہی خاندانوں کو عروج حاصل ہوا۔ یہ تھے مشرقی اور شمالی ہندوستان میں پال خاندان، مغربی ہندوستان اور بالائی وادی گنگا میں پرتی ہار خاندان اور دکن میں راشٹر کوٹ خاندان۔ قنوج کو اس وقت پورے شمالی ہندوستان کے پایہ تخت کی اہمیت حاصل تھی جس کی وجہ سے یہ تینوں ریاستیں اس پر قبضے کے لیے پوری کوششیں کرتی تھیں۔ اس طرح وہ پورے شمالی ہند پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتی تھیں۔ ان کی اس جدوجہد کو 'سہ طرفہ جدوجہد' (Trianguler Struggle) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اگرچہ یہ تمام سلطنتیں آپس میں لڑتی رہتی تھیں، لیکن انہوں نے اپنی ریاستوں میں زندگی کو پر سکون بنایا اور ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی حوصلہ افزائی کی۔ ان تینوں میں راشٹر کوٹ سلطنت سب سے زیادہ عرصے تک قائم رہی، یہ نہ صرف اس عہد کی سب سے طاقتور سلطنت تھی بلکہ اس نے معاشی اور تہذیبی میدانوں میں شمال اور جنوب کے درمیان ایک پل کا کام بھی کیا۔

مگدھ کے زوال کے بعد ہرش کے تحت قنوج کے عروج کے بعد سے ہی اسے شمالی ہندوستان پر اقتدار کی علامت مانا جاتا تھا۔ سلطنت عہد میں یہ مقام دلی کو حاصل ہوا۔ قنوج گنگا کے کنارے واقع تھا جہاں سے مختلف حصوں تک دریائی راستے سے بآسانی فوج بھیجی جا سکتی تھی اور گنگا کے ذریعے ہونے والی تجارت کو کنٹرول کیا جا سکتا تھا۔ اس کے ذریعے گنگا کے وسیع میدانوں پر بھی گرفت رکھی جا سکتی تھی۔ قنوج پر قبضے کا مطلب وادی گنگا کے بالائی حصے نیز اس حصے میں موجود وافر زرعی اور تجارتی وسائل کا حصول تھا۔ مزید یہ کہ بنارس سے جنوبی بہار تک کے وسائل سے پُر علاقوں پر تسلط کے لیے بھی پال حکمرانوں اور پرتی ہار حکمرانوں کے درمیان مقابلہ آرائی ہوئی۔ یہ علاقے بھی نہایت زرخیز اور خوش حال تھے۔ اس علاقے پر قبضے کے لیے پرتی ہاروں کو راشٹر کوٹ حکمرانوں سے بھی مقابلہ کرنا پڑا، جس میں وہ ہمیشہ راشٹر کوٹوں کے

ہاتھوں شکست سے دوچار ہوئے اور ان کا ایک عظیم ریاست کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

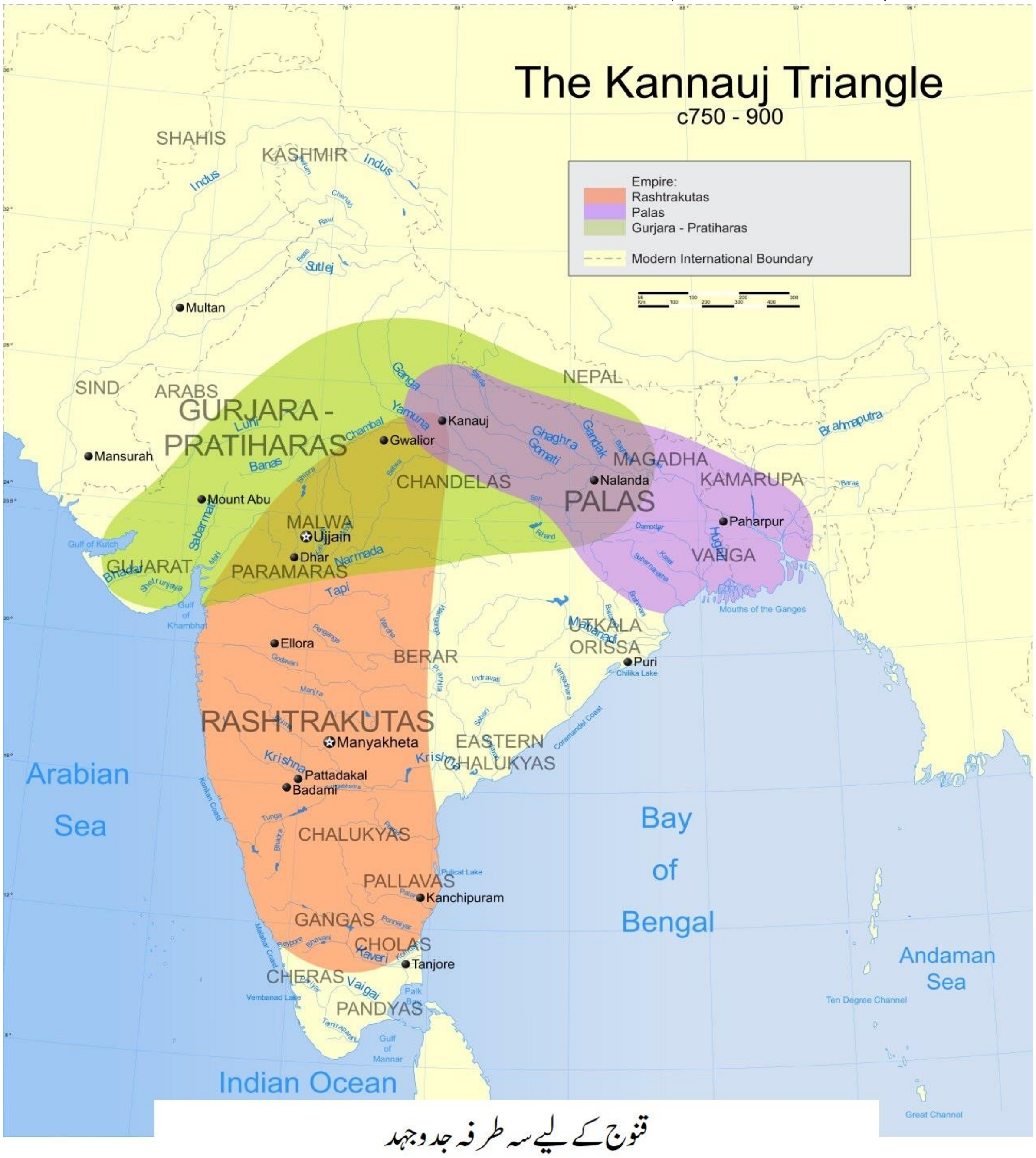

قنوج کے لیے سہ طرفہ جدوجہد

https://en.wikipedia.org/wiki/Tripartite_Struggle#/media/File:Indian_Kanauj_triangle_map.svg

1.3 پال خاندان (Pala Dynasty)

پال سلطنت تقریباً 750 میں گوپال نے اس وقت قائم کی تھی جب اس علاقے کے معزز لوگوں نے اس علاقے میں پھیلی ہوئی تمام لاقانونیت کو ختم کرنے کے لیے اسے اپنا راجا چن لیا تھا۔ 770 میں اس کا بیٹا دھرم پال اس کا جانشین بنا جس نے 810 تک حکومت کی۔ دھرم پال کو راشٹر کوٹ راجا دھروو کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ راجا دھروو اس سے پہلے پرتی ہار راجا کو بھی شکست دے چکا تھا لیکن ان علامتی فتوحات کے

بعد راجا دھرو دکن واپس لوٹ گیا جس کی وجہ سے دھرم پال کو اپنی حالت مضبوط بنانے میں دیر نہیں لگی۔ دھرم پال نے قنوج پر اپنا اقتدار قائم کر کے ایک شاندار دربار لگایا جس میں پنجاب، مشرقی راجستھان وغیرہ کے ماتحت راجاؤں نے شرکت کی تھی لیکن دھرم پال قنوج پر اپنے اقتدار کو مضبوطی سے قائم نہ رکھ سکا۔ ناگ بھٹ دوم کے عہد میں پرتی ہار طاقت ایک بار پھر زور پکڑ گئی۔ دھرم پال پیچھے ہٹ گیا لیکن بہار میں مونگیر کے قریب اسے شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ بہار اور موجودہ مشرقی اتر پردیش پر اقتدار کے سوال پر پال اور پرتی ہار حکمرانوں کے درمیان برابر مقابلہ آرائی ہوتی رہی لیکن بیشتر عرصے تک بنگال کے ساتھ ساتھ بہار پر بھی پال حکمرانوں کا تسلط رہا۔

شمال میں ناکام رہنے کے بعد پال حکمرانوں نے اپنی توانائیوں کو دوسرا موڑ دے دیا۔ دھرم پال کے بیٹے دیو پال نے جو کہ 810 میں گدی نشین ہوا اور جس نے 60 سال تک حکومت کی، پراگ جیوتش پور (آسام) نیز اڑیسہ کے کچھ حصوں تک اپنا اقتدار قائم کر لیا۔ شاید موجودہ نیپال کا بھی ایک حصہ پال حکمرانوں کے زیر اقتدار آ گیا تھا۔

اس طرح آٹھویں صدی کے وسط سے نویں صدی کے وسط تک یعنی تقریباً سو سال تک پال حکمرانوں نے مشرقی ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم رکھا۔ کچھ عرصے کے لیے ان کے اقتدار کا دائرہ بنارس تک پھیل گیا تھا۔ ایک عرب تاجر سلیمان کے سفر نامے سے پال حکمرانوں کے زیادہ طاقتور ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ سلیمان تاجر نے نویں صدی کے وسط میں ہندوستان کا سفر کیا تھا اور اپنے سفر کا حال تحریر کیا تھا۔ اس نے پال سلطنت کو روحم (یا دھرم پال کا مخفف و ترم) کہا ہے۔ اس کے تذکرے سے پتہ چلتا ہے کہ پال حکمران اپنے پڑوسی پرتی ہار حکمرانوں اور راشٹر کوٹ حکمرانوں سے جنگ کرتا رہتا تھا لیکن اس کی فوجیں دشمن کی فوجوں سے بہت زیادہ تھیں۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ پال راجا پچاس ہزار ہاتھیوں کے ساتھ جنگ میں جایا کرتے تھے اور دس پندرہ ہزار افراد اس کی فوج میں کلف دینے اور کپڑا دھونے کے لیے مامور کیے گئے تھے۔ اس بات سے ہی پال حکمرانوں کی فوجوں کی وسعت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

پال حکمرانوں کے بارے میں تبتی روزنامچوں سے یہ بھی ہو پاتا ہے اگرچہ یہ سترہویں صدی میں لکھے گئے تھے ان کے مطابق پال حکمران بودھ دھرم اور بودھ علوم کے زبردست سرپرست اور محافظ تھے۔ ساری مشرقی دنیا میں مشہور، نالندہ یونیورسٹی کو پال حکمرانوں نے ہی دوبارہ زندہ کیا تھا اور اس کے مصارف کے لیے دوسو گاؤں کا عطیہ دیا گیا تھا۔ وکرم شیلا یونیورسٹی بھی پال حکمرانوں نے ہی قائم کی تھی جو کہ شہرت میں نالندہ یونیورسٹی کے بعد دوسرے نمبر پر تھی۔ یہ یونیورسٹی مگدھ میں دریائے گنگا کے کنارے ایک پہاڑی کی چوٹی پر قائم کی گئی تھی جس کے ارد گرد کا ماحول بہت ہی فرحت بخش تھا۔ پال حکمرانوں نے متعدد بودھ وہار بھی بنوائے جس میں بودھ بھکشو بڑی تعداد میں رہتے تھے۔

پال حکمرانوں کے تبت کے ساتھ بھی بہت گہرے ثقافتی روابط تھے۔ مشہور بدھ علماء، سنت رکشت اور دیپنکر (جو آتش کہلاتے ہیں) کو تبت آنے کی دعوت دی گئی تھی۔ وہاں جا کر ان دونوں بدھ عالموں نے ایک نے بودھ فرقے کی بنیاد رکھی۔ اس کے نتیجے میں بہت سارے تبتی بودھ، نالندہ اور وکرم شیلا کی یونیورسٹیوں میں علم حاصل کرنے کے لیے آتے تھے۔

جنوب مشرقی ایشیاء کے ساتھ بھی پال حکمرانوں کے بہت قریبی تجارتی اور تہذیبی تعلقات تھے۔ جنوب مشرقی ایشیا کے ساتھ پال حکمرانوں کی تجارت بہت ہی سود مند تھی۔ اس سے پال سلطنت میں بہت زیادہ خوش حالی آئی۔ طاقتور شیلیندر خاندان نے، جو کہ بودھ مذہب کا پیرو تھا اور جس کا اقتدار ملایا، جاوا، ساترا اور قریب کے تمام جزیروں پر تھا، اپنے کئی سفیر پال حکمرانوں کے دربار میں بھیجے تھے۔ انہوں نے نالندہ میں ایک بدھ مٹھ قائم کرنے کی اجازت چاہی تھی اور پال حکمران دیوپال سے اس مٹھ کے اخراجات کے لیے پانچ گاؤں بھی مانگے تھے۔ یہ درخواست منظور کر لی گئی تھی جو کہ ان دونوں کے درمیان گہرے تعلقات کا ثبوت ہے۔

1.4 پرتی ہار خاندان (Pratihara Dynasty)

پرتی ہاروں کو گرجر پرتی ہار بھی کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا اصل تعلق گجرات یا جنوبی مغربی راجستھان سے تھا۔ ممکن ہے کہ یہ لوگ شروع میں مقامی نوعیت کے عہدے دار رہے ہوں گے اور پھر بعد میں وسطی اور مشرقی راجستھان کے متعدد علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔ راجستھان پر سندھ کی طرف سے ہونے والے عرب حکمرانوں کے حملے کو روکنے کے نتیجے میں ہی ان کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ بہر حال 783 میں گجرات کے چالوکیہ راجاؤں نے عربوں کو فیصلہ کن شکست دی اور ان کا خطرہ ختم ہوا۔

اپنی سرحدوں کو بالائی وادی گنگا اور مالوہ تک پھیلانے کے لیے شروع کے پرتی ہار حکمرانوں کے عزائم کو راشٹر کوٹ حکمرانوں دھرو اور گوپال سوئم نے ناکام بنایا۔ 790 اور پھر 7-806 میں راشٹر کوٹوں نے پرتی ہاروں کو شکست دی اور پھر دکن کی طرف واپس لوٹ گئے اور میدان پال حکمرانوں کے لیے چھوڑ دیا۔ شاید راشٹر کوٹوں کا اصل مقصد مالوہ اور گجرات پر اپنا تسلط قائم کرنا تھا۔ پرتی ہار سلطنت کا اصل بانی اور خاندان کا سب سے بڑا راجا بھوج تھا۔ اس کی شروع کی زندگی کے بارے میں زیادہ معلوم نہیں ہے اور یہ کہ وہ کب گدی نشین ہوا تھا۔ اس نے سلطنت کی پھر سے تشکیل کی اور 836 کے آس پاس قنوج کو دوبارہ حاصل کر لیا جو تقریباً ایک صدی تک پرتی ہار سلطنت کا دارالسلطنت رہا۔ راجا بھوج نے اپنی سرحدوں کو مشرق کی طرف پھیلانے کی کوشش کی لیکن اسے پال راجا، دیوپال کے ہاتھوں شکست ہوئی۔ اس کے بعد اس نے وسطی ہندوستان دکن اور گجرات کا رخ کیا۔ اس طرح راشٹر کوٹوں کے ساتھ اس کی مقابلہ آرائی پھر شروع ہو گئی۔ دریائے نرمدا کے کنارے ایک خوں ریز جنگ ہوئی اور بھوج، مالوہ کے اہم علاقے اور گجرات پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن وہ اس سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس لیے وہ ایک بار پھر شمال کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ایک کتبے کے مطابق، اس کی سلطنت کا پھیلاؤ دریائے ستلج کے مشرقی کنارے تک تھا۔ عرب سیاحوں کا بیان ہے کہ پرتی ہار حکمرانوں کے پاس ہندوستان بھر میں بہترین گھڑ سوار فوج تھی۔ ان دنوں وسطی ایشیا اور عرب سے گھوڑوں کی درآمد کاری ہندوستانی تجارت کا اہم عنصر تھی۔ دیوپال کی موت اور پال سلطنت کے کمزور پڑ جانے پر بھوج نے اپنی سرحدیں مشرق میں بھی بڑھا لیں۔ بھوج کا نام داستانوں میں بھی مشہور ہے۔ ممکن ہے کہ بھوج کے ابتدائی زندگی کے کارنامے، اپنی کھوئی ہوئی سلطنت کی دوبارہ حصولیابی اور آخر میں قنوج پر دوبارہ قبضے نے اس کے ہمعصر کے تخیل کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ بھوج وشنو پرست تھا اور اپنے لیے "آدی وراہ" کا خطاب اختیار کیا تھا جو کہ اس کے جاری کردہ سکوں پر بھی کندہ پایا گیا ہے۔ کچھ عرصے بعد کے اجین کے پرمار خاندان کے راجا بھوج اور

اس میں امتیاز کرنے کے لیے اسے کبھی کبھی مہر بھوج کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ بھوج کی موت 885 کے آس پاس ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مہیندر پال اول اس کا جانشین ہوا۔ مہیندر پال نے بھوج سلطنت کو قائم رکھتے ہوئے 908-909 کے آس پاس تک حکومت کی اور مگدھ نیز شمالی بنگال تک اس کی توسیع بھی کی۔ اس کے کتبے کاٹھیاواڑ، مشرقی پنجاب اور اودھ میں بھی پائے گئے ہیں۔ مہینہ رپال نے کشمیر کے راجا کے ساتھ بھی ایک بار جنگ کی لیکن اس سے شکست کھا جانے پر اپنے والد بھوج کے ذریعے جیتے گئے پنجاب کے کچھ علاقے اسے دینے پڑے تھے۔

اس طرح نویں صدی کے وسط سے دسویں صدی کے ربع اوّل تک پرتی ہاروں نے تقریباً ایک صدی تک شمالی ہندوستان پر حکومت کی۔ بغداد کے باشندے المسعودی نے جو کہ 915-16 میں گجرات آیا تھا، پرتی ہار حکمرانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور سلطنتوں کے پھیلاؤ کا ذکر کیا ہے۔ اس نے گرجر پرتی ہار سلطنت کو الجزر (غالباً گرجر کا عربی متبادل ہے) اور راجا کو بورا کہا ہے جو کہ شاید راجا بھوج کے خطاب ''آدی وراہ'' کا غلط تلفظ ہو سکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ بھوج کا اس وقت تک انتقال ہو چکا تھا۔ المسعودی کا بیان ہے کہ الجزر سلطنت میں 1,800,000 گاؤں شہر اور دیہی علاقے شامل تھے اور اس کا پھیلاؤ طول میں 2000 کلومیٹر اور عرض میں 2000 کلومیٹر تھا۔ راجا کی فوج چار حصوں پر مشتمل تھی اور ہر قصے میں 7,00,000 سے 9,00,000 سپاہی تھے۔ شمال کی فوج سے وہ ملتان کے حکمران اور اس سے ملے ہوئے مسلمانوں سے جنگ کرتا تھا۔ جنوب کی فوج راشٹر کوٹوں اور مشرق کی فوج پال حکمرانوں کے خلاف جنگ کرتی تھی۔ جنگ کے لیے اس کے پاس صرف دو ہزار تربیت یافتہ ہاتھی تھے لیکن ملک کے کسی بھی راجا کے مقابلے میں اس کے پاس بہترین گھڑ سوار فوج تھی۔

پرتی ہار راجا علم و ادب کے سرپرست تھے۔ سنسکرت زبان کا عظیم شاعر اور ڈرامہ نگار راج شیکھر، راجا بھوج کے پوتے، مہی پال کے دربار میں رہتا تھا۔ پرتی ہار حکمرانوں نے قنوج کو متعدد عظیم الشان عمارتوں اور مندروں سے آراستہ کیا۔ آٹھویں اور نویں صدی کے دوران متعدد ہندوستانی عالم سفیر بن کر بغداد میں خلیفہ کے دربار میں گئے۔ ان ہندوستانی عالموں نے عربی دنیا کو ہندوستانی سائنس خاص طور پر ریاضی، الجبرا اور علم طب سے روشناس کرایا۔ ہمیں ان راجاؤں کے نام بھی معلوم نہیں ہیں جنہوں نے ان سفیروں کو بغداد بھیجا تھا۔ پرتی ہار حکمران، سندھ کے عرب حاکموں کے خلاف دشمنی کے لیے مشہور تھے۔ اس کے باوجود بھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں بھی ہندوستان اور مغربی ایشیا کے درمیان عالموں کی آمد و رفت اور اشیاء کا لین دین جاری رہا۔

915 اور 918 کے درمیان راشٹر کوٹ راجا اندرا سوم نے پھر قنوج پر حملہ کیا اور شہر کو تاراج کر ڈالا۔ اس سے پرتی ہار سلطنت کافی کمزور پڑ گئی اور گجرات تو تقریباً راشٹر کوٹوں کے ہاتھ میں ہی چلا گیا کیونکہ المسعودی کا بیان ہے کہ پرتی ہار سلطنت کی رسائی سمندر تک نہیں تھی۔ گجرات کے ہاتھ سے نکل جانے کی وجہ سے پرتی ہاروں کو اور بھی دھکا پہونچا، کیونکہ گجرات سمندر کے راستہ ہونے والی تجارت کا مرکز تھا اور شمالی ہندوستان سے مغربی ایشیا کو بھیجی جانے والی اشیاء کی نکاسی یہیں سے ہوتی تھی۔ 963 میں دوسرے راشٹر کوٹ راجا کرشن سوم نے شمالی ہندوستان پر حملہ کر کے پرتی ہار راجا کو شکست دی۔ اس کے بعد جلد ہی پرتی ہار سلطنت کا زوال ہو گیا۔

1.5 راشٹر کوٹ خاندان (Rashtrakuta Dynasty)

جب شمالی ہندوستان پر پال اور پرتی ہار حکمرانوں کی حکومت تھی، دکن پر راشٹر کوٹ حکومت کر رہے تھے۔ یہ ایک عظیم خاندان تھا جس نے متعدد جنگجو اور قابل حکمراں گذرے۔ اس سلطنت کی بنیاد دنتی درگ نے رکھی تھی۔ اس نے مانیہ کھیت یا ملکھید کو اپنی راجدھانی بنایا تھا جو کہ موجودہ شولاپور کے پاس واقع ہے۔ راشٹر کوٹوں نے بہت جلد شمالی مہاراشٹر کے تمام علاقوں پر اپنا تسلط قائم کر لیا تھا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے، مالوہ اور گجرات پر تسلط کے لیے انہوں نے پرتی ہار حکمرانوں سے بھی جنگ کی۔ اگرچہ راشٹر کوٹ اپنے ان حملوں کے باوجود بھی اپنی سرحدوں کو وادی گنگا تک نہ پھیلا سکے تاہم ان کی شہرت میں چار چاند لگ گئے اور کافی مال غنیمت بھی ملا۔ راشٹر کوٹ راجا، وینگی (موجودہ آندھرا پردیش) کے مشرقی چالوکیہ حکمرانوں، جنوب میں کانچی کے پلو راجاؤں اور مدورائی کے پانڈیوں کے خلاف مسلسل جنگ کرتے رہے۔

راشٹر کوٹ خاندان کے سب سے بڑے حکمران غالباً گووند سوم (763-814) اور اموگھ ورش (814-978) تھے۔ قنوج کے ناگ بھٹ کے خلاف کامیاب مہم اور مالوہ کو اپنی سلطنت میں شامل کر لینے کے بعد گووند سوم نے جنوب کا رخ کیا۔ ہمیں ایک کتبے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ گووند نے چیر، پانڈیہ اور چول راجاؤں کو خوف زدہ کر ڈالا تھا اور پلوؤں کو منتشر کر دیا تھا۔ اڑیسہ کے گنگ راجا کو اس کی سرکشی کی بنیاد پر نوبیڑیوں میں جکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ لنکا کے راجا اور اس کے وزیر کو لاپرواہی اور سازش کے الزام میں گرفتار کر کے راجدھانی لایا گیا تھا۔ سری لنکا کے راجا کے دو مجسمے بھی مانیہ کھیت لائے گئے تھے اور ایک شیو مندر کے سامنے فتح کی علامت کے طور پر نصب کر دیئے گئے تھے۔

اموگھ وورش نے 68 سال حکمرانی کی لیکن وہ جنگ و جدال کے مقابلے میں مذہب اور ادب میں زیادہ دلچسپی رکھتا تھا۔ وہ خود بھی مصنف تھا اور شعریات کے موضوع پر پہلی کنڑ کتاب کا مصنف مانا جاتا ہے۔ اسے تعمیرات سے بھی بڑی دلچسپی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ راجدھانی مانیہ کھیت کی تعمیر اسی نے کرائی تھی جو خوبصورتی میں اس عہد کے شہروں سے کافی آگے تھی۔ اموگھ ورش کے عہد میں وسیع و عریض راشٹر کوٹ ریاست میں کئی بار بغاوتیں بھی ہوئیں۔ ان بغاوتوں پر مشکل سے قابو پایا جاسکا تھا۔ اس کی موت کے بعد وہ پھر سے شروع ہو گئیں۔

اس کے پوتے اندر سوم (915-921) نے سلطنت کو پھر سے استوار کیا۔ 915ء میں مہی پال کی شکست اور قنوج کی غارت گری کے بعد اندر سوم اپنے وقت کا سب سے طاقتور راجا بن گیا۔ اس وقت ہندوستان کی سیاحت پر آئے ہوئے مسعودی کے بیان کے مطابق راشٹر کوٹ راجا بلہار یا ولبھ راج ہندوستان کا سب سے بڑا راجا تھا۔ اور بیشتر ہندوستانی راجاؤں نے اس کی حاکمیت کو تسلیم کر رکھا تھا۔ وہ ان کے سفیروں کا کافی احترام کرتے تھے۔ اس کے پاس بہت بڑی فوج تھی اور بے شمار ہاتھی بھی تھے۔

کرشن سوم (934-963) راشٹر کوٹ خاندان کے عظیم حکمرانوں میں آخری راجا تھا۔ وہ مالوہ کے پرمار راجاؤں اور دیلنگی کے مشرقی چالوکیوں کے ساتھ جنگوں میں الجھا رہا۔ اس نے تنجور کے چول حکمرانوں کے خلاف بھی مہم شروع کی، جو کہ کانچی پلو حکمرانوں کو بے

دخل کر چکے تھے۔ کرشن سوم نے چول راجا پار نتکاوّل کو شکست دی اور چول سلطنت کے شمالی حصے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا۔اس کے سارے مخالف اس کے جانشین کے مقابلے پر متحد ہو گئے۔ راشٹر کوٹ کی راجدھانی مانیہ کھیت 972 میں لوٹ لی گئی اور جلادی گئی۔اس طرح راشٹر کوٹ سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

راشٹر کوٹ حکومت دکن میں دو سو سال یعنی دسویں صدی کے آخر تک قائم رہی۔ راشٹر کوٹ حکمرانوں میں مذہبی رواداری تھی اور صرف وشنومت اور شیومت کی ہی نہیں بلکہ جین مذہب کی بھی پوری سرپرستی کی۔ نویں صدی میں ایک راشٹر کوٹ راجا، کرشن اول نے ایلورا میں مشہور شیو مندر تعمیر کرایا تھا جو ایک ہی چٹان کو تراش کر بنایا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا جانشین اموگھ ورش جین مذہب کا ماننے والا تھا لیکن اس نے دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کی بھی سرپرستی کی تھی۔ راشٹر کوٹ راجاؤں نے اپنی ریاست میں مسلمان تاجروں کو آباد ہونے اور اسلام کی تبلیغ کی اجازت دے رکھی تھی۔ راشٹر کوٹ ریاست کے متعدد ساحلی شہروں میں مسلمانوں کی بستیاں اور روزمرہ کی عبادت کے لیے کئی مسجدیں تھیں۔ مذہبی رواداری کی اس پالیسی سے غیر ملکی تجارت کو کافی فروغ حاصل ہوا جس سے راشٹر کوٹ ریاست کی بھی خوشحالی میں اضافہ ہوا۔

راشٹر کوٹ حکمران فنون لطیفہ اور ادب کے زبردست سرپرست تھے۔ان کے درباروں میں نہ صرف سنسکرت کے عالم تھے بلکہ شاعر اور دوسرے لوگ بھی تھے۔ جنھوں نے پراکرت اور اپ بھرنش زبانوں میں بھی لکھا جن سے ہندوستان کی مختلف موجودہ زبانیں پیدا ہوئیں۔اپ بھرنش کے عظیم شاعر سویمبھو اور اس کا بیٹا شاید راشٹر کوٹ دربار میں رہتے تھے۔

1.6 سیاسی تنظیم (Political Orgnisation)

مندرجہ بالا ریاستوں کا نظم ونسق، گپت سلطنت، ہرش کی سلطنت اور جنوب میں چالوکیہ حکمرانوں کے خیالات اور روایات پر مبنی تھا۔ حسب سابق سلطنت کا سارا اقتدار راجا میں مرکوز تھا۔ وہ حکومت کا سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ مسلح افواج کا سربراہ اعلیٰ بھی ہوتا تھا۔ ایک عظیم دربار کے علاوہ شاہی محل کے سامنے گھڑ سوار اور پیادہ فوج تعینات رہتی تھی۔ جنگ میں پکڑے گئے ہاتھیوں اور گھوڑوں کی قواعد اسی جگہ کی جاتی تھی۔ دوار پال (چوبدار) حاضر رہتے تھے، جو راجا کے دربار میں حاضری دینے والے ماتحت سرداروں، جاگیرداروں، سفیروں اور دوسرے اعلیٰ عہدے داروں کی آمد و رفت کا بندوبست کرتے تھے۔ سیاسی معاملات اور انصاف کے علاوہ شاہی دربار تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی بھی سرپرستی کرتا تھا جہاں رقاصائیں اور ماہر موسیقار بھی ہوتے تھے۔ تقریب کے موقعوں پر شاہی خاندان کی عورتیں بھی دربار میں موجود رہتی تھیں۔ عرب سیاحوں کے بیان کے مطابق راشٹر کوٹ ریاست میں شاہی خاندان کی عورتیں چہرے کو ڈھکتی نہیں تھیں۔

عام طور پر راجا موروثی ہوتا تھا۔اس زمانے میں سیاسی اتھل پتھل کی وجہ سے اس وقت کے دانشور، حکمراں سے مکمل وفاداری اور تابعداری پر زور دیتے تھے۔ راجاؤں کے درمیان اور راجاؤں اور ماتحت جاگیرداروں کے درمیان لگاتار جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ اگرچہ راجا اپنی

ریاستوں میں امن و قانون قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ان کی طاقت اور اقتدار کبھی کم پڑ جاتے تھے۔ علاقائی حکمران اور خود مختار سردار اکثر براہِ راست انتظام والے علاقے کو محدود کر دیتے تھے۔ اس وقت کے ایک مصنف میدھا تیتھی کا خیال ہے کہ اس وقت کسی بھی شخص کو چوروں اور قاتلوں سے تحفظ کے لیے اپنے پاس ہتھیار رکھنے کا حق تھا۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ ایک ظالم اور بے انصاف بادشاہ کی مخالفت کرنا درست تھا۔ اس طرح گویا شاہی حقوق اور مراعات کے بارے میں وقطعی تصور، جس کا بیشتر ذکر وضاحت کے ساتھ پرانوں میں نہیں کیا گیا ہے، تمام مفکرین کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

جانشینی کا طریقہ قطعی اور جامد نہیں تھا۔ اگرچہ عام طور پر سب سے بڑا لڑکا ہی جانشین ہوتا تھا لیکن کئی ایسی مثالیں بھی ہیں کہ سب سے بڑے بھائی کو چھوٹے بھائیوں سے جنگ کرنی پڑی تھی اور کبھی کبھی تو شکست کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس طرح راشٹر کوٹ حکمراں دھرو اور گووند چہارم نے اپنے بڑے بھائیوں کو ہی بے دخل کیا تھا۔ بعض اوقات راجا اپنے سب سے بڑے بیٹے یا کسی چہیتے بیٹے کو اپنا جانشین یا ولی عہد نامزد کر دیا کرتا تھا۔ ایسی صورت میں ولی عہد راجدھانی میں رہ کر حکومت چلانے میں راجا کی مدد کرتا تھا۔ چھوٹے شہزادوں کو کبھی کبھی صوبائی گورنر بنایا جاتا تھا۔ شہزادیوں کا تقرر کسی سرکاری عہدے پر شاید ہی کبھی ہوتا ہو لیکن ایک ایسی مثال ہے کہ ایک راشٹر کوٹ شہزادی چندرو لبھی نے، جو کہ اموگھ ورش کی لڑکی تھی، کچھ عرصے کے لیے رائچور کے دوآبہ پر حکومت کی تھی۔

عام طور پر راجا کو مشورہ دینے کے لیے کچھ وزیر ہوتے تھے۔ راجا ان وزیروں کا انتخاب سرکردہ خاندانوں سے خود ہی کرتا تھا۔ ان وزیروں کا عہدہ بھی اکثر موروثی ہی ہوتا تھا۔ پال راجاؤں کے عہد حکومت میں ایک ہی برہمن خاندان کے چار لوگ مسلسل طور پر دھرم پال اور اس کے جانشینوں کے وزیر اعلیٰ رہے تھے۔ ایسی صورت میں وزیر کبھی کبھی بہت طاقت ور بھی ہو جایا کرتے تھے۔ اگرچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کے کئی محکمے ہوتے تھے لیکن ان محکموں کی تعداد اور طریقہ کار کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ قدیم کتبوں اور ادبی کتابوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اکثر سبھی سلطنتوں میں وزیر خارجہ، وزیر مالیات، خازن، مسلح افواج کا سربراہ، منصف اعلیٰ اور پجاری ہوتے تھے۔ ایک شخص ایک سے زائد عہدے بھی سنبھال سکتا تھا۔ وزیروں میں بھی ایک وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم ہوتا تھا جس پر راجا دوسرے وزیروں کے مقابلے میں زیادہ انحصار کرتا تھا۔ پجاری کے علاوہ سبھی وزیروں کو ضرورت پڑنے پر فوجی مہموں کی قیادت کے لیے بھی کہا جا سکتا تھا۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ محل سرا کے لیے بھی عہدے دار ہوتے تھے چونکہ راجا سبھی طاقتوں کا سرچشمہ ہوتا تھا اس کی محل سرا کے کچھ افسر بھی بہت طاقتور ہو جایا کرتے تھے۔

مسلح افواج، دفاع اور سلطنت کی توسیع کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ ہم عرب سیاحوں کے سفر ناموں سے اس بات کے شواہد پہلے ہی پیش کر چکے ہیں کہ پال، پرتی ہار اور راشٹر کوٹ حکمرانوں کے پاس بڑی تعداد میں اور بہت ہی منظم پیادہ اور گھڑ سوار فوج تھی اور بڑی تعداد میں جنگی ہاتھی تھے۔ ہاتھی طاقت کی۔ علامت سمجھے جاتے تھے اور ان کی بہت اہمیت تھی۔ پال خاندان کے حکمراں کے پاس سب سے زیادہ ہاتھی تھے۔ راشٹر کوٹ اور پرتی ہار حکمران سمندری راستے سے عرب اور مغربی ایشیا سے زمینی راستے سے وسطی ایشیا سے بڑی تعداد میں

گھوڑے منگایا کرتے تھے۔ ملک بھر میں پرتی ہار حکمرانوں کی گھڑ سوار فوج سب سے بہترین مانی جاتی تھی۔ رتھوں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا کیونکہ جنگ میں ان کا استعمال بند ہو چکا تھا۔ کچھ راجاؤں، خاص طور پر راشٹر کوٹ حکمرانوں کے پاس بہت تعداد میں قلعے تھے۔ ان قلعہ جات میں خاص قسم کی فوجیں رہتی تھیں۔ پیدل فوج کی تشکیل، باقاعدہ نیز بے قاعدہ طور پر اور جاگیرداروں کے ذریعہ فراہم کردہ سپاہیوں سے ہوتی تھی۔ باقاعدہ قسم کی فوجیں اکثر موروثی ہوتی تھیں اور بعض اوقات ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بھرتی کی جاتی تھیں۔ اس طرح پال حکمرانوں کی پیدل فوج مالو، کھس (آسام)، لاٹ (جنوبی گجرات) اور کرناٹک کے سپاہیوں کو ملا کر بنائی گئی تھی۔ پال حکمرانوں اور راشٹر کوٹ حکمرانوں کی اپنی بحری فوج تھی لیکن ان کی تعداد اور بناوٹ کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں ہو سکی ہیں۔

ریاست میں دو طرح کے علاقے ہوتے تھے، ایک تو وہ جن پر راجا کا براہ راست اقتدار و تسلط ہوتا تھا اور دوسرے وہ جن پر سرداروں کی حکومت ہوتی تھی۔ یہ سردار اندرونی معاملات کے سلسلے میں خود مختار ہوتے تھے لیکن انہیں اپنے راجا یا حکمراں کے تئیں وفادار اور تابعدار رہنا ہوتا تھا اور جنگ میں اسے طے شدہ تعداد میں فوج فراہم کرنا پڑتی تھی۔ سردار، راجا کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں اس لیے ان کے ایک بیٹے کو راجا کے حضور میں رہنا پڑتا تھا۔ خاص موقعوں پر ماتحت سرداروں کو دربار میں حاضری دینی ہوتی تھی اور کبھی کبھی تو اپنی کسی ایک لڑکی کی شادی راجا یا اس کے کسی لڑکے کے ساتھ کرنی پڑتی تھی لیکن یہ باج گزار سردار آزاد ہونے کے ہمیشہ خواہش مند رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کے اور ان کے حکمراں کے درمیان اکثر جنگیں بھی ہوتی تھیں۔ اس طرح راشٹر کوٹ راجاؤں کو وینگی (آندھرا) اور کرناٹک کے باج گزار سرداروں کے خلاف نیز پرتی ہار راجاؤں کو پرماروں اور بندیل کھنڈ کے چندیلوں کے خلاف مسلسل لڑنا پڑتا تھا۔

پال اور پرتی ہار حکمرانوں کی جن علاقوں پر براہ راست حکومت تھی وہ بھکتی (صوبوں) اور منڈل یا وشیہ (ضلعوں) میں تقسیم تھے۔ صوبے کے حاکم گورنر کو اپرک اور وشیہ کے سربراہ کو وشیہ پتی کہا جاتا تھا۔ اپرک سے زمین کا محصول وصول کرنے اور فوج کی مدد سے امن و قانون قائم رکھنے کی توقع کی جاتی تھی۔ وشیہ پتی سے بھی اپنے اختیار کے علاقے میں اس طرح کے کام کی توقع کی جاتی۔ اس مدت میں ایسے چھوٹے سرداروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا سامنت (جاگیردار) یا بھوگ پتی کہلاتے تھے۔ یہ کچھ گاؤں پر حکومت کے تھے۔ وشیہ پتیوں اور ان چھوٹے سرداروں نے آپس میں ایک دوسرے میں ضم ہونے کی سمت میں پیش قدمی کی اور امتداد زمانے کے ساتھ ساتھ سامنت کی اصطلاح بلا کسی امتیاز ان دونوں کے لیے ہی استعمال کی جانے لگی۔

راشٹر کوٹ سلطنت میں براہ راست تسلط والے علاقوں کو راشٹر (صوبہ) وشیہ اور بھکتی میں تقسیم کیا گیا۔ راشٹر کا سربراہ راشٹر پتی کہلاتا تھا اور پال نیز پرتی ہار سلطنت کے اپرک جیسے ہی کام انجام دیتا تھا۔ وشیہ کی نوعیت آج کل کے ضلع جیسی تھی اور بھکتی اس سے بھی چھوٹی اکائی تھی۔ پال اور پرتی ہار سلطنتوں میں وشیہ سے چھوٹی اکائی کہلاتی تھی۔ ان چھوٹی اکائیوں کے لیے طے کیے گئے کاموں کے بارے میں ابھی تک کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اہم مقصد زمینی محصول وصول کرنا اور کسی حد تک امن اور قانون قائم رکھنا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ تمام افسروں کو تنخواہ ادائیگی محصول سے آزاد زمین کی شکل میں کی جاتی تھی۔ اس سے ان افسروں نیز موروثی سرداروں

اور چھوٹے سامنتوں (جاگیر داروں) کے درمیان کا فرق کم ہو گیا تھا۔اسی طرح بعض اوقات راشٹر پتی (صوبائی گورنر) کو ایک جاگیر دار راجہ کا عہدہ اور حیثیت بھی حاصل ہو جاتی تھی۔

اس علاقائی تقسیم کے سب سے نیچے گاؤں تھے۔گاؤں کو انتظامیہ کی بنیادی اکائی کی حیثیت حاصل تھی۔گاؤں کا نظم گاؤں کا مکھیا اور گاؤں کا محاسب چلاتا تھا جس کا عہدہ موروثی ہوتا تھا۔انہیں تنخواہ کی شکل میں محصول سے مستثنیٰ زمین ملتی تھی۔گاؤں کے کاموں میں مکھیا کی مدد گاؤں کا بزرگ کرتا تھا، جسے گرام مہاجن کہا جاتا تھا۔راشٹر کوٹوں کی سلطنت میں گرام کمیٹیاں ہوتی تھیں جو مقامی مندروں اور سڑکوں کا بندوبست کرتی تھیں۔یہ کمیٹیاں ٹرسٹ کی شکل میں رقم جائداد بھی لے سکتی تھیں۔بندوبست کر سکتی تھیں۔یہ ذیلی کمیٹیاں مکھیا کے ساتھ تعاون کرتی تھیں اور انہیں زمین کی محصول کی وصولی کا ایک حصہ بھی ملتا تھا۔یہ کمیٹیاں چھوٹے موٹے معاملات کا تصفیہ بھی کرتی تھیں۔شہروں میں بھی اسی طرح کی کمیٹیاں ہوتی تھیں۔اس میں تجارتی اور کاروباری تنظیموں کے سربراہ بھی شامل ہوتے تھے۔شہر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں امن اور قانون قائم رکھنے کی ذمہ داری کوشٹ پال یا کوتوال کی ہوتی تھی جس کا ذکر متعدد قصے کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔

اس عہد کی ایک اہم خصوصیت دکن میں موروثی مالیاتی افسروں کا عروج تھا جنہیں ناوگونڈ یا دیش گرام کوٹ کہا جاتا تھا۔انہیں وہی کام کرنے پڑتے تھے۔جو بعد میں مہاراشٹر کے دیش مکھوں اور دیش پانڈوں کو سونپے گئے تھے۔جیسا کہ ابھی ذکر کیا گیا کہ شمالی ہندوستان میں چھوٹے سرداروں کے عروج سے سماج اور سیاست پر اہم اثرات مرتب ہوئے۔ان موروثی سرداروں کی طاقت میں اضافہ ہوتے ہی دیہی کمیٹیاں کمزور پڑنے لگیں۔مرکزی حکمران کے لیے بھی ان سرداروں پر اپنا کنٹرول قائم رکھنا مشکل ہو گیا۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حکومت جاگیر دارانہ نظام میں ڈھلتی جارہی تھی۔

اس عہد کی یاد رکھنے کی ایک دوسری اہم بات مذہب اور سلطنت کا آپسی تعلق ہے۔اس عہد کے متعدد مذہب پرست حکمران شیو کی عبادت کرتے تھے یا یاوشنو مت کے پیروکار تھے۔یا بدھ مذہب یا جین مذہب کی تعلیمات کی پیروی کرتے تھے۔یہ حکمران برہمنوں یا بودھ وہاروں یا جین مندروں کو وافر مقدار میں عطیہ دیا کرتے تھے لیکن عام طور پر سبھی مذہبوں کی سرپرستی کرتے تھے اور کسی کو ان کے مذہبی عقائد کی وجہ سے تکلیف نہیں پہونچاتے تھے۔راشٹر کوٹ راجاؤں نے مسلمانوں کا بھی خیر مقدم اور انہیں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت بھی دی۔عام طور پر کسی بھی راجا سے دھرم شاستر کی کتابوں میں مذکور ضابطہ اخلاق یا رسوم ورواج میں مداخلت کرنے کی توقع نہیں کی جاتی تھی لیکن برہمنوں کی حفاظت کرنا اور سماج کے چاروں طبقوں (ورنوں) کی روایات کو برقرار رکھنا اس کی عام ذمے داری ہوتی تھی۔اس سلسلے میں پجاری سے راجا کو مشورہ دینے کی توقع کی جاتی تھی لیکن یہ ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے کہ پجاری، راجا کے کاموں میں مداخلت کرتے تھے یا وہ راجا پر حاوی ہوتے تھے۔اس عہد میں دھرم شاستر کے سب سے پہلے شارح 'میدھا تیتھی' کا کہنا تھا کہ راجا کا اختیار ویدوں کے مطابق، دھرم شاستروں سے ہی لیا گیا ہے۔اس کا عوامی فرض یا راج دھرم، ارتھ شاستر یعنی علم سیاسیات پر مبنی ہونا چاہیئے۔اس کا حقیقی مطلب یہ تھا کہ علم سیاسیات اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ رکھا جاتا تھا۔اور مذہب راجا کا بالکل ذاتی معاملہ ہوتا تھا۔اس طرح راجا پر وہت کا یا دھر شاستر کا غلبہ یا کنٹرول

نہیں ہوتا تھا۔

1.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد ہم نے جانا کہ شمالی ہندوستان میں ہرش کی سلطنت کے خاتمے کے بعد سیاسی بد نظمی پھیل گئی اور اقتدار کے متعدد مراکز اٹھ کھڑے ہوئے۔ان میں سب سے طاقت ور پال، پرتی ہار اور راشٹر کوٹ تھے جو قنوج پر اقتدار کے لیے آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ ہرش کے عہد سے قنوج پورے شمالی ہند پر اقتدار کی علامت بن کر ابھرا۔ان تینوں طاقتوں میں سے کوئی بھی پورے شمالی پر مکمل اقتدار قائم کر کے ایک عظیم حکومت قائم کرنے میں ناکام رہا۔ان کی اس سیاسی کشمکش کو سہ طرفہ جدوجہد کا نام دیا گیا۔دسویں صدی کے خاتمے تک یہ تینوں سلطنتیں زوال پذیر ہو گئیں اور ان کے علاقے متعدد خود مختار ریاستوں میں تقسیم ہو گئے۔ان کی جگہ چوہانوں، پرماروں، گہڑوالوں ،چندیلوں اور چالوکیوں نے لے لی۔ان کا سیاسی نظام بعض مورخین کے مطابق جاگیردارانہ تھا،جبکہ دوسرے مورخین اسے ہندوستانی وضع کا منفرد نظام مانتے تھے جو ذات پات کے ڈھانچے پر قائم تھا، جہاں سزائیں مجرم کی ذات کے حساب سے دی جاتی تھیں۔ راجپوت افواج کی تشکیل بھی ذات کی بنیاد پر ہوتی تھی جو ایک سامنت یا راجا کے تحت یکجا ہوتی تھی۔

1.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

مگدھ	:	جنوبی بہار کا علاقہ
قنوج	:	اتر پردیش کا ایک شہر
ششانک	:	بنگال کے گوڑ خاندان کا حکمراں (م۔640)
دارالسلطنت	:	راجدھانی
الجزر	:	گرجر پرتی ہار سلطنت کا عربی نام

1.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

1.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. مگدھ کے زوال کے بعد کس شہر کو عروج حاصل ہوا؟
2. ہرش وردھن کی موت کس سال میں ہوی؟
3. سہ طرفہ جدوجہد میں کون سی طاقتیں شامل تھیں؟
4. پلووں کے زوال کا سب سے زیادہ فائدہ کسے ملا؟
5. پال سلطنت کی بنیاد کس نے ڈالی؟

6. کس عرب تاجر کے سفر نامے سے پال حکمرانوں کے طاقت ور ہونے کا ثبوت ملتا ہے؟

7. وکرم شیلا یونیورسٹی کس حکمراں خاندان نے قائم کی تھی؟

8. پرتی ہاروں کا پورا نام کیا تھا؟

9. عربی میں ''الجزر'' سے کیا مراد لیا جاتا تھا؟

10. راشٹر کوٹوں کی راجدھانی کا نام بتائیے؟

1.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سہ طرفہ جدوجہد پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. پال سلطنت کے بارے میں عرب تاجر سلیمان کے تاثرات بیان کیجیے۔
3. پرتی ہار سلطنت کے بارے میں المسعودی کے تاثرات بیان کیجیے۔
4. چوہان خاندان کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔
5. گہڑوال خاندان کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔

1.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پال خاندان کے عروج وزوال پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. پرتی ہار خاندان کے عروج وزوال پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. راشٹر کوٹ خاندان کے عروج وزوال پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

1.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Majumdar, R.C. (1955). *The Age of Imperial Kanauj* (First ed.). Bombay: Bharatiya Vidya Bhavan.
2. Sailendra Nath Sen (1999). *Ancient Indian History and Civilization*. New Age International.

اکائی 2۔ راجپوت: سیاست

(Rajputs: Polity)

اکائی کے اجزا

2.0 تمہید
2.1 مقاصد
2.2 راجپوتوں کے آغاز سے متعلق نظریات
2.2.1 غیر ملکی آباؤ اجداد
2.2.2 قدیم چھتری قبیلے کا نظریہ
2.2.3 اگنی کل نظریہ
2.2.4 برہمن نسل کا نظریہ
2.2.5 مخلوط نسل کا نظریہ
2.2.6 قبائلی پس منظر کا نظریہ
2.3 ہندوستانی سیاست میں راجپوتوں کا عروج
2.4 سیاسی تنظیم
2.5 اکتسابی نتائج
2.6 کلیدی الفاظ
2.7 نمونہ امتحانی سوالات
2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
2.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

2.0 تمہید (Introduction)

قدرت کے ایک اصول کے طور پر اس کائنات میں ہر چیز کا آغاز اور اختتام ہوتا ہے۔تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے اب تک ہم نے بہت سی سلطنتوں، ریاستوں اور نسلوں کے بارے میں پڑھا۔ ہم نے قدیم ہندوستان میں آریہ نسل کے بارے میں پڑھا جنہوں نے ویدک دور اور مابعد ویدک دور میں ایک تہذیب کی بنیاد ڈالی اور ہندوستان کے کافی بڑے رقبے پر حکومت کی۔آریہ ایک نسل تھی یا ایک لسانی گروہ یہ ایک الگ بحث کا موضوع ہے۔ابتدائی عہد وسطیٰ میں گپت سلطنت کے زوال کے بعد اسی طرح ایک نئے گروہ کی آمد ہوئی جنہیں راجپوت کہا گیا۔ان کی اہمیت اتنی زیادہ تھی کہ اس پورے دور کو دہلی سلطنت کے قیام تک ''راجپوت دور'' کا نام دیا گیا۔

پہلی عظیم راجپوت ریاست یعنی پرتی ہار سلطنت کے زوال کے فوراً بعد ہی شمالی ہندوستان میں کئی راجپوت ریاستیں قائم ہوئیں۔ان میں قنوج کے گہڑوال، مالوہ کے پرمار اور اجمیر کے چوہان حکمران سب سے اہمیت کے حامل تھے۔ملک کے مختلف حصوں میں کچھ دوسرے شاہی خاندان بھی تھے، جن میں موجودہ جبل پور کے آس پاس کے علاقوں کے کلچری، بندیل کھنڈ کے بندیل، گجرات کے چالوکیہ اور دہلی کے تومر خاندان وغیرہ قابل ذکر ہیں۔بنگال پہلے پال حکمرانوں کے اور پھر بعد میں سین حکمرانوں کے زیر تسلط رہا۔قنوج کے گہڑ والوں نے دھیرے دھیرے پالوں کو بہار سے بے دخل کر دیا اور بنارس کو اپنی دوسری راجدھانی بنالیا۔اس درمیان میں چوہانوں نے اجمیر میں اپنے قدم مضبوطی سے جما لیے تھے اور دھیرے دھیرے اپنی سلطنت کا دائرہ 'گجرات'، 'دہلی' اور 'پنجاب' تک بڑھاتے جارہے تھے۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایسی حالت میں ان کا ٹکراؤ قنوج کے گہڑ والوں سے ہوا۔اس آپسی کشمکش کی وجہ سے ہی راجپوت حکمران پنجاب کی سرزمین سے غزنوی فوجوں کو نکال باہر کرنے کے لیے باہم متحد نہیں ہو سکے تھے بلکہ درحقیقت غزنوی یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ وہ اب اتنے طاقتور ہیں کہ اجین پر حملہ کر سکتے ہیں۔

راجپوت سماج کی بنیاد کل یا قبیلہ تھی۔راجپوت قبیلہ اپنی ابتدا کا سرچشمہ کسی نہ کسی فرضی یا حقیقی مورث اعلیٰ کو مانتا تھا۔عام طور پر ان راجپوت خاندانوں کا اقتدار ایک مخصوص علاقے پر ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ان علاقوں کا تعین 12 یا 24 یا 48 یا 84 گاؤں کی اکائیوں کی بنیاد پر ہوتا تھا۔ان علاقوں کے سردار اپنے ماتحت سرداروں کو گاؤں کی زمین سونپ دیتے تھے اور وہ اس زمین کو بعد میں مختلف راجپوت سورماؤں کو ان کے کنبے اور گھر کے اخراجات کے لیے دے دیا کرتے تھے۔ زمین، اپنے کنبے اور اپنی عزت سے راجپوتوں کا لگاؤ ان کی خصوصیت تھی۔

2.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ہندوستان کی تاریخ میں راجپوتوں کے عروج کے بارے میں جان سکیں گے۔
- راجپوتوں کی اصل سے متعلق مختلف نظریات کو سمجھ سکیں گے۔
- اہم راجپوت حکمراں خاندانوں سے واقف ہو سکیں گے۔

- راجپوتوں کی سیاسی تنظیم کا تجزیہ کر سکیں گے۔

2.2 راجپوتوں کے آغاز سے متعلق نظریات (Theories of the Origin of Rajputs)

750ء سے 1200ء کا درمیانی عرصہ ہندوستانی تاریخ میں کئی حکمراں خاندانوں کے عروج اور زوال کا دور رہا ہے۔ان حکمراں خاندانوں میں گرجر پرتیہار، چوہان، پرمار، چالوکیہ، چندیل، گہڑوال، گہل، تومر وغیرہ جیسے اکثر خاندان راجپوت مانے جاتے ہیں۔راجپوتوں کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات ہیں جن کا ذکر مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے۔

- غیر ملکی مورخین کے نظریات
- ہندوستانی مورخین کے مختلف نظریات
- ذاتوں کے عروج وارتقا کے روایتی نظریے کی عملی شکل
- سیاسی طاقتوں کے عروج کا قبائلی پس منظر
- مخصوص علاقے میں سماجی اور اقتصادی تبدیلی اور ترقی کا معاون کردار

2.2.1 غیر ملکی آباؤاجداد (Foreign Ancestors)

متعدد یورپی مورخین نے راجپوتوں کو غیر ملکی اصل کا ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔کسی حد تک ان کی اس کوشش کے پیچھے اصل مقصد ہندوستان میں غیر ملکی حکومت کی روایت کو ثابت کرنا ہو سکتا ہے۔اینلز آف راجستھان (Annals of Rajasthan) کے مصنف، کرنل ٹوڈ (Colonal Tod) کا خیال ہے کہ راجپوتوں کی ابتدا غیر ملکیوں سے ہوئی تھی۔ان کے مطابق راجپوت، شک، کشان اور ہن جیسے غیر ملکی حکمرانوں کی نسل تھے۔ٹاڈ کی دلیل یہ ہے کہ اشومیدھ یگیہ، گھوڑے اور ہتھیار کی پرستش، عورتوں کی سماجی حیثیت وغیرہ کے معاملے میں راجپوتوں اور ان غیر ملکی حکمرانوں میں کافی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ولیم کروک (William Crooke) اور ونسنٹ اسمتھ (Vincent Smith) بھی ٹوڈ سے متفق ہیں اور ان کا بھی خیال ہے کہ راجپوت غیر ملکیوں کی نسل سے تھے۔خاص طور پر گرجر پرتی ہار ہنوں کے وقت میں ہی ہندوستان آئے تھے اور ان میں سے کچھ خاندان راجپوت چھتریوں کے طور پر ہندوستانی سماج میں شامل ہوگئے تھے۔بعد کے ادوار میں انہوں نے قدیم ہندوستانی روایت کے ''چندرونشی'' اور ''سوریہ ونشی'' چھتریوں سے اپنا تعلق قائم کر لیا۔اسمتھ یہ بھی مانتے ہیں کہ ورن سنکر کی وجہ سے نچلے درجے کے چھتری، راجپوت مانے جانے لگے۔

ہندوستانی مورخین میں ڈی۔آر۔ بھنڈارکر (D.R. Bhandarkar) اور ایشوری پرساد (Ishvari Parsad) کے مطابق ہندوستانی سماج میں غیر ملکی نسل کے لوگوں کے شامل ہونے سے راجپوتوں کی تخلیق ہوئی۔بھنڈارکر نے ایک سکے پر کندہ ''شری واسودیو بہمن'' کی بنیاد پر ساتھ ہی اور کئی دلیلوں کی بنیاد پر چوہانوں کو خزر نامی غیر ملکی ذات کے پجاری طبقے سے متعلق مانا ہے۔

اس تمام بحث و مباحثہ کو ہم ایک اور پہلو سے بھی دیکھ سکتے ہیں۔ جو غیر ملکی قومیں ہندوستان آئیں وہ راجپوتوں کی طرح جنگجو اور لڑاکو تھیں۔ جنگی ہتھیاروں اور گھوڑوں کی اہمیت ساتھ ہی عورتوں کی مخصوص سماجی حیثیت ان سبھی میں ایک دوسرے کے اثرات کے بنا بھی آزادانہ طور پر موجود ہو سکتی ہے۔ اس لیے ان راجپوتوں کو غیر ملکی ماننے کے لیے رسم و رواج کے اثرات کی دلیل کی کوئی مضبوط بنیاد نہیں ہے لیکن ہمیں تاریخی شواہد سے ہن نسل کے حکمرانوں کے راجپوت ذات میں شامل ہونے کے کافی ثبوت ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر بنافر راجپوتوں میں بنسفر اور تومر راجپوتوں کو ہن تورامن سے جوڑا جاتا ہے۔ برہمنوں میں شاکل دویپی برہمن ایران کے مگ پجاریوں کی نسل ہیں ۔ان مثالوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ سبھی راجپوت خاندانوں کو غیر ملکی ماننا سراسر غلط اور گمراہ کن ہے۔

2.2.2 قدیم چھتری قبیلے کی نسل سے (Theory of Kshatriya Lineage)

راجپوتوں کی غیر ملکی اصل کے برخلاف گوری شنکر ہیراچند اوجھا(Gaurishankar Hirachand Ojha)کا خیال ہے کہ راجپوت قدیم چھتری قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ کچھ پرانے ریکارڈوں اور کاویوں کی دلیل کی بنیاد پر اوجھا جیسے مورخین کا خیال ہے کہ وہ سوریہ ونشی (سورج کی نسل کے) راجپوت تھے۔ ٹاڈ کی دلیل کو رد کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں کہ اشومیدھ یگیہ، گھوڑے اور ہتھیار کی پرستش غیر ملکیوں میں رائج تھی اور غیر ملکی حکمراں طبقے نے انہیں مقامی راجپوتوں سے اخذ کیا تھا۔ اوجھا کا ماننا ہے کہ راجپوت اپنے ذاتی اوصاف اور جسمانی ساخت میں بھی قدیم چھتریوں کی نسل محسوس ہوتے ہیں۔ بعض مورخین کے مطابق چھتری سامنتوں کے غیر قانونی بچے (جنہیں حکمرانوں سے خصوصی اراضی بطور امداد ملی اور وہ بڑی بڑی زمینوں کے مالک تھے) راجپتر کہلاتے تھے۔ بعد میں انہیں راجپوتوں کے نام سے جانا گیا۔

راجپوتوں کے ابھرنے کے مسئلے کی جڑ میں قدیم ہندوستانی ورن نظام کا پیمانہ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ اسی وجہ سے شاستروں کے نظام کے تحت ہم پاتے ہیں کہ صرف چھتری ذات کو ہی حکمرانی کا اہل سمجھا گیا ہے۔ یہاں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ برہمن یا پجاری ہی اس نظام کے کٹر حامی تھے۔ حالانکہ عام طور پر کسی بھی ذات کا کوئی بھی قابل آدمی سیاسی طاقت کو منظم کر سکتا تھا یا پھر حکمراں بن سکتا تھا۔ مہاپدم نند، چندر گپت موریہ، پشیہ متر شنگ وغیرہ قدیم زمانے سے ہی ایسی مثالیں پیش کرتے آئے ہیں۔ منو یا یگیہ والکیہ جیسے ویدوں کے مفسرین نے ''جاتی اُپکرش'' (نیچ ذات سے اونچی ذات میں اٹھنا) اور ''جاتی اَپکرش'' (اونچی ذات سے نیچی ذات میں گرنا) کو جو پچھلے جنم (پیدائش) سے متعلق کیا ہے اس کے پیچھے سماجی کٹرپن سے زیادہ روایتی سماج کو مضبوطی دینے کا احساس موجود ہے۔ دو چار پیڑھی کے فرق سے ہی کسی خاندان کے اونچی یا نیچی ذات میں تبدیل ہونے کے سماجی عمل سے یہ سماج کے منتظمین ناواقف نہیں سکتے۔ ایسے بدلاؤ چاہے کبھی کبھار ہی ہوتے ہوں لیکن معاشی اور سماجی حالات کے بدلنے کے ساتھ ہی ایک جگہ سے دوسری جگہ ہجرت کر جانے کی وجہ سے اس طرح کے سماجی بدلاؤ کی متعدد مثالیں حاصل ہوتی ہیں۔ کسی شاہی خاندان کو چھتری یا برہمن نسل سے ثابت کرنے کے لیے بنائی گئی کہانیوں کا مقصد اس خاندان کو سماج میں عزت و احترام دلانا تو ہوتا ہی تھا ساتھ ہی اس میں ہندوستانی تہذیب کی حفاظت کی بھی امید کی جاتی تھی۔ کچھ اساطیروں (افسانوی داستانوں) میں یہ بات بطور خاص ظاہر ہوتی ہے۔

2.2.3 اگنی کل نظریہ (Agnikula Theory)

ہندی کے مشہور شاعر چندر بردائی کے ساتھ ساتھ کئی دوسرے شاعروں اور مصنفوں نے اگنی کل کا افسانہ پیش کیا ہے۔اس قدیم کہانی کے مطابق آبو پہاڑ پر وشومتر، گوتم اور اگستیہ رشیوں کے یگیہ کی اسروں یعنی شیطانوں سے حفاظت کے لیے وششٹھ منی نے پر تیہار، چالوکیہ، پرمار اور آخر میں چوہان (چوہان) کو اگنی کنڈ (آتش دان) سے پیدا کیا۔

ٹاڈ، اسمتھ، بھنڈار کر جیسے مورخین نے اس افسانوی نظریے کو غیر ملکی حکمران طبقے کو راج پوت ذات میں تبدیل کرنے کے عمل کا حصہ مانا ہے۔اس افسانے میں اتنی سچائی تو ضرور ہے کہ یگیہ اور دھرم کی حفاظت راجپوت یا چھتری کے ذریعے ہی ممکن مانی گئی ہے۔یہ بھی سچ ہے کہ صرف ان چار خاندانوں کو ہی ویدک سماج خاص طور پر برہمنوں نے قانونی طور پر چھتری حکمران تسلیم کیا ہے۔اس افسانے سے صرف ان کے اصل ابتدا کا علم ہی نہیں ہوتا بلکہ ان خاندانوں کے ویدک اصل کا چھتری ہونا شک و شبے سے بالاتر معلوم ہوتا ہے۔حالانکہ پرشستیوں کے مصنفین اور ہمعصر مورخین نے بھی اس میدان میں قابل ذکر کوششیں کی ہیں۔رتن پال کے سیواڑی تانبے کے کتبے میں چوہانوں کی ابتدا اندر سے مانی گئی ہے۔چوہان گوتراچار میں انہیں سوم ونشی (چندرونشی) اور پرتھوی راج وجے، ہمیر راسو اور پرتھوی راج سوم کے بیدل کتبے میں چوہانوں کو سوریہ ونشی اعلان کیا گیا ہے۔چونکہ اس نظریے کو سائنسی علم کی بنیاد پر قبول نہیں کیا جاسکتا اس لیے یہ ایک غیر معتبر نظریہ ہے۔

یہاں اگنی کل افسانے کے ضمن میں راماین اور مہابھارت میں پائی گئی اسی طرح کی ایک کہانی کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔اس کہانی کے مطابق چھتری طاقت کی علامت وشومتر کے ذریعے وششٹھ کی گائے نندنی کے زبردستی اغوا کو روکنے کے لیے نندنی کے مختلف اعضا سے پلو (پہلو)، دراوڑ، شک، یون، شبر، سنہال، روس، پلند، چین اور ہن وغیرہ ہندوستانی اور غیر ملکی ذات کے جنگجو پیدا ہوئے۔اس کہانی میں برہمنوں - چھتریوں کے درمیان موجود کشمکش تو واضح ہے لیکن نندنی سے پیدا ہونے والی مختلف ذاتوں کو چھتری ماننے کے بجائے انہیں چھتری اقتدار کا مخالف ظاہر کیا گیا ہے۔

منو نے شک، یون، لچھوی، مل، دراوڑ، چین وغیرہ متعدد ذاتوں کو بنیادی طور پر چھتری لیکن شودر کی سطح کا مانا ہے۔اس منووادی نظام کو اگر ہم اگنی کل مفروضے پر نہ بھی تھوپیں تو بھی یہ تاریخی حقیقت ہے کہ غیر ملکی اور ہندوستانی اصل کے لوگوں کا مخصوص سماجی، اقتصادی اور سیاسی سطح پر اونچی سے نیچی اور نیچی سے اونچی ذات میں جانا چلتا رہا۔ویدک روایت کے مشہور چھتریوں میں اٹھارہ ریاستوں کا خاتمہ کرنے والے مہاپدم نند نچلی ذات کے سمراٹ یا شہنشاہ تھے۔بودھ روایت میں چھتری ہونے پر بھی برہمن متنوں میں موریوں کو ویدک چھتری نہیں مانا گیا۔ایسا معلوم ہاتا ہے کہ آنے والی صدیوں میں کافی جدوجہد کے بعد شنگ، کنو، ستواہن اور کدمب جیسے برہمن خاندانوں نے اپنی حکومت قائم کی تھی۔کدمب خاندان کے میور شرمن کی اولاد دو سو تیرہ نسلوں کے بعد ورمن نام اختیار کرکے جاتیا پکرش (اونچی ذات سے نیچی ذات میں گرنا) کی واضح مثال پیش کرتی ہے۔ان سبھی حکمراں خاندانوں کے علاوہ واکاٹک، گپت، اور ہرش قدیم ویدک طرز کی چھتری حکمرانی کی روایت

کو بالکل ہی ختم کر چکے تھے، حالانکہ اس طرح کے چھتری عام طور پر یا خاص طور پر سماج میں موجود ضرور تھے۔

2.2.4 برہمن نسل کا نظریہ (Theory of Brahmana Lineage)

دشرتھ شرما(Dashrath Sharma)اور وشمبر سرن پاٹھک(Vishambar Saran Pathak)کا خیال ہے کہ اس وقت کے راجپوتوں کی ابتدا برہمنوں سے ہوئی ہے۔ بجولیا کے فرمان میں چوہانوں کو وتس گوتریہ ، برہمنوں اور واسودیو کے جاگیر دار جانشینوں کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ پر تھوی راج راسو بھی وتس سے چوہانوں کی ابتدا کو بیان کرتی ہے۔ چنانچہ ان مورخین کے مطابق چوہان برہمن ذات سے تھے حالانکہ ذات پات کی ابتدا اس اکائی کا موضوع نہیں ہے۔ اس عہد کے اہم شاہی خاندانوں کی ابتدا سے متعلق متعدد تاریخی شواہد کو پیش کیا جاسکتا ہے لیکن یہاں پر جدید مورخین کے ذریعے دی گئی دلیلوں کا تجزیہ ہی بہتر لگتا ہے۔ ایسا کرنے کا بنیادی سبب تو یہی ہے کہ اہم غیر ملکی مورخین کے ذریعے راجپوتوں کے غیر ملکی ذاتوں سے ابھرنے کے نظریے کا تجزیہ ہم اوپر کر چکے ہیں۔

کتبوں کے مطابق بھنڈور کے پرتی ہار برہمن ہریش چندر کی چھتری نسل کی بیوی بھدرا کی اولاد تھے۔ پرمار، آبو پہاڑ کے وششٹھ گوتر کے برہمن اور چوہان، وتس گوتر کے برہمن معلوم ہوتے تھے۔ چندیلوں کی ابتدا سے متعلق مفروضہ کہانی میں انہیں کاشی کے شاہی پجاری چندراتریہ کی لڑکی سے پیدا شدہ بتایا گیا ہے۔ کئی دانشور ایسا مانتے رہے ہیں کہ گہلوت خاندان، جس میں راناپرتاپ کی پیدائش ہوئی، کے بانی بپا راول، ناگر برہمن تھے۔ بعد کے دانشوروں نے اس خاندان کو بھی رام چندر جی کے خاندان سے منسوب کر کے انہیں سوریہ ونشی چھتری ثابت کرنے کی بھرپور کوششیں کی ہیں۔

2.2.5 مخلوط نسل کا نظریہ (Theory of Mixed Race)

ونسنٹ آرتھر اسمتھ کا خیال ہے کہ راجپوت کچھ قدیم چھتریوں اور کشانوں کی مخلوط نسل تھے۔ ان غیر ملکی نسلوں کا ہندوستانی لوگوں کے ساتھ میل جول ہوا۔ نتیجتاً اُن سے پیدا ہونے والی حکمراں نسل کو راجپوت کہا جانے لگا۔ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ راجپوت مخلوط نژاد تھے اور چوہان ان کی اولاد تھے، اور یہ ہندوستانی تاریخ کا سب سے زیادہ قبول شدہ نظریہ ہے۔

مندرجہ بالا تجزیے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ مختلف نظریات ایک دوسرے کی صداقت پر سوالیہ نشان کھڑے کرتے ہیں۔ ڈاکٹر شرما کی یہ دلیل کافی حد تک قابل یقین ہے کہ چوہانوں کو برہمنی نظام کی حفاظت کی وجہ سے چھتری مانا گیا ہے۔

2.2.6 قبائلی پس منظر کا نظریہ (Theory of Tribal Background)

اسمتھ نے گہری کھوج بین کے بعد یہ نظریہ پیش کیا کہ گونڈ، بھر، خروار نامی قبیلوں سے چندیل، راٹھور اور گہڑوال جیسے خاندانوں کی پیدائش ہوئی۔ نظریاتی طور پر یہ ماننے میں کوئی حرج نہیں ہے کہ کھیتی باڑی، سیاسی اقتدار اور ورن نظام کے پھیلنے سے قبیلوں میں سماجی درجہ بندی ضرور ہوئی ہوگی۔ گونڈ، بھر، خربار ذاتوں کے پجاریوں اور سرداروں کے ذریعے برہمن اور چھتری کی حیثیت حاصل کرنے کی مثالیں ملتی

ہیں، لیکن پورے قبیلے کی بنسبت کچھ ایک خاندانوں میں اس طرح کی تبدیلی کا پایا جانا زیادہ قابل قبول ہے۔ مخصوص علاقے میں مضبوط معاشی بنیاد کی وجہ سے قبائلی سرداروں کے ذریعے سیاسی تنظیم مہیا کرنے کے ثبوت بھی ملتے ہیں۔ قدیم عہد سے ہی نند، موریہ، گپت، ہرش اور متعدد دوسرے راجپوت حکمراں اسی قبائلی روایت سے جڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ نئی اقتصادی، سماجی اور تہذیبی تبدیلی کے سبب ویدک چھتریوں کی حکمرانی کی روایت کا خاتمہ اور ورن نظام کی بنیاد پر نئے چھتری طبقے (ذات) کی پیدائش ایک تاریخی حقیقت ہے۔ یہاں چوہانوں میں حکومت کی مختلف اکائیوں اور اعلیٰ فوجی عہدوں پر راجا اپنی ذات-خاندان کے ولی عہد اور دوسرے لوگوں کو بڑی تعداد میں متعین کرتا تھا، جسے ایک حد تک ہم ذاتی حکمرانی (Clan Monarchy) کہا جا سکتا ہے۔

اس ضمن میں راجپوت (مہابھارت اور ہرش چرتر میں مذکور راجپتر لفظ کی اپبھرنش شکل) لفظ پر غور کرنا کافی ضروری ہے۔ راجپوت یعنی راجا کا بیٹا کسی خاص فرد کے لیے استعمال ہونا عام بات ہے، لیکن یہاں ایک خاص ذات کے لیے استعمال کیا جاتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ یقیناً ہی اس کی مخصوص سماجی اور ثقافتی اہمیت ہے۔ ساتھ ہی موریہ، گپت وغیرہ خاندانوں کو چھتری ثابت کرنا ورن نظام سے خصوصی لگاؤ کو ظاہر کرتا ہے۔ لیکن یہاں یہ سوال زیادہ اہمیت رکھتا ہے کہ متعدد برہمنوں اور قبائلی سرداروں کو راجپوت ثابت کرنے کی خاص ضرورت کیوں محسوس ہوئی، جب کہ شنگ، کنو، ساتواہن، واکاٹک، کدمب، گپت، ہرش وغیرہ کے تعلق سے ایسا نہیں ہوا۔ یقیناً ہی اس کے پیچھے متعدد تاریخی وجوہات موجود تھیں، یہاں ان کا تفصیلی تجزیہ ممکن نہیں۔ اس تعلق سے تین اہم باتوں پر دھیان دینا بہت ضروری ہے۔

- پہلی نئے حکمران خاندانوں کی مخصوص سماجی سمجھ۔ 'چھتری' لفظ کی مانند ہی 'راجپوت' لفظ بھی تاریخی سلسلہ واقعات میں ذات کی طرف اشارہ کرے گا۔ ایسی حالت میں کسی حکمراں طبقے کے خاص اور عام طور پر ہم ذات شخص کے لیے راجپوت لفظ کا استعمال یقیناً ہی اسے اس خاندان کے شاہی اقتدار کے قریب لاتا ہے۔ اس لفظ کے ابتدائی استعمال کا یہی مطلب ممکن ہے۔ ہم مان سکتے ہیں کہ مخصوص خاندان کے اقتدار کی بنیاد اسی ذات کے لوگ ہوتے ہیں۔ یہ بنیادی طور پر قبائلی احساس و شعور کو بھی ظاہر کرتا ہے، جو عہد وسطیٰ کے سماجی شعور کا حصہ تھا اور ترکوں اور افغانوں میں بھی موجود تھا۔
- دوسری اہم بات یہ ہے کہ عہد وسطی کی حکمرانی کی روایت نے ایک مخصوص تہذیبی شعور پیدا کیا، جسے ہم آسان لفظوں میں 'راجپوت ثقافت' کہہ سکتے ہیں۔ اس ثقافت میں متعدد عناصر شامل تھے، جیسے راجپوتوں جنگ پسندی، بہادری، رحم دلی، کثیر ازدواجی، حکمرانی کی مہارت، قربانی کا جذبہ، مخصوص طرز کے رسم و رواج، فن تعمیر، کھان پان، لباس اور زیورات وغیرہ۔
- تیسری اہم بات غیر ملکی حملوں کے خلاف مسلسل جدوجہد کی وجہ سے یہ برہمنی سماج کے رہنما مان لیے گئے اور راجپوت ذات کی مخصوص سماجی حیثیت مسلّم ہو گئی۔

2.3 ہندوستانی سیاست میں راجپوتوں کا عروج (Rise of the Rajputs in Indian Politics)

مشہور مورخ عرفان حبیب اپنی کتاب Medieval India: An Study of Civilisation میں لکھتے ہیں:

ہندوستانی قسم کے جاگیرداری نظام کی نشوونما میں جنگ کے اوزاروں، جنگی طریقوں اور فوجی تنظیم میں نئی تبدیلیوں کی وجہ سے مزید تیزی آئی۔ ساتویں صدی آتے آتے جنگ میں رتھوں کے استعمال کو چھوڑ دیا گیا اور گھوڑ سوار زیادہ اہمیت اختیار کرتے جا رہے تھے۔ جنگ میں گھوڑ سواروں کی بڑھتی ہوی کارکردگی کی وجہ غالباً باقاعدہ زین اور چوبی تختے والی رکاب رہی ہوگی۔ لفظ ''راجپتر'' جس کو پراکرت میں ''راوت'' اور ہندی میں ''راجپوت'' کہیں گے، عام طور پر چنے ہوے ماہر گھوڑ سواروں کے لقب کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ یہ راجپتر یا راوت عموماً گھوڑ سوار تھے جو جنگ میں نیزے استعمال کرتے تھے اور اس بات کی صلاحیت رکھتے تھے کہ اپنے ایک سردار کی ماتحتی میں فوجی دستہ بنا کر کسی بڑے علاقے پر قبضہ جمالیں۔ پھر ان میں سے ہر ایک اس علاقے کے کسی نہ کسی حصے پر اپنی عملداری قائم کرے۔ اس عملداری کے نتیجے میں لازمی طور پر حکام کا ایک سلسلہ مراتب (hierarchy) بن گیا۔ اس سیڑھی یا پائیدان میں سب سے نیچے راجپتر تھے جو چھوٹے چھوٹے علاقوں پر موروثی قبضہ جما لیتے تھے۔ ان کے اوپر کئی اعلیٰ حاکم وجود میں آئے جن کو ''سامنت''، ''ٹھاکر''، ''رانا'' یا ''نایک'' وغیرہ کہا جاتا تھا۔۔ اس نظام میں حکمراں ''راجا'' یا ''رانا'' کی اصل حیثیت مقامی سرداروں کے غیر رسمی گٹھ بندھن کے سربراہ کی سی تھی، جہاں ایک طرف وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس حکمراں کے اختیارات کم ہوتے گئے، وہیں دوسری طرف اس کے خطابات اور زیادہ لمبے چوڑے ہوتے گئے۔

2.4 سیاسی تنظیم (Political Orgnisation)

ان سلطنتوں کا نظام حکومت گپت سلطنت، شمال میں ہرش کی حکومت اور جنوب میں چالوکیہ حکمرانوں کے خیالات اور روایات پر مبنی تھا۔ حسب سابق سلطنت کا سارا اقتدار راجا میں مرکوز تھا۔ وہ حکومت کا سربراہ ہونے کے ساتھ ساتھ مسلح افواج کا کمانڈر ان چیف بھی ہوتا تھا۔ اس کا دربار بہت عظیم الشان ہوتا تھا۔ محل کے سامنے کی کھلی مسطح زمین پر گھڑ سوار اور پیادہ فوج تعینات رہتی تھی۔ جنگ میں پکڑے گئے ہاتھیوں اور گھوڑوں کی قواعد اس کے سامنے ہوتی تھی۔ شاہی حاجب (چوبدار) حاضر رہتے تھے، جو راجا کے دربار میں حاضری دینے والے باج گزار سرداروں، سامنتوں، سفیروں اور دوسرے اعلیٰ عہدے داروں کی آمد و رفت کا بندوبست کرتے تھے۔ راجا انصاف بھی کرتا تھا۔ دربار صرف سیاسی سرگرمیوں اور انصاف کا ہی مرکز نہیں تھا بلکہ تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بھی تھا۔ رقاصائیں اور ماہر موسیقار بھی ہوتے تھے۔ تقریب کے موقعوں پر شاہی خاندان کی عورتیں بھی دربار میں موجود رہتی تھیں۔ عرب سیاحوں کے بیان کے مطابق راشٹر کوٹ ریاست میں شاہی خاندان کی عورتیں چہرے کو ڈھکتی نہیں تھیں۔

عام طور پر راجا موروثی ہوتا تھا۔ اس زمانے میں عدم تحفظ کی وجہ سے اس وقت کے مفکر راجا کے تئیں مکمل وفاداری اور تابعداری پر زور دیتے تھے۔ راجاؤں کے درمیان نیز راجاؤں اور سامنتوں کے درمیان مسلسل جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ اگرچہ راجا اپنی سلطنتوں میں امن و

قانون قائم رکھنے کی کوشش کرتے تھے لیکن ان کی طاقت لامحدود اور بہت وسیع نہیں ہوتی تھی علاقائی حکمران اور خود مختار سردار اکثر براہِ راست انتظام والے علاقے کو محدود کر دیتے تھے۔ اس وقت کے ایک مصنف میدھا تیتھی کا خیال ہے کہ اس وقت کسی بھی شخص کو چوروں اور قاتلوں سے تحفظ کے لیے اپنے پاس ہتھیار رکھنے کا حق تھا۔ اس کا یہ بھی خیال ہے کہ ایک ظالم اور بے انصاف بادشاہ کی مخالفت کرنا درست تھا۔ اس طرح گویا شاہی حقوق اور مراعات کے بارے میں وقطعی تصور، جس کا بیشتر ذکر وضاحت کے ساتھ پرانوں میں نہیں کیا گیا ہے، تمام مفکرین کے لیے قابل قبول نہیں تھا۔

جانشینی کا طریقہ قطعی اور جامد نہیں تھا۔ اگرچہ عام طور پر سب سے بڑا لڑکا ہی جانشین ہوتا تھا لیکن کئی ایسی مثالیں بھی ہیں کہ سب سے بڑے بھائی کو چھوٹے بھائیوں سے جنگ کرنی پڑی تھی اور کبھی کبھی تو شکست کا بھی سامنا کرنا پڑا تھا۔ اس طرح راشٹر کوٹ حکمرانوں کا دھرواور گووند چہارم نے اپنے بڑے بھائیوں کو ہی بے دخل کیا تھا۔ بعض اوقات راجا اپنے سب سے بڑے بیٹے یا کسی چہیتے بیٹے کو اپنا جانشین یا ولی عہد نامزد کر دیا کرتا تھا۔ ایسی صورت میں ولی عہد راجدھانی میں رہ کر حکومت چلانے میں راجا کی مدد کرتا تھا۔ چھوٹے شہزادوں کو کبھی کبھی صوبائی گورنر بنایا جاتا تھا۔ شہزادیوں کا تقرر کسی سرکاری عہدے پر شاید ہی کبھی ہوتا ہو لیکن ایک ایسی مثال ہے کہ ایک راشٹر کوٹ شہزادی چندرولبھی نے، جو کہ اموگھ ورش کی لڑکی تھی، کچھ عرصے کے لیے رائچور کے دوآبہ پر حکومت کی تھی۔

عام طور پر راجا کو مشورہ دینے کے لیے کچھ وزیر ہوتے تھے۔ راجہ ان وزیروں کا انتخاب سرکردہ خاندانوں سے خود ہی کرتا تھا۔ ان وزیروں کا عہدہ بھی اکثر موروثی ہی ہوتا تھا۔ پال راجاؤں کے عہد حکومت میں ایک ہی برہمن خاندان کے چار لوگ مسلسل طور پر دھرم پال اور اس کے جانشینوں کے وزیر اعلیٰ رہے تھے۔ ایسی صورت میں وزیر کبھی کبھی بہت طاقت ور بھی ہو جایا کرتے تھے۔ اگرچہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کے کئی محکمے ہوتے تھے لیکن ان محکموں کی تعداد اور طریقہ کار کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہے۔ قدیم کتبوں اور ادبی کتابوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اکثر سبھی سلطنتوں میں وزیر خارجہ، وزیر مالیات، خازن، مسلح افواج کا سربراہ (سیناپتی)، منصف اعلیٰ اور پجاری ہوتے تھے۔ ایک شخص ایک سے زائد عہدے بھی سنبھال سکتا تھا۔ وزیروں میں بھی ایک وزیر اعلیٰ یا وزیر اعظم ہوتا تھا جس پر راجا دوسرے وزیروں کے مقابلے میں زیادہ انحصار کرتا تھا۔ پجاری کے علاوہ سبھی وزیروں کو ضرورت پڑنے پر فوجی مہموں کی قیادت کے لیے بھی کہا جا سکتا تھا۔ ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ محل سرا کے لیے بھی عہدے دار ہوتے تھے چونکہ راجا سبھی طاقتوں کا سرچشمہ ہوتا تھا اس کی محل سرا کے کچھ افسر بھی بہت طاقتور ہو جایا کرتے تھے۔

مسلح افواج، دفاع اور سلطنت کی توسیع کے لیے بہت اہمیت رکھتی تھیں۔ ہم عرب سیاحوں کے سفر ناموں سے اس بات کے شواہد پہلے ہی پیش کر چکے ہیں کہ پال، پرتی ہار اور راشٹر کوٹ حکمرانوں کے پاس بڑی تعداد میں اور بہت ہی منظم پیادہ اور گھڑ سوار فوج تھی اور بڑی تعداد میں جنگی ہاتھی تھے۔ ہاتھی طاقت کی علامت سمجھے جاتے تھے اور ان کی بہت اہمیت تھی۔ پال خاندان کے حکمرانوں کے پاس سب سے زیادہ ہاتھی تھے۔ راشٹر کوٹ اور پرتی ہار حکمران سمندری راستے سے عرب اور مغربی ایشیا سے، زمینی راستے سے وسطی ایشیا سے بڑی تعداد میں

گھوڑے منگایا کرتے تھے۔ ملک بھر میں پرتی ہار حکمرانوں کی گھڑ سوار فوج سب سے بہترین مانی جاتی تھی۔ رتھوں کا کوئی حوالہ نہیں ملتا کیونکہ جنگ میں ان کا استعمال بند ہو چکا تھا۔ کچھ راجاؤں، خاص طور پر راشٹر کوٹ حکمرانوں کے پاس بہت تعداد میں قلعے تھے۔ ان قلعہ جات میں خاص قسم کی فوجیں رہتی تھیں۔ پیدل فوج کی تشکیل، باقاعدہ نیز بے قاعدہ طور پر اور سامنتوں کے ذریعہ فراہم کردہ سپاہیوں سے ہوتی تھی۔ باقاعدہ قسم کی فوجیں اکثر موروثی ہوتی تھیں اور بعض اوقات ہندوستان کے مختلف علاقوں سے بھرتی کی جاتی تھیں۔ اس طرح پال حکمرانوں کی پیدل فوج کا مروپ، گوڑ، مگدھ اور اڑیسہ کے سپاہیوں کو ملا کر بنائی گئی تھی۔ پال حکمرانوں اور راشٹر کوٹ حکمرانوں کی اپنی بحری فوج تھی لیکن ان کی تعداد اور بناوٹ کے بارے میں زیادہ معلومات فراہم نہیں ہو سکی ہیں۔

سلطنت میں دو طرح کے علاقے ہوتے تھے، ایک تو وہ جن پر راجا کا براہ راست اقتدار و تسلط ہوتا تھا اور دوسرے وہ جن پر سرداروں کی حکومت ہوتی تھی۔ یہ سردار اندرونی معاملات کے سلسلے میں خود مختار ہوتے تھے لیکن اپنے مقتدر اعلیٰ کے تئیں وفاداری اور تابعداری رکھنی ہوتی تھی اور طے شدہ تعداد میں فوج فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی تھی۔ سردار، راجا کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں، ان کی جگہ پر ان کے ایک بیٹے کو راجا کے حضور میں رہنا پڑتا تھا۔ خاص موقعوں پر جاگیرداروں اور سرداروں کو دربار میں حاضری دینی ہوتی تھی اور کبھی کبھی تو اپنی کسی ایک لڑکی کی شادی راجا یا اس کے کسی لڑکے کے ساتھ کرنی پڑتی تھی لیکن یہ باج گزار سردار آزاد ہونے کے ہمیشہ خواہش مند رہتے تھے جس کی وجہ سے ان کے اور ان کے مقتدر اعلا کے درمیان اکثر جنگیں بھی ہوتی تھیں۔ اس طرح راشٹر کوٹ راجاؤں کو وینگی (آندھرا) اور کرناٹک کے باج گزار سرداروں کے خلاف نیز پرتی ہار راجاؤں کو پرماروں اور بندیل کھنڈ کے چندیلوں کے خلاف مسلسل لڑنا پڑتا تھا۔

پال اور پرتی ہار حکمرانوں کی جن علاقوں پر براہ راست حکومت تھی وہ بھکتی (صوبوں) اور منڈل یا وشیہ (ضلعوں) میں تقسیم تھے۔ صوبے کے حاکم یا گورنر کو اپرک اور وشیہ کے سربراہ کو وشیہ پتی کہا جاتا تھا۔ اپرک سے زمین کا محصول وصول کرنے اور فوج کی مدد سے امن و قانون قائم رکھنے کی توقع کی جاتی تھی۔ وشیہ پتی سے بھی اپنے اختیار کے علاقے میں اس طرح کے کام کی توقع کی جاتی۔ اس مدت میں ایسے چھوٹے سرداروں کی تعداد میں کافی اضافہ ہوا جو سامنت (جاگیردار) یا بھوگ پتی کہلاتے تھے اور کچھ گاؤں پر قبضہ جما کر ان پر حکومت کرتے تھے۔ کسی مرکزی حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے سرکاری افسر وشیہ پتی اور ان چھوٹے سرداروں کے درمیان فرق مٹتا چلا گیا اور گزرتے زمانے کے ساتھ ساتھ سامنت کی اصطلاح بلا کسی امتیاز ان دونوں کے لیے ہی استعمال کی جانے لگی۔

راشٹر کوٹ سلطنت میں براہ راست تسلط والے علاقوں کو راشٹر (صوبہ)، وشیہ اور بھکتی میں تقسیم کیا گیا۔ راشٹر کا سربراہ راشٹر پتی کہلاتا تھا اور پال نیز پرتی ہار سلطنت کے اپرک جیسے ہی کام انجام دیتا تھا۔ وشیہ کی نوعیت آج کل کے ضلع جیسی تھی اور بھکتی اس سے بھی چھوٹی اکائی تھی۔ پال اور پرتی ہار سلطنتوں میں وشیہ سے چھوٹی اکائی کہلاتی تھی۔ ان چھوٹی اکائیوں واں کے لیے طے کیے گئے کاموں کے بارے میں ابھی تک کوئی معلومات حاصل نہیں ہو سکی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اہم مقصد زمینی محصول وصول کرنا اور کسی حد تک امن اور قانون قائم رکھنا تھا۔ ایسا لگتا ہے کہ تمام افسروں کو تنخواہ ادائیگی محصول سے آزاد زمین کی شکل میں کی جاتی تھی۔ اس سے ان افسروں نیز موروثی

سرداروں اور چھوٹے سامنتوں (جاگیرداروں) کے درمیان کا فرق کم ہو گیا تھا۔اسی طرح بعض اوقات راشٹرپتی (صوبائی گورنر) کو ایک جاگیر دار راجہ کا عہدہ اور حیثیت بھی حاصل ہو جاتی تھی۔

اس علاقائی تقسیم کے سب سے نیچے گاؤں تھے۔گاؤں کو انتظامیہ کی بنیادی اکائی کی حیثیت حاصل تھی۔گاؤں کا نظم گاؤں کا مکھیا اور گاؤں کے پٹواری چلاتے تھے جس کا عہدہ موروثی ہوتا تھا اور انہیں تنخواہ کی شکل میں بنا محصول والی زمین ملتی تھی۔گاؤں کے کاموں میں مکھیا کی مدد گاؤں کا بزرگ کرتا تھا جس ے گرام مہاجن کہا جاتا تھا۔راشٹر کوٹوں کی سلطنت میں گرام کمیٹیاں ہوتی تھیں جو مقامی مندروں اور سڑکوں کا بندوبست کرتی تھیں۔یہ کمیٹیاں ٹرسٹ کی شکل میں رقم جائداد بھی لے سکتی تھیں۔بندوبست کر سکتی تھیں۔یہ ذیلی کمیٹیاں مکھیا کے ساتھ تعاون کرتی تھیں اور انہیں زمین کی محصول کی وصولی کا ایک حصہ بھی ملتا تھا۔یہ کمیٹیاں چھوٹے موٹے معاملات کا تصفیہ بھی کرتی تھیں۔ شہروں میں بھی اسی طرح کی کمیٹیاں ہوتی تھیں۔ان میں تجارتی اور کاروباری انجمنوں کے سربراہ شامل ہوتے تھے۔شہر اور اس کے آس پاس کے علاقوں میں امن وامان قائم رکھنے کی ذمہ داری کوشٹ پال یا کوتوال کی ہوتی تھی جس کا ذکر متعدد قصے کہانیوں میں بھی ملتا ہے۔

اس عہد کی ایک اہم خصوصیت دکن میں موروثی مالیاتی افسروں کا عروج تھا جنہیں نادوگوڑا یا نادوگونڈا کہا جاتا تھا۔انہیں وہی کام کرنے پڑتے تھے۔جو بعد میں مہاراشٹر کے دیش مکھوں اور دیش پانڈوں کو سونپے گئے تھے۔اس بات کے ساتھ ساتھ شمالی ہندوستان میں چھوٹے سرداروں کے عروج سے، جس کا ذکر ابھی کیا گیا ہے، سماج اور سیاست پر اہم اثرات مرتب ہوئے۔ان موروثی عناصر کی طاقت میں اضافہ ہوتے ہی دیہی کمیٹیاں کمزور پڑنے لگیں۔مرکزی حکمران کے لیے بھی ان موروثی عناصر پر اپنا اقتدار قائم رکھنا کافی مشکل ہو گیا تھا اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ حکومت جاگیردارانہ نظام میں ڈھلتی جارہی تھی۔

اس عہد کی یاد رکھنے کی ایک دوسری اہم بات مذہب اور سیاست کا آپسی تعلق ہے۔اس عہد کے متعدد مذہب پسند حکمران شیومت کے ماننے والے تھے یا وشنومت پر عمل کرتے تھے یا پھر بدھ مذہب یا جین مذہب کی تعلیمات کی پیروی کرتے تھے۔یہ حکمران برہمنوں یا بودھ وہاروں یا جین مندروں کو وافر مقدار میں عطیہ دیا کرتے تھے لیکن عام طور پر سبھی مذہبوں کی سرپرستی کرتے تھے اور کسی کو ان کے مذہبی عقائد کی وجہ سے تکلیف نہیں پہونچاتے تھے۔راشٹر کوٹ راجاؤں نے مسلمانوں کا بھی خیر مقدم اور انہیں اپنے مذہب کی تبلیغ کی اجازت بھی دی۔عام طور پر کسی بھی راجا سے دھرم شاستر کی کتابوں میں مذکور ضابطہ اخلاق یا رسوم ورواج میں مداخلت کرنے کی توقع نہیں کی جاتی تھی لیکن برہمنوں کی حفاظت کرنا اور سماج کے چاروں طبقوں ورنوں کی روایات کو برقرار رکھنا اس کا عام فریضہ ہوتا تھا۔اس سلسلے میں پجاری سے راجا کو مشورہ دینے کی توقع کی جاتی تھی لیکن یہ ہر گز نہیں سمجھنا چاہے کہ پجاری، راجا کے کاموں میں مداخلت کرتے تھے یا وہ راجا پر حاوی ہوتے تھے۔اس عہد میں دھرم شاستر کے سب سے پہلے شارح میدھا تیتھی کا کہنا تھا کہ راجا کا اختیار ویدوں کے بقول دھرم شاستر نیز ارتھ شاستر یا علم سیاسیات سے ہی ماخوذ ہے۔اس کا عوامی فریضہ یا راج دھرم، ارتھ شاستر یعنی علم سیاسیات پر مبنی ہونا چاہئے۔اس کا حقیقی مطلب یہ تھا کہ علم سیاسیات اور مذہب کو ایک دوسرے سے الگ رکھا جاتا تھا۔اور مذہب راجا کا بالکل ذاتی فریضہ ہوتا تھا۔اس طرح راجا پر پروہت یا دھرم

شاستر کا غلبہ یا کنٹرول نہیں ہوتا تھا۔

2.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ راجپوتوں کی ابتدا کا سوال ایک وسیع تاریخی سیاق پیش کرتا ہے۔ راجپوت خاندانوں کی ابتدا، غیر ملکی پجاریوں، قبائیلوں یا ویدی چھتریوں سے ہونا فطری لگتا ہے۔ اس سماجی عمل میں کام کے مطابق اونچی ذات میں جانا یا نچلی ذات میں گرنا، دونوں پائے جاتے تھے۔ ساتھ ہی اس عمل میں عظیم معاشی اور سماجی تبدیلیوں سے ابھرنے والے عہد وسطیٰ کے شعور کی تاریخی لازمیت نے اہم کردار ادا کیا ہے۔

عرفان حبیب کے مطابق راجپوتوں کی سیاست اس وقت کے عام حالات سے متاثر تھی، کیونکہ یہ دور زمین کی ملکیت پر مبنی سیاسی تعلقات کا دور تھا۔ کسان اپنی زمین اپنے سامنت سے لیتا تھا۔ سامنت اسے مہا سامنت یا ٹھاکر سے اور آخری پائیدان پر راجا یا رانا ہوا کرتا تھا، جو زمین کے بدلے اپنے سامنتوں سے سپاہی حاصل کرتا تھا۔

موریہ عہد کے سیاسی مرکزی نظام کی جگہ اب پورے ملک میں ایک غیر مرکزی نظام قائم ہو گیا تھا جہاں سرکاری افسر شاہی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ ہر سامنت اپنے علاقے میں امن وامان اور عدالت کا ذمے دار تھا اور راجا کی حیثیت بڑے سامنت سے زیادہ کچھ بھی نہیں تھی۔

2.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

سوریہ ونشی	سورج کی نسل کے
اگنی کل	آبو پہاڑ پر اگنی کنڈ سے پیدا ہونے والے
کاویہ	کاویہ ایک انتہائی مصنوعی ادبی طرز ہے جو عیسوی دور کی ابتدائی صدیوں سے ہمارے ملک کے درباری رزمیہ میں اپنایا جاتا ہے۔ اس میں تقریر کا ایک مخصوص انداز ہے اور تحریر کے شاعرانہ اجزاء پائے جاتے ہیں
ورن سنکر	برہمنی متون کے مطابق ذاتوں کا اپنے اصولوں پر عمل نہ کرنا ورن سنکر کہلاتا ہے۔
یگیہ	برہمنی نظام میں آگ کے سامنے دیوتاؤں کے لیے منتر پڑھنا، اس کے مخصوص قاعدے قانون ہیں۔
دھرم	سماجی فرائض یا برہمنی متون کے مطابق نظام زندگی، اسے انصاف کے معنیٰ میں بھی لیا جاتا ہے۔
پرشستی	مدحیہ قصیدہ، جو عموماً پتھروں یا تانبے کی کتبوں پر کندہ ہوتا ہے۔
آبو پہاڑ	گجرات میں واقع ایک پہاڑ جو مقدس سمجھا جاتا ہے۔
دیتیہ	شیطان، برہمنی متون کے مطابق جو لوگ برہمنی نظام کے دشمن ہیں۔

اگنی کنڈ	آتش دان
کثیر ازدواجی	کئی شادیاں کرنا

2.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

2.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. پہلی عظیم راجپوت ریاست کا نام بتایئے۔
2. راجپوت سماج کی بنیاد کیا تھی؟
3. کسی تین راجپوت حکمراں خاندانوں کے نام بتایئے۔
4. اینلزآف راجستھان(Annals of Rajasthan)کے مصنف کون ہیں؟
5. شاکل دویپی برہمن کن کی نسل سے مانے جاتے ہیں؟
6. جاتی اُپکرش سے کیا مراد ہے؟
7. جاتی اَپکرش کا کیا مطلب ہے؟
8. اگنی کل نظریے کے مطابق کس نے چار جنگجو ذاتوں کو آگ سے نمودار کیا؟
9. ملک بھر میں کن حکمرانوں کی گھڑ سوار فوج بہترین سمجھی جاتی تھی؟
10. صوبے کے حاکم کو کیا کہا جاتا تھا؟

2.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. راجپوتوں کے غیر ملکی اصل پر ایک نوٹ لکھیے۔
2. قدیم چھتری طبقے سے متعلق ہونے پر ایک نوٹ لکھیے۔
3. اگنی کل نظریے پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. برہمن نسل سے تعلق پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. راجپوتوں کے مخلوط نسل سے ہونے پر ایک نوٹ لکھیے۔

2.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. راجپوتوں کے قبائلی پس منظر پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. راجپوتوں کے غیر ملکی ہونے یا نہ ہونے سے متعلق بحث کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. راجپوتوں کی سیاسی تنظیم پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔

(Suggested Books for Further Reading) مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں 2.8

1. Asopa, Jai Narayan. *Origin of the Rajputs*. 1st ed. Bharatiya Pub. House 1976.
2. Asher, Catherine B and Talbot, Cynthia. *India Before Europe.* Second ed. Cambridge University Press, 2023.
3. Chattopadhyaya, Brajadulal. *"Origin of the Rajputs: The Political, Economic and Social Processes in Early Medieval Rajasthan". The Making of Early Medieval India*. Oxford University Press,1994.
4. Eaton, Richard M. *India in the Persianate Age: 1000-1765.* Penguin Books Limited, 2019.
5. Singh, R. B. *Origin of the Rajputs.* 1st ed. Sahitya Sansar Prakashan, 1975.
6. Talbot, Cynthia. *The Last Hindu Emperor: Prithviraj Cauhan and the Indian Past, 1200–2000.* Cambridge University Press, 2015.
7. Vaidya, Chintaman Vinayak. *Early History of Rajputs (750 to 1000 A.D.)* Gyan Publishing House 2018.

اکائی 3۔ پال خاندان

(The Palas)

اکائی کے اجزا

3.0 تمہید

3.1 مقاصد

3.2 پال خاندان کا تعارف

3.3 سیاسی پس منظر

3.4 پال خاندان کے حکمراں

3.4.1 گوپال اول

3.4.2 دھرم پال

3.4.3 دیو پال

3.4.4 درمیانی دور

3.4.5 مہی پال اول

3.4.6 نے پال

3.4.7 وگرہ پال سوم

3.4.8 مہی پال دوم

3.4.9 رام پال

3.5 پال خاندان کا زوال

3.6 اکتسابی نتائج

3.7 کلیدی الفاظ

3.8 نمونہ امتحانی سوالات

3.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
3.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
3.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
3.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

3.0 تمہید (Introduction)

ساتویں سے بارہویں صدی عیسوی تک کا عرصہ جسے مورخین ابتدائی عہد وسطیٰ کے نام سے جانتے ہیں، ایک ایسا دور ہے جس میں شمالی ہندوستان میں کسی طاقت کو مرکزی اہمیت حاصل نہیں ہو سکی۔ اس کے برعکس متعدد چھوٹی بڑی ریاستیں اپنی سرحدوں کو بڑھانے اور نئے علاقوں پر قبضہ کرنے کی کوشش میں آپس میں جدوجہد کرتی نظر آتی ہیں۔ ایسی ہی ایک طاقت نے اس وقت کے بنگال اور بہار کے علاقوں میں عروج حاصل کیا، جسے ہم پال خاندان کے نام سے جانتے ہیں۔

637 عیسوی میں بنگال کے عظیم حکمران ششانک کی موت کے بعد بنگال میں لگ بھگ ایک صدی تک سیاسی اتھل پتھل کا دور رہا۔ قنوج کے یشوورمن، کشمیر کے للتادتیہ اور چین کے ایک فوجی دستے نے اس علاقے پر حملہ کیا۔ بنگال کا زیادہ تر حصہ آسام کے حکمران بھاسکر ورمن کے ہاتھوں میں چلا گیا، جبکہ بہار اور اڑیسہ کے علاقے ہرش کی مملکت میں شامل ہو گئے۔ دھرم پال کے 'خلم پور' تانبے کے کتبے میں ذکر ملتا ہے کہ پال خاندان کے بانی گوپال کو عوام نے حکمراں کے طور پر منتخب کیا اور اس علاقے میں پھیلی بدامنی یا متسیہ نیائے (جنگل راج) کی حالت کا خاتمہ ہوا۔ یہ اکائی اسی پال خاندان کی تاریخ سے متعلق ہے جس نے عہد وسطی کے ابتدائی دور میں مشرقی ہندوستان کے بڑے حصے پر حکومت کی۔ اس اکائی میں ہم اس خاندان کی ابتداء، اس کے حکمرانوں اور اس کی سیاسی تاریخ کا تفصیلی مطالعہ کریں گے۔

3.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- پال خاندان کی ابتدا سے پہلے بنگال کے سیاسی حالات سے واقف ہو سکیں گے۔
- پال خاندان کی ابتدا اور اس کے عروج کے بارے میں جان سکیں گے۔
- پال خاندان کے حکمرانوں کے بارے میں معلومات حاصل کر سکیں گے۔
- سہ طرفہ جدوجہد میں پال خاندان کے کردار کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- پال خاندان کے زوال پر روشنی ڈال سکیں گے۔

3.2 پال خاندان کا تعارف (Introduction to Pala Dynasty)

ابتدائی عہد وسطیٰ میں پال ریاست ایک عظیم طاقت تھی جس کی ابتدا بنگال کے خطے میں ہوئی۔اس خاندان کا نام اس کے بانی گوپال کے نام پر رکھا گیا،اوراس کے تمام حکمراں اپنے نام کے آگے ' پال ' لفظ کا استعمال تھے۔پال سنسکرت زبان کا ایک لفظ ہے جس کا مطلب ' محافظ ' ہوتا ہے۔پال حکمراں بدھ مذہب کے پیروکار تھے اور بدھ مذہب میں تانترک اور مہایان مکتب فکر کی پیروی کرتے تھے۔دھرم پال کے ' کھالم پور ' تانبے کے کتبے کے مطابق پال خاندان کے بانی گوپال کا انتخاب عوام نے 750 عیسوی میں کیا تھا۔اسی سال سے پال ریاست کی ابتدا تسلیم کی گئی ہے۔ان کی حکومت بنیادی طور بہار اور بنگال کے علاقوں پر تھی۔وکرم پور، پاٹلی پتر، گوڑ، منگیر، سوم پور، رام وتی، تامر لپتی اور جگدالا اس ریاست کے اہم شہروں میں شمار ہوتے تھے اور اس خاندان نے آٹھویں سے بارہویں صدی عیسوی یعنی تقریباً چار صدیوں تک بنگال پر حکومت کی۔

3.3 سیاسی پس منظر (Political Backdrop)

گپت سلطنت کے زوال کے بعد،آخر گپت (Later Guptas) نامی ایک خاندان مگدھ کا حکمراں بنا۔اس خاندان کا عظیم گپت خاندان سے کوئی تعلق نہیں تھا سوائے اس بات کے کہ اس خاندان کے حکمرانوں کے نام کے آگے بھی گپت لگا ہوا تھا۔البتہ یہ خاندان عظیم گپتوں کی جانشینی کا دعوے دار اور گپت سلطنت کے مرکزی علاقوں جیسے مگدھ، گوڑ وغیرہ پر حکمراں ضرور تھا۔اس خاندان کے بانی کرشن گپت کی بیٹی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے قنوج کے موکھری خاندان کے شہزادے آدتیہ ورمن سے شادی کی تھی۔آخر گپت حکمراں آدتیہ سین کے افسد کتبے (Aphsad Inscription) کے مطابق، کرشن گپت کے پوتے جیویت گپت نے ہمالیہ کے علاقے اور جنوب مغربی بنگال میں فوجی مہمات روانہ کیں۔

جیویت گپت کے بیٹے کمار گپت کے دور حکومت میں اس خاندان کی قنوج کے موکھریوں کے ساتھ دشمنی کی شروعات ہوگئی۔کمار گپت نے 554 عیسوی میں موکھری حکمراں ایشان ورمن کو شکست دی اوراس کے کچھ وقت بعد ہی پریاگ میں کمار گپت کی موت بھی ہوگئی۔ اس کا بیٹا دامودر گپت موکھریوں کے خلاف جنگ میں ناکام رہا۔دامودر گپت کے بیٹے مہاسین گپت نے تھانیشور کے پشیہ بھوتی خاندان کے ساتھ اتحاد قائم کیا اور اپنی بہن کی شادی اس خاندان کے حکمراں آدتیہ وردھن سے کروائی۔اس اتحاد سے طاقت پاکر مہاسین گپت نے نے کامروپ پر حملہ کیا اور وہاں کے حکمراں سستھت ورمن (Susthita Varman) کو شکست دی۔یہ فتح بہت کم کے لیے تھی کیونکہ اس کے فوراً بعد اسے تین حملہ آوروں کا سامنا کرنا پڑا:

- موکھری بادشاہ شرواورمن (Sharva Varman)
- کامروپ کے بادشاہ سپر تشتھیتا ورمن (Supratishthita Varman)
- تبتی بادشاہ سونگتسین (Songtsen)

اس کے جاگیردار ششانک نے بھی اسے چھوڑ دیا اور بعد میں اپنی خود مختار گوڑ ریاست قائم کی۔ایسامانا جاتا ہے کہ موکھری بادشاہ شرواور من نے تقریباً 575 عیسوی میں مگدھ پر حملہ کیا اور دامودر گپت کو شکست دی جس نے اسے پورے اتر پردیش کا حکمراں بنا دیا۔ان حالات میں مہاسین گپت کو مگدھ سے بھاگ کر مالوہ میں پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔کچھ عرصے بعد پشیہ بھوتی خاندان کے عظیم حکمراں ہرش (606-647ء) نے مگدھ میں آخر گپتوں کی حکومت کو بحال کیا جس کے بعد انہوں نے ہرش کے ماتحت (vassal) کے طور پر مگدھ اور آس پاس کے کافی علاقے پر حکومت کی۔

ہرش کی موت کے بعد، آخر گپت حکمراں آدتیہ سین، شمال میں گنگا سے لے کر جنوب میں چھوٹا ناگپور تک اور مشرق میں دریائے گومتی سے مغرب میں خلیج بنگال تک پھیلی ہوئی ایک بڑی ریاست کا خود مختار حکمراں بن گیا۔تاہم اسے چالوکیوں کے ہاتھوں شکست کھانی پڑی۔اس خاندان کے آخری اہم حکمران، جیویت گپت دوم کو تقریباً 750 عیسوی میں قنوج کے ورمن خاندان کے حکمراں یشوورمن نے شکست دی تھی۔تاریخ کے حوالوں میں جیویت گپت کے جانشینوں کی کوئی جانکاری نہیں ملتی ہے۔البتہ جیویت گپت کے بعد بنگال میں پھیلنے والی بدامنی اور انتشار کا ذکر ملتا ہے، جس کے نتیجے میں ایک سپاہی کے بیٹے گوپال کو بنگال کا حکمراں بنایا گیا۔

3.4 پال خاندان کے حکمراں (Rulers of the Pala Dynasty)

3.4.1 گوپال اول (Gopala-I)

ہرش کے ہمعصر ششانک کے بعد پال خاندان کی حکومت میں بنگال کی طاقت مستحکم ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کا شمار شمالی ہندوستان کی اہم طاقتوں میں ہونے لگا۔پال حکومت کو بدھ مذہب کے پیروکار گوپال (750-770ء) نے قائم کیا۔بنگال کے جاگیرداروں نے بنگال کی سیاسی کشمکش اور بدامنی کو ختم کرنے کے لیے گوپال کی قابلیت سے متاثر ہو کر اسے اپنا حکمران منتخب کیا۔ان جاگیرداروں نے ریاست کے مفاد کے لیے اپنے ذاتی فائدوں کو ایک طرف رکھ دیا۔تبتی مورخ تاراناتھ کے مطابق گوپال، پنڈروردھن (بوگرہ ضلع) کے ایک چھتری خاندان میں پیدا ہوا تھا۔اس نے جنگ کے ذریعے ریاست کو وسیع کیا اور ریاست کو مضبوط تنظیم بھی فراہم کی۔

3.4.2 دھرم پال (Dharmapala)

گوپال کا بیٹا دھرم پال (770-810ء) ایک نہایت لائق حکمراں ثابت ہوا اور اس نے بنگال کو شمالی ہندوستان کی اہم ریاستوں میں جگہ دلائی۔دھرم پال کے دور میں شمالی ہندوستان میں قنوج پر قبضے کے لیے سہ طرفہ جدوجہد کی زمین تیار ہو رہی تھی۔مالوہ اور راجستھان کے گرجر پرتیہار اور جنوبی ہندوستان کے راشٹر کوٹ گنگا کی وادی کے زرخیز علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے بھرپور فوجی اور ذہنی طور پر تیار ہو رہے تھے۔اپنی توسیعی مہم میں دھرم پال کا سامنا پرتی ہار حکمراں وتس راج سے ہوا جس کے ہاتھوں اسے شکست کھانی پڑی۔وتس راج کی یہ فتح چند روزہ ثابت ہوئی، کیونکہ اسے راشٹر کوٹ حکمران دھرو کے ہاتھوں ہار کا منہ دیکھنا پڑا۔راشٹر کوٹوں کے ہاتھوں پرتی ہاروں کی شکست سے دھرم پال نے فائدہ اٹھایا اور قنوج پر قبضہ کر لیا۔اس نے قنوج کے حکمران اندرایودھ کو ہٹا کر اس کی جگہ ایک کٹھ پتلی حکمراں چکرایودھ کو اپنی

ماتحتی میں قنوج کا حکمراں بنایااور اس طرح اپنے اقتدار اعلیٰ کا اعلان کیا۔ دھرم پال کے ذریعے منعقد کردہ اس دربار میں کئی ماتحت جاگیردار حکمراں شامل ہوئے۔ دھرم پال کی حکمرانی کا بنیادی علاقہ بنگال اور بہار تھا۔ یہ علاقے براہ راست اس کی عملداری میں تھا۔اس کے باہر قنوج کی ریاست اس کے زیر اثر تھی۔ علاوہ ازیں مغرب اور جنوب میں پنجاب کے حکمراں، مغربی پہاڑی علاقوں کے سردار، راجپوتانہ، مالوہ اور برار نےاس کے اقتدار کو تسلیم کیا۔اس کے علاوہ بھی شمالی ہند کی متعدد چھوٹی چھوٹی ریاستوں نے اس کی برتری کا اعتراف کیا۔ سوینبھو پران (Suvayanbhu Purana) میں دی گئی تفصیلات کے مطابق نیپال بھی اس کی ایک ماتحت ریاست تھی۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ گیارہویں صدی کے ایک گجراتی شاعر 'سوڈھل' نے دھرم پال کو 'اتراپتھ سوامن' کہا ہے۔ اگر تبت کے ماخذ کو تسلیم کریں تو وکرم شلا کے

تصویر 3.1۔ وکرم شلا کے بدھ مہاوہار کے باقیات، انتی چک، بھاگل پور ضلع، بہار

Courtesy: Prataparya, https://en.wikipedia.org/wiki/Vikramashila#/media/File:Vikramshila_2012-08-10-17.14.08.jpg

بدھ مہاوہار (انتی چک، بھاگل پور ضلع، بہار) کی تعمیر دھرم پال نے ہی کروائی تھی۔اس کے علاوہ وارییندر کا سومپوری مہاوہار بھی اسی نے بنوایا تھا، جس کے قدیم باقیات راج شاہی ضلع کے پہاڑ پور میں پائے گئے ہیں۔ اودنت پوری مہاوہار (بہار) کی تعمیر بھی تبتی متون میں دھرم پال سے منسوب کی جاتی ہے، حالانکہ دوسرے ماخذ کے مطابق اس کی تعمیر گوپال یا دیوپال نے کی تھی۔

اتناسب کچھ ہونے کے بعد بھی دھرم پال کی یہ فتح دیرپا ثابت نہیں ہوئی۔ کچھ ہی عرصے بعد وتس راج کے بیٹے ناگ بھٹ دوم نے قنوج کی گدی سے چکرایدھ کو بے دخل کرکے دھرم پال کے اقتدار کو چنوتی دی۔ قنوج پر قبضہ کرنے کے بعد پرتی ہار ناگ بھٹ پال ریاست کی

تصویر 3.2۔ پال ریاست اپنے انتہائی عروج پر تقریباً نویں صدی
https://en.wikipedia.org/wiki/Pala_Empire#/media/File:Map_of_the_Pala_Empire.png

راجدھانی منگیر کی طرف بڑھا۔ ادھر دھرم پال بھی اپنا لشکر لے کر مقابلے کے لیے تیار تھا۔ منگیر کے قریب دونوں میں ایک گھمسان جنگ ہوئی جس میں دھرم پال نے شکست کھائی۔ مجبور ہو کر دھرم پال کو راشٹر کوٹ حکمراں گووند سوم سے مدد طلب کرنا پڑی۔ گووند سوم نے شمالی ہند کے لیے کوچ کیا اور حملہ کر کے ناگ بھٹ دوم کو شکست دی۔ راشٹر کوٹ دستاویزوں سے پتہ چلتا ہے کہ چکرایدھ اور دھرم پال دونوں نے

راشٹر کوٹوں کی بالادستی تسلیم کی۔ گووند سوم کے واپس دکن کوچ کرنے کے بعد پرتی ہار طاقت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دھرم پال نے نہ صرف کھوئے ہوئے سابقہ علاقے واپس حاصل کر لیے، بلکہ قنوج کے ساتھ ساتھ شمالی ہند کے کافی بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔اس کے ساتھ ہی اس نے پرمیشور، پرم بھٹارک، مہاراج دھراج دھرم پال کا عظیم لقب اختیار کیا۔

3.4.3 دیو پال (Devapala)

دھرم پال کا بیٹا دیو پال (810-850ء) اپنے باپ کی طرح ہی قابل اور اولوالعزم حکمراں تھا۔ پال ریاست کو منظم رکھنے کے ساتھ ہی اس نے لگاتار جنگوں کے ذریعے اپنی ریاست کو وسعت دی۔اس نے پرتی ہار حکمراں ناگ بھٹ دوم کو قنوج سے کھدیڑنے میں کامیابی حاصل کی، جس نے دھرم پال کی موت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے دوبارہ قنوج پر قبضہ کر لیا تھا۔اس کے بعد دیو پال نے شمالی ہند میں مزید فتوحات حاصل کیں۔اسے پال حکمرانوں میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔اس کے جانشینوں کے کتبوں کے مطابق اس نے شمال میں ہمالیہ اور جنوب میں وندھیاچل تک حملہ کیا تھا۔حالانکہ جدید مورخین کے مطابق یہ بیان پالوں کی جنگی طاقت کو دیکھتے ہوئے کافی مبالغہ آمیز معلوم ہوتا ہے۔اپنی مہمات کے دوران اس نے پراگ جیوتش (موجودہ آسام) پر حملہ کیا اور یہاں بغیر کسی خاص مزاحمت کے فتح حاصل کی۔اس کے بعد اتکل (موجودہ اڑیسہ) کی طرف کوچ کیا۔وہاں کا حکمراں دیو پال کے آنے کی خبر سن کر اپنی راجدھانی چھوڑ کر فرار ہو گیا۔اس طرح وقتی طور پر آسام اور اڑیسہ، پال ریاست کے ماتحت ہو گئے۔ایسا پتہ چلتا ہے کہ پرتی ہار ناگ بھٹ کو ہرانے کے بعد دیو پال نے ہنوں کے خلاف پنجاب اور کمبوج میں بھی فوجی مہم چلائی تھی۔دھرم پال اور دیو پال کی تبت سے بھی جنگوں کا ذکر کتبوں میں ملتا ہے، لیکن یہ صرف چھوٹی موٹی جھڑپوں سے بڑھ کر کچھ نہیں رہی ہونگی، کیونکہ کوئی بھی ہمالیہ کی عظیم چوٹیوں کو پار کرکے دوسرے کے ملک پر قبضہ کرنے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ناگ بھٹ دوم کے علاوہ اس نے مہر بھوج کو بھی شکست دی تھی۔عرب سیاح سلیمان نے دیو پال کو پرتی ہار اور راشٹر کوٹ دونوں سے زیادہ طاقتور مانا ہے۔یہ بات واضح ہے کہ بنگال کو شمالی ہند کی ہمعصر سیاست میں ایک معزز مقام دلانے کا سہرا دھرم پال اور دیو پال کے سر ہے۔

3.4.4 درمیانی دور (The Interregnum)

دیو پال کی موت کے بعد اس کے سب سے بڑے بیٹے راجیہ پال نے گدی سنبھالی۔راجیہ پال کے مرنے کے بعد اس کا سب سے بڑا لڑکا مہندر پال حکمراں بنا۔ایسا تسلیم کیا جاتا ہے کہ ان دونوں نے ورثے میں ملی عظیم ریاست کو قائم رکھا اور غالباً مہندر پال نے اتکلوں اور ہنوں کے حملوں کا کامیابی کے ساتھ سامنا بھی کیا۔مہندر پال کا چھوٹا بھائی شور پال اول اس کا جانشیں بنا۔شور پال کے مرزاپور تانبے کے کتبے سے ثابت ہوتا ہے کہ اس کی حکومت بنگال، بہار اور اترپردیش تک پھیلی ہوئی تھی۔ شور پال اول کے بیٹے گوپال دوم کے دور حکومت سے متعلق کوئی جانکاری نہیں ملتی اور اس کی موت کے ساتھ ہی دھرم پال کے خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

اس کے بعد پال ریاست کا تخت، دھرم پال کے چھوٹے بھائی واک پال کے خاندان کو ہاتھ آیا، جس کے ساتھ ہی آہستہ آہستہ ریاست کا شیرازہ بکھرنے لگا۔واک پال کے پوتے وگرہ پال اول نے ایک مختصر حکومت کے بعد گدی چھوڑ دی اور جوگی بن گیا۔ وگرہ پال کا بیٹا نارائن پال

اول ایک کمزور حکمراں ثابت ہوا۔اس کے 54 سالہ طویل دور حکومت کے دوران پرتی ہار حکمراں مہر بھوج نے پالوں کو شکست دی۔ پال ریاست کی کمزوری ظاہر ہوتے ہی پراگ جیوتش (موجودہ آسام) اور اتکل (موجودہ اڑیسہ) کی ریاستیں خود مختار ہو گئیں ۔ نارائن پال کے بیٹے راجیہ پال کی حکومت تقریباً 32 سال تک رہی۔ اس نے عوام کی سہولت کے لیے متعدد عمارتیں اور مندر تعمیر کرائے۔ پہلے یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کے بیٹے گوپال سوم کے دور حکومت میں بنگال ہاتھ سے نکل گیا اور اس کی حکومت صرف بہار تک محدود ہو گئی، لیکن بھاگلپور کتبے میں اس کے ذریعے شمالی بنگال کے 'پنڈر بردھن' بھکتی (ضلع) میں ایک برہمن کو دو گاؤں عطیہ کرنے کا ذکر ملتا ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ بنگال اب بھی اس کی حکومت میں شامل تھا۔

اگلے حکمراں وگرہ پال دوم کو چندیلوں اور کلچوریوں کے حملوں سے نمٹنا پڑا۔ اس کی حکومت کے دوران پالوں کی قائم کردہ عظیم ریاست گوڑ(Gauda) ، رادھا(Radha)،انگ(Anga)اور ونگ(Vanga) جیسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بنٹ گئی۔ مشرقی بنگال کے سامنت اور ہری کیلا خاندان کے حکمراں کانتی دیو نے اپنی خود مختار حکومت قائم کر لی اور مہاراج دھراج کا لقب اختیار کیا۔ مغربی اور شمالی بنگال میں واقع گوڑ پر کمبوج- پال خاندان نے قبضہ کر لیا۔ اس خاندان کا بانی غالباً کوئی پال افسر تھا جس نے بشمول راجدھانی پال ریاست کے ایک بڑے حصے پر اپنی حکومت قائم کی۔ آخر کار مہی پال اول نے ان کی حکومت کا خاتمہ کیا اور پھر سے پال ریاست کو متحد کیا۔

3.4.5 مہی پال اول (Mahipala I)

وگرہ پال دوم کے جانشیں مہی پال اول (978-1038ء) کی حکومت اس کی تخت نشینی کے وقت مگدھ یعنی جنوبی بہار تک محدود تھی۔ ابتدائی تین سالوں میں مہی پال اول مشرقی بنگال کی بازیابی میں مصروف رہا۔ لگاتار جنگوں کے ذریعے اس نے مشرقی، مغربی اور شمالی بنگال کو پال ریاست میں شامل کرنے میں کامیابی حاصل کی اور ریاست کی سرحدوں کو بنارس تک پھیلا دیا۔

پال ریاست کو کچھ ہی عرصے بعد چول ریاست کے راجندر چول اول اور کلچوری حکمراں کرن یا گانگیہ دیو کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا، جس سے ریاست کی طاقت کو سخت دھکا لگا۔ اس کے باوجود بنگال اور بہار کے زیادہ تر حصے اب بھی مہی پال کے زیر اقتدار تھے۔ مہی پال نے محمود غزنوی کے حملوں سے بھی فائدہ اٹھایا جس نے پرتی ہار ریاست کی قوت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس دوران اس نے شمالی اور جنوبی بہار کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا۔ اس نے بنارس اور اس کے آس پاس کے علاقوں کو بھی فتح کر لیا تھا۔ اس کے بھائی استھر پال اور وسنت پال نے بنارس میں کئی مقدس مقامات کی تعمیر اور مرمت کرائی۔ بعد میں کلچوری حکمراں کرن نے ونگ کے حکمراں کو شکست دے کر اس سے بنارس چھین لیا۔ انگ کا یہ حکمراں مہی پال کا بیٹا نے پال ہو سکتا ہے۔

3.4.6 نے پال (Nayapala)

مہی پال اول کے بیٹے 'نے پال' (1038-1055ء) کو کلچوری حکمراں کرن سے کافی دنوں تک جنگ میں مشغول رہنا پڑا۔ اس طرح کے بہت سے شواہد دستیاب ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ بدھ راہب 'اتیس دیپنکر سری گیان' (Atisa Dipankara

(Srijnana کے بیچ میں پڑنے سے دونوں ریاستوں کے درمیان امن قائم ہوا، جو کہ نے پال کی موت تک قائم رہا۔

3.4.7 وگرہ پال سوم (Vigrahapala III)

نے پال کے بیٹے وگرہ پال سوم کو بھی کلچوری حکمراں کرن کا سامنا کرنا پڑا۔ اس جنگ میں اسے کامیابی حاصل ہوئی اور کلچوری حکمراں کو اپنی بیٹی یوانسری (Yuvanshri) کی شادی وگرہ پال سوم سے کرنی پڑی۔ وگرہ پال سوم کو بعد میں چالکیہ حکمراں وکرمادتیہ چہارم اور اڑیسہ کے سوم ومسی راجا مہاشیو گپت ییتی کے حملوں کی بھی روک تھام کرنی پڑی۔ اس کے بعد حملوں کے ایک لمبے سلسلے نے پال ریاست کی چولیں ہلا دیں، جس کی وجہ سے ریاست کے بہت سے حصے الگ ہو گئے۔ اسی دوران آسام کے ورمن حکمراں نے مشرقی بنگال کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ اس سب کے باوجود وہ کسی طرح گوڑ اور مگدھ کو اپنے قبضے میں رکھنے میں کامیاب رہے۔

3.4.8 مہی پال دوم (Mahipala II)

وگرہ پال سوم کے بعد اس کی بیوی اور کلچوری شہزادی یوناشری کے بطن سے پیدا ہونے والے مہی پال دوم نے اقتدار سنبھالا۔ سندھیا کرنندی نے رام چرترم (Ramcharitam) میں اس کی حکومت کا بڑی خوبصورتی سے تذکرہ کیا ہے۔ اس نے ایک قلیل مدت کے لیے ریاست کو طاقتور بنانے کی کوشش کی، لیکن اسے پہلے اپنے سگے بھائیوں سے نمٹنا پڑا۔ مہی پال دوم نے اپنے بھائی سور پال دوم اور رام پال کو اپنے خلاف سازش رچنے کے شک میں قید کر دیا۔ اس کے چند دنوں کے بعد ہی کائیبرت (Kaibarta) (مچھوارہ برادری) کے ماتحت سرداروں نے بغاوت کر دی۔ انہیں میں سے دویہ (Divya) یا دووکا (Divvoka) نام کے ایک سردار نے مہی پال دوم کو قتل کر دیا اور واریندر کے علاقے پر قبضہ کر لیا، جس پر اس کے بعد اس کے جانشین رودک اور بھیم نے حکومت کی۔ پال حکمراں مہی پال دوم کے قتل سے مچی افراتفری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے مہی پال دوم کے دونوں بھائی یعنی سور پال دوم اور رام پال جو قید میں تھے، بچ کر نکلنے اور مگدھ پہنچنے میں کامیاب رہے۔ مگدھ میں سور پال دوم ایک مختصر حکومت کے بعد مر گیا۔

3.4.7 رام پال (Ramapala 1077-1120 AD)

سور پال دوم کے بعد اس کا بھائی رام پال اس کی جگہ تخت نشیں ہوا۔ اس نے دویہ کے بھتیجے بھیم پر ایک زبردست فوجی حملے کی تیاری کی۔ اس جنگ میں راشٹر کوٹ خاندان سے اس کے ماموں مٹھانا (Mathana) اور سوراج دیو (Sivarajadeva) کے علاوہ جنوبی بہار اور جنوب مغربی بنگال کے کئی ماتحت سامنتوں نے رام پال کی مدد کی۔ نتیجتاً بھیم کو شکست ہوئی اور اسے اس کے خاندان کے لوگوں کے ساتھ بے رحمی سے قتل کر دیا گیا۔

پال ریاست کو دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش میں رام پال نے واریندری (شمالی بنگال) پر فتح حاصل کی اور ایک نئی راجدھانی رام وتی (Ramvati) سے حکومت کی، جو کہ آخری وقت تک پال ریاست کی راجدھانی بنی رہی۔ اس نے 'کامروپ' اور 'راڑھ' کو اپنے قبضے میں لے کر آسام کے ورمن حکمراں کو اپنی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ وہ گنگا حکمرانوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو روکنے اور انہیں اڑیسہ پر قبضے

سے روکنے میں بھی کامیاب رہا، حالانکہ اس کی موت کے بعد یہ علاقہ گنگوں کے قبضے میں چلا گیا۔ گہڑوال خاندان کے حکمراں گووند چندر سے اپنی چچیری بہن کماردیوی(Kumaradevi) کی شادی کر کے اسے اپنا اتحادی بنالیا اور پال ریاست پر حملہ کرنے سے روک لیا۔ اس نئے اتحاد سے اسے بہت فائدہ حاصل ہوا، جس سے وہ مغربی بنگال کے سردار ننیودیو(Nanyadeva) کو روکنے میں کامیاب رہا، لیکن اس کوشش میں اسے متھلا (بہار کا انتہائی شمالی علاقہ) سے ہاتھ دھونا پڑا۔

رام پال نے چول حکمراں کلوتنگ کے ساتھ دوستانہ مراسم قائم کیے اور اس طرح اپنے دشمنوں گنگوں اور چالکیوں کے حملوں کی روک تھام میں کامیاب رہا۔ اس طرح رام پال نے اپنی مہارت اور تدبر سے ریاست کے زوال کی رفتار کم کرنے کی کوشش کی۔ اس کے علاوہ اس نے کھیتی باڑی کو بڑھانے، تجارت کو پھیلانے اور عوام کو خوش رکھنے کے لیے بھی اپنی بھرپور جدوجہد کی۔

3.5 پال خاندان کا زوال (Decline of Pala Dynasty)

رام پال اس ریاست کا آخری طاقتور حکمراں تھا۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے کمار پال نے پال ریاست کو متحد رکھنے کی کوشش کی۔ اس کے دور حکومت میں کامروپ میں ایک بغاوت پھوٹ پڑی جسے کمار پال کے وزیر ویدیہ دیو(Vaideyadeva) نے کچل دیا۔ اس کے علاوہ بھی ویدیہ دیو نے جنوبی بنگال میں ایک سمندری جنگ میں کامیابی حاصل کی۔ کمار پال کی موت تک ویدیہ دیو اس کے وزیر کے طور پر اس کا وفادار رہا، لیکن کمار پال کی آنکھ بند ہوتے ہی ویدیہ دیو نے عملی طور پر ایک علاحدہ حکومت قائم کی۔ حالانکہ وہ اب بھی رسمی طور پر پال اقتدار کو تسلیم کرتا رہا۔ راجب پور(Rajibpur) تانبے کے کتبے کے مطابق کمار پال کا بیٹا گوپال دوم کم عمری میں گدی پر بیٹھا اور اس کے چچا مدن پال نے نائب کے طور پر حکومت کا کاروبار سنبھالا۔

گوپال دوم یا تو کم عمری میں مر گیا یا پھر اس کے چچا مدن پال نے اسے مار ڈالا، یہ ابھی تک واضح نہیں ہے۔ بہر حال مدن پال نے پال ریاست کی باگ ڈور سنبھالی۔ اس کی دور حکومت میں مشرقی بنگال میں ورمنوں نے خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اڑیسہ میں مشرقی گنگوں سے بھی جنگ شروع ہو گئی۔ مدن پال منگیر کو تو گہڑوالوں سے واپس لینے میں کامیاب رہا، لیکن اسے سین حکمراں وجے سین کے ہاتھوں بدترین شکست ہوئی اور جنوبی اور مشرقی بنگال اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ سین خاندان جو بنگال کے رادھا علاقے میں پال ریاست کا ایک معمولی باج گزار تھا اب پوری پال ریاست کا حکمراں بن بیٹھا۔ گووند پال نام کے ایک حکمراں نے تقریباً 1162ء میں گیا پر حکومت کی لیکن پال حکمرانوں سے اس کے تعلقات کے کوئی پختہ ثبوت نہیں ملتے اور اس طرح عظیم پال خاندان کا خاتمہ ہوا۔

3.6 انتظام حکومت (Administration)

پال ریاست، شاہی طرز حکومت(monarchy) پر مبنی تھی جس میں حکمراں کو تمام اعلیٰ اختیارات حاصل تھے۔ پال حکمرانوں نے پرمیشور، پرم بھٹارک، مہاراج ادھیراج جیسے بڑے بڑے القابات اختیار کیے تھے۔ پال ریاست میں حکمراں کے بعد سب سے اہم عہدہ

منتری یا وزیر کا ہوتا تھا۔ گرگ خاندان نے تقریباً سو سال تک پالوں کے وزیر اعظم کے طور پر خدمات انجام دیں۔

- گرگ (Garga)
- درواپانی یا دربھپانی (Darvapani or Darbhapani)
- سومیشور (Someshwar)
- کیدار مسرا (Kedarmisra)
- بھٹہ گورومیسرا (Bhatta Guravmisra)

انتظامی اکائیاں اس طرح تھی۔

- بھکتی (Bhuktis)یعنی صوبہ
- وشیہ (Vishayas)یعنی ڈویزن
- منڈل (Mandalas)یعنی ضلع
- کھنڈل(Khandala)، بھاگ(Bhaga)،اورتی(Avritti)، چترک(Chaturaka)اور پٹک(Pattaka)وغیرہ ذیلی انتظامی اکائیاں تھیں۔

پالوں کے کتبوں میں متعدد عہدے داروں کا ذکر ہے

- راجا
- راجنیک
- رانک(ممکنہ طور پر ماتحت سربراہان)
- سامنت اور مہاسامنت(ماتحت باجگذار حکمراں)
- مہاسندھی وگراہیک(وزیر خارجہ)
- دوت(سفیر)
- راجستھانیہ(نائب)
- انگرکشک(محافظ)
- ششٹھاوگراہک(محصول جمع کرنے والا)
- دشاپرادھیک(جرمانوں کا جمع کرنے والا)
- تارک(دریا کا محصول کلکٹر)
- مہاپسپتال(محاسب اعلیٰ)

- جیشٹھ کایستھ (دستاویزوں کا ذمے دار افسر)
- کسیتر پ (زمین کے استعمال کے محکمے کا سربراہ)
- پرماتر (زمین کی پیمائش کا سربراہ)
- مہادنڈنایک یا دھرم ادھیکار (منصف اعلیٰ)
- مہاپر تیہار (محافظ اعلیٰ)

3.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

پال ایک سنسکرت اصطلاح ہے جس کے معنی محافظ کے ہیں۔اس ریاست کے ابتدائی حکمراں اپنے نام کے بعد یہ لاحقہ جوڑتے تھے۔انہوں نے ہندوستان کے ابتدائی عہد وسطیٰ میں مشرقی اتر پردیش، بہار، بنگال، اڑیسہ اور کامروپ کے کچھ علاقوں پر حکومت کی۔اس کے بانی گوپال کا تعلق ایک بہت ہی سادہ گھرانے سے تھا۔ایک مدت تک انتشار اور بدنظمی کے بعد بنگال کے سامنتوں نے گوپال کو حکمراں بنایا اور پال ریاست وجود میں آئی۔پال ریاست کو اپنے شروعاتی دور سے ہی ہمسایہ ریاستوں سے الجھنا پڑا۔اس کے علاوہ وہ قنوج پر اقتدار قائم کرنے کے مقصد سے ہونے والی سہ طرفہ جدوجہد کا بھی حصہ رہی۔دھرم پال اور دیو پال نے مسلسل جنگوں اور فتوحات سے اسے شمالی ہند کی ایک عظیم طاقت بنایا۔کچھ مدت کی بدنظمی اور انتشار کے بعد مہی پال اول نے ریاست کو از سر نو منظم اور مضبوط بنایا۔

مہی پال کے بعد کئی دیگر حکمرانوں نے اسے قائم رکھنے کی کوشش کی، لیکن گہڑوالوں، گنگوں، چالوکیوں اور کلچوریوں کے حملوں سب سے اہم ماتحت سرداروں کی بغاوت نے اس سلطنت کمزور کر دیا۔رام پال اس خاندان کا آخری طاقتور حکمراں تھا جس نے ریاست کو پہلے جیسی شان وشوکت واپس لوٹانے کی کوشش کی، مگر اس کی آنکھ بند ہوتے ہی ریاست سکڑنے لگی۔کامروپ خود مختار ہو گیا۔اڑیسہ گنگوں کے قبضے میں چلا گیا۔سب سے آخر میں بنگال پر سین حکمرانوں کا قبضہ ہو گیا جنہوں نے سین خاندان کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔آخر کار کمزور جانشین، خاندانی جھگڑے، باج گذار سرداروں کی سرکشی اور بیرونی حملے اس ریاست کے خاتمے کی وجہ بنے۔پال ریاست بدھ مذہب کی سرپرست تھی اور اس نے بدھ علم وادب کے فروغ میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔نالندہ، وکرم شلا جیسے عظیم مہاوہار ان کے دور اقتدار میں تعمیر ہوئے۔جنوب مشرقی ایشیا میں بدھ مذہب کے مہایان مکتب فکر کے فروغ کا سہرا اسی خاندان کے حکمرانوں کے سر جاتا ہے۔

پال حکمراں	عہد حکومت	
گوپال اول	770–750	
دھرم پال	810–770	
دیو پال	c. 850–810	
مہندر پال	860–845	ان کے ہونے کا پتہ صرف ایک تانبے کے کتبے کے فرمان سے چلتا ہے۔

شور پال اول یا وگرہ راج اول	858–850	
گوپال دوم	نامعلوم	اس حکمراں سے متعلق صرف ایک کتبہ 1995 میں دستیاب ہوا
وگرہ پال اول	853–850	
نارائن پال	908–854	
راجیہ پال	940–908	
گوپال سوم	957–940	
وگرہ پال دوم	c. 986–960	
مہی پال اول	c. 1036–988	
نے پال	1053–1038	
وگرہ پال سوم	1072–1054	
مہی پال دوم	1075–1072	
شور پال دوم	1077–1075	
رام پال	1130–1077	
کمار پال	1140–1130	
گوپال چہارم	1144–1140	
مدن پال	1162–1144	

3.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

جانشین	نائب، وارث	**واریندر**	شمالی بنگال
مستحکم	مضبوط	**پال**	محافظ
پراگ جیوتش	آسام	**متھلا**	بہار کا انتہائی شمالی علاقہ
اتکل	اڑیسہ	**بیرونی**	باہری
تشکیل	شکل دینا، بنانا	**گوڑ**	مغربی اور جنوبی بنگال
متسیہ راج	جنگل راج	**باج گذار**	ماتحت، خراج دینے و
مگدھ	جنوبی بہار		
ابتدائی عہد وسطیٰ	ہندوستانی تاریخ میں ساتویں سے بارہویں صدی عیسوی تک کا عرصہ		

3.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

3.9.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. بنگال کے عظیم حکمراں ششانک کی موت کب ہوئی؟
2. لفظ پال سے کیا مراد ہے؟
3. پال ریاست کا بانی کون تھا؟
4. پال خاندان نے ہندوستان کے کس حصے پر حکومت کی؟
5. وکرم شلا مہاوہار کس نے تعمیر کرایا؟
6. پال حکمراں کس مذہب کے پیروکار تھے؟
7. سہ طرفہ جدوجہد کی شروعات کس کے دور سے ہوئی؟
8. کس پران کے مطابق نیپال بھی دھرم پال کی حکومت میں شامل تھا؟
9. کس عرب سیاح نے پالوں کو پرتی ہار اور راشٹر کوٹ سے بھی طاقتور مانا تھا؟
10. مہی پال اول نے شمالی ہند پر کس کے حملوں سے فائدہ اٹھایا؟

3.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پال ریاست کی ابتدا کا سیاسی پس منظر بیان کیجیے۔
2. پال ریاست کی توسیع میں دھرم پال کے کردار کی وضاحت کیجیے۔
3. پال حکمراں دیو پال کے عہد حکومت پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. پال حکمراں مہی پال اول کے عہد حکومت پر ایک نوٹ لکھیے۔
5. پال ریاست کے زوال کے بارے میں بتائیے۔

3.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پال خاندان کا تعارف پیش کرتے ہوئے اس کے قیام سے پہلے کے سیاسی حالات اور گوپال کی تخت نشینی پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. پال سلطنت کی توسیع میں دھرم پال، دیو پال، مہی پال اول اور رام پال کی کوششوں کا تفصیلی تذکرہ کیجیے۔
3. پال ریاست کے عروج اور زوال پر ایک مضمون لکھیے۔

3.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Bagchi Jhunu., *The History and Culture of the Pālas of Bengal and Bihar, c.750 A.D.–c.1200 A.D.* Abhinav Publications, New Delhi, 1993
2. Monahan Francis John., *The Early History of Bengal*. Bhartiya Pub. House 1974.
3. Paul Pramode Lal., *The Early History of Bengal. Indian History*. Vol. 1. Indian Research Institute, Culcutta, 1939.
4. Sengupta Nitish K., *Land of Two Rivers: A History of Bengal from the Mahabharata to Mujib*. Penguin Books India, 2011. pp. 39–49.

اکائی 4۔پرتی ہار خاندان

(The Pratiharas)

اکائی کے اجزا

4.0 تمہید
4.1 مقاصد
4.2 مآخذ
4.3 پس منظر
4.4 ابتدا
4.5 پرتی ہار حکمراں
4.5.1 ناگ بھٹ اول
4.5.2 وتس راج
4.5.3 ناگ بھٹ دوم
4.5.4 رام بھدر دیو
4.5.5 مہر مہر بھوج اول
4.5.6 مہیندر پال اول
4.5.7 مہی پال اول
4.5.8 مہی پال دوم
4.6 پالوں اور راشٹر کوٹوں کے ساتھ مہمات
4.7 زوال
4.8 اکتسابی نتائج
4.9 کلیدی الفاظ

4.10 نمونہ امتحانی سوالات
4.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
4.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
4.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
4.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

4.0 تمہید (Introduction)

یہ اکائی مغربی ہندوستان میں ابھرنے والی پرتی ہار نامی ایک عظیم سیاسی طاقت کے عروج، قیام اور زوال سے متعلق ہے جس کو گرجر پرتی ہار کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ اس ریاست نے مغربی اور شمالی ہندوستان کے بڑے حصے پر اپنی حکمرانی قائم کی تھی اور اسے علاقائی توسیع اور بالادستی کے لیے دیگر ہمعصر سیاسی طاقتوں جیسے پالوں، کلچوریوں، چندیلوں اور راشٹر کوٹوں سے متعدد جنگیں بھی لڑنی پڑیں۔ حکومت کے رقبے میں اتار چڑھاؤ کے باوجود پرتی ہار ریاست آٹھویں سے گیارہویں صدی تک شمالی ہندوستان کی سیاست میں حاوی رہی۔ ہرش وردھن کے زمانے سے قنوج شمالی ہندوستان پر اقتدار کی علامت سمجھا جانے لگا اور اس پر قبضے کا مطلب پورے شمالی ہندوستان کی حکمرانی تھا۔ قنوج کی اسی اہمیت کے سبب اس دور کے ہندوستان کی تین اہم سیاسی طاقتوں یعنی پال، پرتی ہار اور راشٹر کوٹ نے اس پر قبضے کے لیے جدوجہد کی۔ پرتی ہار بھی اس سہ طرفہ جدوجہد (Triangle Struggle) میں شامل تھے۔ قنوج پر قبضے کی کوششوں کے انہیں جنوبی ہندوستان کی عظیم طاقت راشٹر کوٹوں کے ہاتھوں کئی مرتبہ ہار کا بھی سامنا کرنا پڑا، لیکن وہ اپنی سیاسی اہمیت برقرار رکھنے میں کامیاب رہے۔

عظیم حکمراں ہرش وردھن کی موت کے بعد شمالی ہندوستان میں کوئی بڑی مرکزی طاقت نہیں بچی جو متعدد چھوٹی بڑی ریاستوں کو ابھرنے اور اقتدار حاصل کرنے سے روک سکتی تھی۔ متعدد حکمراں خاندان پورے شمالی ہندوستان پر اپنی حکومت کے خواب دیکھ رہے تھے اور اس کے لیے سیاسی تگ ودو میں مصروف تھے۔ ان میں ڈنڈ کا وسیہ (جدید ددوان، راجستھان) کے پرتی ہار کافی حد تک کامیاب ہوئے۔

پرتی ہاروں نے مغربی اور شمالی ہندوستان پر اپنا اثر ورسوخ قائم کیا۔ ناگ بھٹ اول (730تا760) کا زمانہ اس سلطنت کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے جس نے عرب حملہ آوروں کو کامیابی کے ساتھ شکست دی۔ بھوج یا مہر بھوج (836تا885) کو اس سلطنت کا سب سے مشہور بادشاہ مانا جاتا ہے۔ پرتی ہار ریاست کو خصوصی طور پر ان کے فنون لطیفہ، مجسمہ سازی اور مندروں کی تعمیر کے لیے جانا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی ہمعصر دشمن طاقتوں میں شمالی ہندوستان میں پال (8تا12ویں صدی) اور جنوبی ہند میں راشٹر کوٹ (8تا10ویں صدی) سے مسلسل جنگ کی۔

4.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- پرتی ہار خاندان کی ابتدا سے واقف ہو سکیں گے۔
- عظیم پرتی ہار حکمراں ناگ بھٹ اول اور مہر بھوج کے کارناموں کو جان سکیں گے۔
- اس دور کی ہندوستانی سیاست میں پرتی ہاروں کا مقام متعین کر سکیں گے۔
- پرتی ہاروں کے دور میں مذہبی، ادبی اور ثقافتی ترقی کے بارے میں جان سکیں گے۔

4.2 ذرائع (Sources)

عمارتوں، کتبوں اور ادبی دستاویز کی ایک اچھی خاصی تعداد ہمیں پرتی ہار سلطنت کے تاریخی واقعات کی جانکاری حاصل کرنے میں مدد کرتی ہے۔ پرتی ہار حکمراں مہر بھوج اول کے دستاویزوں میں حکمراں کے شجرہ نسب کے ساتھ ساتھ ہر حکمراں کی شخصیت کا مختصر ساذکر موجود ہے۔ ان دستاویزوں کے علاوہ پرتی ہار دور حکومت میں تعمیر کردہ اس دور کی یادگار عمارتیں اور مجسمے بھی پرتی ہاروں کی تاریخ سے متعلق قیمتی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ بنیادی ادبی وسائل میں ہندوستان میں آنے والے عرب تاجروں کی روداد سفر بھی شامل ہیں۔ مثلاً سلیمان جو تقریباً نویں صدی عیسوی میں ہندوستان آیا تھا اور مسعودی جس نے 16-915 میں گجرات کا سفر کیا تھا، اپنے سفر کی تفصیلی یادداشت چھوڑی ہے۔ ان سبھی نے پرتی ہار سلطنت کو الجزر (جو سنسکرت کے گرجر سے نکلا ہے) کا نام دیا اور پرتی ہار حکمرانوں کی عظمت و شہرت اور وسیع سلطنت کی تصدیق بھی کی۔

4.3 پس منظر (Background)

647ء میں، ہرش وردھن کے موت کے ساتھ کنیاکبج (موجودہ دور میں قنوج شہر، اتر پردیش) کی پشیہ بھوتی سلطنت کا خاتمہ افراتفری اور سیاسی انتشار کا باعث بنا۔ بہت سی حکومتیں آباد اور برباد ہوئیں اور ان میں سے جنہیں اقتدار حاصل ہوا وہ پرتی ہار، شمالی ہند کے پال اور جنوبی ہند کے راشٹر کوٹ تھے۔ نویں صدی میں قنوج پر ایودھ خاندان کی حکومت تھی۔

4.4 ابتدا (Origin)

پرتی ہار جنہیں گرجر پرتی ہار بھی کہا جاتا ہے، کی ابتدا آج بھی بحث کا موضوع ہے۔ گرجروں کو پہلے غیر ملکی خیال کیا جاتا تھا لیکن آہستہ آہستہ وہ ہندوستانی سماج کا حصہ بن گئے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ مقامی لوگ یا قبائلی گروہ جو گرجر (گرجر دیش یا گجراتر) سے تعلق رکھتے تھے، گرجر پرتی ہار کہلانے لگے۔ پرتی ہار جو کہ سنسکرت کے لفظ پرتی ہار یعنی "دربان" سے نکلا ہے، گرجروں کے قبائلی گروہ میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مہاکاویہ رامائن میں شہزادہ لکشمن نے ایک بار اپنے بڑے بھائی رام کے دربان کا کردار نبھایا تھا اور چونکہ لکشمن کو اپنا جد امجد مانتے ہیں اس

لیے انہوں نے پرتی ہار کا لقب اختیار کیا۔ پرتی ہاروں نے مقامی سرداروں اور افسروں کی حیثیت سے اپنے کریر کی شروعات کی اور آخر کار موجودہ راجستھان کے جنوبی اور مشرقی حصے میں اپنی ریاست قائم کرنے میں کامیاب رہے۔

4.5 پرتی ہار حکمراں (Pratihara Rulers)

4.5.1 ناگ بھٹ اول (Nagabhatta I)

ناگ بھٹ اول (760-730ء) پرتی ہار ریاست کا سب سے قابل ذکر اور تاریخی بادشاہ گزرا ہے۔ اس نے عربوں کو شکست دینے کی وجہ سے دوسرے ہم عصر حکمرانوں میں نمایاں مقام حاصل کیا۔ گوالیار کے بادشاہ مہر بھوج اول کے دستاویزوں میں شجرہ نسب کے ساتھ ساتھ ہر حکمراں کی شخصیت کا مختصر ساذکر موجود ہے۔ غالبا. اس نے عربوں کو شکست دے کر انہیں زمین چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ دکن میں راشٹراکتاس اپنی سرحدوں کی توسیع میں مصروف تھے۔ ظاہر ہے کہ دونوں بڑھتی ہوئی طاقتوں کے مابین اسی طرح کی دلچسپی سے گریز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ لیکن یہ ان کے درمیان جنگ اور تنازع کا باعث بنا۔

انہوں نے راشٹر کوٹوں کے ساتھ جنگ کی اور ناکام ہوئے۔ راشٹر کوٹ دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ راجا دنتی درگ نے مالو، لتا، گنگ اور سندھ کے علاوہ جنوبی ہند کے کئی بادشاہوں پر اپنا تسلط قائم کیا۔ سنجن کے چاندی کے دستاویز ہمیں گرجریش (گرجر دیش کا حاکم) کی شکست کی جانکاری دیتے ہیں۔ لیکن یہ شکست کچھ بہت طویل نہیں تھی۔ اس نے 756 میں دوبارہ اپنا اقتدار واپس لے لیا اور اپنی سرحد بھر گو کچھ تک بڑھادی۔ اس کے بعد اس کا بھتیجا کاکشتا اس کا جانشین بنا اور اس کے بعد اس کے بھائی دیوراج کو حکومت ملی۔ ان دونوں نے 760 سے 775 تک حکومت کی۔ ان کے دور میں کوئی قابل ذکر واقعہ پیش نہیں آیا یا کم از کم لیکن انہوں نے اپنے اجداد کی سلطنت کو صحیح وسالم رکھا۔

4.5.2 وتس راج (Vatsaraja)

دیوراج کے بعد وتس راج تخت حکومت پر بیٹھا اور بھنڈی یا بھٹی قبیلے کو شکست دی۔ وتس راج (775 تا 800) نے وسط راجستھان کے بیشتر علاقوں پر قبضہ کیا اور گجرات میں اپنا دبدبا قائم کیا۔ اس نے گوڑ کے ساتھ بھی جنگ کی اور گوڑ کے پال حکمراں کو اسی کی سرزمین پر شکست دی۔ پرتھوی راج وجے میں دی گئی تفصیلات کے مطابق چوہان سردار درلبھ راج نے نولوک کی مدد کی تھی اور پھر قنوج کی سیاست میں شامل ہو کر پالوں کو ہرایا اور ایودھ خاندان سے اپنے وفادار امیدوار کے لیے تخت حاصل کیا۔ حالانکہ اس کی توسیعی کوششوں پر راشٹر کوٹ حکمراں دھروو نے پانی پھیر دیا۔ اس نے وتس راج کو شکست دے کر اس سے مفتوحہ مقامات چھین لیے اور پرتیہاروں کو راجستھان کے صحرا کی طرف ڈھکیل دیا۔

4.5.3 ناگ بھٹ دوم (Nagabhatta II)

وتس راج کے بعد اس کا بیٹا ناگ بھٹ دوم (800 تا 833ء) اس کا جانشین بنا۔ اس کی تاج پوشی اس وقت ہوئی جب جاگیرداری

نظام اپنے عروج پر تھا۔ راشٹر کوٹوں سے جنگ سے متعلق دستاویزات کی اچھی خاصی تعداد غالباً اپنی طاقت کو واپس لینے کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ناگ بھٹ نے چکرایودھ کو ہرا کر قنوج پر قبضہ کر لیا۔ اس کی یہ فتح پال حکمراں کے لیے اعلان جنگ تھی اور جس کے نتیجے میں مد گری (منگیر بہار) کے مقام پر دونوں میں جنگ ہوئی۔ اس جنگ میں ناگ بھٹ نے اپنے جاگیر دار کا کا کی مدد کی مدد سے پالوں کو ہرا دیا۔

اس نے سلطنت کے وقار کو واپس لانے کی کوشش کی اور اس طرح اس نے اپنے ایک طاقتور دشمن پال حکمراں کو مات دے کر اپنی حدود میں توسیع کرنے کی پوزیشن حاصل کر لی۔ اس کے مقابلے میں آندھرا، سندھ، ویر بھدر اور کلنگ کے بادشاہوں نے اپنے طور پر جدوجہد کی۔ ناگ بھٹ نے سب کو شکست دے کر انہیں اپنی ماتحتی قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ مزید یہ کہ اس نے آندھرا، مالوا، کیرت، ترشک، وتس اور متسیوں کے پہاڑی قلعوں کو جبراً بند کر دیا۔ ناگ بھٹ نے پال حکومت کے شمال مغربی حصے کے علاوہ مشرق سے مغرب اور ہمالیہ سے نرمدا تک تمام علاقوں میں اپنی خود مختاری قائم کی۔ شاکمبھری کے چوہانوں نے بھی اس کی خود مختاری کا اعلان کیا۔ گجرات پر قبضہ کرنے کے دوران اس کا مقابلہ راشٹر کوٹوں سے ہوا اور بالآخر راشٹر کوٹ حکمراں گووندا نے ناگ بھٹ کو شکست دی جس کی وجہ سے گجرات اور مالوا اس کے ہاتھ سے چلا گیا۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس نے دوبارہ اپنی طاقت بحال کی تو اس نے اپنے کچھ کھوئے ہوئے علاقوں کو واپس حاصل کر لیا۔ اس نے ایودھ حکومت کے خاتمے کے بعد کنیاکبج (موجودہ قنوج) کو بھی اپنے تصرف میں لے لیا اور اسے اپنی راجدھانی بنایا۔

پربھاک چرت کے دستاویز سے معلوم ہوتا ہے کہ بھردپاڑا کے مہینے میں ناگ بھٹ دوم گنگا کے مقدس پانی میں ڈوب گیا اور اس کی موت ہو گئی۔ یہ بات قابل توجہ ہے کہ فن کے ممتاز پرتی ہار نمونے صرف اسی کے دور میں ہی ملتے ہیں۔ بٹیسر اور نسریسر (اب مورینا) کے بڑے مندروں کے گروپ اور اس کے آس پاس کے اور دوسرے مندروں کو بنانے میں کئی عظیم سرپرستی کو اس کے حوالے کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ مہوا اور تیراہی کے شیو مندر میں پرتی ہار کے دور کی فن کاری کو دیکھا جا سکتا ہے۔ قدیم عمارتوں کے سائنسی تجزیے ارتقا کے مختلف میدانوں میں ہمعصر فن کاری کی کافی حد تک تصدیق کرتے ہیں۔

4.5.4 رام بھدر (Rambhadra)

رام بھدر 833 میں اپنے والد کا جانشین بنا اور اس نے تین سال کی مختصر مدت کے لیے حکومت کی۔ اس کے دور میں گجراترا اور کلنجر کے منڈلوں کا پرتی ہاروں کے ہاتھ سے نکل جانا اس کی سیاسی نااہلی کا ثبوت دیتے ہیں۔ پربھاک کریتا کے دستاویز نے اسے ایک علاحدہ شخص کے طور پر پیش کیا اور یہی وجہ ہے کہ اس کے بیٹے مہر مہر بھوج اول نے اپنے والد کو قتل کر کے اس کی جگہ لے لی۔

4.5.5 مہر مہر بھوج اول (Mihirbhoja I)

مہر مہر بھوج اول (836تا889ء) کے دور حکمرانی کو پرتی ہار ریاست کی تاریخ میں بہت اہمیت حاصل ہے۔ سب سے پہلے اس نے گجراترا اور کالنجر منڈل کے دو علاقوں میں اپنے اقتدار کو واپس حاصل کیا۔ چندیلوں نے اپنے 954 عیسوی تک کے شاہی دستاویز میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ مہر بھوج اول نے اپنی سرحدوں کو شمال میں ہمالیہ کی ترائی تک وسیع کر دیا یہاں تک کہ گہیلوں نے ان کی اطاعت قبول کر

لی۔ کہا جاتا ہے کہ گورکھپور کے ایک کلچوری بادشاہ گنم بدھ دیو نے مہر بھوج اول سے زمین کا معاوضہ لیا اور گوڑوں کے سکون اور وقار کو غارت کر دیا۔ غالب امکان ہے کہ اس نے پالوں کے بادشاہ دیو پال کے خلاف مہم میں بھوج کی مدد کی۔ لیکن بھوج نے پال ریاست پر کہاں تک قبضہ کر لیا یہ کہنا مشکل ہے۔

طاقتور دشمنوں کے خلاف بھوج کی فتح نے یقیناً اس کی توجہ دوسری طرف بھی مرکوز کی۔ اس نے جنوب مغربی علاقوں میں مہمات کی اور جنوبی راجستھان سے اونتی اور نرمدا کے آس پاس کے علاقوں پر راج کیا جس میں اس کے جاگیر دار چوہانوں نے اس کی مدد کی۔ پرتھوی راج وجے کے مطابق چوہان شہزادی کلاوتی نے دوسرے خواہش مند لوگوں کے مقابلے قنوج کے بادشاہ کو اپنے شوہر کی شکل میں منتخب کیا۔ دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ یہ ازدواجی معاہدہ اس کی خوش حالی کا باعث بنا۔ اسکندپران کی یہ بات ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ ''گرنار کے جنگلوں میں گھومنے والی ایک دو چہرہ والی دوشیزہ کے بارے میں ون پال (جنگلات کے محافظ) کے بیان کو سن کر بھوج نے اپنی فوج کے ساتھ جنگل کا رخ کیا اور اور دوشیزہ کو حاصل کر لیا اور اس طرح اس نے کنیا کبج حاصل کیا۔'' ہمیں اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ دستاویز سے ملنے والے اشاروں کے مطابق اس کی فوج سوراشٹر میں چلی گئی۔ ظاہر ہے یہ علاقہ اس کی حدود میں شامل ہو گیا تھا۔ بال ورمن اور اونی ورمن کے دستاویز بالواسطہ طور پر اس بات کی تصدیق کرتے ہیں۔

جنوب مغرب میں بھوج کی فتوحات نے اسے پرتی ہار سلطنت کے پرانے دشمن راشٹر کوٹوں کے نزدیک کر دیا اور اس طرح وہ راشٹر کوٹوں سے جنگ میں الجھ گیا۔ جنگ جاری رہی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی اس نے اپنے دشمن راشٹر کوٹ حکمراں کرشن دوم کو پسپا کر کے اس کے ملک کی طرف کھدیڑ دیا۔ لیکن کتبات سے ہمیں اس کے خلاف حوالہ ملتا ہے جس میں اسے راشٹر کوٹوں کے ہاتھ سے مات کھاتے دکھایا گیا ہے۔ بہر حال پرتی ہاروں نے اپنی گجرات اور مالوہ پر مضبوط فوجی قوت قائم رکھی۔

مہر بھوج اول نے دریائے ستلج کے کنارے مشرقی پنجاب کے کچھ حصوں کو اپنی حدود میں شامل کر لیا۔ پیہوو دستاویز میں بھوج کے دور حکومت کے دوران گھوڑوں کے لین دین کے ثبوت کے موجود ہیں۔ راج ترنگنی نے بھی پنجاب کے باشندے تھکیا کے کچھ علاقوں میں حملہ ہونے اور قبضہ کیے جانے کی بات کہی ہے۔ مہر بھوج اول کا دور حکومت اتنا خوشحال، منظم، پر امن اور شاندار رہا کہ عرب سیاح سلیمان (851) نے اس کی فوجی قوت کے ساتھ ہی اس کے گھڑ سواروں کی بھی تعریف کی۔ اس نے اس بات کا تذکرہ کیا کہ اس کی سلطنت کی اس زمین پر مرکزی حیثیت ہے اور اس کے علاوہ ہندوستان کا کوئی دوسرا صوبہ لٹیروں سے محفوظ نہیں ہے۔ اس کے دور میں بہت سے مندر وجود میں آئے۔ Pratihara Art in India کے مصنف رحمٰن علی کے مطابق گوالیار قلعے کے اندر موجود چتر جھج مندر اس بات کا ثبوت ہے۔ اس دور کی یادگار عمارتوں میں تیلی کا مندر، سورج مندر (گوالیار)، اندور کے گرگاج مہادیو مندر، بروا ساگر کا جری مٹھ مندر وغیرہ قدیم پرتی ہار طرز تعمیر کی قابل ذکر مثالیں ہیں۔ زندگی کے آخری ایام میں بھوج نے اپنے بیٹے کی خاطر راج پاٹ ترک کر دیا اور سن 889ء میں سنہرے تالاب کے مقدس پانی میں ڈوب کر خودکشی کر لی۔ اس طرح مہر بھوج اول کی شاندار حکومت کا خاتمہ ہوا۔

4.5.6 میندراول (Mahendra I)

مہر بھوج اول کے بعد اس کا بیٹا میندر (890تا907ء) اس کا جانشین بنا۔ اس کے زمانے میں پرتی ہار سلطنت کو شمال مغرب میں مشکلیں آئیں لیکن جنوب اور مغرب میں اپنی حکومت کو برقرار رکھتے ہوئے مشرق کی جانب توسیع بھی ہوئی۔ جب مہی پال اول مشرقی مہم میں مصروف تھا تو کشمیر کے حکمراں شنکر ورمن نے پرتی ہار علاقے پر حملہ کیا لیکن پرتھوڈاک (ضلع کرنال) پر ان کی حکومت پھر بھی برقرار رہی۔ اس زمانے کے ایٹ کھوری (ہزاری باغ، بہار) اور راج شاہی (بنگلہ دیش) کے دستاویز میں مشرق میں اس کی شاندار فتح اور اقتدار کا تذکرہ ہے۔ گنیر یا دستاویز (ضلع گیا) میں لکھا ہے کہ اس نے ان تمام علاقوں پر اپنی حکومت کے نویں سال فتح حاصل کی۔ اسی طرح مغربی خطے میں اس کی حکومت سے متعلق کچھ غیر مستحکم ثبوت ملتے ہیں۔

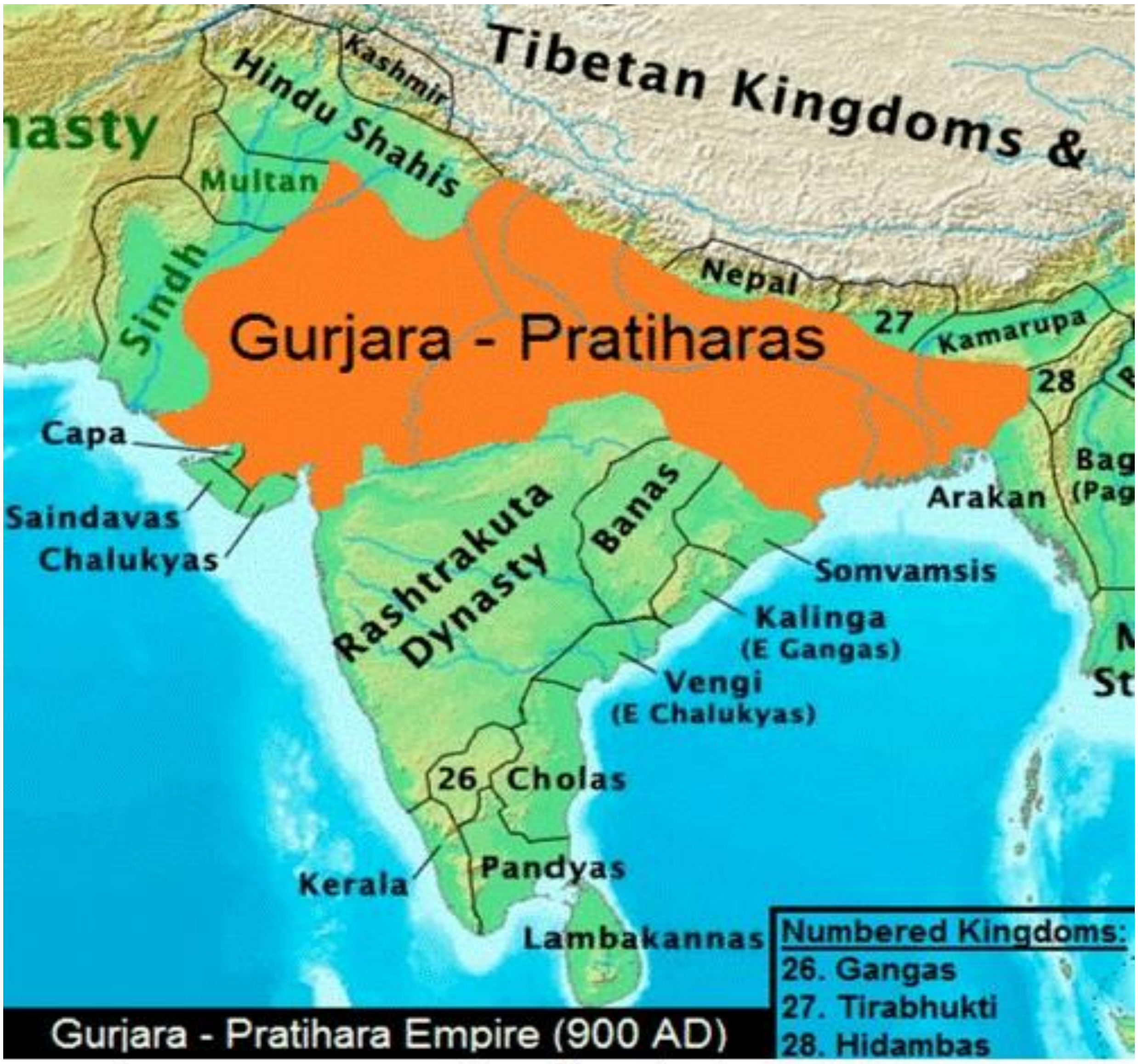

گرجر پرتی ہار سلطنت

Courtesy Thomas Lessman (CC BY-SA)

مہیندر پال کی ریاست شمال میں ہمالیہ کی ترائی تک اور شمال مغرب میں پنجاب کے ضلع کرنال تک پھیلی ہوئی تھی۔ جنوب میں بندیل کھنڈ اور مشرق میں مگدھ اور راج شاہی ضلع کا شمالی حصہ بھی اس کی حکمرانی میں شامل تھا۔ مغرب میں سوراشٹر اور جنوب مغرب میں دریائے نرمدا کے نچلے حصے تک اس کی عملداری تھی۔

4.5.7 بھوج دوم (Bhoja II)

بھوج دوم (908 تا 913ء) اپنے والد کے مہندر پال اول کے بعد ان کا جانشین بنا۔ غالباً اس کے لیے اسے اپنے دو سوتیلے بھائیوں سے اندرونی جھگڑوں کا سامنا بھی کرنا پڑا جس کے دوران پال بادشاہ نرائن پال نے اپنی ریاست کے مغربی حصے کو واپس چھین لیا۔ اس طرح پرتی ہار سلطنت موجودہ اترپردیش کی مشرقی حدود تک محصور ہو کر رہ گئی۔ اسی طرح کلچوری بادشاہ کوکال نے گرجر بادشاہ کا خزانہ لوٹ لیا۔ یووراج دیو کے بلہاری دستاویز میں لکھا ہے کہ بھوج دیو بہت عیش پسند تھا اور جس شخص کی وجہ سے لفظ بھوج کو شہرت ملی وہ یقیناً بھوج اول ہی تھا۔ جس بھوج کا یہاں ذکر کیا جا رہا ہے وہ یقیناً بھوج دوم ہی ہے جسے کوکالا نے شکست دی۔ اس طرح بھوج دوم کی ذلت آمیز حکومت کا 914 میں خاتمہ ہو گیا۔

4.5.8 مہی پال اول (914 تا 943 عیسوی)

اگرچہ وہ اپنے والد کا جانشین بنا لیکن سیاسی لحاظ سے یہ فیصلہ بہت اچھا نہیں تھا۔ راشٹر کوٹ حکمراں اندر سوم نے کنیا کبج کو اپنے قبضے میں لے لیا۔ واپس جاتے ہوئے کالپی میں اس نے دریائے یمنا کو پار کیا۔ اس مہم کے دوران اندر دوم کے جاگیر دار نرسمہا اور چوہان نے اس کی مدد کی۔ چونکہ اس نے گرجر راجا کے ہاتھوں سے فتح کی دیوی کو چھین لیا تھا اس لیے اس نے کرناٹک شبدانو شاسنا کے ذریعے اس کی توصیف کی۔ اس نے گنگا یا پریاگ کے سنگم تک مہی پال اول کا تعاقب کیا۔ 17-916 میں اندر سوم نے کچھ اور مہمات کیں۔ یہ بات واقعی حیرت کرنے کی ہے کہ مسلسل حملوں اور شکست کے بعد بھی مہی پال اول نے ہمت نہیں ہاری اور چندیل راجا ہرش کی مدد سے فوج تیار کی اور اپنا کھویا ہوا تخت واپس لے لیا۔ بال بھارت کے علاوہ چندیل دستاویز اس بات کا ثبوت ہیں کہ ڈرامہ نگار راج شیکھر نے فتح کی تصویر کو بڑے فخر کے ساتھ پیش کیا ہے۔ غالباً مہی پال اول نے کنتلا، مرلا اور کیرلا پر فتح حاصل کی۔ اپنی سلطنت کے لیے جانے کے لیے اس نے مشرقی گھاٹ کا رخ اختیار کیا اور کلنگ، میکال کو شکست دی اور اپنے علاقے کو پریاگ تک پھیلا دیا۔ اس کے بعد بندیل کھنڈ کی طرف مڑ گیا اور قنوج پہنچا۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کچھ نامعلوم وجوہات کے باعث جنوبی مہمات کے دوران راشٹر کوٹوں کی طرف سے کوئی مزاحمت نہیں پیش آئی۔ شمال مغرب کی طرف اس نے کلوتا اور رامتھا کو ہرایا اور اس طرح اس نے شمال مغرب کی کھوئی ہوئی سلطنت کو واپس لے لیا۔

شمال مغرب میں مہی پال کے حصے میں سندھ کا بھی ایک حصہ شامل تھا، کیونکہ مسعودی نے اسے سندھ کا بادشاہ کہا ہے اور پنجاب کا ایک بڑا حصہ اور کلو ضلع، اور بیاس ندی کا بالائی راستہ پرتی ہاروں کے علاقے میں شامل تھا۔ جنوب میں بندیل کھنڈ کی رکاوٹ تھی جس پر چندیل آہستہ آہستہ قابض ہو رہے تھے۔ ان کی خود مختاری کو تسلیم کر لیا گیا۔ جنوب مغرب میں مہی پال نے مالوا کو دوبارہ فتح کر لیا۔ کالہا کے تانبے کے

کتبے کے مطابق دھارا کی فتح میں گور کھپور کے بامن راجا اور کلچوریوں کے ایک جاگیر دار نے اس کا ساتھ دیا۔ مغرب میں سوراشٹر تابعداری پر قائم رہا۔ مہی پال اول کی حکومت کے آخری مرحلے میں اسے راشٹر کوٹ مہمات کا سامنا کرنا پڑا۔ کرشن سوم نے شمال پر حملہ کیا اور چتر کوٹ اور کالنجر کا قلعہ تشویش ناک حالت میں آگیا۔ چندیل بادشاہ یشوور من نے 954 میں کچھ دنوں کے لیے قلعے پر قبضہ کر لیا۔

قدرت کا قانون ہے کہ ہر ابتدا کی انتہا ہوتی ہے، مہی پال اول کی موت کے ساتھ ہی پرتی ہاروں کا شاندار دور ختم ہو گیا۔ ان کے کمزور جانشین حکومت کو موثر طریقے سے چلانے میں پوری طرح ناکام رہے۔ ماتحت حکمرانوں نے اپنی آزادی کو اولیت دی اور پرتی ہاروں سے اپنا تعلق منقطع کر دیا۔ دوسری طرف، پرتی ہار ریاست محمود غزنوی کے حملوں سے چور چور ہو گئی، جس کی بہادری نے ایک ہوا کے جھونکے کی طرح مغربی ہندوستان کی عظیم ریاست کو ختم کر دیا۔

4.5.9 مہیندر پال دوم (Mahendrapala II)

آخری پرتی ہار حکمراں مہندر پال دوم (944تا948ء) نے 944 میں تخت حاصل کیا۔ وہ اور اس کے جانشین اپنے دور حکومت میں کوئی قابل ذکر کارنامہ انجام نہیں دے سکے۔ ان حکمرانوں نے چھوٹے راجاؤں کی طرح حکومت کی اور ریاست کے زوال اور انتشار کو روک نہ سکے۔ حالانکہ 943-942 کے کوروکشیتر (گونا) کے ایک دستاویز سے پتہ چلتا ہے کہ انہوں نے پانی کے مسائل کو دور کرنے کے پختہ انتظامات کیے جو ثقافتی سرگرمیوں میں ان کی دلچسپی کو ظاہر کرتا ہے۔

4.6 پالوں اور راشٹر کوٹوں کے ساتھ مہمات (Wars with Palas and Rashtrakutas)

پرتی ہار سلطنت کی توسیع کے دوران ہمعصر طاقتوں مثلاً پال اور راشٹر کوٹوں کے ساتھ مسلسل جھگڑے ہوتے رہے جسے سہ طرفہ جد وجہد کہا جاتا ہے۔ اس تنازع کی بنیادی وجہ قنوج پر قبضہ تھا کیونکہ ہرش کے زمانے سے، قنوج کو شمالی ہند میں اقتدار اعلیٰ کی علامت سمجھا جاتا تھا اور بالائی گنگا کی وادی اور اس کے قیمتی وسائل پر بھی اسی کا قبضہ ہوتا تھا جس کے قبضے میں قنوج رہتا تھا جن میں کھیتی باڑی اور تجارت اور ذرائع معاشیات شامل تھے۔

قنوج کے ایودھ حکمرانوں کو کمزور سمجھا جاتا تھا۔ پال حکمراں اکثر ان کی سیاست میں دخل اندازی کرتے تھے اور اپنی مرضی کے کسی شخص کی تخت کے لیے حمایت کرتے اور اسے اپنے جاگیر دار کی طرح رکھتے تھے۔ پالوں کے دشمن پرتی ہاروں نے انہیں قنوج پر قبضہ کرنے سے روکنے کی کوشش کی اور تخت کے لیے اپنا امیدوار کھڑا کیا۔ نتیجتاً دونوں کے درمیان جنگ کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کا آغاز وتس راج نے کیا تھا۔

پرتی ہاروں اور راشٹر کوٹوں میں بہت یکسانیت ہے۔ دونوں بالائی گنگا وادی اور مالوا پر قبضہ رکھنے کی کوششوں میں ناکام رہے۔ آٹھویں صدی کی شروعات میں جب راشٹر کوٹ اور پرتی ہار ریاستیں قائم ہوئیں تب سے مالوا اور گجرات پر قبضے کے ساتھ دشمنی شروع ہوئی۔

راشٹر کوٹ حکمران دھر ودھارا ورش (780 تا 793) اور گووندا سوم (793 تا 814) نے انہیں شکست دی۔ المسعودی نے راشٹر کوٹ - پرتی ہار کی دشمنی کے بارے میں کہا ہے کہ یہ اس زمانے کا مزاج تھا۔

اگرچہ راشٹر کوٹ شمالی ہند پر کبھی قبضہ نہیں رکھ پائے۔ وہ آئے اور پرتی ہاروں کے لیے مشکلیں کھڑی کیں اور جو چاہا وہ حاصل کیا اور واپس چلے گئے۔ مؤرخ کے ایم منشی نے راشٹر کوٹوں کے آنے کو "جنوب سے آنے والے بھنور" سے تعبیر کیا جو پرتی ہار کو برباد کر کے چلا جاتا ہے۔ اس نے یہ مشاہدہ کیا کہ ناقابل برداشت طاقت کے ساتھ پرتی ہار شاہی تابے بانے کو بحال کرتے تھے لیکن اسی تیزی سے راشٹر کوٹ جنوب میں اپنا ماتحت بنا کر شمال کی جانب بربادی مچانے آجاتے۔

وتس راج پر دھروکی فتح سے پالوں مدد ملی اور وہ کنیا کبج کو اپنے ماتحت کر سکے۔ البتہ، راشٹر کوٹوں کے واپس چلے جانے کے بعد ناگ بھٹ دوم اور بعد میں مہر بھوج نے اپنی سلطنت کو دوبارہ قنوج اور پرتی ہاروں کے پرانے علاقوں میں از سرنو قائم کیا۔ راشٹر کوٹوں نے دسویں صدی کے دوران پرتی ہار حکمرانوں کے ساتھ لڑائی کی اور ان کو کئی بار شکست دی۔

جغرافیائی وسائل نے بھی انہیں دور دراز علاقے کے دشمنوں پر حملہ آور ہونے کا موقع دیا۔ گنگا ندی سے منسلک علاقوں پر قبضہ، بنگال سے وسطی ہندوستان تک پورے ملک کو ملانے والی شاہراہیں، زراعت اور تجارت کے ذریعے کسی بھی سلطنت کی خوشحالی کے لیے بہت اہم تھیں۔ اسی طرح جنوب مغربی ہندوستان کی تجارت پر کنٹرول اور سمندری تجارت نے پرتی ہاروں کو گجرات پر حکومت کرنے میں مدد کی۔ جغرافیائی اعتبار سے شمالی ہند سے بہت دور جنوبی مقامات پر رہنے کی وجہ سے راشٹر کوٹ کبھی بھی شمال میں بہت لمبے عرصے تک نہیں ٹھہر پائے۔ ان کی زیادہ تر مہمات اچانک حملے کی شکل میں ہوتی تھیں اور یہ سب حملے مال غنیمت، شاہی شان و شوکت اور ہندوستان کی طاقتور ریاستوں پر اپنا رعب وداب قائم کرنے کے لیے انجام دیے گئے۔

4.7 زوال (Decline)

بھوج کے بعد پرتی ہاروں کی فوجی طاقت میں زوال آ گیا اور ان کے جانشین یکے بعد دیگرے شکست کا منہ دیکھنے لگے۔ راشٹر کوٹوں نے دسویں صدی کے اوائل میں شدید ہنگامہ مچایا جب اندر سوم (915 تا 928) نے مہی پال کو شکست دی اور کنیا کبج کو مکمل طور سے تباہ کر دیا اور اس کے بعد جب کرشن سوم (967-939) نے دوبارہ 963 میں حملہ کیا تھا۔

منشی نے لکھا ہے کہ پرتی ہاروں کی راجپوت جاگیردار ایک علاحدہ خطرہ تھے۔ مہر بھوج کی اولادوں کے پاس گجر دیش کا تھوڑا سا حصہ باقی تھا۔ ہر جاگیر دار اپنی خود مختاری کی بنیاد پر سب سے بڑی طاقت بننے کا خواہاں تھا۔ اس وقت ہندوستان کے تانے بانے میں تقریباً ہر بادشاہ محکوم ہو کر فاتح کا ماتحت ہو جاتا، لیکن مستقل طور پر بلا روک ٹوک آزادی حاصل کرنے کے لیے کوشاں رہتا اور تھوڑا سا موقع ملنے پر حاصل کر لیتا تھا۔ پرتی ہار بھی ان سے الگ نہیں تھے۔ مرکزی طاقتوں کے کمزور ہونے، اور دار الحکومت پر حملوں نے جاگیروں کی بنیاد ڈالی، اور صوبائی

گورنر اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے لگے جس کے نتیجے میں، سلطنتیں منتشر ہو کر کنیا کبج کے اطراف کی مملکت میں تبدیل ہو گئی۔

پرتی ہار سلطنت گیارہویں صدی کے اوائل تک اپنے وجود کو کسی طرح گھسیٹتی رہی جب تک غزنوی ترکوں نے اسے فتح نہیں کیا۔ تاہم ان کا قبضہ عارضی تھا اور اس علاقے کو ہندوستانیوں نے اپنے قبضے میں لے لیا جس میں سب سے اہم نام گہڑوال ریاست (1080تا1194عیسوی) کا ہے۔

4.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

ڈنڈ کاوسیہ (جدید ددوان، راجستھان) کے باشندے پرتی ہار گجراتر میں پہلی بار اقتدار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔ پرتی ہاروں (8تا11ویں صدی) نے مغربی اور شمالی ہندوستان پر اپنا اثر ورسوخ قائم کیا۔ ناگ بھٹ اول (730تا760) کا زمانہ اس سلطنت کا عہد زریں کہا جا سکتا ہے جس نے عرب حملہ آوروں کو کامیابی کے ساتھ روک کر رکھا۔ بھوج یا مہر بھوج (836تا885) کو اس سلطنت کا سب سے مشہور بادشاہ مانا جاتا ہے۔ پرتی ہار کو خصوصی طور پر ان کے فنون، مجسمہ سازی اور مندروں کی تعمیر کے لیے جانا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنی ہمعصر دشمن طاقتوں میں شمالی ہندوستان میں پال (8تا12ویں صدی) اور جنوبی ہند میں راشٹر کوٹوں (8تا10ویں صدی) سے مسلسل جنگ کی۔

4.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

انحطاط	نقصان، زوال	توسیع	بڑھانا، وسعت پیدا کرنا
اقتدار	اختیار، حکومت، مرتبہ	فقدان	کمی، کسی چیز کا نہ ہونا
خود مختاری	قادر، آزاد، بااختیار	باشندے	رہنے والے، ساکن
رسوخ	مضبوط، مستحکم، ثبات	دستاویز	وہ تحریر جس کی تاریخی اہمیت ہو
مجسمہ سازی	بت بنانے کا فن	تاجر	تجارت کرنے والا
تصدیق	صداقت، سچاپیہ	نمایاں	کھلا ہوا، برملا
تسلط	قبضہ، اقتدار	جانشین	نائب، وارث
ممتاز	منفرد، الگ	معاوضہ	بدلا، تاوان، ہرجہ
وقار	عزت، جاہ وجلال، قدر ومنزلت	غارت	برباد، پسپا، تاراج، تباہ
مہمات	جنگ، لڑائی	منتخب	انتخاب کرنا، چننا
ازدواجی	شادی شدہ	معاہدہ	تحریری عہد نامہ، قانونی دستاویز
استحصال	ناجائز فائدہ اٹھانا	مقبوضہ	قبضہ کیا گیا

محصور	قید، حصار میں رکھنا	مزاحمت	روک ٹوک، ممانعت، تعرض
ماتحت	تابع، محکوم، معاون، نائب	یکے بعد دیگرے	ایک کے بعد ایک
دارالحکومت	پایہ صدر، حکومت کا راجدھانی	منتشر	بکھر جانا، موتیوں کی طرح ٹوٹنا
شجرہ	نقشہ یا تحریر جس میں کسی خاندان کے سب سے بزرگ اور اس کی اولاد کا ترتیب وار نام لکھا ہو		

4.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

4.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. پرتی ہار کہاں کے باشندے تھے؟
2. پرتی ہار ریاست کو دوسرے کس نام سے جانا جاتا ہے؟
3. کس پرتی حکمراں نے عرب افواج کو شمال مغربی ہند میں داخل ہونے سے روکا تھا؟
4. دو عظیم پرتی ہار حکمرانوں کے نام بتایئے۔
5. کس پرتی ہار حکمراں کے دستاویز میں شجرہ نسب کے ساتھ حکمراں کی مختصر سوانح پائی گئی ہے؟
6. کس چوہان شہزادی نے قنوج کے حکمراں کو اپنا شوہر چنا تھا؟
7. مہر بھوج اول کا جانشین کون تھا؟
8. کنیا کبج کا جدید نام بتایئے۔
9. کس دستاویز سے پرتی ہار حکمرانوں کی آبی وسائل سے متعلق دلچسپی کا پتہ چلتا ہے؟
10. پرتی ہار ریاست کے بڑے حصے پر قبضہ کرنے والی ریاست کا نام بتایئے۔

4.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. پرتی ہار ریاست سے متعلق ذرائع معلومات پر ایک مضمون لکھیے۔
2. ناگ بھٹ اول کے بارے میں ایک مضمون لکھیے۔
3. ناگ بھٹ دوم کے بارے میں ایک مضمون لکھیے۔
4. مہیندر اول کے بارے میں ایک مضمون لکھیے۔
5. پرتی ہار ریاست کے زوال پر ایک نوٹ لکھیے۔

4.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. پرتی ہار ریاست کی پالوں اور راشٹر کوٹوں سے مہمات سے متعلق ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

2. مہر بھوج اول کے کارناموں پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
3. پرتی ہار ریاست کے استحکام میں ابتدائی پرتی ہار حکمرانوں کے کردار پر روشنی ڈالیے۔

4.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Avari, Burjor., *India: The Ancient Past. A History of the Indian-Subcontinent from 7000 BC to AD 1200*. New York, Routledge, 2007.
2. Ganguly, D. C., "*Origin of the Pratihara Dynasty*", *The Indian Historical Quarterly*, Caxton, 1935. XI: 167–168
3. Majumdar, R. C., "*The Gurjara-Pratiharas*" in R. S. Sharma and K. K. Dasgupta (eds.), *A Comprehensive history of India*: A.D. 985–1206, vol. 3 (Part 1), Indian History Congress / People's Publishing House, 1981.
4. Majumdar, R.C., *The Age of Imperial Kanauj* (First ed.) Bombay, Bharatiya Vidya Bhavan, 1955.
5. Mishra, V. B., "*Who Were the Gurjara-Pratīhāras*?" *Annals of the Bhandarkar Oriental Research Institute*, 1954. pp. 42–53.
6. Puri, Baij Nath.,[first published 1957], *The History of the Gurjara-Pratiharas*, Delhi: Munshiram Manoharlal, 1986.
7. Sharma, Dasharatha., *Rajasthan through the Ages.* Bikaner: Rajasthan State Archives, 1966.
8. Sharma, Shanta Rani., *Origin and Rise of the Imperial Pratihāras of Rajasthan: Transitions, Trajectories and Historical Change* (First ed.). Jaipur,University of Rajasthan, 2017. pp. 77–78.
9. Tripathi, Rama Shankar., *History of Kanauj: To the Moslem Conquest*. Motilal Banarsidass, 1959.

اکائی 5۔ راشٹر کوٹ خاندان

(The Rashtrakutas)

اکائی کے اجزا

5.0 تمہید

5.1 مقاصد

5.2 پس منظر

5.3 اصل

5.4 سیاسی تاریخ

5.4.1 بانی

5.4.2 کرشنا اول

5.4.3 گووندا دوم

5.4.3 دھروا دھارا ورشا

5.4.5 گووندا دوم

5.4.6 اموگھ ورش

5.4.7 کرشنا دوم

5.4.8 اندرا سوم

5.4.9 اموگورشا دوم

5.4.10 گووندا چہارم

5.4.11 کرشنا سوم

5.4.12 کھوٹیگا

5.4.13 کرکا دوم

5.5 اکتسابی نتائج

5.6 کلیدی الفاظ
5.7 نمونہ امتحانی سوالات
5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
5.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

5.0 تمہید (Introduction)

قدیم ہندوستان کی تاریخ میں متعدد خاندانوں کے گزشتہ احوال موجود ہیں ۔ چھوٹے بڑے خاندانوں نے جدید ہندوستان کے کئی حصوں پر حکومت کی۔ جنوبی ہند میں ستواہنوں، پلووں، چیراؤں، چولوں، پانڈیوں، چالکیوں اور راشٹر کوٹوں نے مختلف حصوں میں الگ الگ حکمرانی کی۔ بیشتر طاقتیں ایک دوسرے کی ہمعصر رہیں اور وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ ایک دوسرے پر برتری حاصل کرلینا ایک عام بات تھی۔اس لحاظ سے راشٹر کوٹ، چالکیوں کے ماتحت تھے۔ مگر بعد میں چالکیوں کو ہرا کر خود بادشاہ بن گئے۔بعدازاں دو صدیوں کی مدت میں بادامی کے چالکیوں نے نئی قوت حاصل کرلی اور راشٹر کوٹوں کی حکومت کا خاتمہ کردیا۔اس طرح راشٹر کوٹوں کا مطالعہ ایک طرح سے چالکیوں کی طاقت کے عروج وزوال کی داستان ہے۔ان کا غلبہ آٹھویں سے دسویں صدی عیسوی کے درمیان رہا۔

5.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعدآپ

- راشٹر کوٹ خاندان کے پس منظر کو سمجھ سکیں گے۔
- اس خاندان کی اصل کے بارے میں جانیں گے۔
- راشٹر کوٹ حکمرانوں کے حالات سے واقف ہوسکیں گے۔
- اس حکومت کے زوال پر روشنی ڈال سکیں گے۔

5.2 پس منظر (Background)

راشٹر کوٹ دو الفاظ راشٹر اور کوٹ کا مرکب ہے۔راشٹر کا مطلب ہے ایک علاقہ اور کوٹ کے معنی ہیں رہنما یا سربراہ۔اس اصطلاح کے معنی ایک علاقائی تقسیم یعنی راشٹر کا سربراہ ہے۔ یہ اصطلاح اشوک کے دور سے ملتی ہے۔ قدیم ہندوستان میں اس نام سے متعدد خاندان

بطور حکمراں پھلے پھولے۔ان میں سے بیشتر مدھیہ پردیش، مہاراشٹر، کرناٹک اور تلنگانہ کے کچھ حصوں کے حکمراں تھے۔ وہ بیتول کے راشٹر کوٹ، من پور کے راشٹر کوٹ اور پٹھاری کے راشٹر کوٹ تھے۔تاہم ہمارے پاس ایسے پختہ ثبوت نہیں ہیں کہ ہم یہ ثابت کر سکیں کہ وہ ایک دوسرے سے متعلق تھے لیکن مانیاکھیت کے شاہی راشٹر کوٹ جن کا ہم تفصیل سے مطالعہ کریں گے اور گجرات پر حکومت کرنے والے لتا کے راشٹر کوٹ ایک دوسرے سے رشتے داری کے ذریعے جڑے ہوئے تھے۔

5.3 اصل (Origin)

راشٹر کوٹوں کے اصلی وطن کے بارے میں بہت سے نظریات ہیں، لیکن زیادہ قابل قبول نظریہ یہ ہے کہ وہ لاتور کے رہنے والے تھے جو مہاراشٹر کے موجودہ ضلع عثمان آباد کے نام سے جانا جاتا ہے۔قدیم ہندوستان میں یہ علاقہ کنڑ بولنے والوں کا تھالہٰذا کنّڑ راشٹر کوٹوں کی مادری زبان تھی۔ راشٹر کوٹ خاندان کے لوگ بادامی کے ابتدائی چالکیوں کے علاقائی افسران تھے۔ان کے خاندان کے بعض افراد جو برار ہجرت کر گئے تھے،640 عیسوی میں جاگیرداروں کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔

5.4 سیاسی تاریخ (Political History)

5.4.1 بانی (Founder)

دنتی درگ راشٹر کوٹ سلطنت کا بانی تھا۔اس کے عروج کے وقت یہ خاندان گزشتہ چار نسلوں سے مہاراشٹر میں آباد تھا۔ وہ اندرا دوم کا بیٹا تھا جو بادامی کے چالکیوں کے تحت ایک سردار کے طور پر خدمت انجام دیتا تھا۔اِندرا کے وقت تک چالکیوں کی طاقت کم ہونے لگی تھی اور وہ ایک اور جنوبی طاقت کانچی کے پلووں کے ساتھ مسلسل جنگ کر رہے تھے۔ مزید برآں چالکیوں کے اسی خاندان کی ایک شاخ نے مکمل آزاد ہو کر وینگی سے حکومت کرنا شروع کر دی تھی اور وہ بادامی کے چالکیوں کے مدمقابل بن گئے تھے۔اِندرا نے ' چالکیوں کی ایک شہزادی کو اغوا کر کے اس سے شادی کر لی تھی۔ ایسے حالات میں پرُعزم دنتی درگ کو چالکیوں کی کمزوری نے اپنے ہی مالک سے لڑنے کا حوصلہ بخشا۔اس نے اپنے مالک چالکیہ بادشاہ وکرمادتیہ دوم پر فتح حاصل کی۔ مجبوراً وکرمادتیہ نے اس کی شجاعت کی تعریف کی اور اسے بہت سے خطابات سے نوازا۔اپنے ہی مالک کی مخالفت میں دنتی درگ کی بڑھتی ہوئی بہادری نے چالکیوں کی مقبولیت میں کمی کر دی۔ پھر بھی دنتی درگ اپنے مالک کے سلسلے میں پوری طرح وفادار رہا لیکن جب مالک کی موت کے بعد کیرتی ورمن دوم چالکیہ تخت پر بیٹھا تو تھوڑی ہی مدّت میں اسے اپنے ایلورا کے جاگیردار دنتی درگ کے ہاتھوں شکست ملی۔اس فتح سے دنتی درگ سارے مہاراشٹر کا مالک بن گیا۔تاہم کیرتی ورمن کو بخش دیا گیا۔

دنتی درگ نے کوشل، میرپور کے اُدائن اور رائے پور کے پرتھوی ویاگھرا جیسے اپنے مشرقی ہمسایوں پر حملے کر کے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔اس نے پلو خاندان کے نندی ورمن کے ساتھ معاہدہ کر کے ان مشرقی حکمرانوں پر بھی برتری حاصل کر لی۔ بعدازاں اس نے بھڑوچ کے گرجروں اور گجرات کے چالکیوں کے خلاف کارروائیوں میں دلچسپی لی۔اس نے ان پر حملے کیے اور کامیابی حاصل کی۔ان کامیابیوں سے

اس کے وسائل میں خاصا اضافہ ہوااور اس نے وسطی اور شمالی مدھیہ پردیش کے بیشتر اضلاع حاصل کر لیے۔اس نے سری سیلم (موجودہ کرنول) پر حکومت کرنے والے تیلگو چولؤں کو محکوم بنایا۔اگلے قدم کے طور پر وہ 750عیسوی میں کانچی پورم کی جانب بڑھااور اپنی طاقت کا مظاہرہ کرکے اس نے پلو حکمراں کے ساتھ معاہدہ کیااور اس کی بیٹی کے ساتھ شادی کی۔آخر میں اس نے اپنے شکست خوردہ دشمن کیرتی ورمن کی جانب رُخ کیااور اس سے ماتحتی کااقرار کرانے کے بعد مہاراج ادھیراج، پر میشور، پدم بھٹار کا وغیرہ جیسے خطابات کے ساتھ اپنی بادشاہت کا اعلان کردیا۔اس طرح دنتی درگ راشٹر کوٹ خاندان کا حقیقی بانی تھالیکن وہ محض 30سال کی عمر میں 750عیسوی میں لاولد انتقال کر گیا۔

5.4.2 کرشنااوّل (Krishna I)

چوں کہ دنتی درگ کے کوئی اولاد نہیں تھی لہٰذااس کے مرنے کے بعد اس کا چچا کرشنااول تخت نشین ہوا۔اس وقت وہ 45سال کا ایک تجربہ کار شخص تھا۔کرشنانے جنوبی کونکن کا علاقہ فتح کرلیااور کیرتی ورمن کی جگہ سلہروں کو جاگیر دار بناکر چالکیہ طاقت کو مکمل طور پر ختم کردیا۔اس سے مہاراشٹر اور کرناٹک علاقوں میں اس کی پوزیشن مضبوط ہوگئی۔سلہراخاندان اپنے خاتمے تک راشٹر کوٹوں کا وفادار رہا۔امن وامان کی ایک مختصر مدت کے بعد بلند ہمت کرشنااپنی حکومت کو پھیلانے کے لیے متعدد جنگوں میں مصروف رہا۔اس نے گنگاوتی (پرانا میسور) کے گنگا حکمراں سری پرشاپر حملہ کیا۔گنگوں نے اپنی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے بڑی دلیری سے جنگ کی اور بہت قربانیاں دیں لیکن کرشنا کامیاب ہوااور 768عیسوی ان کی راجدھانی مانیہ پور (بنگلور میں موجودہ منّے) پر قبضہ کرلیا۔اس دور کی تانبے کی ایک پلیٹ پر کندہ عطیہ سے معلوم ہوتاہے کہ کرشنانے مانیہ پور کی دولت سے بہت سے خیراتی کام انجام دیے۔بعدازاں اس نے وینگی کے چالکیوں کی جانب توجہ مبذول کی۔نتیجتاًموجودہ تلنگانہ کاایک بڑاحصہ راشٹر کوٹوں کے اقتدار میں آگیا۔کرشنانے اپنے سب سے بڑے بیٹے گووندادوم کوراشٹر کوٹ تخت کے لیےاپناولی عہد منتخب کیا۔772تا775عیسوی کے درمیان اس کی موت واقع ہوگئی۔کرشنابلاشبہ ایک اہل حکمراں اور ایک ماہر جنرل تھا۔اپنی حکومت کے 18برسوں میں اس نے اپنی سلطنت کو کونکن، کرناٹک اور حیدرآباد کے ایک بڑے حصے کو فتح کرکے تین گنا بڑھالیا تھا۔کرشنانے دکن میں اپنے خاندان کے لیے غالب حیثیت حاصل کرلی تھی اور اسی وجہ سے اس کے جانشینوں کو شمال کی سیاست میں حصہ لینے کا موقع ملا۔علاوہ ازیں اسے عمارتیں تعمیر کرانے کاشوق تھا۔اُس کے حکم پر ایلورا میں کیلاش کو پوری ایک چٹان کاٹ کر تعمیر کیا گیا تھا۔لہٰذا اسے دنیا کا عجوبہ کہاجاتاہے۔ایک ماہر سیاستداں کے طور پر اس نے مفتوح خاندان کے کسی بھی رکن کو اپنی سلطنت میں کوئی اہم سیاسی پوزیشن حاصل کرنے کی اجازت نہیں دی۔

5.4.3 گووندادوم (Govinda II)

سب سے بڑے بیٹے کے طور پر گووندا 772عیسوی کے قریب اپنے باپ کرشنا کے بعد تخت نشین ہوا۔اسے اس کے والد نے اپنا جانشین منتخب کیا تھا لیکن گووندابہت آرام طلب تھااور انتظامیہ سے زیادہ اسے دنیوی عیش وآرام میں دلچسپی تھی جب کہ اس کا چھوٹا بھائی دھروا تخت پر قبضہ کرنے کے لیے کوشاں تھا۔گووندا شروع میں اپنے بھائی کے ارادوں کو نہیں سمجھ پایااور اس نے سارا انتظامیہ دھرواکو سونپ دیا۔دھروانے اپنے نام سے لوگوں کو زمینیں دیں اور کئی بار اپنے بھائی سے اختلاف کیا۔اس سے گووندا پر اپنے بھائی کے حقیقی ارادے منکشف

ہوئے۔ نتیجتاً دھرواکواس کے عہدہ سے برطرف کردیاگیااورایک اجنبی کواس کی جگہ نامزد کیاگیا۔دریں اثنا گووندانے پلووں ،گنگوں ،وینگی کے چالکیوں اور دیگر ہمسایہ طاقتوں کے ساتھ دوستی کی جس سے اس کے وزرا ناراض ہوگئے اور دھرواکی جانب راغب ہوئے۔دھروانے یہ اعلان کرتے ہوئے گووندا کے خلاف بغاوت کردی کہ اس سے راشٹر کوٹ خاندان کو زوال کا خطرہ ہے۔گووندانے کانچی،مالوا،گنگاوتی اور وینگی کی مدد سے اپنے بھائی کی بغاوت کو کچلنے کی پوری کوشش کی۔تاہم دھروانے اپنے بھائی کو شکست دی اور 780عیسوی میں تخت پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

5.4.4 ڈھروادھاراورشا (Dhruva Dharavarsha)

ڈھروا50سال کی عمر میں تاجدار بنالیکن اس کی بڑھتی ہوئی عمراس کے فوجی عزائم کو نہیں روک سکی۔جاگیرداروں کواپنے مقام پر رکھ کرکچھ سال اپنی حالت کو مستحکم کرنے کے بعد دھروانے اپنے ہمسایوں کی جانب رخ کیا۔گووندا کے حریفوں کو سزادینے کے خواہاں دھروا نے سوامارادوم کو جیل میں ڈال دیااور پلو حکمراں سے محصول کی شکل میں ہاتھی وصول کیے۔بعدازاں اس نے وندھیا پہاڑوں کو پار کیا اور 789عیسوی میں مالوا کے گرجرں کو ریگستان میں بھگادیا۔اس مقابلے سے دھرواکو حوصلہ ملااوراس نے گنگا۔یمناد وآب پر حملہ کیااور بنگال کے دھرم پال کو شکست دی۔شمالی ہند میں دھرواکی جنگی مہم وگ وجے (فتح عظیم) تھی لیکن اس سے اسے مال غنیمت،عزت وشہرت کے علاوہ کوئی بڑافائدہ حاصل نہیں ہوا۔وتس راج اور دھرم پال پراس کی فتح کی بدولت حالانکہ اس کے علاقوں میں توسیع ہوئی لیکن وہ اپنی بنیاد سے دور تھااور اتنا بوڑھا ہوگیا تھا کہ قنوج کی افواج کو مکمل طور پر کچل نہیں پایا۔چاہے حقیقی سبب کچھ بھی ہو،راشٹر کوٹ افواج نے بلاشبہ سلطنت کی شان میں اضافہ کیا تھالیکن بہت کم علاقے کو سلطنت میں شامل کرپائیں۔اب وہ جنوب کی جانب واپس لوٹنے کے لیے بے چین تھیں۔اس کے بعد وینگی کے وشنوور دھن چہارم کی باری تھی جسے دھرواکے ہاتھوں شکست کا سامنا کرناپڑا۔اس نے اپنے علاقے کا کچھ حصہ دھرواکے حوالے کیااور اپنی بیٹی سیلا مہادیوی کی دھرواکے ساتھ شادی کردی۔اس طرح جنوب کی جنگی مہم نے اس کی علاقائی سرحد میں اضافہ کیا۔ دھرواسارے ہندوستان میں ناقابل شکست رہا۔وہ راشٹر کوٹ خاندان کااہم ترین حکمراں تھا۔13سال کی اپنی مختصر حکمرانی میں اس نے نہ صرف راشٹر کوٹوں کی طاقت میں اضافہ کیابلکہ اسے ایک ہیبت ناک جنگی قوت میں تبدیل کردیا۔دھرواکے چار بیٹے تھے جن کے نام تھے کرک،استمبھ،گووندااوراندر۔ایسالگتاہے کہ کرکااپنے باپ سے پہلے ہی فوت ہوگیاتھا۔دھروانے گووندسوم کو تخت کے لیے منتخب کیاتھاکیوں کہ وہ اس کی صلاحیت ومہارت سے استمبھ کے مقابلہ میں زیادہ متاثر تھا۔استمبھ اپنے والد کے دورحکومت میں نومفتوحہ صوبہ گنگاوتی کاوائے سرائے تھا۔کرکااپنے باپ کے تاجدار بننے سے پہلے ہی خاندیش کا منتظم تھا۔گووندا کواس کے والد نے اپنے جانشیں کے طور پر منتخب کرلیا تھااوراندر کی اتنی اہمیت نہیں تھی۔گووند کاانتخاب ایک رسمی تاجپوشی کے ذریعے ہوااور دھروانے اپنا تخت چھوڑدیا793اور794عیسوی کے درمیان اس کی موت ہوگئی۔

5.4.5 گووندا سوم (Govinda III)

گووند کی تخت نشینی توپرامن طور پر ہوگئی تھی لیکن اس کا بڑابھائی استمبھ بے عزتی کے احساس سے جل اٹھا۔لہٰذااس نے جلد ہی تخت

تاج حاصل کرنے کے لیے بارہ راجاؤں کا ایک مضبوط اتحاد قائم کیا۔ اگرچہ ہمیں اس اتحاد کے اراکین کے بارے میں کچھ سراغ نہیں ملتا ہے لیکن پھر بھی ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ وہ ہمسایہ اور جاگیر دار ہوں گے جنہیں بوڑھے بادشاہ دھروانے دبایا ہوگا۔ گووندنے اس متوقع بغاوت کا بعض حلیف جاگیر داروں کی مدد سے سامنا کیا۔ چھوٹے بھائی اندرانے پرجوش طریقے سے اس کی حمایت کی۔ گووندانے استمبھ اور اس کے حلیفوں کو شکست دے کر اپنی پوزیشن کو محفوظ بنایا اور انتہائی مددگار بھائی اندرا کو 'لتا (گجرات) کا وائسرائے مقرر کردیا۔ مفتوح گنگا حکمرانوں کو قیدی بنا کر اور 798 عیسوی میں گنگاوتی کو راشٹر کوٹ سلطنت میں شامل کرلیا گیا۔ استمبھا کو دوبارہ گنگاوتی کا وائے سرائے مقرر کیا گیا وہ 802 عیسوی تک اپنے عہدہ پر فائز رہا۔ نولم بواڈی نے گووند کے اقتدار کو تسلیم کیا۔ گووند نے شمال کی جانب رخ کیا۔ مالوا کے گرجر رتیہار راجا ناگ بھٹ نے بعض دیگر راجاؤں کے ساتھ اتحاد کر کے خود کو شمال کا ایک طاقتور حکمراں بنایا۔ گووندا کو شک ہوا کہ ناگ بھٹ اپنے بڑھتے ہوئے اثر کی وجہ سے راشٹر کوٹ علاقے پر حملہ کر سکتا ہے۔ لہٰذا اس نے محسوس کیا کہ اس سے قبل کہ ناگ بھٹ بہت زیادہ طاقتور ہو جائے، اسے کچل دینا چاہیے۔ گووندا اپنی افواج کے ساتھ شمالی ہند میں داخل ہوا اور ناگ بھٹ نیز اس کے حلیفوں کو شکست دی اور مالوا کا لتا کے ساتھ کچھ وقت کے لیے الحاق کردیا۔ گووندا جیسے ہی شمال میں آگے بڑھا ویسے ہی قنوج کے حکمراں چکر ایودھ نے رضاکارانہ طور پر اس کی برتری تسلیم کرلی۔ واپسی کے دوران اس نے نرمدا کے قریب سری بھاؤنا میں قیام کیا کچھ عرصہ وہاں رہنے کے بعد وہ پلووں کی راجدھانی کانچی پر حملہ آور ہوا۔ 803 عیسوی سے کچھ پہلے وہ کانچی کے پلوّ حکمراں دانتی ورمن کو ہرانے میں کامیاب رہا لیکن یہ شکست فیصلہ کن نہیں تھی کیوں کہ اسے اپنے اقتدار کے آخری دور میں ان پر دوبارہ حملہ کرنا پڑا۔

گووندا کی فوج کہیں سری لنکا پر حملہ نہ کردے، یہ سوچ کر سری لنکا کے بادشاہ نے ایک سفیر بھیج کر گووندا کی اطاعت قبول کرلی۔ وینگی کے حکمراں وجے آدتیہ نے گووندا کی طاقت و عظمت کو محسوس کیا۔ دریں اثنا گووندانے وجے آدتیہ کے سوتیلے بھائی بھیم کی حمایت کرتے ہوئے اسے وینگی کے تخت پر بٹھادیا۔ بھیم ہمیشہ گووندا کا ایک وفادار اور سعادت مند جاگیر دار رہا۔ بلاشبہ گووندا راشٹر کوٹ خاندان کا ایک اہل ترین حکمراں تھا۔ اس شاہی خاندان کی شان و عظمت بڑھانے اور علاقائی توسیع کا سہرا اس کے سر تھا۔ اس نے شمال میں ناگ بھٹ اور دھرم پال کو شکست دی۔ اس کے دور میں راشٹر کوٹوں کی طاقت سارے ہندوستان میں ناقابل شکست تھی۔ اس کی کامیابی کا سبب اس کی شجاعت، حکمت اور تنظیم کی صلاحیت تھی۔ اس نے اپنے بھائی اندرا کو گجرات کا وائسرائے بنا کر سلطنت کی شمالی سرحدوں کو محفوظ کردیا جس کی بدولت اس کا کم عمر ولی عہد (اموگھ ورش) اس کے بعد پرامن طور پر تخت نشین ہو سکا۔

5.4.6 اموگھ ورش (Amoghavarsha)

گووندا کے بعد اس کا بیٹا اموگھاورشا (814-880ء) جس کا اصلی نام 'سروا' تھا تخت نشین ہوا لیکن وہ سروا کی بجائے اپنے خطاب اموگھ ورش کے نام سے زیادہ مشہور ہوا۔ تاجپوشی کے وقت اس کی عمر صرف 14 سال تھی۔ کرکا کو خاص طور پر گجرات سے اپنے چچیرے بھائی کی نیابت سنبھالنے اور انتظامیہ چلانے کے لیے بلایا گیا۔ 817 عیسوی میں نوعمر بادشاہ کے خلاف زبردست بغاوت ہوئی جس میں اموگھ ورش ملک چھوڑ کر بھاگ گیا تھا لیکن کرکا نے بغاوت کو کچل دیا اور اموگھ ورش کو واپس بلا کر 821 عیسوی میں اسے بحال کیا۔ مشرقی چالوکیہ

راجاوجے آدتیہ دوم اور گنگ حکمراں راجاملا دونوں نے بغاوت کی حمایت کی تھی اس لیے اموگھ ورش انہیں سزا دینا چاہتا تھا۔ اگرچہ وہ مشرقی چالکیوں کو ہرانے کے بعد وینگی پر قابض ہو کر اپنی بالادستی قائم کر چکا تھا لیکن 846-845 عیسوی کے قریب اس نے اسے کھو دیا۔ اس وقت وجے آدتیہ سوم کے ایک جنرل پانڈورنگا نے راشٹر کوٹوں پر فتح حاصل کی اور 15 سال کے اندر ہی مشرقی چالکیوں نے وینگی کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ گنگ حکمراں سیوامرا' جسے گووندا نے رہا کرکے پچھلی حیثیت پر بحال کر دیا تھا وہ مشکل سے ایک سال تک ہی اموگھ ورش کا وفادار رہا اور 816 عیسوی میں اس نے نوعمر بادشاہ کے خلاف بغاوت کر دی لیکن سومارا جنگ میں شکست کھا کر مارا گیا۔ بعدازاں اس کا بھتیجا رچا ملّا حکمراں بنا جس نے راشٹر کوٹوں سے کچھ حصہ تو لے لیا لیکن اس کے لیے وہ تمام علاقے واپس لینا ناممکن تھا جس پر اموگھ ورش نے قبضہ کر لیا تھا۔ رچاملّا کے بیٹے ارایا نے بھی جس نے 870-837 عیسوی کے درمیان حکومت کی، سلطنت کے دیگر جاگیرداروں کے ساتھ مل کر اموگھ ورش کے خلاف بغاوت کی۔ راشٹر کوٹ سپہ سالار بنکیا نے اگرچہ انتہائی مؤثر طور پر بغاوت کو دبا دیا تھا لیکن اسے اپنی مہم کو چھوڑ کر راجدھانی واپس جانا پڑا کیوں کہ وہاں ایک اور ہنگامہ ہو گیا تھا۔ اموگھ ورش کے ایک وفادار جاگیردار گنگا وجے آدتیہ کو بنکیسا کے کام کو جاری رکھنے کے لیے مقرر کیا گیا۔ اس نے نیتی مارگ کو دبایا اور اطاعت پر مجبور کیا۔ راجدھانی کے قریب ولی عہد کرشنا اور لتا کے حکمراں کرکلا کے بیٹے دھروا اول میں کشیدگی پیدا ہو گئی۔ اگرچہ دھروا اول جنگ میں سپہ سالار بنکیا کے ہاتھوں مارا گیا لیکن اس کے بیٹے اکال ورش اور پوتے دھروا دوم کے ساتھ یہ تنازع جاری رہا۔ جب 860 عیسوی میں گرجر پرتیہار حکمراں مہر بھوج نے دھروا دوم کو دھمکی دی تب دھروا نے اموگھ ورش سے مصالحت میں ہی بہتری سمجھی۔ اس معاہدے کے بعد اموگھ ورش اپنے تمام دشمنوں سے نمٹنے میں کامیاب رہا اور 867 عیسوی تک اموگھ ورش نے تخت پر اپنی گرفت مضبوط کر لی۔ اس طرح اموگھ ورش نے اگرچہ 66 سال کے طویل عرصے تک حکومت کی لیکن اپنے علاقے کے کچھ حصوں میں بھی اسے کبھی کبھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مزاج کے لحاظ سے اموگھ ورش ایک امن پسند انسان تھا اور مذہب وادب میں بھی اس کی دلچسپی تھی۔ اس نے کبھی بھی رسمی طور پر ہندومت کو ترک نہیں کیا لیکن جین دھرم کا ایک حصہ پرینترا، رتنا ما لیکا اس سے منسوب تھا۔ وہ جس طرح مذہبی اصولوں کو سنتا تھا ان پر عمل بھی کیا کرتا تھا۔ وقتاً فوقتاً وہ اپنے حکمرانی کے منصب سے سبکدوش ہو کر کچھ وقت جین بھکشوؤں کے ساتھ گزارا کرتا تھا۔ ایسے مواقع پر ولی عہد کرشنا' حکومتی امور انجام دیتا تھا۔ اموگھا ورشا نے اپنی راجدھانی مانیہ کھیت میں ایک شاندار محل تعمیر کرایا جو اپنے فن تعمیر کے لیے مشہور تھا جس میں زنان خانہ اور ایک تالاب تھا۔ اموگھ ورش کے بعد اس کا بیٹا کرشنا دوم 880 عیسوی میں بادشاہ بنا۔

5.4.7 کرشنا دوم (Krishna II)

اس لحاظ سے کرشنا خوش قسمت تھا کہ اپنے بیشتر پیشروؤں کی طرح اسے جانشینی کے لیے جنگ کا سامنا نہیں کرنا پڑا کیوں کہ وہ اپنے باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ تاہم اس وقت کے سیاسی حالات اس کے لیے سازگار نہیں تھے۔ کرشنا کو اپنے بیشتر ہمسایوں کے ساتھ جنگوں میں مصروف رہنا پڑا۔ جنوب میں اسے گنگاؤں اور نولمباؤں، مشرق میں وینگی کے چالکیوں اور شمال میں گجرات کے راشٹر کوٹوں اور گرجر پرتیہاروں کے ساتھ جنگیں لڑنا پڑیں۔ اس نے چیدی حکمراں کوکل کے ساتھ رشتہ ازدواج قائم کرکے اسے اپنا جنگی حلیف بنا دیا۔ وینگی کے چالکیوں کے

ساتھ اس کے سیاسی رشتے اچھے نہیں تھے۔ چالوکیہ راجا بھیم اول نے وینگی کے مفتوح علاقوں کو کرشنا دوم سے دوبارہ جیت لیا تھا لیکن جنگ کے دوران بھیم کا سب سے بڑا بیٹا لڑتے ہوئے مارا گیا تھا۔ اس کے باوجود کرشنا کی حکومت سب سے طاقتور تھی۔ اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد 888 عیسوی کے قریب کرشنا کی بھوج سے جنگ ہوئی۔ اس لڑائی میں چیدی حکمراں، اس کے اپنے جاگیردار اور ولی عہد جگا تنگا شامل تھے۔ ان جنگوں سے کسی کو بھی مکمل کامیابی حاصل نہیں ہوئی اور گرجر پر تیہار ایک مضبوط شمالی طاقت بنے رہے۔ انہوں نے راشٹر کوٹوں کو شمال میں آگے بڑھنے سے باز رکھا۔ کرشنا اتنا کمزور تھا کہ وہ اپنے اجداد کی طرح عملی اقدام نہیں کر سکا اور بھیم اتنا بوڑھا ہو چکا تھا کہ وہ اپنے شمالی ہمسائے کے خلاف حملے نہیں کر سکتا تھا۔

نویں دہائی کے اختتام تک راشٹر کوٹ کی گجرات شاخ ختم ہو چکی تھی اور گجرات کے حکمراں یا اس کے جانشیں کو راجدھانی سے نکال دیا گیا تھا۔ کرشنا اپنے دادا کی طرح ایک باصلاحیت حکمراں نہیں تھا۔ اس کی واحد فوجی حصولیابی یہ تھی کہ اس نے گجرات میں راشٹر کوٹوں کی شاخ کو تباہ کر دیا تھا لیکن یہ کوئی عظیم کارنامہ نہیں تھا۔ اس نے مہر بھوج اول اور بنگال کے میندر پال کے مقابلے میں خود کو بچائے رکھا۔ اس کا جھکاؤ بھی اپنے والد کی طرح جین دھرم کی جانب تھا اور آدی پران کے آخری پانچ ابواب لکھنے والے مشہور جین سنت گیا نیشور اس کے رہنما تھے۔ 914 عیسوی تک کرشنا فوت ہو گیا تھا۔

5.4.8 اندرا سوم (Indra III)

کرشنا دوم کے بعد اس کا پوتا اندرا سوم راشٹر کوٹ کے تخت پر بیٹھا۔ جب اس کی تاج پوشی ہوئی تو وہ تقریباً 35 سال کا تھا اور اس نے صرف 5 سال حکمرانی کی لیکن اس کا دور حکومت شاندار رہا۔ اس نے گوردھن پر حملہ آور پرمار حکمراں اپیندر کو شکست دی۔ نتیجتاً پرمار احکمراں جو گرجر۔ پرتیہاروں کے جاگیردار تھے، اب راشٹر کوٹوں کے باجگزار بن گئے۔ اس طرح اندرا کو گرجر پرتیہاروں سے نمٹنے کا موقع ملا۔ جب بھوج دوم اپنے باپ کے بعد تخت نشین ہوا تو دو برسوں کے اندر ہی اسے جانشینی کی جنگ کا سامنا کرنا پڑا۔ شاہی خاندان میں جھگڑوں سے جاگیردار بھی دو پارٹیوں میں تقسیم ہو گئے تھے اور اس موقع کا اندرا نے فائدہ اٹھایا۔ اس طرح اس نے شمال میں اپنی برتری قائم کر لی۔ اس نے پہلے اجیّن پر حملہ کیا، بعد ازاں یمنا ندی کو عبور کر کے قنوج پر قبضہ کر لیا۔ گرجر پرتیہار راجا مہی پال کو اندرا کے سپہ سالار چالکیا نرسمہا نے شکست دے کر محکوم بنا لیا۔ تاہم یہ فتح اندرا کی اچانک موت کے باعث کم وقت تک ہی برقرار رہی۔

5.4.9 اموگھ ورش دوم (Amoghavarsha II)

اموگھ ورش دوم 917 عیسوی میں اپنے باپ کا جانشیں بنا لیکن ایک سال کے اندر ہی فوت ہو گیا۔ بعد ازاں اس کا بھائی گووندا چہارم 918 عیسوی میں اس کا جانشیں بنا۔

5.4.10 گووندا چہارم (Govinda IV)

بعض تانبے کی پلیٹوں پر کندہ عبارتوں میں لکھا ہے کہ وہ عشق کے دیوتا جیسا خوبصورت نظر آتا تھا۔ وہ 20 سالہ کا نوجوان تھا اور اپنی

حکومت کا زیادہ تر وقت لہو ولعب میں گزارتا تھا۔ گووندا میں اپنے باپ کے مفتوحہ صوبوں کو سنبھالنے کی قابلیت نہیں تھی۔ اسی کے دور حکو
مت میں کسی وقت مہی پال نے قنوج کو دوبارہ فتح کر لیا اور راشٹر کوٹ فوج کو پیچھے ہٹنا پڑا۔

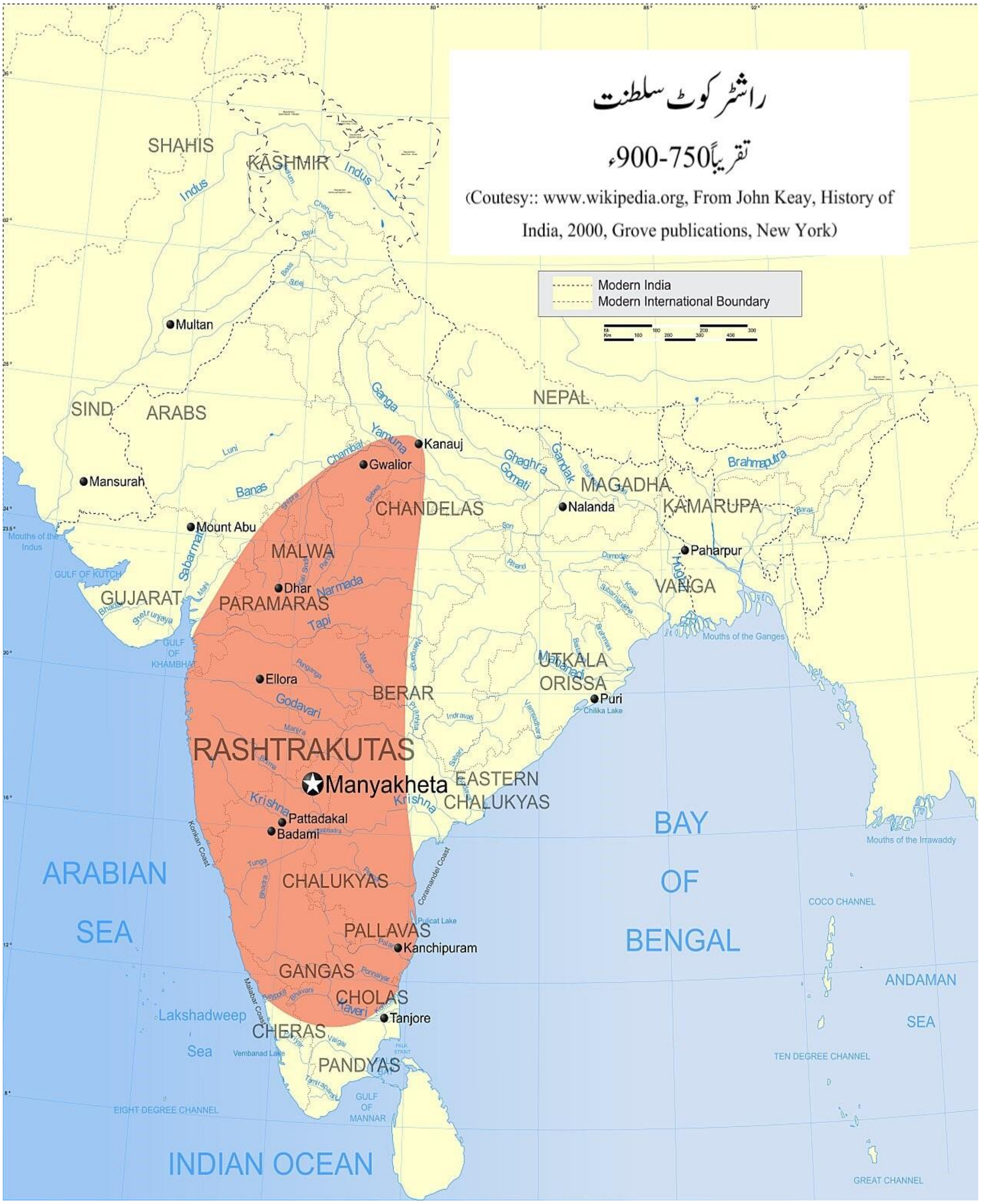

مشرقی چالکیہ راجا بھیم دوم نے جو 934 عیسوی میں تخت نشین ہوا تھا، گوونداکو شکست دی اور اپنے علاقوں کو واپس لے لیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گووندا نے اپنے جاگیر داروں اور خود اپنے ہی وزرا میں عدم اعتماد پیدا کر دیا تھا۔ بالآخر اس کے چچا اموگھ ورش سوم کو جو کافی عمر دراز تھا، تخت نشین کرایا گیا۔ کرشنا سوم کو ولی عہد بنایا گیا اور اسے انتظامیہ کی نگرانی سونپ دی گئی۔ اموگھ ورش نے اپنی بیٹی کی شادی گنگا کے ولی عہد بٹوکا دوم سے کر دی۔ کرشنا اپنے بہنوئی کو گنگا کے تخت پر بٹھانا چاہتا تھا۔ اس نے دانتیگا اور وانگا کو، جو شاید نولمبا شہزادے اور اس وقت گنگا کے حکمراں رچاملّا کے جاگیر دار تھے، مار ڈالا۔ بعد میں اس نے خود رچاملّا کو شکست دے کر قتل کر دیا اور بٹوکا کو گنگا کے تخت پر بٹھا دیا۔ اس کے بعد کرشنا نے شمال کی طرف پیش قدمی کی اور چیدی کے حکمراں کو شکست دی۔ راشٹر کوٹ فوج نے چنڈیل ملک کے قلب میں واقع قلعے وں کا لنجر اور چتر کوٹ پر قبضہ کر لیا تھا۔ یہ تقریباً دس سال تک راشٹر کوٹوں کے قبضہ میں رہا لیکن بعد میں چنڈیل راجا سورمن نے اسے دوبارہ فتح کر لیا تھا۔ جب اموگھ ورش فوت ہو گیا تو 40-939 عیسوی میں کرشنا سوم راشٹر کوٹ تخت پر بیٹھا۔

5.4.11 کرشنا سوم (Krishna III)

کرشنا پہلے ہی اپنے آپ کو ولی عہد ثابت کر چکا تھا لہٰذا اس کی جانشینی پر امن طور پر ہوئی۔ کرشنا نے جنوب کی جانب توجہ مبذول کی۔ اس کا بہنوئی بٹوکا، گنگاوتی کے تخت پر بیٹھا ہوا تھا اور بانا کا شہزادہ وکرم آدتیہ اس کا حلیف تھا۔ اسے صرف چول راجا پرانتک سے خطرہ تھا جو ایک پر عزم حکمراں تھا۔ پرانتک نے بنالڑی کو فتح کر لیا تھا۔ لہٰذا کرشنا نے اپنی حکومت کے تیسرے سال میں وکرم آدتیہ سوم کے تخت کو محفوظ بنانے کے نام پر چول حکومت پر حملہ کر دیا۔ اس کا خفیہ ایجنڈہ جنوب کے زیادہ سے زیادہ علاقوں کو فتح کرنا تھا۔ کرشنا نے سارے ٹونڈئی منڈلم کو اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس جنگ کے بعد یہ علاقہ اس کے دور اقتدار میں اس کے قبضے میں رہا۔ فیصلہ کن جنگ 949 عیسوی میں شمالی ارکاٹ ضلع کے ٹکوّلم (Takkolam) میں ہوئی۔ بٹوکا نے چول ولی عہد وکرم آدتیہ کو مار ڈالا اور چول راجدھانی پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح کرشنا نے چول سلطنت کے شمالی حصے کو اپنے علاقے میں ضم کرنے کی کوششیں کیں۔ کرشنا نے وینگی کے تخت پر اپنی حلیف طاقت کو لانے کی بھی کوشش کی۔ اسی دوران جب کرشنا جنوب میں مصروف تھا تو شمال میں مشکلات پیدا ہونے لگیں جہاں سورمن کے دور میں چنڈیلوں کا عروج ہوا اور انہوں نے کالنجر کے قلعہ کو دوبارہ فتح کر لیا۔ کرشنا نے اپنی سلطنت کی شمالی سرحدوں پر ایک بڑی جاگیر دارانہ طاقت کے طور پر پرماروں کو ابھرنے کی چھوٹ دے کر ایک بڑی سیاسی غلطی کی تھی، جس کی وجہ سے اس نے جتنا جنوب میں حاصل کیا تھا اس سے زیادہ شمال میں کھونا پڑا۔ وہ ایک لائق حکمراں اور باصلاحیت سالار تھا کیوں کہ اس کے بغیر یہ تمام حصولیابیاں ناممکن تھیں۔

5.4.12 کھوٹیگا (Khotega)

کرشنا کا ایک بیٹا تھا لیکن وہ اپنے باپ سے پہلے ہی وفات پا چکا تھا اور اس کا پوتا ابھی حکمرانی سنبھالنے کے لائق نہیں تھا۔ لہٰذا کرشنا کے چھوٹے بھائی کھوٹیگا کو 968 عیسوی میں تخت نشیں کرایا گیا۔ کھوٹیگا کے دور اقتدار سے راشٹر کوٹوں کے زوال کے شروعات ہوئی۔ شمال میں کبھی ناقابل تسخیر سمجھے جانے والے راشٹر کوٹوں کو شمالی ہند کے پرمار راجاؤں کے ہاتھوں پہلی ہار کا سامنا کرنا پڑا اور راشٹر کوٹ فوج کی طاقت کا بھرم ٹوٹ گیا۔ کھوٹیگا کے ہمعصر مالوہ کے حکمراں ہرش دیو نے حملہ کر کے راشٹر کوٹ راجدھانی کو لوٹ لیا اور خوب قتل وغارت مچائی۔ ایسا لگتا

ہے کہ شاید 972عیسوی کے آس پاس کھوٹیکا بھی جنگ میں مارا گیااور کرکا دوم تخت سلطنت پر بیٹھا۔

5.4.13 کرک دوم (Karka II)

کرک، کرشنااور کھوٹیگا کے چھوٹے بھائی نروپما کا بیٹا تھا۔اس نے بمشکل 18 ماہ حکمرانی کی۔973عیسوی کے وسط میں چالکیہ سلطنت کے تیلادوم نے کرکا کو شکست دی اور اس خاندان کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔راشٹر کوٹ ریاست کا اچانک خاتمہ کوئی طویل سیاسی عمل نہ تھا، جس طرح ایک فتح سے اس کی شروعات ہوئی اسی طرح ایک شکست سے اس کا زوال ہوا، مگر یہ بیحد تیزی کے ساتھ ہوا۔967عیسوی میں کرشناسوم ہر لحاظ سے طاقتور تھالیکن پھر بھی 973عیسوی میں راشٹر کوٹوں کا خاتمہ ہو گیا۔

5.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دور قدیم میں راشٹر کوٹوں نے جنوبی ہند کے ایک بڑے حصے پر حکومت کی۔ابتدامیں راشٹر کوٹ،چالکیوں کے جاگیر دار تھے لیکن بعد میں ان کو شکست دے کر خود حکمراں بن گئے۔دوصدیوں بعد بادامی کے چالکیوں نے نئی طاقت حاصل کی اور راشٹر کوٹوں کا خاتمہ کر دیا۔ راشٹر کوٹوں کا تعلق لاتور(مہاراشٹر کے موجودہ ضلع عثمان آباد) سے تھا۔ان کی مادری زبان کنڑ تھی۔بادامی کے چالکیوں کے ابتدائی دوراقتدار میں راشٹر کوٹ ضلع افسران تھے جو بعد میں برار ہجرت کر کے جاگیر دار بن گئے تھے۔دنتی درگ راشٹر کوٹ ریاست کا بانی تھا۔نوجوان اور پر عزم ہونے کے باعث دنتی درگ نے چالکیوں کی کمزوری کا فائدہ اٹھایا۔بادامی کے کیرتی ورمن دوم کو شکست دے کر وہ مہاراشٹر کا مالک بن گیا۔اس نے کوسل،سرپور کے اُدین،رائے پور کے پرتھوی ویا گرہ،بھڑوچ کے گرجروں،گجرات کے چالکیوں اور تلنگانہ کے کوداس پر کامیابی حاصل کی اور پلووں کے ساتھ اتحاد کرکے وہ راشٹر کوٹ کا سلطنت کا حقیقی بانی بن گیا تھا۔اس نے خود کو مہاراج ادھیراج کا کہلوایا۔756عیسوی میں اس کے مرنے کے بعد کرشنااول تخت نشین ہوا۔اس نے کونکن،کرناٹک اور تلنگانہ کے بڑے حصے کا اپنی سلطنت میں الحاق کرکے اپنا علاقہ تین گنا بڑھالیا تھا۔اس سے پورے دکن میں راشٹر کوٹ خاندان کا دبدبہ قائم ہو گیا۔772عیسوی کے قریب اس کا سب سے بڑا بیٹا گووندادوم تخت نشین ہوا۔گووندا کو انتظامیہ سے زیادہ دلچسپی عیش وعشرت میں تھی لیکن اس کے چھوٹے بھائی دھروا کی نظریں تخت پر لگی تھیں۔780عیسوی میں دھروانے گووند کو شکست دی اور خود حکمراں بن گیا۔وہ راشٹر کوٹوں کے اہل ترین حکمرانوں میں سے تھا۔اس نے جنوب میں راشٹر کوٹوں عظمت بخشی اور شمالی ہند میں مہم جوئی کرکے راشٹر کوٹوں کو کل ہند طاقت بنایا۔اس کے بعد اس کا تیسرا بیٹا گووندا سوم تخت نشین ہوا۔اس نے علاقہ میں توسیع کے ساتھ ساتھ سلطنت کے وقار میں بھی اضافہ کیا۔اس کے دور میں راشٹر کوٹ ہندوستان میں ناقابل شکست رہے۔اس کی کامیابی کے اسباب اس کی دلیری سیاسی حکمت اور تنظیم کی صلاحیت تھی۔گووندا سوم کے بعد اس کا بیٹاامو گھورش تخت پر بیٹھا۔تاجپوشی کے وقت اس کی عمر صرف 14 سال تھی۔اس کے عہد میں بہت سی بغاوتیں ہوئیں لیکن اپنے حامیوں کی مدد سے وہ اپنے تخت کو بچانے اور بحال رکھنے میں کامیاب رہا۔880عیسوی میں اس کے بعد اس کا بیٹا کرشنا حکمراں بنا۔وہ اپنے پیشرووں کی طرح ایک لائق حکمراں نہیں تھا۔اس کی موت کے بعد اس کا پوتا اندرا سوم تخت نشین ہوا لیکن اس نے صرف پانچ سال حکومت کی۔اپنی مختصر

مدت اقتدار میں بھی اس نے بہت سی فتوحات حاصل کیں بعد ازیں اس کا بیٹا امو گھ ورش تخت سلطنت پر بیٹھا لیکن ایک سال کے اندر ہی اس کی وفات ہو گئی۔918عیسوی میں اس کا بھائی گووندا چہارم تخت نشین ہوا مگر اسے زندگی کے عیش و آرام میں زیادہ دلچسپی تھی۔اس وجہ سے راشٹر کوٹوں کے کچھ علاقے پر چالکیوں نے قبضہ کر لیا۔ گووندا کے بعد اس کی سلطنت اس کے چچا امو گھ ورش سوم کے پاس چلی گئی جس نے کچھ فتوحات کیں لیکن وہ جلد ہی وفات پا گیا اور اس کے بعد کرشنا سوم تخت نشین ہوا۔اس نے چولوں کے ایک شمالی علاقے کو اپنی سلطنت میں شامل کر لیا لیکن اس کے ساتھ ہی اپنے شمالی علاقوں کو گنوا دیا۔968عیسوی میں اس کا چھوٹا بھائی کھوٹیگا تخت پر بیٹھا جس کے دور میں راشٹر کوٹ حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔

5.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

راشٹر	:	علاقہ
کوٹ	:	سر براہ یا رہنما
یوو راج	:	شہزادہ
دِگ وجے	:	فتح عظیم

5.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

5.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. راشٹر کوٹ لفظ کے معنی کیا ہیں؟
2. راشٹر کوٹوں کے اصلی وطن کا نام بتایئے۔
3. راشٹر کوٹ خاندان کا بانی کون تھا۔
4. دنتی درگ کس خاندان کا ماتحت جاگیر دار تھا؟
5. کس راشٹر کوٹ حکمراں نے ایلورا میں کیلاش مندر تعمیر کرایا۔
6. کس حکمراں کی کوششوں سے راشٹر کوٹ ایک عظیم طاقت میں تبدیل ہو گئے؟
7. گووندا سوم نے کسے لتا (گجرات) کا گورنر مقرر کیا؟
8. جین دھرم کا ایک حصہ پرینترا، رتنامالیکا کس سے منسوب تھا
9. مانیہ کھیت میں ایک نئی راجدھانی کس حکمراں نے بنوائی؟
10. پراتنک کس حکمراں خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔

5.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. راشٹر کوٹ خاندان کے پس منظر اور اصل کے بارے میں ایک مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
2. راشٹر کوٹ حکومت کی بنیاد پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیجیے
3. کرشنا اول کے بارے میں بتائیے۔
4. دھرواداھارا ورشا کی سیاسی کامیابیوں پر روشنی ڈالیے۔
5. کرشنا دوم کے اوپر ایک نوٹ لکھیے۔

5.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. گووندا سوم کے عہد حکومت پر ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔
2. اموگھ ورش کی خدمات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔
3. راشٹر کوٹ سلطنت کی توسیع پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

5.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Altekar, Anant Sadashiv (1934) [1934]. *The Rashtrakutas And Their Times; being a political, administrative, religious, social, economic and literary history of the Deccan during C. 750 A.D. to C. 1000 A.D*. Poona: Oriental Book Agency.
2. Chopra, P.N.; Ravindran, T.K.; Subrahmanian, N (2003) [2003]. *History of South India* (Ancient, Medieval and Modern) Part 1. New Delhi: Chand Publications.
3. Majumdar, R.C. (1966) [1966]. *The Struggle for Empire*. Bharatiya Vidya Bhavan.
4. Reu, Pandit Bisheshwar Nath (1997) [1933]. *History of the Rashtrakutas* (Rathodas). Jaipur: Publication Scheme.
5. Sastri, Nilakanta K.A. (2002) [1955]. *A history of South India from prehistoric times to the fall of Vijayanagar*. New Delhi, Oxford University Press.
6. Singh, Upinder (2008) [2008]. *A History of Ancient and Early Medieval India:From the Stone Age to the 12th Century*. India: Pearsons Education.

اکائی 6۔ چوہان خاندان

(The Chauhans)

اکائی کے اجزا

6.0 تمہید

6.1 مقاصد

6.2 چوہانوں کی ابتدا

6.2.1 اگنی کل نظریہ

6.2.2 قدیم چھتری نژاد

6.2.3 برہمن نژاد

6.2.4 غیر ملکی نژاد

6.2.5 مخلوط النسل

6.3 چوہانوں کا اصل مسکن

6.4 چوہانوں کے ابتدائی خاندان

6.5 رنتھمبور کے چوہان

6.6 ناڈول کے چوہان

6.7 جالور کے چوہان

6.8 چوہانوں کے تحت ثقافت اور تہذیب

6.8.1 بادشاہت کی نوعیت

6.8.2 فوج

6.8.3 آمدنی

6.8.4 سماجی زندگی

6.8.5 تعلیم
6.8.6 مصوری اور مجسمہ سازی
6.8.7 موسیقی
6.9 چوہانوں کا زوال
6.10 اکتسابی نتائج
6.11 کلیدی الفاظ
6.12 نمونہ امتحانی سوالات
6.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
6.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
6.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
6.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

6.0 تمہید (Introduction)

قدرت کے ایک اصول کے طور پر اس کائنات میں ہر چیز کا آغاز اور اختتام ہوتا ہے تاریخ کے طالب علموں کی حیثیت سے اب تک ہم نے بہت سی سلطنتوں کے بارے میں پڑھا ہے جو بچ گئیں یا امتدادِ زمانہ کا شکار ہو گئیں اور ہم ہمیشہ کسی خاندان کی ابتدا کو سمجھنے سے شروع کرتے ہیں۔ اسی طرح ہم چوہانوں کی اصلیت کے بارے میں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ چوہان کا لفظ سنسکرت کی اصطلاح چوہان کی مقامی شکل ہے۔ چوہان کے متعدد کتبات میں چوہان نامی ایک افسانوی ہیرو کو اپنا جد قرار دیا گیا ہے لیکن ان میں سے کوئی بھی اس دور کو بیان نہیں کرتا جس میں وہ رہتا تھا جبکہ 'وقت' یا 'زمانہ' تاریخ کا ایک اہم جزو ہے۔

ابتدائی عہد وسطیٰ کی سیاست میں چوہان خاندان کا ایک اہم مقام تھا، کیونکہ وہ قدیم ہندوستانی راجاؤں اور ترک حکمرانوں کے درمیان ایک کڑی کا کام کرتے تھے۔ اس اکائی میں ہم چوہان خاندان کی ابتدا اور اس کے عروج کا جائزہ لینے کی کوشش کریں گے۔ عظیم پرتی ہار ریاست سے ٹوٹ کر بنی اس ریاست کو اس کے داستانوی حکمراں پرتھوی راج سوم یا پرتھوی راج چوہان یا پھر ترکوں کے رائے پتھورا کے ذریعے شہرت حاصل ہوئی۔ یہ وہی پرتھوی راج ہے جس کی محبت اور بہادری کی داستان کو اس کے درباری شاعر چندر بردائی کے افسانے پرتھوی راج راسو میں بنیادی اہمیت دی گئی ہے۔

6.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- چوہانوں کے اصل نژاد سے واقف ہو سکیں گے۔
- چوہان خاندان کی ابتدا کے بارے میں جان سکیں گے۔
- رنتھمبور کے چوہان خاندان کے بارے میں دریافت کر سکیں گے۔
- ناڈول کے چوہان خاندان کے بارے میں دریافت کر سکیں گے۔
- جالور کے چوہان خاندان کے بارے میں دریافت کر سکیں گے۔
- چوہان عہد میں ثقافت اور تہذیب پر روشنی ڈال سکیں گے۔

6.2 چوہانوں کی ابتدا (Origin of the Chauhanas)

چوہانوں کی ابتدا کے بارے میں مختلف نظریات ہیں جن کا ذکر مختلف طریقوں سے کیا گیا ہے چوہانوں کی ابتدا کو بیان کرنے والا سب سے پہلا تشریحی کتبہ نادول کے چوہان حکمران رتن پال کا 1119ء کا سیوادی کتبہ ہے۔ اس کتبے کے مطابق چوہانوں کا جداعلیٰ اندر دیوتا کی آنکھ سے پیدا ہوا جو سائنسی حقائق کے متضاد ہے۔

اس وقت کے شعراء اور تاریخ نگار انہیں آگ میں پیدا ہونے والے یا اگنی کل سے سمجھتے تھے۔ یہ صرف ایک افسانہ ہے اور حقیقت میں ناممکن ہے۔ کچھ پرانے دستاویزوں اور کاویوں کی دلیل کی بنیاد پر اوجھا جیسے مورخین کا خیال ہے کہ وہ شمسی نسل کے راجپوت تھے۔ مورخین کا ایک اور گروہ انہیں غیر ملکی سمجھتا ہے جو ہندوستان میں ہجرت کر کے آباد ہوئے۔ آیئے ان نظریات کو تفصیل سے دیکھتے ہیں۔

6.2.1 اگنی کل نظریہ (Agnikula Theory)

اس نظریے کی تشہیر راجپوت حکمرانوں کے شعراء اور درباری مورخین نے کی جن کی رائے تھی کہ راجپوتوں کی تخلیق مہارشی وشیشٹھ نے کی تاکہ ان کے ذریعہ ان بدروحوں صفایا کیا جائے جنہوں نے زمین پر انار کی پھیلائی ہے، ان کے خیال میں اگنی کل سے وشیشٹھ نے چار جنگجو: پرتی ہار، چالوکیہ، پرمار اور چوہان تخلیق کیے چونکہ یہ چاروں اگنی (آگ) سے پیدا ہوئے تھے اس لیے انہیں اگنی ونشی یا آگ سے پیدا ہونے والا کہا جاتا تھا۔ چونکہ اس نظریے کو سائنسی علم کی بنیاد پر قبول نہیں کیا جاسکتا اس لیے یہ ایک غیر معتبر نظریہ ہے۔

6.2.2 قدیم چھتری نژاد (Ancient Kshatriya Origin)

گوری شنکر اوجھا کا خیال ہے کہ یہ راجپوت قدیم چھتری قبیلہ سے پیدا ہوئے تھے بعض مورخین کی رائے ہے کہ چھتری جاگیرداروں کے غیر قانونی بچے (جنہیں حکمرانوں سے خصوصی اراضی بطور امداد ملی اور وہ بڑی بڑی زمینوں کے مالک تھے) راجپتر کہلاتے تھے بعد میں

انہیں راجپوت کے نام سے جانا گیا اور چوہان ان ہی کی اولاد تھے۔

6.2.3 برہمن نژاد (Brahman Origin)

دشرتھ شرما اور وشمبر سرن پاٹھک کا خیال ہے کہ اس وقت کے راجپوتوں کی ابتدا برہمنوں سے ہوئی ہے۔ بجولیا کے فرمان میں چوہانوں کو وتس گوتر، برہمنوں اور واسودیو کے جاگیردار جانشینوں کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ پرتھوی راج راسو بھی وتس سے چوہانوں کی ابتدا کو بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ ان مورخین کے مطابق چوہان برہمن ذات سے تھے حالانکہ ذات پات کی ابتداء اس اکائی کا موضوع نہیں ہے۔

سومیشور کے 1170ء کے بجولیا چٹانی کتبہ کے مطابق ابتدائی چوہان بادشاہ سمنترج کی پیدائش آہی چھترپورہ میں سیج وتسا کے گوتر میں ہوئی تھی۔ مورخ آر۔بی سنگھ کا نظریہ ہے کہ چوہانوں کا آغاز غالبا اہیچھترپورہ (جو ناگور کے نام سے جانے گئے) کے چھوٹے موٹے حکمرانوں کے طور پر ہوئی تھی اور سلطنت کی وسعت کے بعد انہوں نے اپنا دارالحکومت شکمبھری (سمبھر) منتقل کیا۔ بعد میں وہ شاہی گرجارہ پرتی ہاروں کے محکوم بن گئے۔

6.2.4 غیر ملکی نژاد (Foreign Origin)

کرنل ٹوڈ، بھنڈارکر اور ایشور پرساد کا خیال ہے کہ وہ غیر ملکی تھے۔ اینلز آف راجستھان کے مصنف، ٹوڈ کا خیال ہے کہ راجپوتوں کی ابتدا غیر ملکیوں سے ہوئی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ وہ یا تو شک تھے یا سیتھین تھے۔ ولیم بروک بھی ٹوڈ سے متفق ہیں اور ان کا بھی خیال ہے کہ وہ غیر ملکی نژاد تھے۔

6.2.5 مخلوط النسل (Mixed Race)

وی اے اسمتھ کا خیال ہے کہ راجپوت کچھ قدیم چھتریوں اور کشانوں کی مخلوط نسل تھے۔ ان غیر ملکی نسلوں کا ہندوستانی ذات کے لوگوں کے ساتھ اختلاط تھا اور ان سے پیدا ہونے والی اور ہندوستان پر حکومت کرنے والی نسل کو راجپوت کہا جاتا تھا۔ یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ راجپوت مخلوط نژاد تھے اور چوہان ان کی اولاد تھے، اور یہ ہندوستانی تاریخ کا سب سے زیادہ قبول شدہ نظریہ ہے۔

6.3 چوہانوں کا اصل مسکن (Original Home of the Chauhanas)

مختلف تاریخی ذرائع ہیں جو ہمیں چوہانوں کے اصل مسکن (گھر) کے بارے میں تفصیلی معلومات فراہم کرتے ہیں۔ اپی گرافک ریکارڈز (کتبوں کے حوالے) اور تاریخی واقعات ہمیں یہ معلومات دیتے ہیں کہ وہ جانگل دیس (بیکانیر کے آس پاس کا علاقہ) میں ابھرے جسے بعد میں سپاد لکش کہا جانے لگا۔ سپادلکش کا مطلب سوالاکھ گاؤں والا علاقہ ہوتا ہے۔ ان کی راجدھانی اہیچھترپورہ بتائی جاتی ہے، جو مارواڑ میں ناگور علاقہ مانا جاتا ہے۔ روایات بتاتی ہیں کہ وہ شمال کی جانب بڑھے اور توماروں سے دہلی کو حاصل کرلیا جو ایک حقیقت ہے جس کی تصدیق کتباتی شواہد سے بھی ہوتی ہے۔ پرتھوی راج وجیہ نامی تحریر چوہان خاندان کے بانی واسودیو کے دارالحکومت کے بارے میں بتاتی ہے کہ وہ

راجستھان میں شاکمبھری (سانبھر کے قریب مشرق میں) میں واقع ہے۔ ہرش کتبہ سے پتہ چلتا ہے کہ اننت (جے پور، راجستھان میں سیکر کے قریب) چوہانوں کی قدیم راجدھانی تھا۔ یہیں تنترپال اور سمپال نے وگرہ راج دوم کے دادا واکپتی راج پر حملہ کرنے کی کوشش کی تھی اور یہیں چوہانوں کے خاندانی دیوتا ہرش کا مندر تھا۔ بجولیا کتبہ سمنت کو اننت سامنت لکھتا ہے جس کی روشنی میں صرف یہ مطلب لیا جاسکتا ہے کہ وہ اننت کا سامنت یا حکمراں تھا۔ بجولیا کتبے میں اس کی جڑیں اہیچھتر پورہ میں ہونے کا ذکر بھی کیا گیا ہے جو راجدھانی اننت گوچر (موجودہ ہرشا گیری کے قریب) سے میل نہیں کھاتا۔ مزید برآں پرتھوی راج وجے، ہمیر امہا کاویہ اور سرجنا چریت، راجستھان کے پشکر کو چوہان خاندان کی جائے پیدائش بتاتے ہیں۔

تصویر 6.1۔ شاکمبھری چوہان کے دور حکومت میں جاری کتبات کے مقامات، بشکریہ- وکی پیڈیا

ان حوالوں کی بنیاد پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کا ابتدائی مسکن جنوب میں پشکر اور شمال میں تقریباً ہرش تک پھیلے ہوئے علاقہ میں واقع تھا۔ پیلو، کریرا اور سامی درختوں کی بہتات کی بنا پر اسے جانگل دیس کہلانے کا پورا حق ہے۔ ایسے قطعہ زمین کی نباتی خصوصیات کو اس علاقے میں شامل کیا گیا تھا جسے اسکند پران کے مطابق شاکمبھر سَپَد لکش کے نام سے جانا جاتا تھا اور منہاج السراج نے اس کا ذکر شیو لیکھ کے طور پر کیا ہے۔ ہرش کتبہ اسے چوہانوں کی سرزمین بتاتا ہے اور بجولیا کتبہ کے مطابق بھی یہ صحیح ہے۔ فی الحال وہاں کوئی اہی چھترپورہ نہیں ملتا ہے لیکن اس علاقے میں اس کا وجود اس حقیقت سے لگایا جاسکتا ہے کہ تاریخی شواہد کی بنیاد پر چوہان حکمران واسودیو کا تعلق سامبھر جھیل کے علاقے سے ہے اور ایک اور بہت ہی ابتدائی حکمران نردیو کو راجستھان کے جودھ پور علاقے کے پورن تال یا پنٹالا میں راج کرنے کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اہی چھترپورہ، پنٹالا اور سامبھر کے درمیان کہیں رہا ہو، کم از کم یہ ان سے زیادہ دور نہیں ہو سکتا تھا۔

6.4 چوہانوں کے ابتدائی خاندان (Early Dynasties of Chauhanas)

بھر گو کچا یا بھروچ کے چوہان: چوہانوں کا سب سے پہلا کتبہ ہنسوت تانبے کے کتبے کے طور پر ملتا ہے جو بھروچ کے چوہانوں کا ہے۔ اس میں بھرترودھ دوم نامی چوہان سامنت (جاگیردار) کا ذکر ہے جو ناگ والوکا (پرتی ہار ناگ بھٹ دوم) کا ماتحت تھا۔ بھرترودھ دوم، بھروچ (گجرات) کے چوہان خاندان کا مکھیا تھا۔ چوہان حکمراں کو کتبے میں راجن کہا گیا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ محض ماتحت سردار تھا۔ خلیفہ ہشام کی ماتحتی میں سندھ کے گورنر جنید (724ء تا 743ء) کے دور حکومت میں عربوں کے حملے کے نتیجے میں پرتی ہار اقتدار کمزور ہو گیا جس کی وجہ سے بھرترودھ دوم نے خود کو آزاد حکمران قرار دے دیا۔ بھرترودھ دوم کے بعد بھروچ کے چوہانوں کے ساتھ کیا ہوا اس کے بارے میں اب تک دریافت ہونے والے کسی بھی ریکارڈ سے معلومات نہیں ملتیں۔

دھول پور کے چوہان: چوہانوں کا دوسرا ابتدائی کتبہ دھول پور کے چندر مہاسین سے متعلق ہے۔ یہ ایک رحم دل اور روادار حکمراں تھا اور سورج کا ممتاز پجاری تھا۔ اس نے دھول پور سے ملے ہوئے جنگلاتی علاقے میں ایک سورج مندر کی تعمیر کی۔ چند مہاسین، قنوج کے پرتی ہار حکمران بھوج اول کا جاگیردار تھا۔ شواہد کی نہ ملنے کی وجہ سے ہم چند مہاسین کے جانشینوں کے بارے میں کچھ نہیں جان سکے۔

پرتاپ گڑھ کے چوہان: گھونٹاورسیکا (جدید گھوترسی) کے ایک مندر سے ملنے والے دو کتبات میں ایک شخص کا ذکر ہے جو چوہان مہاسامنت اندرراج تھا جس نے ایک مندر تعمیر کیا تھا جہاں یہ کتبات نصب تھے۔ یہ مندر سورج دیوتا آدتیہ کے لیے تعمیر کیا گیا تھا۔ اس کے جانشینوں کے بارے میں بھی کوئی معلومات نہیں ملتیں۔

چندواڑہ کے چوہان: انورتن پر دیپ نامی دستیاب ایک جین تحریر میں جین مذہب کے ایک عظیم سرپرست کے طور پر اہوامل کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان کی راجدھانی چندواڑہ ہے جو گہڑوال علاقے میں واقع ہے۔ اہواملا کے پردادا جن کا نام بھرت پال تھا گہڑوالوں کا جاگیردار تھا۔ اہواملا کو ملیچھوں (غیر ملکیوں) کے خلاف جنگ میں ایک مل یا پہلوان اور ہمیرا کے دل میں خاردار کانٹا قرار دیا گیا ہے۔ اہوامل کی حکومت کے بعد اس خاندان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس بارے میں زیادہ معلومات نہیں ملتیں۔

6.5 شاکمبھری کے چوہان (Chauhans of Shakambhari)

شاکمبھری یا سانبھر کا چوہان خاندان جو روایتی طور پر سپاد لکش یا جانگل دیش کا چوہان خاندان کہلاتا تھا، سب سے اہم چوہان خاندان تھا۔اس خاندان میں کئی حکمراں گزرے۔

واسودیو: واسودیو اس سلسلہ کا سب سے پہلا معلوم حکمران ہے۔ پرتھوی راج وجے کی داستانوں کے مطابق واسودیو کو ودیادھارا، جس سے اس نے دوستی کی تھی، سے سامبھر کی نمکین جھیل کا تحفہ ملا تھا۔

سمنت: بجولی کتبہ میں اس کا ذکر اننت کے برہمن نواب کے طور پر کیا گیا ہے جو آہچھتر پورہ میں وتسا گوترا میں پیدا ہوا تھا۔

نردیو: نردیو نے پورنتالہ میں حکومت کی جس کی شناخت اس وقت جودھ پور میں گاؤں پنٹالا کے طور پر کی گئی ہے۔

دُرلب راج: اسے اس خاندان کا پہلا عظیم حکمران سمجھا جاتا ہے جس کا ذکر گنگا اور سمندروں کے سنگم پر اپنی تلوار کو غسل دینے اور گوڑ سرزمین کا مالک ہونے کے طور پر کیا جاتا ہے۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنی بادشاہت کو وسعت دی اور اپنی مملکت میں کئی نئے علاقے بھی شامل کیے۔

چندرراج: وہ گوواک دوم کا بیٹا تھا جو تاریخ میں تومر سردار 'رودر' کو قتل کرنے کے لیے جانا جاتا ہے، اس کی ملکہ رودرانی تھیں جسے آتم پربھا بھی کہا جاتا ہے۔اسے یہ نام اس کی یوگی طاقت کی وجہ سے ملا۔ کہا جاتا ہے کہ وہ پشکر میں لنگموں (شیولنگ) کے سامنے روزانہ 1000 چراغ روشن کرتی تھی۔

واکپتی راج: پرتھوی راج وجیا نے اس حکمران کے سر ایک سو اٹھاسی فتوحات کا سہرا باندھا ہے جو سراسر مبالغہ آرائی معلوم ہوتا ہے۔اس کا سب سے بڑا کارنامہ پر تیہار فوج پر فتح حاصل کرنا تھا جس نے اس وقت کے ہمعصر حکمرانوں میں اس کے وقار میں اضافہ کیا۔ ہرسا کتبہ کے مطابق یہ مہاراجا کے طور پر زندگی گزارتا تھا وہ اپنے جانشین سمہاراجا کا بڑا بھائی تھا اس نے دیوتا دشیوا کے لیے پشکر میں ایک مندر تعمیر کیا تھا جو پرتھوی راج سوم کے دور تک وہاں موجود تھا۔

سمہاراج: وہ اپنے بھائی واکپتی راج کی طرح جارحانہ پالیسیوں کے لیے جانا جاتا تھا۔ اس نے تومار سردار سلوانا کو قتل کیا اور اپنی حکومت کو وسعت دی۔

وگرہ راج دوم: اپنے والد سمہاراج کے بعد یہ ان کا جانشین بنا۔ وگرہ راج کو 'شاکمبھری' کے ابتدائی چوہانوں کا سب سے بڑا حکمران سمجھا جاتا ہے اس نے گرجارا حکمران ملاراجا کو کنتھا قلعے میں محصور ہونے پر مجبور کیا اور سے قیدی بنا کر بھر گو کچھا تک لے گیا جہاں اس نے دیوی آسا پوری کے لیے مندر تعمیر کیا تھا۔ وہ چوہان حکمرانوں میں سے پہلا تھا جس نے گرجارا حکمران کو شکست دی جس کی وجہ سے چوہان اقتدار اس وقت کے ہمعصر ہندوستان کی ایک مضبوط سیاسی طاقت کے طور پر ابھرا۔

درلبھ راج دوم: اس کا سب سے پہلا حوالہ ہرش کتبہ سے ملتا ہے جہاں اس کا ذکر اس کے بھائی وگرج دوم نے ہے۔اس کا سب سے سخت دشمن اناہل پٹن (انہلواڑہ) کا چالوکیہ حکمران تھا۔ سکاری کتبہ میں اسے مہاراج ادھیراج کے طور پیش کیا گیا ہے جو اس کے آزاد کردار کو ظاہر کرتا ہے۔

گووندراج سوم: پر تھوی راج وجیانے اسے یور یگر ٹا یا دشمنوں کو ختم کرنے والے (دشمنوں کا صفایا کرنے والا) کا خطاب دیا۔ پر بندھ کوسا میں مذکور شجرہ نسب میں ان کا ذکر سلطان محمود غزنوی کے شکست دینے والے کے طور پر کیا ہے۔

واکپتی راج دوم: یہ گووندراج سوم کا بیٹا تھا اور پھر اپنے باپ کی موت کے فوراً بعد ہی اس کا جانشین بنا، وہ چوہان کی تاریخ میں اگھٹہ کے حکمران امباپر ساد کے قاتل کے طور پر جانا جاتا ہے جو میواڑ کا دارالحکومت تھا۔

پرتھوی راج اول: یہ وگرہ راج سوم کا بیٹا تھا اور اس کی شادی رسل دیوی سے ہوئی تھی۔ شیخاوتی میں جن ماتا کے سبھا منڈپ کے ستون پر ایک کتبہ پرم بھٹارا ک مہاراجا دھیرج پر میشور کے نام سے اس کا ذکر کرتا ہے جو بطور حکمران اس کے آزاد کردار کو ظاہر کرتا ہے۔ رنتھمبور کے جین مندر پر سنہری کنول لٹکانے کا سہرا اسی کے سر جاتا ہے۔ اس نے کچھ برہمنوں کی جائیداد ہڑپنے کی سزا دینے کے لیے سات سو چالو کیوں کا قتل کیا۔ یہ عقیدے کے لحاظ سے شیو کا پرستار تھا اور سومناتھ مندر جانے والے لوگوں میں مفت کھانا تقسیم کرتا تھا۔

اجے راج: اجے راج پرتھوی راج اول کا فوری جانشین تھا۔ اسے اجے دیو کے طور بھی جانا جاتا ہے۔ اس نے اونتی کی سرحد پر مالوا کے 'نرورمن پرمار' کو شکست دی اور اس کے جرنیل سونل کو زندہ پکڑ لیا۔ اجے راج بعد کی راجدھانی اجمیر کا بانی تھا جو اصلاً اسی کے نام اجے میرو سے موسوم ہے جس کا مطلب اجے کا تالاب ہوتا ہے۔ اس کے سکوں میں نہ صرف حکمران کا نام ہے بلکہ اس کی ملکہ سومل دیوی کا نام بھی ہے۔ اگرچہ وہ شیو تھا لیکن اس نے جینوں کو اپنے نئے قائم کردہ شہر اجمیر میں جین مندر قائم کرنے کی اجازت دی اور پارشوناتھ کے مندر میں سنہری کلس بھی پیش کیا۔ اس طرح وہ دوسرے مذاہب کے ساتھ روادار تھا اور اپنے تمام شہریوں کو ایک جیسا سمجھنے کی پالیسی کی وجہ سے ایک صحیح حکمراں ثابت ہوا۔ حالانکہ شودروں اور نچلی ذات والوں سے اس کا سلوک بدترین تھا۔

ارنوراج: یہ اجے راج اور سومل دیوی کا بیٹا تھا اور اپنے کئی کارناموں کے لیے جانا جاتا ہے۔ اس نے اجمیر کے قریب ترکوں پر فتح حاصل کی جس کے ذریعے وہ اپنے علاقوں کا دفاع کر سکتا تھا اور انہیں برقرار رکھ سکتا تھا۔ مالوہ کے نرورمن کو شکست دی اور چوہانوں کو دریائے سندھ تک لے گیا اور اپنی حکمرانی میں مزید نئے علاقوں کا اضافہ کیا۔ 'ہریتناک' ملک میں اس کی مہم ایک اور بڑی کامیابی تھی۔

وگرہ راج چہارم: یہ تاریخ میں بیسل دیو کے نام سے جانا جاتا ہے۔ اس کے کتبات ایک مندر میں پائے گئے ہیں جسے دشرتھ شرما کے مطابق بعد میں مسلم حکمرانوں نے "آدھے دن کا جھونپڑا" مسجد میں تبدیل کر دیا تھا۔ اس کا ذکر 'سجنا' نامی اس وقت کے سب سے زیرک حکمران کو شکست دینے کے طور پر کیا گیا ہے۔ اس نے بھدنک، مارو اور تکہ ممالک (صحرائے تھار اور جنوب مشرقی پنجاب) کے باشندوں کو بھی شکست دی۔ اس نے توماروں سے دہلی اور ہانسی بھی ہتھیا لیا اور چوہانوں اور توماروں کے درمیان طویل جدوجہد بالآخر چوہانوں کے فاتح ہونے کے ساتھ ختم ہو گئی۔ ایک کامیاب فوجی جرنیل ہونے کے علاوہ وگرہ راج ادب کا بہت بڑا سرپرست تھا۔ وہ خود ایک اچھا شاعر اور بہترین عمارتی سرگرمیوں کی سرپرستی کرتا تھا جیسا کہ کچھ عمارتوں سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سوم دیو وگرہ راج چہارم نہ صرف بہادری بلکہ اپنے علم کے لحاظ سے بھی اس وقت کے حکمرانوں میں سب سے آگے تھا۔

پرتھوی راج دوم: پرتھوی راج دوم جگدیو کا بیٹا تھا جس نے شاکمبھری کے حکمرانوں کو جنگ میں شکست دی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپرگ ناگ کو شکست دے کر اجمیر کا تخت حاصل کیا۔ بجولیا کتبہ میں لکھا ہے کہ اس نے ہاتھی منھ سدھیکاری کو حکمران وست پال سے بچایا تھا

جسے حکمران وسنت پال کے نام سے جانا جاتا ہے جو اپر گ ناگ کے دادا ہیں۔ وہ اور اس کی ملکہ سدھاوا شیو کے عظیم بھکت تھے جس نے برہمنوں کو بڑی رقم عطیہ کی۔ اس کے عطیہ میں بجولیا میں پارشوناتھ کے جین مندر کی دیکھ بھال کے لیے مور جاری نامی ایک گاؤں بھی شامل تھا جو ہم مندرجہ بالا صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

سومیشور: سومیشور کی ابتدائی زندگی گجرات میں گزری جہاں اس کی دیکھ بھال اس کے دادا جیا سنگھا سدھاراجا نے کی لیکن یہ کمار پال چالوکیہ حکمران تھا جس نے اپنے خاندان سے دشمنی کے باوجود اس کی بہ حفاظت پرورش کی۔ یہ بات سومیشور نے ہمیشہ یاد رکھی اور اس نے چالوکیہ تخت کے تئیں اپنے فرائض خلوص نیت سے بخوبی نبھائے۔ سومیشور کی شادی گجرات میں تریپوری کے حکمران **اچالا** کی بیٹی کارپورادیوی کے ساتھ ہوئی۔ سومیشور نے پرتاپ لنکیشور کا خطاب اختیار کیا اور اپنے والد کے نام سے ایک قصبہ تعمیر کیا اور وہاں پانچ مندر بھی تعمیر کیے۔ وہ مذہب کے لحاظ سے شیو تھا اور جین مذہب کے لوگوں کے ساتھ روادار تھا اور ان مناسب احترام کرتا تھا۔ اس نے وندا والی یا بجولی میں پراسو نتھا کے جین مندر کو ریونا گاؤں عطیہ کیا۔ بادشاہ نے بیل اور گھوڑ سوار قسم کے کچھ سکے بھی جاری کیے۔ اسکندا اور اس کے بیٹے سودھا سمیت اس کے دو معتبر وزراء کا تعلق گجرات سے تھا اور وہ اس کی حکومت تک گجرات میں حکمران کے ساتھ ہی رہے۔

پرتھوی راج سوم: پرتھوی راج سوم سومیشور اور کارپوردیوی کا بیٹا تھا۔ سومیشور کی موت کے بعد ملکہ نے اپنے بچوں کی دیکھ بھال کی اور ایک بہترین نائب ثابت ہوئی۔ نابالغ بادشاہ کم عمر ہونے کی وجہ سے اس کے دشمنوں کا موقع ملا جنہوں نے اس کی حکومت کی مخالفت کرنے اور اپنے لیے چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم کرنے کی کوشش کی۔ ان میں سے ایک ناگ ارجن بھی تھا جس نے گڈاپورہ قصبے کا کنٹرول سنبھال لیا تھا۔ پرتھوی راج سوم اپنی فوج لے کر قصبے کی طرف بڑھا تو ناگ ارجن بھاگ کھڑا ہوا لیکن اس کا خاندان اور بہت بڑا مال غنیمت پرتھوی راج کے ہاتھ لگ گیا۔ 1181ء میں ہی سلطان معزالدین محمد سام نے جو شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور ہے، پنجاب میں ایک قلعہ تعمیر کیا اور ہندوستان کی طرف بڑھنے کا فیصلہ کیا۔ غوری کی اس پالیسی کی وجہ سے پرتھوی راج سوم کے ساتھ اس کا اختلاف ہوا۔ پرتھوی راج نے 1191ء میں ترائن کی پہلی جنگ میں محمد غوری کو شکست دی لیکن 1192ء میں ترائن کی دوسری جنگ میں اسے شکست دینے میں ناکام رہا جہاں شہاب الدین محمد غوری نے پرتھوی راج سوم کو شکست دی اور ہندوستان میں دہلی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔

6.5 رنتھمبور کے چوہان (Chauhans of Ranthambore)

گووند: رنتھمبور کے چوہانوں کا بانی پرتھوی راج سوم کا بیٹا گووند تھا۔ ترکوں کے ہاتھوں پرتھوی راج سوم کی شکست کے بعد اس کے وارثوں کو دہلی سلطنت کے ماتحت باجگذار کے طور پر اجمیر میں برقرار رکھا گیا۔ گووند نے قطب الدین ایبک کی اطاعت قبول کی اور خراج پیش کیا۔

ولہن: گووند کے بعد اس کا بیٹا ولہن اس کا جانشین بنا جو دہلی سلاطین کی بالادستی کو تسلیم کرتا رہا جیسا کہ منگلانا پتھر کے کتبے سے واضح ہے۔ ولہنا کے بعد اس کا بیٹا پرہلاد آیا جس نے زیادہ دیر حکومت نہیں کی اور شیر کے شکار کے دوران لگنے والی چوٹوں کی وجہ سے اس کی موت ہو گئی۔

ویرنارائن: ویرانارائن کے تعلقات دہلی کے سلاطین کے ساتھ کشیدہ تھے۔ سلطان التمش نے اس کے خلاف فوج بھیجی جس کے خوف سے وہ اطاعت قبول کرنے پر راضی ہو گیا۔ نتیجتاً اسے تخت پر باقی رکھا گیا۔

واگ بھٹ: واگ بھٹ ویر نارائن کا چچا تھا جسے التمش کی موت کے بعد رنتھمبور پر حکومت کرنے کا موقع ملا۔ کمزور حکمران رکن الدین فیروز کی حکومت کے دوران واگ بھٹ کو سلطنت دہلی سے رنتھمبور واپس لینے کا موقع حاصل ہوا۔ رضیہ سلطانہ کے دور حکومت میں الغ خان (بلبن) کو رنتھمبور واپس لینے کی ذمہ داری دی گئی۔ پہلے حملے کی ناکامی کے بعد دوسرے حملے میں الغ خان کامیاب ہوااور قلعہ اس کے کنٹرول میں آگیااور واگ بھٹ کو شکست قبول کرنی پڑی۔

ہمیر: اگلا حکمران جس کے بارے میں ہم سنتے ہیں وہ ہمیر ہے۔اس نے ارجن نامی مالوا کے حکمران کو شکست دی اور منڈلا کرتا یا منڈل گڑھ کے قلعے سے بہت زیادہ خراج حاصل کیا۔اس نے دھارا، اجین، چتور، آبو، وردھن پورہ، چنگا، پشکر، چمپا جیسے کچھ مقامات کو فتح کیا۔ یہ تمام فتوحات اس کی فوجی طاقت اور چوہان حکمران کی حیثیت سے اس کی طاقت کو ظاہر کرتی ہیں۔ جب علاءالدین خلجی تخت نشین ہوا تو رنتھمبور پھر اس کی اولین ترجیح بن گیا۔ گجرات مہم کے دوران گجرات کے کچھ باشندے رنتھمبور قلعے میں ہمیرا کے ساتھ شامل ہو گئے تھے جس سے سلطان علاءالدین خلجی مشتعل ہو گیااور اس نے اپنے دو معتبر جرنیلوں الغ خان اور نصرت خان کو قلعے پر قبضہ کرنے کے لیے بھیجا تھا۔ علاءالدین خلجی کے قریب ترین جرنیلوں میں سے ایک نصرت خان قلعے کا محاصرہ کرتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا جس کی وجہ سے سلطان خود رنتھمبور کی طرف بڑھنے پر مجبور ہو گیا۔ کئی مہینوں کے محاصرے کے بعد رائے ہمیرا کو جنگ کرنے پر مجبور کیا گیااور قلعے کا دفاع کرتے ہوئے وہ جنگ میں اپنی جان گنوا بیٹھا۔

6.6 ناڈول کے چوہان (Chauhanas of Nadaul)

لکشمن: ناڈول کے چوہانوں کا بانی لکشمن (1025ء) تھا جو سمہاراج کا بیٹا تھا اس نے ناڈول میں ایک شیو مندر تعمیر کیااور اسے اپنے نام پر لکشمن سوامی مندر کا نام دیا۔اس نے ناڈول کا قلعہ بھی تعمیر کیا۔ روایت کے مطابق اسے ناڈول شہر کی حفاظت کے لیے ناڈول کے برہمنوں نے رکھا تھااور اس نے یہ ذمہ داری بہت سے فوجیوں کی خدمات حاصل کر کے ادا کی اور شہر کو ملیچھوں سے بچایا جو شہر کے لیے ایک اہم خطرہ بن گئے تھے۔ ملیچھوں کے حملوں نے لکشمن کو ناڈول کے لوگوں کا ہیرو بننے کا موقع دیا جس میں اس نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔

شوبھت: لکشمن کے بعد اس کا بیٹا شوبھت آیا جو 'ابو' پہاڑی کے مالک کو شکست دینے کے لیے جانا جاتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے مالوہ اور ابو دونوں کے پرماروں کو شکست دی۔

اناہل: اناہل کو ناڈول کے چوہانوں کے کامیاب اور قابل حکمرانوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔ وہ گجرات کے اپنے حریف بھیم دیو دوم کو شکست دینے میں کامیاب رہا جسے اس نے پرتشٹھانا میں شکست دی۔ وہ شاکمبھری پر قبضہ کرنے، بھوج پرمار کے جنرل سادھ کو قتل کرنے اور بعض ترکوں کو شکست دینے کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔ اوجھا کے مطابق جب اناہل تخت نشین ہوا تو اس کی بادشاہت میں صرف سات سو گاؤں شامل تھے لیکن اس کی فوجی طاقت کی وجہ سے یہ تعداد 7000 دیہاتوں تک پہنچ گئی۔ تلوار کی طاقت کو اس وقت کسی بھی چیز سے زیادہ اہمیت دی گئی تھی۔

جیندوراج: جیندوراجا نے اپنے بھائی کی پالیسی کو الٹ دیا جو اس نے گجرات کے ساتھ دوستی اختیار کر کے کی تھی اور خود کو آزاد قرار دیا۔ اس نے

جیندیوراجیشور کا مندر تعمیر کیا۔

پرتھوی پال: اس نے اپنے والد کی پالیسی پر عمل کیا اور گجرات کے خلاف بلاوجہ دشمنی کو آگے بڑھایا۔ سُندھا کتبہ کے مطابق اس نے گرجروں کی فوج کو تباہ کر دیا جو کرن کی کمان میں تھی۔ پرتھوی پال نے کسانوں پر عائد ٹیکسوں کو ختم کر دیا اور پرتھوی پالیشور مندر بھی تعمیر کیا۔

آساراج: اسے سدھاراج جے سمہا نے شکست دی اور اپنا جاگیر دار بنالیا۔ آساراجا نے چندلیشور کا مندر تعمیر کیا اور گاؤں پنچاوالی کو تریپوروشا مندر کو عطیہ کیا اور سیکڑوں مفت باورچی خانے، حوض، باغات، شیو دیوتا کے لیے وقف مندر تعمیر کیے۔

رایاپال: رایاپال کو مہاراجادھیراجا پرشمیوار کا خطاب حاصل ہے جو اس کی آزاد حیثیت اور اس کے بہت سے پیشروؤں کے مقابلے اس کی اعلیٰ طاقت کو ظاہر کرتا ہے۔ وہ دھولپو میں پولیس کا نظام قائم کرنے کے لیے جانا جاتا ہے جہاں اس کے شہریوں نے افرادی قوت فراہم کی اور اس نے اسلحہ فراہم کیا۔ اس نے دیوتاؤں پدملشور، شنپالیشور اور سہیاپالیشور کا نام اپنی ملکہ پدمالہ اور دو بیٹوں کے نام پر رکھا۔

الہانا: اگرچہ اس نے ناڈول کے حکمران ہونے کا دعوی کیا تھا لیکن وہ تین قصبوں کیراتاکاپا، رتاہردہ اور سیوا سے حکومت کرتا رہا۔ چالوکیہ وٗں سے وابستگی کی وجہ سے اسے ارنوراجا نے اسے ناڈول سے دور کر دیا تھا۔ اس نے ناڈول میں شیو مندر کی تعمیر کی اور ناڈول میں جینوں کے مہاویر مندر کو ماہانہ خراج عطیات بھی دیے اور جین جذبات کا خیال رکھتے ہوئے جانوروں کو ذبح نہ کرنے کا اعلان کیا۔

6.7 جالور کے چوہان (Chauhanas of Jalor)

جالور کے چوہان خاندان کی بنیاد **کیرتی پال** نے رکھی تھی۔ اس وقت میواڑ کے حکمران کا نام سمنت سمہا تھا۔ اس نے اپنی ناشائستہ پالیسیوں کے ذریعے بہت سے دشمن بنالیے تھے جس سے کیرتی پال کو بھی موقع ملا اور اس نے میواڑ پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس جنگ میں چالوکیوں نے بھی اس کی مدد کی لیکن آخری وقت میں چالوکیوں نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر دیں جس سے کیرتی پال چالوکیوں کا دشمن بن گیا۔ اس کی چالوکیہ مخالف پالیسی پر اس کے جانشینوں نے بھی عمل کیا۔

سمارسمہا: سندھی کتبہ میں سمارسمہا کو عمارتوں کا بانی قرار دیا گیا ہے۔ اس کا میلان ادب کی طرف تھا۔ وہ عالم اور سخی افراد کے ساتھ دوستی رکھتا تھا۔ اس نے بہت سے تلادان (عطیات کی ایک قسم، جہاں عطیہ دینے والے کے وزن کے برابر عطیہ ادا کیا جاتا تھا) دیے اور کنکاچلات، جالور پر وسیع فصیل تعمیر کی یہ وودھدیاداری قسم کی کئی سازوسامان، گوداموں اور جنگی اسلحہ سے لیس تھی۔

ادے سمہا: وہ سب سے طویل حکمران میں سے ایک ہے جس نے 52 سال حکومت کی۔ ایسا لگتا ہے کہ ادے سمہا کسی وقت دہلی کے سلاطین کا جاگیر دار تھا، لیکن انہوں نے خراج پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ فطری طور پر ان کے اس باغیانہ رویے نے ایک جنگ کو دعوت دی جو 1211-1216 عیسوی کے دوران کسی وقت لڑی گئی۔ اس جنگ کو عہد وسطیٰ کی تاریخوں میں بیان کیا گیا ہے، جیسے نظامی کی تیرہویں صدی کے تاج المعاصر (جس میں جالور کے ادے سمہا کا ذکر " جالور کا اودے شاہ" کے طور پر کیا گیا ہے)، اور سولہویں صدی کی تاریخ فرشتہ (جو اسے "جالور کا اودے شاہ یا جاولی پورہ کا اودی شاہ" کہتا ہے)۔ فرشتہ بیان کرتا ہے کہ جب ادے سمہا نے خراج کی ادائیگی بند کر دی تو دہلی کے سلطان

التمش نے جالور پر چڑھائی کی۔ حسن نظامی نے ذکر کیا ہے کہ اس فوج میں رکن الدین حمزہ، عزالدین بختیار، ناصرالدین مردان شاہ، ناصرالدین علی اور بدرالدین ساؤر تیگن جیسے ممتاز جرنیل شامل تھے۔ادے سمہانے جالور قلعے میں پناہ لی لیکن جیسے ہی قلعے کی کچھ فصیلیں مسمار گرائی گئیں تو اس نے ہتھیار ڈال دیے۔ سلطان نے 100 اونٹوں اور 20 گھوڑوں کے خراج پیش کرنے کے بدلے ہتھیار ڈالنے کو قبول کیا اور پھر دہلی واپس آگیا۔ نربھیا بھیمویو گا کے متن میں کہا گیا ہے کہ اس نے جاولی پورہ میں دو شیو مندروں کا کام شروع کیا۔ یہ کتاب اس کے دور حکومت میں مدون کی گئی تھی۔

چاچگادیو: ایسا لگتا ہے کہ چاچگادیو نے خود مختار حیثیت اور اپنے والد سے وراثت میں ملنے والے علاقے کو برقرار رکھا تھا۔ سندھاہل کے کتبے میں اسے شاعرانہ طور پر بیان کیا گیا ہے کہ " گرجتے ہوئے گرجارا بھگوان ورام کو تباہ کرنا، دشمن سالیا کو پریشان کرنا، ملتے ہوئے (یا چھلانگ لگاتے ہوئے) پٹاکا (Pātaka) میں انتہائی خوشی محسوس کرنا، اس کے رنگ سنگا سے محروم کرنا اور پہاڑ پر گرجنا- غضب ناک نہارا"۔ ورام، واگھیلا شہزادہ ورام دیو ہو سکتا ہے جس کی شادی چاچگادیو کی بہن سے ہوئی تھی۔ ورام اور اس کا بھائی وسلادیو دونوں اپنے والد کی موت کے بعد واگھیلا تخت چاہتے تھے۔ واگھیلا کے وزیر واستوپال نے وسلا کی حمایت کی جس کی وجہ سے ورام کو واگھیلا سلطنت سے فرار ہونے پر مجبور ہونا پڑا۔ ورام نے اپنے سسرالی رشتے داروں کے پاس پناہ لی لیکن چوہان واگھیلوں کے ساتھ اچھے تعلقات برقرار رکھنا چاہتے تھے۔ اس لیے چاچگادیو نے دھوکہ دہی سے ورام کو قتل کر دیا۔ یہ واقعہ شاید اس وقت پیش آیا جب چاچگادیو ابھی تک شہزادہ تھا۔ سالیہ غالباً سالہا تھا جو سنچور کی چوہان شاخ کا حکمران اور چاچگادیو کا دور کا رشتے دار تھا۔ ان کے چوتھی نسل کے آباؤ اجداد کرتی پال اور وجے سمہا بھائی تھے۔ اسنگرے کے بارے میں جانا جاتا ہے کہ اس پر چاچگادیو کے والد ادے سمہا کا کنٹرول تھا۔ یہ ممکن ہے کہ سلہا نے اپنی خود مختاری کا دعویٰ کرنے کی کوشش کی ہو، جس کی وجہ سے وہ اور چاچگادیو دشمن بن گئے۔ دوسری جانب بھنڈار کرنے پتوکا کی شناخت ابو کے پرتاپا سمہا کے طور پر کی ہے جس کی شناخت چاچگادیو (ادے سمہا کے بھائی مناو سمہا کا بیٹا) کے رشتے دار کے طور پر ہوئی ہے۔ بھنڈار کرنے ونتھالی کے ایک حکمران سنگا سنگنا کی شناخت بطور بھنڈار کر کی۔ دشرتھا شرما اس نظریے کی مخالفت کرتے ہوئے دلیل دیتے ہیں کہ سنگنا کی موت کے وقت چاچگادیو ایک بچہ تھا۔ شرما کے مطابق نہارا شاید ایک مسلمان جنرل تھا۔ سندھاہل کے کتبے میں کہا گیا ہے کہ چاچگادیو نے شری مالا میں کچھ محصول معاف کر دیے۔ راماسینیا (جدید رام سین) میں اس نے دیوتا وگرادتیہ کے مندر کے لیے چندہ دیا۔

سمنتا سمہا: یہ چوہان خاندان کا ایک ہندوستانی بادشاہ تھا جس نے جاولی پورہ (موجودہ جالور) کے آس پاس کے علاقے پر حکومت کی۔ ابتدائی طور پر اس نے اپنے والد سمنتا سمہا کے ساتھ مشترکہ طور پر انتظامیہ چلائی اور سلطنت دہلی سے حملوں کو روکنے میں مدد کی۔ کنہڑپربندھا اور نینسی کے خیات بھی کنہڑدیو کو دہلی سلطانوں کی فوج کی بے حرمتی سے سومناتھ مندر کی مورتی کو بچانے کا سہرا دیتے ہیں۔ یہ دعویٰ شری دھرویاس کے رنمل چھنڈا (1408-1411) میں بھی ہوتا ہے۔ ان تحریروں کے مطابق کنہڑدیو کی فوج نے متعدد قیدیوں کو آزاد کرایا اور سومناتھ کی مورتی برآمد کی جسے بے حرمتی کے لیے دہلی لے جایا جا رہا تھا۔ نینسی کے خیات کا مزید دعویٰ ہے کہ مموشاہ (محمد شاہ) اور اس کے بھائی گبرو، جنہوں نے دہلی کے جرنیلوں کے خلاف بغاوت کی تھی، کنہڑدیو کے ساتھ پناہ لی۔ تاہم کنہڑدیو نے ان کے گائے کے قتل (جو مقدس سمجھے

جاتے ہیں) کو ناپسند کیا۔اس لیے دونوں باغیوں نے جالور چھوڑ دیااور رنتھمبور کے ہمیرادیوا سے پناہ مانگی۔

6.8 چوہانوں کے تحت ثقافت اور تہذیب (Culture and Civilisation under the Chauhans)

6.8.1 بادشاہت کی نوعیت (Nature of Kingship)

راجپوت دور میں بادشاہت وہ مروجہ نظام تھا جہاں بادشاہ خود مختار تھا۔ریاست کے تمام اختیارات اس کے پاس تھے لیکن ہندوستان میں عمومی طور پر بادشاہ مخیر نوعیت کے تھے اور زیادہ تر سرپرستانہ مطلق العنانیت کی پیروی کی جاتی تھی۔انہوں نے مختلف ذاتوں اور مسلک کے لوگوں کے ساتھ مساوات ورواداری کا سلوک کیااور اپنے لوگوں کے ساتھ اس وقت کے منوسمروتی پر مبنی قوانین کے مطابق برتاؤ کیا۔ اس دور میں لوگوں کا خیال تھا کہ بادشاہ زمین پر خدا کا نمائندہ ہے۔بادشاہ خود کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھتے تھے۔اس وقت جاگیردارانہ نظام تھا یا جاگیرداری کا نظام رائج تھا۔جاگیردارانہ ادارے اور حقوق موروثی تھے۔جاگیرداروں کا تقرر ان کی اعلیٰ ذات اور طبقے کی بنیاد پر کیا جاتا تھا۔

صوبائی انتظامیہ:۔پوری انتظامیہ کو آسانی اور موثر طریقے سے چلانے کے لیے ریاستوں کو بھوکتیوں میں تقسیم کیا گیااور اس کے منتظم کو اُپارِک کہا گیا۔بھوکت اضلاع میں تقسیم تھے۔ضلع کو دیہات میں تقسیم کیا گیا۔دیہات کے انچارج افسر کو گرامینی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ گاؤں،انتظامیہ کی بنیادی اور سب سے چھوٹی اکائی تھی۔

6.8.2 فوج (Army)

فوج کا نظام ایک پرانے طریقہ کار اور انداز پر مبنی تھا۔بادشاہ کا دارومدار جاگیرداروں یا امرا کی فوج پر تھا۔اگرچہ بادشاہ اور سپاہی بہت بہادر تھے لیکن ان کی مناسب اور باقاعدہ تربیت کا کوئی انتظام نہیں تھا۔فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا: پیدل فوج،ہاتھی اور گھوڑ سوار۔ فوج پر دھیان زیادہ دیا جاتا تھا چونکہ ایک حکمران کو پڑوسیوں کے ساتھ لڑنا پڑتا تھا۔

6.8.3 آمدنی (Income)

جرائم پر جرمانہ، تجارت، کاروبار اور صنعتوں پر محصول ریاست کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔اراضی محصول ریاست کے لیے آمدنی کا بنیادی ذریعہ بنا۔جاگیرداروں نے بادشاہ کو خراج کے طور پر سالانہ محصول اور تحائف بھی ادا کیے۔ریاست کی آمدنی کا ایک بڑا حصہ جنگوں اور فوجی طاقت پر خرچ کیا گیا اگرچہ سب تباہی کا باعث بنے۔

6.8.4 سماجی زندگی (Social Life)

ویدک دور میں ورن نظام صرف چار حصوں میں تقسیم تھااور جلد ہی یہ کہیں زیادہ پیچیدہ ہوگیااور اس میں جاتیوں کی پیدائش ہوئی۔ بعدازاں اب تک بھی جاتیوں یا ذاتوں کی تعداد مزید بڑھ رہی ہے۔چوہانوں کے وقت نئی ذاتیں ابھری تھیں اور بہت ساری ذیلی ذاتیں بھی

موجود تھیں۔ دشرتھ شرما کے خیال کے مطابق نئی ذاتوں کی بنیاد صوبائی حدود، صنعتیں اور پیشے تھے۔ پیشوں کی بنیاد پر اس دور میں کائستھوں جیسی نئی ذاتیں وجود میں آئی تھیں جن کے معنی مصنفین یا منشی تھے۔

چوہان حکمران وگرہ راج چہارم کا سکہ

راجپوت خواتین نے انفرادی اور اجتماعی طور پر جوہر رواج اختیار کیا تھا۔ خاص طور پر فوجیوں کے بڑے پیمانے پر قتل ہونے کی کی صورت میں، یا اگر بادشاہ کے قتل یا گرفتار ہونے کی صورت میں، اور جب بھی فتح کی کوئی امید نہیں ہوتی راجپوت خواتین اپنی ستتوا (عزت) کی حفاظت کے لیے اجتماعی یا انفرادی طور پر خود کو جلا لیتیں۔ خواتین کا اصولی طور پر احترام کیا جاتا تھا لیکن عملی زندگی میں ذلیل کیا جاتا تھا۔ خواتین کے کردار کو بہت اعلیٰ مقام دیا گیا، جہاں راجپوت دور میں کردار ایک عورت کے جسم پر مرکوز تھا۔ شوہر سے عقیدت ان کی زندگی کا حتمی مقصد تھا۔ اس دور میں بہت سی خواتین دانشوروں نظر آتی ہیں۔ یہ اندرلیکھا، موریکا، سبھدرا اور پدم شری تھیں جنہوں نے ادب میں خوب نام کمایا۔ خواتین موسیقی، رقص اور مصوری کی ماہر تھیں جن کے لیے انہیں بنیادی طور پر تربیت دی گئی تھی۔ پردے کا نظام قائم تھا لیکن دشرتھ شرما کا خیال ہے کہ یہ نظام غالب نہیں ہوا اس کے علاوہ تعدد ازدواج، بچپن کی شادی اور ستی نظام جیسے خواتین مخالف مسائل موجود تھے نیز راجپوت دور میں ہندو مذہب بڑی حد تک رائج تھا۔

کمارل بھٹ، شنکر اچاریہ اور رامانج جیسے بہت سے دانشوروں اور اصلاح پسندوں نے ہندو مذہب کو تو زندہ کیا اور دوبارہ منظم کیا لیکن سماج کو نہیں۔ ان میں سے کچھ نے ہندو مذہب کو عام لوگوں کے لیے آسان بنایا اور یہ شیو اور ویشنو فرقے کی شکل میں سامنے آیا۔ یہ دونوں بڑی حد تک الگ الگ تھے اور اپنے اندر بہت سے ذیلی طبقات رکھتے تھے۔ اسی دور میں بدھ مذہب اور جین مذہب کا زوال بھی دیکھا گیا۔

6.8.5 تعلیم (Education)

مذہب پر مبنی تعلیم کا قدیم نظام رائج تھا۔ یہ تمام لوگوں کے لیے دستیاب نہیں تھا یہ صرف مراعات یافتہ ذاتوں کے لیے ہی تھا۔ باقی آبادی اس سے محروم تھی اور ممنوعہ طبقے کے لیے تعلیم کے بارے میں سوچنا بھی ایک جرم سمجھا جاتا تھا۔ اس نظام کے مطابق گروکل، باؤدھا، جین، شیو اور ویشنو مذہبی مراکز بھی تعلیمی مراکز تھے۔ نالندہ اور وکرم شیلا یونیورسٹیاں زوال کا شکار ہو رہی تھیں لیکن پال حکمرانوں نے اس کی تنظیم نو پر بہت توجہ دی۔ بہار میں اودنت پوری، بنگال میں سومپوری، وکرم پور (مشرقی بنگال)، جگدل پور (شمالی بنگال) پال دور میں تعلیم کے مشہور مراکز تھے۔ اجین، کاشی اور متھرا سنسکرت کی تعلیم کے لیے مشہور تھے۔ اس دور میں بہت سی زبانیں خصوصاً سنسکرت نے ترقی کی۔

ہندوستان کے مختلف حصوں میں شورسینی، مگدھی، اپ بھرنش، بنگالی، گجراتی، مراٹھی، تامل، تلگو، ملیالم، کنڑاور راجستھانی جیسی بہت سی علاقائی زبانیں بھی موجود تھیں۔ چوہان بادشاہوں میں سے کچھ نے ادیبوں اور مصنفین کی سرپرستی کی اور انعامات دیے۔

6.8.6 مصوری اور مجسمہ سازی (Painting and Sculptre)

اگرچہ اس دور کی بہت سی پینٹنگز ضائع ہو چکی ہیں لیکن عصری ادب اس کے اعلیٰ درجے کے معیار کی نشاندہی کرتا ہے۔ مندر کی دیواروں پر پرندوں، جانوروں، پھولوں، درختوں اور رینگنے والوں کی پینٹنگ ادھر اُدھر پائی جاتی ہیں، اس دور میں پینٹنگ اسٹوڈیوز موجود تھے۔ اس دور میں مجسمہ سازی کو بہت زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ بت مٹی، پتھر اور دھات سے بنے تھے۔ درگا، شیو، وشنو، سوریہ، گنیش، چنڈی، کالی، سرسوتی، کامتورا کچھ دیوتا اور دیویاں تھیں جن کی مورتیوں کو مندروں میں پوجا کے لیے ڈھالا گیا تھا۔ ایلیفینٹا غار میں شیو کا بت اس دور کا بہترین نمونہ ہے۔

6.8.7 موسیقی (Music)

گانا، مختلف موسیقی کے آلات بجانا اور رقص اس دور میں فروغ پایا۔ موسیقی لوگوں کے تمام طبقات کے لیے تفریح کا بہترین طریقہ تھا۔ چوہان بادشاہوں نے موسیقی کو پسند کیا اور اس کی محفلیں سجائیں۔

6.9 چوہانوں کا زوال (Decline of the Chauhans)

ترک افواج کے ہاتھوں تقریباً 15 سال کی مختصر مدت کے اندر شمالی ہندوستان کی سرکردہ ریاستوں کی شکست کی بھی کچھ وضاحت کی ضرورت ہے۔ یہ بات ایک اندازہ کے طور پر بیان کی جاسکتی ہے کہ کسی ملک کو دوسرے ملک نے صرف اس وقت فتح کیا جب وہ سماجی اور سیاسی کمزوریوں کا شکار ہو، یا اپنے ہمسایوں کے مقابلے میں معاشی اور فوجی طور پر پسماندہ ہو جائے۔ جیسا کہ دشرتھ شرما نے کہا، 'حالیہ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ ترکوں کے پاس ہندوستانیوں کے مقابلے میں کوئی بہتر ہتھیار نہیں تھے۔ لوہے کا رکاب جس نے یورپ میں جنگ کا طریقہ بدل دیا تھا وہ آٹھویں صدی کے بعد سے ہی سے ہندوستان میں پھیل گیا تھا'۔ ترک کمانیں زیادہ فاصلے تک تیر چلا سکتی تھیں لیکن ہندوستانی کمانوں کو زیادہ درست اور زیادہ مہلک سمجھا جاتا تھا، تیروں کے سروں کو عام طور پر زہر میں ڈبویا جاتا تھا۔ دوبدو لڑائی کے لیے ہندوستانی تلواروں کو دنیا میں بہترین سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانیوں کو ہاتھیوں کا فائدہ بھی حاصل تھا۔ ترکوں کے پاس گھوڑے تھے جو ہندوستان میں درآمد کیے جانے والے گھوڑوں سے زیادہ تیز اور مضبوط تھے۔

ہندوستانیوں کی کمزوری سماجی تنظیم تھی، جاگیرداری کے فروغ یعنی مقامی زمینی عناصر اور سرداروں کے عروج نے چوہان ریاستوں کے انتظامی ڈھانچے اور فوجی تنظیم کو کمزور کر دیا تھا۔ حکمرانوں کو ان مختلف سرداروں پر زیادہ انحصار کرنا پڑتا تھا جو شاذونادر ہی ہم آہنگی سے کام کرتے تھے اور جنگ کے بعد تیزی سے اپنے علاقوں میں منتشر ہو جاتے تھے۔ دوسری طرف ترکوں کے قبائلی ڈھانچے اور اقطاع اور خالصہ

نظام کی ترقی نے ترکوں کو بڑی بڑی کھڑی فوجوں کو برقرار رکھنے کے قابل بنایا جو طویل عرصے تک میدان میں رکھی جا سکیں۔اس کے علاوہ چوہان گھڑ سواروں کے ایک منظم ادارے کے طور پر حرکت کرنے کے عادی نہیں تھے جو طویل فاصلے طے کر سکتا تھا اور لڑ سکتا تھا اور داؤ پیچ کر سکتا تھا۔اور نہ ہی ایسا لگتا ہے کہ راجپوتوں کے پاس سوار تیر اندازوں یا بھاری ہتھیاروں سے لیس گھڑ سواروں کے بڑے دستے تھے۔اس کے علاوہ حکمران اپنے پڑوسیوں کے ساتھ لڑتے رہے۔اگر یہ عوامل نہ ہوتے تو راجپوت ریاستوں کو جن میں سے اکثر کے پاس غزنوی اور غوری سلطنتوں سے زیادہ انسانی اور جسمانی وسائل تھے، شکست سے دوچار نہ ہونا پڑتا یا اگر وہ کسی جنگ میں شکست کھا جاتے تو سنبھل جانے میں کامیاب ہو جاتے۔ترکوں کے سماجی اور تنظیمی ڈھانچے نے بھی انہیں بہت سے فوائد دیے۔مغربی ایشیا میں آہستہ آہستہ بڑھنے والے اقتا نظام کا مطلب یہ تھا کہ ایک ترک سربراہ کو ایک زمین کا ایک ٹکڑا، اقطاع کے طور پر مختص کیا گیا تھا جہاں سے وہ ریاست کی وجہ سے زمین کی آمدنی اور محصول وصول کر سکتا تھا۔اس کے بدلے میں اسے حکمران کی خدمت کے لیے فوجیوں کا ایک دستہ برقرار رکھنا پڑا۔یہ عطیہ موروثی نہیں تھا اور اسے سلطان کی خوشی کے تابع رکھا گیا تھا جو اسے کسی بھی جگہ منتقل کر سکتا تھا۔سلطان نے براہ راست زمین کے ٹکڑوں سے آمدنی حاصل کی جسے خالصہ کہا جاتا تھا۔اس سے وہ ایک بڑی کھڑی فوج کو برقرار رکھنے کے قابل ہوا۔جبکہ ہندوستان کی طرح مغربی ایشیا میں ریاستیں عروج اور زوال پذیر ہوا کرتی تھیں۔مغربی ایشیا میں راجپوت ریاستوں کے برعکس، ہر ریاست میں مسلح افواج زیادہ مرکزیت کی حامل تھیں۔ ترک افسروں میں سے بہت سے غلام تھے جن کو جنگ کی تربیت دی گئی تھی اور وہ سلطان کی ماتحتی میں ترقی کر چکے تھے اور جن پر سلطان مکمل بھروسہ کر سکتا تھا۔ذاتی بہادری کے لحاظ سے راجپوت کسی بھی طرح ترکوں سے کم تر نہیں تھے۔اس تناظر میں فوجی تنظیم میں مذہب اور ذات پات کے کردار کو غیر ضروری طور پر بڑھا چڑھا کر پیش نہیں کیا جانا چاہیئے۔ترک جہاں غازیوں کے جذبے سے رنگے ہوئے تھے وہیں راجپوت جنگ میں پسپائی کو بے عزتی سمجھتے تھے۔اس کے علاوہ ذات پات نے غیر راجپوتوں یا کوورن (نچلی ذاتوں) کو لڑائیوں میں حصہ لینے سے نہیں روکا تا کہ راجپوت فوجیں ترکوں کے میدان میں اترنے والوں کے مقابلے تعداد میں بڑی ہوں۔

راجپوتوں نے حوصلہ افزا اور طویل مزاحمت ضرور کی اور کئی بار ترکوں کو شکست بھی دی، لیکن راجپوتوں میں جس چیز کی کمی تھی جسے 'ڈسپلن' اور نظم وضبط کی تربیت کہا جا سکتا ہے۔ایک بار جب ہندوستان کے بیرونی گڑھ کابل اور لاہور ترکوں کے ہاتھوں میں چلے گئے تو راجپوتوں کی جانب سے ان کی بازیابی کی کوئی ٹھوس کوشش نہیں کی گئی نہ ہی غزنویوں کو پنجاب سے باہر دھکیلنے کی بہت کم کوشش کی گئی۔ راجپوتوں کی نگاہیں ہندوستان پر جمی رہیں اور انہوں نے باہر کی پیش رفت پر بہت کم توجہ دی، خاص طور پر وسطی ایشیا پر جس نے اکثر ہندوستان کی تاریخ کی تشکیل میں کلیدی کردار ادا کیا تھا۔

6.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

شمالی ہند کی سیاست میں چوہان خاندان کا اہم کردار ہے۔چوہان کئی خاندانوں میں بٹے ہوئے تھے لیکن ان میں سب سے اہم شاکمبھری یا سانبھر اور بعد میں اجمیر کے چوہان تھے۔ان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ ناگور کے کسی علاقے میں رہتے تھے اور بعد میں

انہوں سانبھر کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ وہ پرتی ہار سلطنت کے باجگذار تھے اور ان کے لیے دشمنوں سے لڑتے تھے۔ پرتی ہار سلطنت کی کمزوری کا فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور اپنی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ شاکمبھری کے بعد رنتھمبھور اور جالور کے چوہان خاندان ان کے وارثین کے طور پر سامنے آئے۔ ترائن کی جنگوں میں سانبھر کے شاکمبھری چوہان خاندان کا خاتمہ ہو گیا اور اس کا آخری حکمراں پرتھوی راج سوم، شہاب الدین غوری سے لڑتے ہوئے مارا گیا۔ بعد میں رنتھمبھور اور جالور بھی دہلی سلطانوں کے ذریعے فتح کر لیے گئے۔

چوہانوں کے عہد میں جاگیردارنہ نظام اور ثقافت کو عروج حاصل ہوا۔ باضابطہ فوج کا زمانہ تو گپت اور ہرش سلطنت کے دور کے بعد ہی ختم ہو گیا لیکن بھاڑے کے فوجیوں کا جتنا چلن اس دور میں تھا اتنا کسی اور دور میں نہیں تھا۔ زمین کے عطیات پر مبنی چوہانوں کی غیر مرکزی ریاست ایک ہی بیرونی حملے سے چرمرا کر ڈھے گئی۔

6.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

سپادلکش — سوا لاکھ گاؤں والا علاقہ

اہی چھتر پورہ — مارواڑ میں ناگور کا علاقہ

شاکمبھری — راجستھان میں سانبھر جھیل کا علاقہ

میرو — تالاب

ملّ — پہلوان

تاج المعاصر — بارہویں صدی میں لکھی گئی حسن نظامی کی کتاب

تاریخ فرشتہ — محمد قاسم بن ہندو شاہ استرابادی کی سترہویں صدی کی تصنیف

کاویا — ایک انتہائی مصنوعی ادبی طرز ہے جو عیسوی دور کی ابتدائی صدیوں سے ہمارے ملک کے درباری رزمیہ میں اپنایا جاتا ہے۔ اس میں تقریر کا ایک مخصوص انداز ہے اور تحریر کے شاعرانہ اجزاء پائے جاتے ہیں۔

اپی گرافک — کتبوں سے متعلق

تلادان — عطیات کی ایک قسم، جہاں عطیہ دینے والے کے وزن کے برابر عطیہ ادا کیا جاتا تھا

6.12.1 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

6.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. چوہانوں کی ابتدا کو بیان کرنے والا سب سے پہلا کتبہ کون سا ہے؟
2. اینلز آف راجستھان کے مصنف کون ہیں؟

3. سرجناچریت چوہانوں کی جائے پیدائش کس جگہ بتاتی ہے؟

4. بھر گو کچھایابروک کے چوہان خاندان کا بانی کون تھا؟

5. کون سی جین تصنیف جین مذہب کے ایک عظیم سرپرست کے طور پر آہو ملہ کا ذکر کرتی ہے؟

6. اجمیر شہر کا بانی کون تھا؟

7. پرتھوی راج نے 1191ء میں ترائن کی پہلی جنگ میں کس کو شکست دی؟

8. جالور کے چوہان سلسلہ کی بنیاد کس رکھی تھی۔

9. عطیہ دینے والے کے وزن پر عطیات ادا کیے جانے کا کیا نام تھا۔

10. راجپوت ریاستوں کو منتظم اُپارِک کے تحت کس میں تقسیم کیا گیا تھا۔

6.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. چوہانوں کے آغاز پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

2. چوہانوں کی ابتدائی سلطنتوں کو بیان کیجیے۔

3. جوہر رسم ورواج کی وضاحت کریں۔

4. چوہانوں کے اصل مسکن پر ایک نوٹ لکھیں۔

5. رنتھمبور کے چوہانوں پر ایک نوٹ لکھیں۔

6.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. چوہانوں کی آغاز وابتدا کے نظریات بیان کیجیے۔

2. چوہانوں کے تحت ثقافت اور تہذیب کی وضاحت کریں۔

3. چوہانوں کے زوال کی وجوہات کیا تھیں؟

6.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Alf Hiltebeitel (1999). *Rethinking India's Oral and Classical Epics: Draupadi among Rajputs, Muslims, and Dalits*. University of Chicago Press.
2. Anita Sudan (1989). *A study of the Cahamana inscriptions of Rajasthan*. Research.
3. Cynthia Talbot (2015). *The Last Hindu Emperor: Prithviraj Cauhan and the Indian Past, 1200–2000*. Cambridge University Press.

4. Dasharatha Sharma (1959). *Early Chauhān Dynasties*. S. Chand / Motilal Banarsidass.
5. Har Bilas Sarda (1935). *Speeches And Writings Har Bilas Sarda*. Ajmer: Vedic Yantralaya.
6. Iqtidar Alam Khan (2008). *Historical Dictionary of Medieval India*. Scarecrow Press.
7. R. B. Singh (1964). *History of the Chāhamānas*. N. Kishore.
8. Upinder Singh (1999). *Ancient Delhi*. Oxford University Press.
9. André Wink (1990). *Al- Hind: The slave kings and the Islamic conquest*. Vol. 1. BRILL.
10. Brajadulal Chattopadhyaya (1994). "Origin of the Rajputs: The Political, Economic and Social Processes in Early Medieval Rajasthan". *The Making of Early Medieval India*. Oxford University Press.
11. Catherine B. Asher; Cynthia Talbot (2006). India Before Europe. Cambridge University Press.
12. David Ludden (1999). *An Agrarian History of South Asia*. Cambridge University Press.
13. Richard Gabriel Fox (1971). *Kin, Clan, Raja, and Rule: State hinterland Relations in Preindustrial India*. University of California Press.
14. Satish Chandra (1982). *Medieval India: Society, the Jagirdari Crisis, and the Village*. Macmillan.
15. Eugenia Vanina (2012). *Medieval Indian Mindscapes: Space, Time, Society, Man*. Primus Books.
16. Richard Eaton (2019). *India in the Persianate Age: 1000-1765*. Penguin Books Limited.
17. Lindsey Harlan (2018). *Religion and Rajput Women: The Ethic of Protection in Contemporary Narratives*. Univ of California Press.

اکائی 7۔ سماج اور ثقافت

(Society and Culture)

اکائی کے اجزا

7.0 تمہید
7.1 مقاصد
7.2 سماج
7.2.1 عوام کا طرز زندگی
7.2.2 ذات پات کا نظام
7.2.3 عورتوں کی حیثیت
7.2.4 لباس، کھانا، زیورات
7.2.5 تعلیم، سائنس اور علم
7.3 ادب اور فنونِ لطیفہ
7.3.1 سنسکرت ادب
7.3.2 عربی فارسی ادب
7.3.3 علاقائی زبانیں
7.3.4 فنون لطیفہ
7.4 اکتسابی نتائج
7.5 کلیدی الفاظ
7.6 نمونہ امتحانی سوالات
7.4.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

7.4.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
7.4.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
7.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

7.0 تمہید (Introduction)

اگرچہ ہم نے ابھی تک ہندوستان میں 1000 سے 1200 تک کی سیاسی نشو و نما کا مطالعہ نہیں کیا ہے، تو بھی، اقتصادی سماجی اور مذہبی زندگی کے مطالعے کے لیے 800 سے 1200 تک کے عہد کو ایک مانا جاسکتا ہے۔ سیاسی زندگی کے مقابلے میں اقتصادی اور سماجی زندگی نیز تصورات اور اعتقادات میں کافی سست رفتاری سے تبدیلی آئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سی ابتدائی خصوصیات جو کہ نویں صدی سے پہلے موجود تھیں وہ اس عہد میں بھی برقرار رہیں۔ لیکن متعدد نئے عوامل کے شامل ہو جانے کی وجہ سے اس عہد کی اپنی الگ خصوصیات پیدا ہو گئیں۔ یہ ایک عام بات ہے کہ ہر تاریخی دور میں نئے عوامل کے ساتھ ساتھ پرانے عوامل بھی موجود رہتے ہیں۔ البتہ تبدیلی کی رفتار اور سمت ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔

7.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- آٹھویں سے بارہویں صدی تک کے عہد کے سماج سے واقف ہو سکیں گے۔
- اس عہد میں عوام کی حالت اور ذات پات کے نظام کے بارے میں سمجھ سکیں گے۔
- اس عہد میں عورتوں کی حالت اور طرز رہائش پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- اس عہد میں تعلیم سائنس اور علوم کی ترقی کا جائزہ لے سکیں گے۔
- اس عہد کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے بارے میں جان سکیں گے۔

7.2 سماج (Society)

اس عہد میں ہندوستانی سماج میں کئی اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان میں سے ایک تبدیلی ان لوگوں کے ایک طبقے کی بڑھتی ہوئی طاقت تھی، جنہیں اس عہد کے مصنفین نے سامنت، رنک، روت (راجپوت) جیسے ناموں سے ذکر کیا ہے۔ ان کی ابتداء مختلف طریقوں سے ہوئی تھی، ان میں سے کچھ تو ایسے سرکاری افسر تھے جنہیں نقد تنخواہ کی بجائے گاؤں دیے جاتے تھے جن سے وہ محصول حاصل کیا کرتے تھے۔ دوسرے مفتوح راجا اور ان کے حامی تھے جنہیں محدود علاقوں سے مالیانہ حاصل کرنے کی اجازت تھی۔ کچھ دوسرے لوگ موروثی مقامی سردار یا جاں باز فوجی تھے جنہوں نے کچھ مسلم حامیوں کی مدد سے اپنے اختیارات کے علاقے قائم کر لیے تھے۔ ان کے علاوہ کچھ دوسرے

لوگ بھی تھے جو قبیلوں یا خاندانوں کے سردار تھے۔ان لوگوں کی حقیقی پوزیشن ایک دوسرے سے کافی مختلف تھی۔ان میں سے کچھ تو محض گاؤں کے مکھیا تھے جن میں سے کچھ کا تو دائرہ اختیار کئی گاؤں پر مشتمل علاقوں تک پھیلا ہوا ہوتا تھا جبکہ ان میں سے کچھ کا تو پورے علاقے پر ہی تسلط ہوتا تھا۔ یہ ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے اور اپنے اختیار اور مراعات کے حلقے کو وسیع کرنے کی کوشش میں رہتے تھے۔

حکمراں کی طرف سے اپنے افسروں اور حامیوں کو آمدنی کی وصولی (بھوگ یا جاگیر) کا جو کام سونپا جاتا تھا وہ نظریاتی اعتبار سے عارضی ہوتا تھا جسے حکمراں اپنی مرضی سے واپس بھی لے سکتا تھا لیکن ایسا بہت کم ہوتا تھا اور اس کی نوبت عام طور پر کھلی بغاوت یا غداری کے بعد ہی آتی تھی۔ موجودہ خیال یہ ہے کہ کسی شکست خوردہ حکمراں کو بھی اس کی زمینوں سے بے دخل کرنا گناہ سمجھا جاتا تھا۔نتیجے کے طور پر اس عہد کی سلطنتوں میں وہ بڑے علاقے بھی شامل ہوتے تھے جو کہ شکست خوردہ اور ماتحت حکمرانوں کے زیر تسلط ہوتے تھے جو کہ اپنی آزادی پر زور دینے کی مسلسل کوشش کرتے تھے۔ پھر یہ کہ ان حکمرانوں کے علاقوں میں بھی جو افسران تھے وہ اپنے عہدے اور کام کو موروثی جاگیر سمجھتے تھے۔امتداد زمانہ کے ساتھ ساتھ، مختلف سرکاری محکمے بھی موروثی سمجھے جانے لگے تھے۔ پچھلے ایک باب میں ایک مثال ہمارے سامنے یہ آ چکی ہے کہ بنگال میں مہامنتری کا عہدہ ایک ہی خاندان میں چار پشتوں تک رہا تھا۔اسی طرح کچھ عہدوں پر چند خاندانوں کی اجارہ داری بھی جانے لگی تھی۔ موروثی سرداروں نے رفتہ رفتہ متعدد سرکاری کاموں کو اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔انہوں نے محض سرکاری محصول طے کرنے اور وصول کرنے کا ہی کام نہیں کیا بلکہ انتظامی امور کو بھی اپنے ہاتھوں میں لے لیا جن میں سزا دینے اور جرمانہ محصول ے جیسے اختیارات بھی شامل تھے اور جو پہلے مخصوص شاہی اختیارات کی حیثیت رکھتے تھے۔انہوں نے اپنی زمینوں کو راجا کی پیشگی مرضی کے بغیر ہی اپنے پیروکاروں اور حامیوں کو دے دینے کا حق بھی اپنے ہاتھ میں لے لیا جس کے نتیجے میں ان لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی تھی جو اس طرح کی زمینوں پر کوئی محنت کیے بغیر ہی ان سے اپنا گزارا کرتے تھے۔اس طرح کے سماج کو ایک جاگیر دارانہ معاشرہ کہا جاسکتا ہے۔جاگیر دارانہ سماج کی عام خصوصیت یہ ہے کہ سماج میں ان لوگوں کو ہی زیادہ طاقت ور حیثیت حاصل ہوتی ہے جو زمین سے کسی محنت کے بغیر روزی حاصل کرتے ہیں۔

ہندوستان میں اس طرح کے ایک سماج کی نشوونما کے دوررس اثرات مرتب ہوئے اس سے راجا کی حیثیت کمزور ہوگئی اور باج گزار سرداروں پر اس کا انحصار اور بڑھ گیا۔ان میں سے بیشتر باج گزار سرداروں کے پاس اپنی فوج بھی ہوتی تھی جسے راجا کی حکم عدولی کے لیے بھی استعمال کیا جاسکتا تھا۔ ہندوستانی ریاستوں کی اندرونی کمزوری بعد میں ترکوں کے ساتھ مقابلہ آرائی کے وقت کافی سنگین ثابت ہوئی۔ چھوٹی ریاستوں نے تجارت کی حوصلہ شکنی کی اور ایک ایسی معیشت کو بڑھاوا دیا جس میں گاؤوں یا گاؤوں کے گروپوں میں زیادہ سے زیادہ خود کفیل بننے کا رجحان پیدا ہوتا گیا۔ باج گزار سرداروں کے غلبے کے نتیجے میں گاؤں کی اپنی حکومت کے نظام کو بھی جھٹکا لگا اور وہ کمزور پڑتا گیا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جاگیر دارانہ نظام میں صرف برائیاں ہی تھیں۔ بدنظمی اور تشدد کے زمانے میں مقابلتاً زیادہ مضبوط باج گزار سردار کسانوں اور دوسرے لوگوں کو جان ومال کا تحفظ فراہم کرتے تھے جن کے بغیر روزمرہ کی زندگی گزارنا ناممکن تھا۔کچھ باج گزار سرداروں نے زراعت کی توسیع اور ترقی میں بھی کافی دلچسپی لی۔

7.2.1 عوام کا طرز زندگی (People's Lifestyle)

اس عہد میں کپڑے، سونے چاندی کے حکام اور دھات سازی جیسی ہندوستانی دست کاریوں کے اعلیٰ معیار میں کوئی زوال نہیں آیا۔ ہندوستانی زراعت بھی ترقی پذیر حالت میں رہی تھی۔ ہمیں بہت سے عرب سیاحوں سے زمین کی زرخیزی اور ہندوستانی کسانوں کی مہارت کی شہادتیں ملتی ہیں۔

اس عہد کی تمام ادبی تخلیقات سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ وزراء، حکام اور زمین دار سردار بہت شان و شوکت اور ٹھاٹ باٹ کی زندگی گزارتے تھے۔ یہ اپنے راجا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے عالیشان مکانوں میں رہتے تھے۔ جو تین سے پانچ منزل تک اونچے ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنے جسموں کی آرائش کے لیے بیش قیمت غیر ملکی لباس پہنتے تھے یا جن میں اونی اور چینی ریشمی کپڑے، بیش قیمت ہیرے جواہرات نیز سونے چاندی کے زیورات بھی ہوتے تھے۔ ان کے محلوں میں بڑی تعداد میں عورتیں ہوتی تھیں اور ان کی دیکھ بھال کے لیے گھریلو نوکر بھی ہوتے تھے جب بھی وہ باہر نکلتے تھے تو ان کے ساتھ بڑی تعداد میں گھریلو خدمت گار بھی ہوتے تھے۔ یہ مہاسامنت ادھی پی جیسے اونچے خطابات بھی اپنے لیے خود ہی اختیار کر لیا کرتے تھے۔ اور ایسے بے امتیازی نشان کی شکل میں جھنڈے، آراستہ و پیراستہ چھتریاں مکھیوں کو اڑانے کے لیے یاک (تبتی بیل) کی دم کی بنی ہوئی پنکھی استعمال کرتے تھے۔ اس عہد کی ایک تصنیف سے ایک شاہی افسر کے چھوٹے لڑکے کی زرق برق پوشاک اور جسمانی آرائش کے سامان کا جو ذکر ملتا ہے اس سے اس عہد کے مٹھی بھر باج گزار سرداروں اور شاہی (سرکاری) افسروں کے رہن سہن کی بخوبی نمائندگی ہوتی ہے۔ اس کو خاص قسم کی انگوٹھیاں، کنڈل (بندے) اور گلے میں ایک پتلا سنہرا ہار ہوئے دکھایا گیا ہے۔ زعفران کے لیپ کی وجہ سے اس کا جسم پیلے رنگ کا ہو گیا ہے۔ اس کے جوتے کامدار ہیں۔ اس کے کپڑے زعفران سے رنگے پیلے ہیں۔ جن میں سنہری کناری ہے۔ جب کبھی وہ عوام میں آتا ہے تو اس کے ساتھ بہت سارے خدمت گار ہوتے ہیں۔ جن میں ایک شخص پاندان کے ساتھ ہوتا تھا اور پانچ یا چھ مسلح سپاہی بھی ہوتے تھے۔

بڑے سوداگر بھی شاہی ٹھاٹ باٹ رکھتے تھے۔ اور بعض اوقات تو ان کا رہن سہن بالکل شاہی انداز اختیار کر لیتا تھا۔ چالوکیہ عہد حکومت کے ایک کروڑپتی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے مکان کے اوپر بجنے والی گھنٹیوں کے ساتھ بڑے جھنڈے لہراتے رہتے تھے اور اس کے اصل مکان کے قریب پہونچنے کے لیے بلور کی سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مکان کے اندر ایک مندر بھی تھا جس کا فرش اور دیواریں بلور کی تھیں۔ جن پر مذہبی تصویریں اور بلور کی ایک مورتی بنی ہوئی تھی۔ وشوپال اور تیج پال جو کہ گجرات میں وزیر تھے، اپنے زمانے کے متمول ترین سوداگر مشہور تھے۔

مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہوگا کہ ہر طرف خوش حالی ہی تھی۔ اگرچہ غذائی اشیا سستی تھیں، لیکن شہروں میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوتے تھے جنہیں پیٹ بھر کھانا بھی نصیب نہیں ہوتا تھا۔ راج ترگنی (شہر میں لکھی گئی بارہویں صدی کی تصنیف کے مصنف نے انہی لوگوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ ایک طرف تو درباری بھنا ہوا گوشت کھاتے اور خوشبودار ٹھنڈی شراب پیتے

تھے تو دوسری طرف تمام لوگوں کو چاول اور اتپل ساگ (کڑوے ذائقے کی جنگلی سبزی) پر ہی صبر کرنا پڑتا تھا۔اس زمانے کے نادار مردوں اور عورتوں کی بدقسمتی کی متعدد کہانیاں ملتی ہیں۔ان میں کچھ لوگ ڈکیتی اور لوٹ مار کر کے زندگی بسر کرتے تھے۔جہاں تک گاؤوں کا تعلق ہے جہاں آبادی کا بڑا حصہ رہتا تھا، تو ہمیں کسانوں کے بارے میں،اس عہد کی ادبی تخلیقات، زمین کے ہبہ ناموں اور کتبوں سے معلومات حاصل ہوتی ہیں۔دھرم شاستر کے شارحین کا کہنا ہے کہ کسانوں سے حسب سابق پیداوار کا چھٹا حصہ محصول کے طور پر لیا جاتا ہے۔زمین کے ہبہ ناموں سے ہمیں چراگاہ محصول،تالاب محصول جیسے کئی اضافی یا ذیلی محصولوں کا بھی پتہ چلتا ہے۔کسانوں کو زمین کے محصول کے ساتھ ساتھ ان محصولوں کی بھی ادائیگی کرنی ہوتی تھی۔کچھ ہبہ ناموں سے زمین کے مالک کو یہ حق حاصل ہو جاتا تھا کہ وہ اس زمین پر متعین یا غیر متعین، مناسب یا نامناسب محصول کسانوں پر لگا سکتا تھا۔کسانوں کو بیگار یا جبریہ مزدوری کرنی پڑتی تھی۔وسطی ہندوستان اور اڑیسہ جیسی بعض جگہوں پر عہد وسطیٰ کے یورپ کے زرعی غلاموں کی طرح گاؤں کی زمینوں کے ساتھ ساتھ،ان زمینوں پر بسے ہوئے کاریگر، دست کار، چرواہے اور کسان بھی دے دیے جاتے تھے۔ادبی تخلیقات سے ہمیں ایسے باج گزار سرداروں کے بارے میں پتہ چلتا ہے جو محصول وصول کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے تھے۔بتایا جاتا ہے کہ ایک راجپوت سردار چڑیوں، مردہ پرندوں، خنزیر کی لید اور مردوں کے کفن سے بھی آمدنی کرتا تھا۔ایک دوسری تخلیق سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ایک باج گزار سردار کی زیادتیوں سے ایک گاؤں انسانوں سے بالکل خالی ہو گیا تھا۔بار بار پڑنے والے قحط اور جنگیں بھی اس صورت حال کا یقیناً ایک سبب رہی ہوں گی۔جنگوں میں پانی کے وسائل کو تباہ کر دینا، گاؤوں کو جلا دینا، مویشیوں اور بازاروں کے غلے کے ذخیروں پر زبردستی قبضہ کر لینا اور شہروں کو تباہ و برباد کر دینا اس حد تک عام بات تھی کہ اس عہد کے مصنفین نے بھی ان کاموں کو درست ہی بتایا ہے۔اس طرح جاگیردارانہ نظام کی ترقی سے عام لوگوں کے مصائب میں اور اضافہ ہو گیا۔

7.2.2 ذات پات کا نظام (Caste System)

ذات پات کا نظام، جو کہ کافی پہلے قائم ہو چکا تھا سماجی ڈھانچے کی سب سے اہم بنیاد بن گیا۔اس عہد کی سمرتیوں کے لکھنے والوں نے برہمنوں کے خصوصی حقوق کو کافی بڑھا چڑھا کر بتایا اور شودروں (نچلی ذاتوں) کو سماجی اور مذہبی اعتبار سے نااہل قرار دینے کے سلسلے میں اپنے پیش رو مصنفین کو بھی پیچھے چھوڑ گئے۔اس عہد کے سمرتی کے ایک مصنف، پراشر کے مطابق شودروں کا تیار کیا ہوا کھانا کھانا، ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اور ان سے کچھ سیکھنا ایسے کام ہیں جو خاندانی شخص کو بھی پنچ بنا دیتے ہیں۔ہمیں اس سوال پر بھی ایک بحث و مباحثے کا پتہ چلتا ہے کہ کسی شودر کا سایہ بھی نجس ہے یا نہیں۔اس بارے میں یقین سے کچھ کہنا مشکل ہے کہ سمرتی کے ان مصنفین کے یہ خیالات روزمرہ کی زندگی پر کس حد تک اثر انداز تھے؟ لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عہد میں پس ماندہ اور نچلے طبقوں کے لوگوں کی حالت اور بھی خستہ ہو گئی تھی۔مختلف ذاتوں کے درمیان شادی کو برا سمجھا جاتا تھا۔اگر کوئی اونچی ذات کا مرد کسی نچلی ذات کی عورت سے شادی کر لیتا تھا تو اس کی اولاد کی ذات، ماں کی ذات کے اعتبار سے طے پاتی تھی لیکن اگر عورت اونچی ذات کی ہوتی تھی اور مرد نچلی ذات کا، تو ایسی صورت میں اولاد کی ذات، باپ کی ذات کے اعتبار سے طے ہوتی تھی۔اس عہد کے مصنفین نے اس عہد کی کئی ذاتوں کا ذکر کیا ہے جن میں کمہار، جولاہا، سونار، گویا، موسیقار، نائی (حجام)، رسی بانٹنے والے، چمڑے کا کام کرنے والے، مچھیارا، شکاری وغیرہ شامل ہیں۔ان میں سے کچھ تو مزدوروں کی تنظیمیں تھیں، جن میں

اس عہد میں ذات (جاتی) کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ اہم بات یہ ہے کہ اس عہد کی سمرتی کے لکھنے والوں نے دست کاریوں کو ادنی پیشہ قرار دیا تھا۔ اس طرح بیشتر مزدور پیشہ لوگوں اور بھیل قبائل جیسے لوگوں کو اچھوت اور نچلی ذات کا مانا جانے لگا تھا۔

اس عہد میں راجپوتوں کے عروج کا بھی پہ چلتا ہے۔ راجپوتوں کی اصل کے بارے میں عالموں میں کافی اختلاف رائے پایا جاتا ہے۔ کئی راجپوت خود کو مہابھارت کے عہد کے سوریہ ونشی اور چندر ونشی چھتریوں کی اولاد مانتے ہیں جبکہ کچھ دوسرے راجپوت اپنی اصل کا سرچشمہ اس یگیہ کی قربانی کی آگ کو مانتے ہیں جو کہ رشی وششٹ نے آبو پہاڑ پر کیا تھا لیکن ہم راجپوتوں کی اصل کے سلسلے میں ان روایتوں پر ہی منحصر نہیں رہ سکتے کیونکہ ان میں سے بعض روایتوں کا ذکر جیسے ماؤنٹ آبو کا یگیہ پرتی ہار، پرمار، چوہان اور سولنکی جیسی کچھ راجپوت ذاتیں معرض وجود میں آئیں۔ پہلی بار بعد کی شعری روایتوں میں ہی آیا ہے۔ ہم ان روایتوں سے صرف یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ مختلف راجپوت خاندانوں کی اصل کا سرچشمہ بھی مختلف ہے۔ کچھ ہندوستانی اور غیر ملکی عالموں کا یہ خیال ہے کہ ان میں سے کچھ راجپوتوں کے آباواجداد سیتھین اور ہن تھے، جو کہ ہرش کے بعد ہندوستان میں آکر بس گئے تھے، جبکہ دوسرے راجپوت خاندان، ہندوستان کے ہی قبائل سے نکلے ہیں۔ چھتریوں کے علاوہ برہمنوں اور ویشیہ خاندان کے لوگوں نے مختلف زمانوں میں ملک پر حکومت کی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ مختلف ذاتوں کے حکمرانوں کو راج پتر یا راجپوت کہا جانے لگا تھا اور انہیں چھتری کا درجہ دے دیا گیا۔

قابل غور بات یہ ہے کہ ذات کی درجہ بندی اتنی شدید نہیں تھی جیسی کہ بعض اوقات سمجھی جاتی ہے۔ لوگ انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر اونچی ذات میں شامل ہو سکتے تھے اور نچلی ذات میں گر بھی سکتے تھے۔ بعض اوقات نئی ذاتوں کو ورن کے درجے میں رکھنا مشکل بھی ہو جاتا تھا۔ اس کی ایک مثال کائستھ ذات ہے جس کا ذکر خاص طور پر اس زمانے سے شروع ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں مختلف ذاتوں کے لوگ، جن میں برہمن اور شودر بھی تھے جو سرکاری کام میں شامل تھے۔ کائستھ کے نام سے پکارے گئے اور امتداد زمانہ کے ساتھ ان لوگوں نے ایک الگ ذات کی حیثیت حاصل کر لی۔ اس عہد میں ہندو دھرم تیزی سے پھیل رہا تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ بڑی تعداد میں بدھسٹوں اور جینیوں کو اپنے میں جذب کر لیا بلکہ مختلف دیسی قبیلوں اور غیر ملکی لوگوں کو بھی ہندو بنا لیا۔ ان نئے طبقوں نے نئی ذاتوں اوذیلی ذاتوں کو نیا روپ دیا اور عام طور پر اپنی رسموں، شادی بیاہ کے طریقوں بلکہ اپنے قبائلی دیوی دیوتاؤں کی پرستش کو بھی جاری رکھا۔ اس طرح سماج اور مذہب دونوں ہی زیادہ سے زیادہ پیچیدہ ہوتے چلے گئے۔

7.2.3 عورتوں کی حیثیت (Position of Women)

حسب سابق اس عہد میں بھی عورتیں ذہنی اعتبار سے کم تر ہی سمجھی جاتی تھیں۔ اپنے شوہر کے علم کو آنکھ بند کر کے بجالانا ان کا فرض تھا۔ ایک مصنف نے اس عہد میں اپنے شوہر کے تئیں بیوی کے فرائض پر اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ اسے اپنے شوہر کے پیروں کی مالش اور وہ تمام کام کرنے چاہئیں جو کہ نوکروں کے لیے مناسب ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی وہ یہ شرط بھی لگاتا ہے کہ شوہر کو راستی کے راستے پر چلنا چاہئے اور اپنی بیوی کے تئیں نفرت یا حسد نہیں رکھنا چاہئے۔ متسیہ پران میں بد چلن بیوی کے شوہر کو یہ حق دیا گیا ہے کہ وہ اس کے سر اور چھاتی کو چھوڑ

کر، کوڑے یا بانس کی چھڑی سے اس کی پٹائی کر سکتا ہے۔اس عہد میں بھی عورتوں کو دید پڑھنے کی اجازت نہیں تھی۔اس کے علاوہ لڑکیوں کی شادی کی عمر بھی کم کر دی گئی جس کے نتیجے میں ان کی اعلیٰ تعلیم کے مواقع بھی ختم کر دیے گئے۔اس عہد کی فرہنگوں میں معلماؤں کا ذکر نہ ملنا اس بات کی علامت ہے کہ عورتوں کی اعلیٰ تعلیم کی حالت ناگفتہ بہ تھی۔تاہم اس عہد میں تحریر کیے گئے کچھ ڈراموں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ شاہی محل کی عورتیں اور رانی کی باندیاں بھی سنسکرت اور پراکرت زبانوں اعلیٰ معیار کی شاعری کر سکتی تھیں۔فنون لطیفہ، خاص طور پر مصوری اور موسیقی میں شہزادیوں کی مہارت کا ذکر مختلف قصوں اور کہانیوں میں ملتا ہے۔اعلیٰ عہدیداروں کی لڑکیاں، طوائفیں اور داشتائیں بھی مختلف فنون لطیفہ کے ساتھ ساتھ شعر وشاعری پر بھی پورا پورا عبور رکھتی تھیں۔

شادی کے سلسلے میں سمرتی لکھنے والوں کا یہ کہنا تھا کہ لڑکیوں کی شادی چھ اور آٹھ سال کی عمر کے درمیان یا آٹھ سال کی عمر کے بعد اور بالغ ہونے سے پہلے پہلے کر دینی چاہئے۔دوسری یا دوبارہ شادی کی اجازت بعض مخصوص حالت میں تھی یعنی اس صورت میں جبکہ شوہر نے بیوی سے کنارہ کشی کر لی ہو (یعنی اس کا کوئی پتہ نہ ہو یا شوہر فوت ہو گیا ہو یا اس نے سنیاس لے لیا ہو، نامرد ہو یا اسے ذات سے باہر کر دیا گیا ہو۔

عام طور پر عورتیں ناقابل اعتبار بھی جاتی تھیں۔انہیں بالکل الگ رکھا جاتا تھا اور وہ ہر حال میں کسی نہ کسی مرد یعنی باپ، بھائی، شوہر یا بیٹے کے تابع ہوتی تھیں۔تاہم گھر میں ان کا پورا احترام تھا۔اگر کوئی شوہر قصوروار بیوی کو بھی چھوڑ دیتا تھا تو بھی اسے اپنی بیوی کا خرچ دینا پڑتا تھا۔زمین کی ملکیت کے حق کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ جائیداد سے متعلق عورتوں کے حقوق میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ایک کنبے کی جائیداد کو محفوظ رکھنے کی غرض سے عورتوں کو اپنے شوہر، باپ یا بیٹے کی جائیداد میں وراثت کا حق دیا گیا۔اگر کسی شوہر کی موت نرینہ اولاد پیدا کیے بغیر ہی ہو جاتی تھی تو بعض حالات کے استثناء کے ساتھ اس کی بیوی کو شوہر کی ساری جائیداد کا حق ملکیت مل جاتا تھا۔اسی طرح بیوہ کی جائیداد پر اس کی لڑکیوں کا حق ہوتا تھا۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ جاگیردارانہ نظام کی ترقی سے نجی جائیداد کے تصور کو استحکام ملا۔

جہاں کچھ مصنفین نے ستی کے رواج کو لازمی قرار دیا تھا وہیں کچھ دوسرے مصنفین نے اس کی مذمت بھی کی۔ایک عرب سیاح اور تاجر، سلیمان کے بیان کے مطابق راجا کی بیویاں کبھی کبھی اپنے شوہر کی چتا پر جل مرتی تھیں، لیکن اس کا دارومدار ان کی اپنی مرضی پر ہوتا تھا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باج گزار سرداروں کے ذریعے بڑی تعداد میں بیویاں رکھنے کے رواج کو بڑھاوا، نیز اس کے نتیجے میں جائیداد کی تقسیم کے سلسلے میں نزاع پیدا ہونے کی وجہ سے بھی ستی کا رواج پھیلا۔

7.2.4 لباس، کھانا اور زیورات (Garments, Food Habits and Ornaments)

اس عہد میں عورتوں اور مردوں کی پوشاک میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور دھوتی اور ساڑی کو مردوں اور عورتوں کی عام پوشاک کی حیثیت حاصل رہی۔اس کے علاوہ شمالی ہندوستان میں مرد مرزائی (صدری) اور عورتیں چولیاں بھی پہنتی تھیں۔مورتیوں کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی ہندوستان میں اونچے طبقے کے لوگ لمبے کوٹ، پاجامے اور جوتے پہنتے تھے۔راج ترنگنی کے مطابق راجہ ہرش نے کشمیر میں ایک راجا کے شایان شان ایک پوشاک کا چلن شروع کیا تھا۔اس شاہی لباس میں ایک لمبا کوٹ بھی تھا کیونکہ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ایک سابق

وزیر اعلیٰ کو اس وجہ سے شاہی عتاب کا نشانہ بننا پڑا تھا کہ اس نے ایک چھوٹا کوٹ پہنا تھا۔ سردی کے موسم میں اونی کمبل استعمال کیے جاتے تھے۔ عام طور پر سوتی کپڑے کا استعمال سب سے زیادہ ہوتا تھا۔ اونچے طبقے کے لوگ ریشمی اور ململ کے کپڑے پہنتے تھے۔ عرب سیاحوں سے اس بات کی توثیق ہوتی ہے کہ مرد اور عورت زیورات کے شوقین تھے۔ مرد اور عورت دونوں ہی سونے کے بازوبند اور بالیاں پہنتے تھے جو بعض اوقات بیش قیمت پتھروں کے بھی بنے ہوتے تھے۔ ایک چینی مصنف، چاؤ جو کوا کا کہنا ہے کہ گجرات میں مرد، عورت دونوں ہی دوہرے دوہرے کن پھول پہنتے تھے اور ان کے کپڑے چست ہوتے تھے۔ سروں پر پگڑیاں ہوتی تھیں اور پیروں میں لال رنگ کے جوتے ہوتے تھے۔ ایک دوسرے مشہور سیاح مارکو پولو کا کہنا ہے کہ مالا بار میں مرد اور عورت دونوں ہی صرف ایک لنگوٹی پہنتے تھے اور اس سلسلے میں راجا کا بھی استثناء نہیں تھا اور درزی نام کی کوئی چیز ہیں تھی۔ کیلون میں بھی لنگوٹی ہی مردوں اور اورتوں کی پوشاک تھی۔ اگرچہ جنوبی ہند کے حکمرانوں کی پوشاک میں کپڑے بہت کم ہوتے تھے لیکن وہ زیورات کے بہت شوقین تھے۔ چاؤ جو کوا کے بیان کے مطابق مالا بار کا راجا بھی اپنی رعیت کی طرح سوتی لنگوٹی پہنتا تھا اور ننگے پیر رہتا تھا، لیکن جلوس کی شکل میں ہاتھی پر سوار ہو کر باہر جاتے وقت وہ اپنے سر پر ہیرے اور جواہرات جڑا تاج (مکٹ) اور سونے کے بنے بازوبند اور پازیب پہنتا تھا۔ مارکو پولو بتاتا ہے کہ راجا سونے، ہیرے اور جواہرات کی شکل میں جو کچھ بھی پہنتا تھا اس کی مالیت ایک شہر کے فدیہ سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔

جہاں تک کھانے یا غذا کا تعلق ہے تو بہت سے علاقوں اور آبادی کے بڑے حصے میں سبزی خوری (Vegeterianism) کا رواج تھا۔ اس عہد کے سمرتیوں کے مصنفین نے ان مواقع کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جب گوشت کھانا جائز ہوتا تھا۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مور، گھوڑا، جنگلی گدھے، جنگلی مرغ اور جنگلی خنزیر کا گوشت کھانا جائز مانا جاتا تھا۔

ہندوستانیوں میں نشہ آور اشیاء کے استعمال کا رواج نہ ہونے کو عرب مصنفین نے کافی سراہا ہے۔ بہر حال یہ ان کی زندگی کو مثالی انداز سے پیش کرنے کی کوشش بھی معلوم ہوتی ہے۔ اس عہد کی ادبی تخلیقات میں شراب خوری کے متعدد حوالے ملتے ہیں۔ شراب تقریبات کے موقعوں خاص طور پر شادی بیاہ، دعوتوں اور سیر و تفریح وغیرہ میں پی جاتی تھی۔ یہ تقریبات عوام کے کچھ طبقات میں کافی مقبول تھیں۔ راجا کے سفر کے دوران اس کے قافلے میں شامل عورتیں بھی شراب نوشی کا پورا پورا مزہ لیتی تھیں۔ جہاں چند سمرتی لکھنے والوں نے تین اونچی ذاتوں کے لیے شراب نوشی پر پابندی لگائی وہیں کچھ دوسری سمرتیوں میں صرف برہمنوں کے لیے شراب نوشی ممنوع قرار دی گئی اور چھتریوں اور ویشیوں کو چند استثناء کے ساتھ شراب پینے کی اجازت دی گئی۔

اس عہد کے ادب سے پتہ چلتا ہے کہ شہروں کے لوگ کھیل کود اور تفریح بازی کے رسیا تھے۔ میلوں اور جشنوں کے علاوہ باغیچوں کی سیر، تیراکی اور مل بیٹھن کا کافی رواج تھا۔ بھیڑوں، مرغوں وغیرہ جیسے جانوروں کی لڑائی اور کشتیوں کے مقابلے وغیرہ عوام میں بہت مقبول تھے۔ سماج کے اونچے طبقے کے لوگ چوسر اور شکار کھیلنے کے شوقین تھے۔ چوگان شاہی تفریح کا وسیلہ تھا۔

7.2.5 تعلیم، سائنس اور علم

وہ تعلیمی نظام جو کہ سابقہ عہد میں بتدریج ترقی کرتا رہا تھا۔ زیادہ تبدیلی کے بغیر اس عہد میں بھی جاری رہا۔ اس زمانے میں اجتماعی تعلیم کے بارے میں کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ لوگ بس وہی سیکھتے تھے جو وہ اپنی گزراوقات کے لیے لازمی سمجھتے تھے۔ لکھناپڑھنا، کچھ ہی لوگوں، خاص طور پر برہمنوں کائستھوں اور اونچے طبقوں کے لوگوں تک ہی محدود تھا۔ کبھی کبھی اعلیٰ تعلیم کا بندوبست مندروں کے ذریعے بھی ہوتا تھا۔ عام طور پر طالب علم کو معلم کے گھر جا کر یا اس کے ساتھ رہ کر اعلیٰ تعلیم حاصل کرنی ہوتی تھی۔ ایسی صورت میں وہ اپنے معلم کو فیس ادا کرتا تھا یا تعلیم کی تکمیل پر نذرانہ (دکھشنا) دیتا۔ طالب علموں کو، خاص طور پر ایسے طالب علموں کو، جو کہ فیس نہیں دے سکتے تھے اپنے معلم کی خدمت کرنی پڑتی تھی۔ زبان کی قواعد (صرف ونحو) منطق، فلسفہ اور ویدوں کی مختلف شاخوں کی تدریس تعلیم کا اہم موضوع تھا۔ کسی دست کاری یا پیشے کی تعلیم دینے کی ذمہ داری تنظیموں پر یا انفرادی طور پر کنبوں پر ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر ہمارے پاس ایسے بیانات موجود ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ ایک سوداگر اپنے بیٹے کو کس محتاط طریقہ سے اپنے پیشے کی تعلیم دیا کرتا تھا۔

زیادہ رسمی قسم کی تعلیم جس میں غیر مذہبی مضامین پر زیادہ زور ہوتا تھا، بعض بودھ وہاروں میں بھی جاری رہی۔ ان میں بہار میں واقع نالندہ یونیورسٹی سب سے زیادہ مشہور تھی۔ اس طرح کے دوسرے بڑے تعلیمی مرکزوں میں وکرم شیلا اور اُدند پورہ تھے جو بہار ہی میں تھے۔ ان تعلیمی اداروں میں جن دور دراز مقامات سے طالب علم حصول علم کے لیے آتے تھے ان میں تبت بھی شامل تھا۔ بیشتر تعلیم مفت ہی دی جاتی تھی۔ ان اخراجات کو پورا کرنے کے لیے اس وقت کے حکمران کافی فراخ دلی سے رقم اور زمین کا عطیہ دیا کرتے تھے۔ نالندہ کو دوسو گاؤں عطیے میں ملے ہوئے تھے۔

کشمیر تعلیم کا دوسرا اہم مرکز تھا۔ اس وقت کشمیر میں متعدد شیو پرست فرقے اور تعلیم وتدریس کے مرکز تھے۔ جنوبی ہندوستان میں مدورائی اور سرنگیری جیسے کئی مقامات پر کئی اہم مٹھ قائم کیے گئے۔ تعلیم کے مختلف مرکزوں میں مذہب اور فلسفے جیسے موضوعات پر بحث و مباحے کی حوصلہ افزائی کی گئی ملک کے مختلف مقامات پر کئی تعلیمی مرکزوں اور مٹھوں کے توسط سے ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک افکار وخیالات تیزی اور آزادی سے پھیلے۔ فلسفے کی تعلیم اس وقت تک مکمل نہیں سمجھی جاتی تھی جب تک کہ فلسفی نے ملک کے مختلف تعلیمی مرکزوں کا سفر کر کے وہاں کے فلسفیوں سے تبادلہ خیال نہ کرلیا ہو۔ ملک بھر میں افکار وخیالات کے پھیلاؤ اور لین دین کے لیے جو طریق کا اختیار کیا گیا وہ ملک کی ثقافتی اور تہذیبی ایکتا کو برقرار رکھنے اور مستحکم بنانے میں بہت اہمیت رکھتا ہے۔

اس عہد میں ملک میں سائنس کی نشوونما اور ترقی کی رفتار دھیمی پڑگئی یہاں تک کہ کچھ وقت گزرنے کے بعد ملک سائنس کے میدان میں اپنی قائدانہ حیثیت سے ہی محروم ہوگیا۔ اس طرح علم جراحت (سرجری) میں زوال کی وجہ یہ تھی کہ لاشوں کی چیر پھاڑ کے لیے صرف نچلی ذاتوں کے لوگ ہی اہل سمجھے جاتے تھے۔ درحقیقت علم جراحت تو نائیوں کا ہی پیشہ بن کر رہ گیا۔ اس طرح علم نجوم نے دھیرے دھیرے علم فلکیات کی جگہ لے لی۔ بہر حال ریاضیات کے میدان میں کسی قدر ترقی ہوئی۔

بھاسکر دوم کی کتاب لیلاوتی کو جو کہ اس عہد میں لکھی گئی تھی کافی عرصے تک ایک اعلیٰ معیاری درسی کتاب کی حیثیت حاصل رہی۔ کچھ معدنیات، خاص طور پر پارے کے استعمال کی شکل میں علم ادویہ نے بھی کسی قدر ترقی کی۔ نباتاتی علوم، نیز جانوروں (ہاتھیوں، گھوڑوں وغیرہ) کے علاج کے موضوعات پر بھی کئی کتابیں لکھی گئیں لیکن اچھے گھوڑوں کی نسل بڑھانے کا کوئی طریقہ دریافت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی جس کی وجہ سے ہندوستان کا سارادارو مدار ایران، عرب اور وسطی ایشیا سے گھوڑوں کی سپلائی پر ہی رہا۔ان علاقوں پر مسلم حکمرانوں کا تسلط قائم ہو جانے کے بعد ہندوستانی راجاؤں کو اچھی نسل کے گھوڑوں کی حصولیابی میں کافی دشواریاں آتی تھیں۔

اس عہد میں ہندوستانی سائنس میں انحطاط اور جمود کے کئی اسباب تھے۔ تجربہ بتاتا ہے کہ سائنس کی ترقی پورے سماج کی ترقی سے جڑی ہوتی ہے۔اس عہد میں معاشرہ اپنے رویے کے لحاظ سے سخت (جامد) اور تنگ نظر ہوتا جارہا تھا۔ مذہبی قدامت پرستی کی وجہ سے شہری زندگی اور رسل ورسائل کے ذرائع میں بھی زوال آتا جارہا تھا۔

اس زوال کا دوسرا اہم سبب یہ تھا کہ ہندوستانیوں نے باہری دنیا میں ہونے والی سائنسی ترقی کی دھارا سے خود کو الگ رکھا۔اس کی ایک جھلک ہمیں وسطی ایشیا کے ایک مشہور سائنس داں اور عالم البیرونی کی تصنیفات سے بھی ملتی ہے جو گیارہویں صدی کے اوائل میں دس سال تک ہند میں مقیم رہا تھا۔ اگرچہ البیرونی ہندوستانی علم اور سائنس کا زبردست معترف تھا لیکن اس نے ملک کے عالموں یعنی برہمنوں کی تنگ نظری کا بھی ذکر کیا ہے۔اس کا بیان ہے کہ ''یہ لوگ (برہمن) مغرور، خود پسند، خود بین اور ضدی ہوتے ہیں۔'' اور اپنے علم میں دوسروں کو شریک کرنے کے معاملے میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں اور اس بات کا پورا خیال رکھتے ہیں کہ کسی دوسری ذات کے کسی شخص خاص طور پر کسی دوسرے ملک کے شخص کو ان کا علم حاصل نہ ہونے پائے۔ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ان کے علاوہ کائنات کے کسی بھی ذی روح کو سائنس کا علم نہیں ہے۔

7.3 ادب اور فنونِ لطیفہ (Literature and Fine Arts)

7.3.1 سنسکرت ادب (Sanskrit Literature)

زیر نظر عرصے کے دوران سنسکرت ہی اعلیٰ خیالات کے اظہار اور ادبِ عالیہ کی تخلیق کا وسیلہ رہی تھی۔ فی الحقیقت ادب کی مختلف شاخوں میں سنسکرت ادب کی تخلیق کا کام زبردست مقدار میں اور شاید اس سے پہلے دور سے زیادہ ہی عمل میں آیا۔ عظیم شنکراچاریہ کے بعد 'ادویتا' فلسفے کے میدان میں رامانج، مادھو، ولبھ وغیرہ نے جو تحریری کام کیے وہ متواتر سنسکرت میں ہی ہوئے۔ان لوگوں کے خیالات جس تیز رفتار سے ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے اور ان پر بحثیں ہوئیں اس سے اس بات کا بخوبی اظہار ہو جاتا ہے کہ سنسکرت اس دور میں کتنا اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں، جن میں مسلم اقتدار والے علاقے بھی شامل تھے، کچھ مخصوص قسم کے اسکولوں اور علمی اداروں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ان اداروں کے کام میں کسی قسم کی مداخلت یا رکاوٹ پیدا نہیں کی جاتی تھی اور یہ متواتر پھلتے پھولتے رہے۔ان میں سے بہت سے اداروں نے کاغذ کے آنے سے بھی فائدہ اٹھانا شروع کیا اور اسے قدیم تحریروں کو دوبارہ لکھ کر مختلف جگہوں تک پہنچانے میں

استعمال کیا۔اس طرح رامائن اور مہابھارت کے کچھ قدیم ترین نسخے، جو آج موجود ہیں، وہ گیارہویں، بارہویں اور اس کے بعد کے عرصے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

فلسفے کے علاوہ کاویہ (Poetry)، ناٹیہ شاستر (Drama)، اپنیاس(Fiction)، چکتسا شاستر (Medicine)، جیوتش ودیا(Austronomy) سنگیت(Music) وغیرہ میں بھی تحریری کام جاری رہا۔ دھرم شاستر (ہندو قوانین) پر بہت سی تفسیریں اور تلخیصیں (ڈائجسٹ) بارہویں سے سولہویں صدی کے درمیان تیار کی گئیں۔ وجنانیشور کی عظیم 'متا کشر' جو ہندو قوانین کے دو بنیادی مکاتیب فکر میں سے ایک کی تشکیل کرتی ہے، اس کی تیاری کو بھی بارہویں صدی سے پہلے نہیں مانا جاسکتا۔ دھرم شاستروں کا ایک اور مشہور و معروف مفسر بہار کا 'چندیشور' تھا جو چودہویں صدی کا تھا۔ زیادہ تر تحریری کاموں کی تخلیق ہندو حکمرانوں کے تحت جنوبی ہندوستان، اس کے بعد بنگال، پھر متھیلا اور مغربی ہندوستان میں ہوئی۔ سنسکرت کی نشو و نما میں جینیوں کا حصہ رہا۔ ان میں سب سے مشہور نام ہیم چندر سواری کا آتا ہے۔ یہ بات خاصی جیب لگتی ہے کہ انہوں نے عام طور پر ملک میں مسلمانوں کی موجودگی کو نظر انداز کیا ہے۔ اسلامی ادب یا فارسی ادب کو سنسکرت میں ترجمہ کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ شاید ایک واحد استثناء جامی کی تحریر کردہ یوسف وزلیخا کی کہانی کے ترجمے کی تھی۔ اسے ہندوؤں کی طرز فکر کی تنگ نظری یا گھرے پن کی ایک اور مثال سمجھا جاسکتا ہے جس کا ذکر البیرونی پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس دور کی موجود حقیقتوں کو نظر انداز کرنا یا ان سے منہ موڑ لینا شاید اس حقیقت کے لیے ذمے دار مانا جائے گا کہ اس دور کے ادب میں زیادہ تر مواد وہرایا گیا ہے اور اس میں تازگی بصیرت، تخلیقی جدت کی کمی ہے۔

7.3.2 عربی فارسی ادب (Arabic and Persian Literature)

حالانکہ مسلمانوں کا تخلیق کردہ ادب زیادہ تر عربی میں تھا جو ان کے پیغمبر کی زبان تھی اور ادب اور فلسفے کی زبان کی حیثیت میں اسپین سے بغداد تک استعمال ہوتی تھی مگر جب ترک ہندوستان آئے تو ان پر فارسی کا بڑا گہرا اثر تھا کیونکہ دسویں صدی کے بعد سے یہی زبان وسط ایشیا اور ایران میں ادب اور حکومت کے انتظامیہ کی زبان ہو گئی تھی۔ ہندوستان میں عربی کا استعمال عام طور پر علماء اور فلاسفہ کے ایک محدود حلقے میں باقی رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین کی تلخیصیں اور ترجمے فارسی میں بھی تیار ہوتے رہے جنہیں خود ہندوستان کے علماء نے ہی تیار کیا تھا۔ ان میں سب سے مشہور فقہہ فیروز شاہی، ہے جسے فیروز تغلق کے عہد میں تیار کیا گیا تھا۔ بہر حال، عربی تلخیصیں تیار کرنے کا کام بھی جاری رہا، چنانچہ ان میں سب سے مشہور فتاوائے عالمگیری ہے جو اورنگ زیب کے دور میں فقیہوں کے ایک حلقے کے تیار کیے ہوئے اسلامی قوانین کا مجموعہ ہے۔

دسویں صدی میں ترکوں کی آمد سے ملک میں ایک نئی زبان 'فارسی' بھی پہنچی۔ اسی زمانے میں ایران اور وسطِ ایشیا میں بھی فارسی میں ایک نئی زندگی اور توانائی آئی اور فارسی زبان کے کچھ عظیم ترین شعراء فردوسی اور سعدی اور عشقِ حقیقی اور صوفیانہ شاعری کے عظیم شعراء، ثنائی، عراقی، جامی، حافظ وغیرہ ہوئے اور دسویں سے چودھویں صدی کے درمیان ان کا زبردست کلام منظر عام پر آیا۔ ترکوں نے بالکل

ابتداے ہی ادب اور انتظامیہ کے لیے فارسی زبان کو اپنا لیا تھا۔ اس طرح اس زبان کی نشو و نما کے لیے ہندوستان میں سب سے پہلا مرکز لاہور بنا حالانکہ اس ابتدائی دور کے فارسی لکھنے والوں میں سے بہت کم لوگوں کا کام اب باقی ہے لیکن ان میں سے کچھ لکھنے والوں جیسے مسعود سعد سلمان کی تحریروں میں لاہور سے ایک گہرے لگاؤ اور محبت کا احساس ہوتا ہے۔ بہر حال اس دور کے سب سے قابل ذکر لکھنے والے امیر خسرو تھے۔ 1252 میں پٹیالی (مغربی اتر پردیش میں بدایوں کے پاس ایک مقام) میں پیدا ہوئے اور انہیں اپنے ہندوستانی ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ کہتے ہیں، ''میں نے ہندوستان کی تعریف و توصیف دو وجہوں سے کی ہے، چونکہ ہندوستان میری جائے پیدائش اور میرا ملک ہے، اور اپنے ملک سے محبت ایک اہم فریضہ ہے۔۔۔ ہندوستان جنت جیسا ہے۔ اس کی آب و ہوا خراسان سے بہتر ہے۔۔۔ یہ پورے سال ہرا بھرا اور ہمیشہ پھولوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہاں کے برہمن اتنے ہی لائق و فاضل ہیں جیسے ارسطو، اور یہاں بہت سے علموں کے بہت بڑے بڑے عالم موجود ہیں''

ہندوستان سے خسرو کی اس والہانہ محبت سے اظہار ہوتا ہے کہ ترک خود کو اب ایک غیر ملکی حکمراں طبقے کی شکل میں دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اب ان کے اور ہندوستانیوں کے درمیان ایک طرح کی ثقافتی مصالحت اور قربت کے لیے میدان ہموار ہو گیا تھا۔ خسرو نے بہت بڑا شاعرانہ ذخیرہ تیار کیا جس میں تاریخی رومانی کہانیاں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے شاعری کی ہر صنف میں لکھا اور فارسی کا ایک نیا طرز ایجاد کیا جسے سبکِ ہندی، یا ہندوستانی طرز کے نام سے جانا جاتا ہے۔

خسرو نے ہندوستان کی زبانوں کی تعریف کی ہے جس میں ہندی (جسے انہوں نے 'ہندوی' لکھا ہے) بھی شامل تھی۔ اُن کے کچھ متفرق ہندی اشعار بھی اُن کی تحریروں میں نظر آجاتے ہیں، لیکن خالق باری، جس کی تالیف کو اُن سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کے متعلق اغلب خیال یہی ہے کہ وہ کسی بعد کے اِسی نام کے شاعر کی تیار کی ہوئی ہے۔ وہ ایک باکمال موسیقار بھی تھے اور مشہور صوفی نظام الدین اولیا کی 'سماع' کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جس دن خسرو نے اپنے پیر نظام الدین کے انتقال (1325) کی خبر سنی، اُسی دن ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ انہیں بھی نظام الدین اولیا کے مقبرے کے احاطے میں ہی دفن کیا گیا۔

شاعری کے علاوہ اس دور میں فارسی میں تاریخ نویسی کی بھی ایک مضبوط روایت اُبھری۔ اس دور کے سب سے مشہور تاریخ نویس منہاج سراج، ضیاء الدین برنی، عفیف اور عصامی تھے۔ فارسی زبان کے توسط سے ہی ہندوستان کے وسط ایشیا اور ایران سے گہرے ثقافتی تعلقات قائم ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ فارسی صرف انتظامیہ اور سیاسی امور کی زبان ہی نہیں رہی، بلکہ سماج کے اعلیٰ طبقے اور اُن سے ملحق اور منحصر حلقے کی زبان بھی ہو گئی۔ یہ صورتِ حال شمالی ہندوستان سے شروع ہوئی اور بعد میں دہلی سلطنت کی جنوب میں توسیع اور ملک کے مختلف حصوں میں مسلم ریاستوں یا بادشاہتوں کے قائم ہونے سے لگ بھگ پورے ملک میں پھیل گئی۔

ملک میں سنسکرت اور فارسی نے خاص طور پر سیاست، مذہب اور فلسفے کے میدانوں میں خاص طور پر رشتے یا واسطے کی زبان کا کام انجام دیا اور ادبی تخلیقات کی بھی یہی زبانیں رہیں۔ شروع شروع میں ان دونوں زبانوں میں بہت کم لین دین تھا۔ ضیاء نقشبندی (فوت 1350) نے سب سے پہلے سنسکرت سے فارسی میں وہ کہانیاں ترجمہ کیں جو ایک طوطے نے اس عورت کو سنائی تھیں جس کا شوہر سفر پر گیا ہوا

تھا۔ 'طوطی نامہ' کتاب جو محمد بن تغلق کے زمانے میں تیار ہوئی تھی بے حد مقبول ہوئی اور فارسی سے ترکی اور بعد میں بہت سی یوروپی زبانوں میں ترجمہ ہوئی۔ اس نے ہندوستان کی قدیم جنسی کتاب کوک شاستر کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔ بعد میں فیروز شاہ کے زمانے میں علم طب یا اوبیہ، اور موسیقی کی کتابیں بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ کشمیر کے سلطان زین العابدین نے مشہور و معروف تاریخ کی کتاب 'راج ترنگنی' اور 'مہابھارت' کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ اسی کی فرمائش پر علم طب اور موسیقی کی کتابیں بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔

7.3.3 علاقائی زبانیں (Regional Languages)

اس زمانے میں بہت سی علاقائی زبانوں میں بھی اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق ہوا۔ کچھ علاقائی زبانوں ہندی بنگالی، مراٹھی وغیرہ کی ابتدا بھی آٹھویں صدی میں ہی تلاش کی گئی ہے۔ کچھ دوسری زبانیں جیسے تامل بہت پرانی زبانیں ہیں۔ بودھ، جینیوں اور ناتھ پنتھی 'سادھوؤں' نے کچھ ''ملی جلی یا بگڑی ہوئی زبانوں'' (اپ بھرنش) اور علاقائی زبانوں کو سنسکرت کے استعمال پر ترجیح دی۔ چودھویں صدی کے شروع میں امیر خسرو نے علاقائی زبانوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: ''اس زمانے میں ملک کے ہر صوبے میں اس کی ایک مخصوص زبان ہے، جو کسی دوسرے سے مستعار نہیں لی گئی ہے۔ سندھی، لاہوری، کشمیری کباری (جموں کے علاقے کی ڈوگری)، دُھر سمندری (کرناٹک کی کنڑ)، تیلنگی (تلگو)، گوجر (گجراتی)، ماباری (تامل)، گوری (شمالی بنگال) بنگالی، اودھ اور دہلی اور اس کے آس پاس بولی جانے والی (ہندوی)'' انہوں نے آگے بیان کیا'' یہ زبانیں زمانہ قدیم سے ہی زندگی کے عام کاروبار میں ہر طرح استعمال ہوتی رہی ہیں۔''

کچھ جدید علاقائی زبانیں، جیسے آسامی، اُڑیا، ملیالم وغیرہ کا ذکر نہیں ملتا۔ بہر حال خسرو نے اس اہم صورت حال، یعنی جدید علاقائی ہندوستانی زبانوں کی نشو نما کی طرف صحیح نشاندہی کی ہے۔ ان میں سے بہت سی زبانوں کا پختگی کی سطح تک پہنچ جانا اور ان کا ادبی تخلیقات میں استعمال ہونا عہد وسطی کی بڑی ممتاز اور قابل ذکر خصوصیت مانی جائے گی۔ اس کی وجوہات متعدد اور مختلف تھیں۔ ممکن ہے برہمنوں کی بالادستی اور حیثیت میں کمی آنے سے سنسکرت کی حیثیت میں بھی کسی قدر کمی آئی ہو۔ بھکتی سنتوں کی طرف سے علاقائی اور عام زبان کا استعمال بھی ان زبانوں کی ترقی کی ایک یقینی وجہ تھی۔ فی الحقیقت، ملک کے بہت سے علاقوں میں سنتوں سادھوؤں نے ہی ان زبانوں کو ادب کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترکوں کی آمد سے پہلے بہت سی علاقائی حکومتوں میں سنسکرت کے ساتھ تامل، کنڑ، مراٹھی وغیرہ بھی استعمال ہوتی تھیں۔ ترک حکومت کے دوران بھی یہ طریقہ جاری رہا ہوگا کیوں کہ ہمیں دہلی سلطنت میں ہندی جاننے والے محاسبوں (اکاؤنٹنٹس) کے تقرر کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں جب دہلی سلطنت منتشر ہوگئی، تب بھی انتظامی امور میں بہت سی علاقائی حکومتوں میں فارسی کے ساتھ علاقائی زبانوں کا استعمال جاری رہا۔ چنانچہ جنوبی ہندوستان میں وجے نگر کے حکمرانوں کی سرپرستی میں تلگو ادب کی نشو ونما ہوئی۔ مراٹھی بہمنی سلطنت کی انتظامیہ کی زبانوں میں سے ایک تھی اور اس کے بعد بیجاپور کے دربار میں بھی یہ صورت برقرار رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب یہ زبانیں ترقی کر کے ایک خاص درجے پر پہنچ گئیں تو کچھ مسلم حکمرانوں نے ان کے ادبی استعمال کے سلسلے میں بھی سرپرستی کی۔ مثال کے طور پر بنگال کے حکمراں نصرت شاہ نے رامائین اور مہابھارت کا بنگالی میں ترجمہ کروایا۔ اسی کی سرپرستی میں مالادھر باسو نے

'بھگوت' کا ترجمہ کیا۔ بنگالی شعراء کو اس کی جو سرپرستی ملی اس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

صوفیوں کی موسیقی کی محفلوں میں بھکتی سنتوں کی ہندی نظموں اور گیتوں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ مشرقی اتر پردیش میں 'چندا ین' کے مصنف ملا داؤد، ملک محمد جائسی وغیرہ نے ہندی میں ہی لکھا اور صوفیانہ تصورات اور خیالات کو اس انداز میں بیان کیا کہ انہیں عام آدمی سمجھ سکے۔ انہوں نے شاعری کی کچھ صنفوں جیسے مثنوی کو بھی عام کیا۔

7.3.4 فنونِ لطیفہ (Fine Arts)

ایک دوسرے کو سمجھنے، قربت اور میل جول کے رجحانات صرف مذہبی اعتقادات اور رسوم، طرزِ تعمیر اور ادب میں ہی نظر نہیں آتے بلکہ یہ فنونِ لطیفہ، خاص طور پر موسیقی کے میدان میں بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ترک جس وقت ہندوستان آئے تھے تو انہیں موسیقی کی بھرپور روایت عربوں سے ورثے میں مل چکی تھی جس کی ایران اور وسط ایشیا میں مزید نشو ونما ہوئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ نئے ساز بھی لائے تھے، جیسے رباب اور سارنگی اور کچھ نئے طرز اور اصول بھی اُن کے پاس تھے۔ بغداد کے خلفاء کے دربار میں ہندوستانی موسیقی اور موسیقاروں نے شاید وہاں موسیقی کی نشو ونما پر بھی اثر ڈالا تھا۔ بہر حال، ان دونوں کے درمیان باقاعدہ تعلق سلطنت دور میں ہی عمل میں آیا۔ امیر خسرو کا ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ خسرو جنہیں 'نایک' یعنی موسیقی کے اصول اور ریاض دونوں کے استاد کا خطاب دیا گیا تھا، انہوں نے بہت سے فارس۔ عرب راگ شروع کیے۔ جیسے ایمن، گورا (غارا) سنم وغیرہ۔ قوالی کی ابتدا بھی انہیں سے منسوب کی جاتی ہے۔ ستار کی ایجاد کا سہرا بھی انہیں کے سر رکھا جاتا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ طبلے کو بھی اُن سے منسوب کیا جاتا ہے مگر اس کی نشو ونما غالباً سترھویں صدی کے آخری حصے میں یا اٹھارویں صدی کے شروع میں ہوئی تھی۔

موسیقی میں قربت اور تکمیل کا عمل فیروز کے عہد میں جاری رہا۔ اس کے عہد میں ہندوستانی کلاسیکی تحریر 'راگ درپن' کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ موسیقی کی محفلیں صوفیوں کی خانقاہوں اور بسیروں سے باہر نکل کر امراء کے محلوں تک پہنچ گئیں۔ جونپور کا حکمراں سلطان حسین شرقی موسیقی کا بڑا مربی اور سرپرست تھا۔ اس دور کے سب سے بڑے موسیقار کے بعد صوفی پیر بودھن کو ہی اگلے نمبر پر مانا جاتا ہے۔ ایک اور علاقہ جہاں موسیقی کی زبردست آبیاری اور نشو ونما ہوئی وہ گوالیار کی ریاست تھی۔ گوالیار کا راجا مان سنگھ موسیقی کا زبردست دلدادہ تھا۔ 'مان کوتوہال' نام کی کتاب، جس میں مسلمانوں کی اختراع کی ہوئی تمام طرزوں کو جمع کیا گیا ہے، وہ اسی کی سرپرستی اور نگرانی میں تیار کی گئی تھی۔ یہ نہیں معلوم کہ شمال ہندوستان کی موسیقی کی طرز جنوبی ہندوستان کی طرز سے کب الگ ہوئی۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ طرز میں یہ فرق زیادہ تر شمالی ہندوستان میں فارس۔ عرب راگوں اور تالوں کی وجہ سے ہی پیدا ہوا۔

سلطنت کشمیر میں ایک بالکل الگ یا ممتاز طرز ابھرا جس پر ایرانی موسیقی کا زیادہ اثر تھا۔ جون پور کو فتح کرنے کے بعد سکندر لودی نے وہاں کی پرانی روایت، موسیقی کی سرپرستی کو بڑے شاہانہ انداز میں برقرار رکھا۔ بعد میں اسے افغان حکمرانوں نے بھی اپنایا اور اس روایت کو اور آگے بڑھایا۔ چنانچہ شیر شاہ کا جانشین عدالی خود موسیقی کا بڑا استاد تھا۔ بہر حال موسیقی کا نقطہ عروج مغل دور میں پہنچا۔

7.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

آٹھویں سے بارہویں صدی کا عہد ہندوستانی تاریخ میں ایک عبوری دور کی حیثیت رکھتا ہے۔اس عہد میں جس طرح سیاسی اور انتظامی میدان میں بہت سی تبدیلیاں واقع ہوئیں ویسے ہی سماج اور اور ثقافت بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکے۔سماج میں سامنت وادی نظام یا بالفاظ دیگر جاگیر داری نظام کو عروج حاصل ہوا۔حالانکہ یہ یورپی جاگیر داری کی طرح نہیں تھااور نہ ہی یہاں مینر نظام اور وسائل پر جاگیر دار کا کنڑول تھا۔زرعی جاگیر داری (Serfdom) کی جگہ یہاں وشٹھی یا بیگار کا نظام تھا،البتہ کسان کو اس کے ہل بیل اور زمین سے محروم نہیں رکھا جاتا تھا۔

سماج میں کئی طبقات تھے جن میں سب سے اوپر راجا یا اس کے سامنت ہوا کرتے تھے۔برہمنوں کو نظریاتی طور پر سب سے اونچا سمجھا جاتا تھا اور انہیں پہلے سے زیادہ مراعات بھی حاصل تھیں،پھر بھی وہ اپنی حفاظت کے لیے چھتریوں کے محتاج تھے،جیسا کہ اگنی کل نظریے سے معلوم ہوتا ہے جہاں برہمن وششٹھ یگیہ کی آگ سے چوہان،پرمار، چندیل اور چالوکیہ کو باہر نکالتے ہیں۔سماج میں حاشیے پر نچلے طبقے، شودر، اچھوت اور انتیج یا ذات باہر لوگ تھے،جن کے کندھوں پر تمام اعلیٰ طبقات کی خدمت اور چاکری کرنا تھا۔البیرونی نے چنڈالوں اور انتیج لوگوں کی بدتر حالت کا بذات خود مشاہدہ کیا ہے۔پاکی اور ناپاکی کا تصور اس عہد تک آتے آتے اتنا سخت اور بے لچک ہو گیا تھا کہ برہمن کے کنویں سے نچلی ذات والا اگر پانی پی لیتا تو اسے سزائے موت دی جاتی تھی۔

برہمنی نظام اس عہد میں بدھ مذہب اور جین مذہب پر مکمل غالب آچکا تھا اور اس کے بہت سے عناصر جیسے مورتی کی عبادت، مندر اور مجسموں کی تیاری وغیرہ بدھ مذہب سے لیے ہوئے تھے۔پال حکمرانوں کی سرپرستی سے بدھ مذہب شمال مشرقی ہند میں زندہ تو تھا مگر وہ اب اپنی آخری سانسیں لے رہا تھا۔برہمن یا ہندو مذہب کی شکتی کی عبادت اور بدھ مذہب کا تانتر مسلک ایک دوسرے میں گڈمڈ ہو چکا تھا۔

سماج میں عورتوں کی حیثیت اور ان کے حقوق میں گراوٹ آئی تھی اور کئی سمرتی کے مفسرین نے بد چلن عورت کو کوڑے مارنے کی سزا سنائی تھی اور اس کا حق مرد کو دیا تھا۔جائیداد اور ملکیت کے طور پر عورتوں کو بھی دان کیا جانے لگا جسے کنیا دان کہا جاتا تھا۔عورتوں کو اغوا کر کے شادی کر لینے کی مثالیں اب عام ہو چکی تھیں جو پہلے کبھی کبھی نظر آتی تھیں۔دشمن کو ہرا کر اس کی عورتوں پر قبضہ کر لینا مردانگی اور ہمت کا کام سمجھا جانے لگا۔عورتوں کو گھونگھٹ ڈالنے اور پردہ کرنے پر زور دیا گیا۔شوہر کے مرنے پر اس کی چتا میں جل جانا (ستی)،دشمن سے بچنے کے لیے خود کو جلا لینا (جوہر) بھی اب عام ہو چکا تھا۔بیواؤں کی شادی پر سختی سے روک لگائی گئی۔مجموعی طور پر عورتوں کی حالت پہلے سے بدتر ہو چکی تھی۔البتہ اعلیٰ طبقے کی عورتوں کو کچھ حقوق حاصل تھے جیسے کی عطیہ دینا، مندر بنوانا اور تجارت میں حصہ لینا، لیکن یہ سب عام عورتوں کی حالت سے بہت دور کی بات تھی۔

اس عہد کے لوگوں کے لباس، رہن سہن اور زیورات میں تبدیلی آئی۔اب یہ ہر شخص کی حیثیت پر منحصر تھا اور ہر ایک اپنے کو دوسرے سے بہتر دکھانے کی کوشش میں لگا رہتا تھا۔سامنتوں کی آپسی لڑائی اور رقابت اس حد تک پہنچی ہوئی تھی کہ جو گھوڑا دوسرے کے

پاس ہے وہ میرے پاس کیوں نہیں ہے،اس پر بھی لڑ پڑتے تھے۔نئے نظام میں پہلے کی سادگی کے بجائے سجنے دھجنے پر زیادہ زور دیا جانے لگا جس کا خمیازہ عام کسانوں اور مزدوروں کو جھیلنا پڑتا تھا۔

تعلیم کے میدان میں کافی ترقی دیکھنے کو ملی،حالانکہ برہمنوں کا زاویہ نظر البیرونی کے مطابق تنگ ہو گیا تھا اور وہ اپنے علم کو دوسرے لوگوں سے چھپانے پر زور دیتے تھے۔اس سب کے باوجود متھرا،کشمیر اور بنارس تعلیم کے بڑے مراکز تھے اور یہاں علم و ادب سے متعلق بہت سی تخلیقات وجود میں آئیں۔

سنسکرت ، عربی اور فارسی میں بہت سی تصنیفات لکھی گئیں اور کچھ پرانی کتابوں کے ترجمے بھی کیے گئے۔اس کے علاوہ فنون لطیفہ،تعمیرات اور موسیقی کے میدان میں ترقی دیکھنے کو ملتی ہے۔بہت سے مندر اس عہد میں بنائے گئے جو پہلے کے مندروں سے شان وشوکت میں عظیم تھے اور ساتھ ہی راجا اپنے نام سے بہت مندر بنوانے لگے اور اسی کے حساب سے ان کی سرپرستی کرتے تھے۔

7.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

رانک،راوت	راجپوتوں کے لیے فارسی مورخین کے ذریعے استعمال کیے جانے والے الفاظ
مکٹ	شاہی تاج،تمغہ
لیلاوتی	بھاسکر دوم کی ایک اہم درسی تصنیف جو 1150 میں لکھی گئی۔
ہندوی	ہندوستانی زبان

7.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

7.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. رانک اور راوت کون تھے ؟
2. ادھی پی کے خطاب کون اختیار کرتے تھے ؟
3. ”کنڈل“ سے کیا سمجھا جاتا ہے ؟
4. وشوپال اور تیج پال کہاں کے سوداگر تھے ؟
5. راج ترنگنی کب لکھی گئی ؟
6. دھرم شاستر کے مطابق کسانوں سے کتنا محصول لیا جاتا تھا ؟
7. پراشر کے مطابق شودروں کا کھانا کھانے سے کیا ہوتا ہے ؟
8. لڑکی کی شادی کی سمرتیوں کے مصنفین نے کیا عمر بتائی تھی ؟

9. دوبارہ شادی کی اجازت کی کیا صورت تھی؟

10. اس دور میں تعلیم کے دو بڑے مراکز کا نام بتائیے۔

7.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. اس عہد کے ذات پات کے نظام پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. اس عہد میں عورتوں کی حالت کا مختصر جائزہ لیجیے۔
3. اس عہد میں لباس کھانا اور زیورات پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. اس عہد میں سنسکرت ادب کی ترقی کا مختصر تجزیہ کیجیے۔
5. اس عہد میں موسیقی کی نشوونما پر روشنی ڈالیے۔

7.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. آٹھویں سے بارہویں صدی کے دوران ہندوستان میں عربی فارسی ادب کے ارتقا پر ایک مضمون لکھیے۔
2. تعلیم اور سائنس کی ترقی پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
3. اس عہد میں عوام کی حالت کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

7.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. André Wink (1990). *Al- Hind: The slave kings and the Islamic conquest*. Vol. 1. BRILL.
2. Catherine B. Asher; Cynthia Talbot (2006). *India Before Europe*. Cambridge University Press.
3. David Ludden (1999). *An Agrarian History of South Asia*. Cambridge University Press.
4. Richard Gabriel Fox (1971). *Kin, Clan, Raja, and Rule: State hinterland Relations in Preindustrial India*. University of California Press.
5. Satish Chandra (1982). *Medieval India: Society, the Jagirdari Crisis, and the Village*. Macmillan.
6. Eugenia Vanina (2012). *Medieval Indian Mindscapes: Space, Time, Society, Man*. Primus Books.
7. Richard Eaton (2019). *India in the Persianate Age: 1000-1765*. Penguin Books Limited.

اکائی 8۔ عرب

(The Arabs)

اکائی کے اجزا

8.0 تمہید

8.1 مقاصد

8.2 جزیرۃالعرب کا محلِ وقوع

8.3 جزیرۂ عرب کے جغرافیائی حالات

8.3.1 آب وہوااور موسم

8.4 اقوام عرب

8.4.1 عربِ بائدہ

8.4.2 عربِ عاربہ

8.4.3 عربِ مستعربہ

8.5 عربوں کی سماجی حالات

8.6 عربوں کے سیاسی حالات

8.7 عربوں کے مذہبی حالات

8.8 عربوں کی تہذیب اوران کا تمدن

8.9 عرب وہند کے تعلقات

8.10 اکتسابی نتائج

8.11 کلیدی الفاظ

8.12 نمونہ امتحانی سوالات

8.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

8.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

8.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
8.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

8.0 تمہید (Introduction)

عرب علمائے انساب کا ماننا ہے کہ عرب نسلی اعتبار سے دو اشخاص عدنان اور قحطان کی اولاد ہیں۔ کچھ دانشور قحطان کو حضرت اسماعیل کی اولاد کہتے ہیں اور کچھ لوگ انہیں سام بن نوح کی اولاد مانتے ہیں۔ ایک تیسری اہم شخصیت قضاعۃ کا بھی ذکر ملتا ہے جسے کچھ ماہرین معد بن عدنان اور کچھ مالک بن حمیر سے منسوب کرتے ہیں۔ ابنِ حزم کے مطابق قضاعہ کا جائے مسکن شام تھا اور اس نسل کے لوگ معدوم ہو چکے ہیں البتہ قحطان اور عدنان کی نسلیں باقی ہیں جن سے "جزیرۃ العرب" آباد ہے۔ اپنے تاریخی سفر میں یہ لوگ مختلف قبائل میں بٹتے رہے۔ وقت کے ساتھ ان میں آپسی میں جول بھی بڑھا۔ ان میں سے کچھ نے تہذیب و تمدن کے اعلیٰ نمونے بھی چھوڑے جن کے آثار و باقیات یمن کے پہاڑی کھنڈروں، محلوں اور پلوں کی شکل میں موجود ہیں جو ان کے عزم و حوصلے اور حسنِ تخیل کا پتہ دیتے ہیں۔ عربوں نے بڑی بڑی جنگیں لڑیں، اور اپنی فتوحات کے ذریعہ کئی اہم بادشاہتیں اور ریاستیں قائم کیں۔ وہ قانونی تصورات اور اخلاقی اصولوں سے آشنا تھے۔ صنعت و حرفت، شجاعت و بہادری، تجارت و معیشت کے میدان کے ماہر شناور تھے۔ ان کی تجارتی سرگرمیوں کا محور بحر احمر اور بحرِ ہند کی ساحلی بندرگاہیں تھیں جو بین الاقوامی تجارت کی شہ رگ کی حیثیت رکھتی تھی۔ عرب تاجر، ملاح اور ان کے تجارتی بیڑے قدیم دنیا کی متمدن اقوام میں بڑی شہرت کے حامل تھے۔ انہوں نے سینچائی اور آب رسانی کے بڑے بڑے منصوبے بنائے تھے۔ جن کے باقیات دیکھ کر ان کی اعلیٰ ہنر مندی اور قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ عربوں کی خوش حالی کا ذکر "ہیروڈوٹس" "ڈائیڈورس" اور "اسٹرابیو" نے بھی کیا ہے۔ یونانی اور رومی ہمیشہ ان کی طرف للچائی ہوئی نظر سے دیکھتے تھے۔ جزیرۃ العرب پر سکندر کے حملے کی وجہ بھی غالباً عربوں کی ناموری اور شہرت تھی۔ عربوں کی تاریخ سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے مورخین نے کئی اہم ماٰخذوں کا مطالعہ کیا اور ان اقوام کی تاریخ استفادہ کیا جو عربوں کے ہمسایہ تھیں۔ ہمیں ایرانیوں کی قدیم تاریخ کے ان اہم پہلوؤں کا جائزہ لینا چاہئے جن کا تعلق براہِ راست عربوں سے تھا۔ اس سلسلہ میں پہلوی زبان کے کتبے اور دستاویزات بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ عراق میں قائم اشوری سلطنت کے کتبے قدیم عرب کے کچھ اہم سیاسی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ ان سے ہمیں عرب قبائل اور ان کے سرداروں کے ناموں کی جانکاریاں ملتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہمعصر اقوام کی تاریخی نگارشات سے شام کی سرحدوں پر آباد عربوں کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ رومی اور یونانی مورخین کی کتابوں میں بھی "جزیرۃ العرب" سے متعلق ایسے واقعات ملتے ہیں جن کا تعلق تیسری صدی قبل مسیح کے حالات سے ہے۔

8.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- عرب کے محلِ وقوع اور اس کے جغرافیائی حالات کو جان سکیں گے۔

- عرب اقوام اوراس کے باشندوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- عربوں کی رہائش اوران کی طرزِ زندگی کو بیان کر سکیں گے۔
- عربوں کے سیاسی اور سماجی حالات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- عربوں کے مذہبی خیالات عقائد و نظریات سے واقف ہو سکیں گے۔
- عربوں کے تہذیب و تمدن پر گفتگو کر سکیں گے۔
- عرب وہند کے تعلقات پر روشنی ڈال سکیں گے۔

8.2 جزیرہ عرب کا محلِ وقوع

ملکِ عرب یا خطہ عرب سے مراد وہ جگہ یا علاقہ جہاں کی اکثریت عربی زبان بولنے والوں کی ہے۔ عرب اقوام کرہ ارض کے جس حصہ پر آباد ہیں اس کو"جزیرۃ العرب" یا "جزیرہ نمائے عرب" کہتے ہیں۔ اس کے تین طرف پانی اور ایک طرف خشکی ہے۔ یہ جزیرہ نما برّاعظم ایشیاء کے جنوب مغرب میں اس مقام پر واقع ہے جہاں ایشیا اور افریقہ کی حدود آپس میں ملتی ہیں اور وہاں سے یوروپ خشکی اور تری دونوں راستوں سے بہت قریب ہے۔ عہدِ قدیم کے لوگ انہیں تین براعظموں ایشیا، افریقہ اور یوروپ سے ہی واقف تھے۔ جزیرۃ عرب کے ذریعہ ہی ان تینوں براِعظموں پر آسانی سے رسائی ممکن تھی۔ الغرض جغرافیائی اعتبار سے عرب کو دنیا کے نقشہ پر انتہائی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس خطہ کی مرکزی اہمیت کی وجہ سے ہی غالباً اسے مذہب اسلام کی دینی تعلیمات کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ آج بھی یہ علاقہ بڑی حد تک اسلامی تعلیمات کا مرکز ہے۔ اس علاقے کے حدود اربعہ اس طرح ہیں کہ مشرق میں خلیج فارس اور بحر عمان، جنوب میں بحر عرب یا بحر ہند، مغرب میں بحر احمر یا بحر قلزم اور اس کی شمالی سرحدیں شام اور عراق سے ملتی ہیں۔

8.3 جزیرۂ عرب کے جغرافیائی حالات

جزیرہ عرب کا بڑا حصہ ریگستان پر مشتمل ہے جہاں پر کوئی آبادی نہیں ہے۔ اس کا شمالی علاقہ زیادہ عرصہ دراز تک بے آب و گیاہ تھا۔ جب کہ جنوبی علاقہ میں اتنی بارش ہو جاتی تھی کہ باقاعدہ کھیتی باڑی اور زراعت کی جاسکے۔ اس جزیرہ نما کے اندر پہاڑوں کا ایک سلسلہ ہے جسے "کوہ سراۃ" کہتے ہیں۔ یہ سلسلہ شام کی سرحدوں سے جاملتا ہے۔ عراق کے دو دریاؤں دجلہ اور فرات کے علاوہ یہاں کوئی بڑا دریا نہیں ہے۔ اس کے زیادہ تر پہاڑ خشک ہیں لیکن کہیں کہیں چشمے بھی ملتے ہیں۔ انہیں چشموں پر قبضہ کے لیے عربوں میں اکثر لڑائیاں ہوتی تھیں۔ بارش عموماً کم ہوتی ہے۔ بارش ہو تو اس کا پانی نشیبی علاقوں میں بہہ کر کھیتوں میں پہونچ جاتا ہے۔ عرب کے جنوبی علاقوں میں جہاں جہاں آب پاشی کا تھوڑا بہت انتظام ہے وہاں گیہوں، جو، لوبیا وغیرہ کی کاشت کی جاتی ہے۔ کچھ علاقوں میں سبزیاں بھی اگائی جاتی ہیں۔ طبعی لحاظ سے اس ملک کے پانچ حصے ہیں۔ (1) تہامہ (2) حجاز (3) نجد (4) یمن (5) عروض۔

تہامہ: وہ حصہ جو بحر قلزم کے سواحل سے کوہ سراۃ تک واقع ہے۔ چونکہ یہ نشیبی علاقہ ہے اس وجہ سے اسے "غور" کہتے ہیں نیز

اس علاقے میں گرمی زیادہ پڑتی ہے۔اس لیے اسے تہامہ ‘‘یعنی پیاس لگنے کی جگہ " بھی کہتے ہیں۔

حجاز: سراۃ کے کوہستانی سلسلہ کو کہتے ہیں۔ جو یمن سے شروع ہو کر شام تک چلا گیا ہے۔ چونکہ یہ نجد اور تہامہ کے درمیان حدّ فاصل کا کام کرتا ہے اس وجہ سے اسے حجاز کہتے ہیں۔

نجد: اسی کوہستان کے مشرقی حصہ کو کو یمن سے شروع ہو کر سماوہ اور عراق تک پہونچتا ہے۔ چونکہ یہ حصہ کچھ ابھرا ہوا ہے اس لیے اسے نجد کہتے ہیں۔

یمن: وہ قلعہ ہے جو نجد کے جنوب سے بحر ہند کے ساحل تک اور مشرق میں حضر موت اور عمان تک پھیلا ہوا ہے۔

عروض: بلاد یمامہ اور بحرین وغیرہ کو کہتے ہیں۔

8.3.1 آب وہوا اور موسم

جزیرہ نما عرب میں بارش کم ہوتی ہے۔ وہاں کی زمینیں بیشتر ریگستانی ہیں۔ عرب میں کوئی مشہور اور قابل ذکر ندی یا دریا نہیں ہے۔ پہاڑ بھی بہت کم ہیں اور جو ہیں بھی ان میں روئیدگی نہیں ہے۔انہیں میں سے جابجا کچھ چشمے نکلتے ہیں۔ جن کی وجہ سے کہیں کہیں سرسبزی و شادابی نظر آجاتی ہے۔ایسے ہی مقامات پر لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ ورنہ اس ملک کا زیادہ تر حصہ پانی سے خالی اور غیر آباد ہے۔ یمن کا خطہ نسبتاً زیادہ سرسبز وشاداب ہے۔اس میں نخلستان اور کھیتیاں بھی ہوتی ہیں طائف بھی ایک شاداب علاقہ ہے۔

ملک عرب کی آب وہوا گرم اور خشک ہے۔ یہاں دھوپ بڑی شدت سے پڑتی ہے۔اس وجہ سے یہاں پر لوٗ بہت تیز چلتی ہے جسے باد سموم (زہریلی ہوا) کہتے ہیں۔ حجاز کے نشیبی علاقوں کا درجۂ حرارت 80ڈگری ہے لیکن کچھ علاقوں میں باد صبا کے لطیف جھونکے بھی آتے ہیں۔ یمن اور اس کے آس پاس کا جنوبی علاقہ سب سے زیادہ شاداب تھا جہاں عرب کے مشہور و قدیم شہر آباد ہیں۔ یمن عہدِ قدیم سے ہی تہذیب وتمدن کا مرکز رہا ہے جہاں پر تاریخ کی چند ممتاز اور مشہور قومیں ابھریں۔ نجران یمن کا ایک مشہور شہر ہے۔ یمن کا دوسرا شہر ’’صنعاء‘‘ تھا اس کے شمال میں مأرب کا وہ مشہور شہر تھا جسے سبا بھی کہتے ہیں۔ مشہور ’’ملکۂ صبا‘‘ یہیں کی رہنے والی تھی یہیں پر وہ مشہور بند تھا جس کا ذکر قرآن پاک میں ’’سدّ مأرب‘‘ کے نام سے آیا ہے۔ سبا، معین، حضر موت اور قتبان عرب کی چار اہم حکومتیں تھیں۔ جن کا تذکرہ عہد نامۂ قدیم میں بھی آیا ہے۔ غرض یہ کہ جزیرہ نمائے عرب ایک ایسا جزیرہ ہے جہاں مختلف موسم، مختلف آب وہوا اور مختلف طرز زندگی پائی جاتی ہے۔اس جزیرہ میں جو قوم رہتی ہے اسے ’’عرب قوم‘‘ کہتے ہیں۔

8.4 اقوام عرب

مورخین اقوام کے نزدیک عرب قوم سامی اقوام کی ایک شاخ ہیں۔ جو کہ حضرت نوح کے بیٹے سام بن نوح کی اولاد میں سے ہیں۔ ماہرین انساب نے انہیں تین زمروں میں تقسیم کیا ہے۔

8.4.1 عرب بائدہ

عربِ بائدہ (فدائے عرب) یعنی عرب کے وہ قدیم باشندے جو پہلے اس ملک میں آباد تھے مگر بعد میں اپنی سرکشی کی بنیاد پر صفحہ ہستی سے مٹا دیے گئے۔اب ان کا نام ونشان باقی نہیں رہا۔ان کے متعدد قبیلے تھے۔عاد، ثمود، عمالقہ، طسم، جدیس، جرہم، حضرموت اور عملیق وغیرہ تھے۔ان میں سے قومِ عاد اور ثمود کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔ارشاد ہے (فَاَمَّا ثَمُودُ فَاُهْلِكُوْا بِالطَّاغِيَةِ وَاَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ)۔ان لوگوں نے عراق سے لے کر مصر اور شام تک بڑی بڑی سلطنتیں قائم کیں۔بابل اور اشور کی حکومت اور قدیم تمدن کے بانی یہی لوگ تھے۔اگرچہ ان کے مفصل حالات کا ذکر تاریخوں میں موجود نہیں ہے مگر اب بابل، مصر، یمن اور عراق کے آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے ان کے بارے میں قابل قدر انکشافات ہو رہے ہیں۔ممکن ہے کہ مستقبل قریب میں ان کے بارے میں نئی اور چونکا دینے والی معلومات سامنے آئیں اور ان سے ہمیں کچھ نئی معلومات حاصل ہوں۔

8.4.2 عرب عاربہ

عرب کے وہ باشندے جو نسلا یعرب بن قحطان کی اولاد میں سے ہیں۔اور جنہیں توراۃ میں یارح بن قحطان کے نام سے پکارا گیا ہے۔عرب عاربہ کو بنو قحطان بھی کہا جاتا ہے۔یہ حضرت نوح علیہ سلام کے بیٹے سام بن نوح کی اولاد سے ہیں قحطان حضرت نوح علیہ السلام کا پوتا تھا جس کے نام پر یہ لوگ بنو قحطان یا قحطانی کہلائے۔یہ لوگ یمن اور اس کے قرب وجوار میں آباد تھے۔بنو جرہم اور بنو یعرب انہی کی شاخیں ہیں۔بنو یعرب میں سے عبدِ شمس جو سبائی کے نام سے مشہور ہے یمن کے تمام قبیلوں کا جد امجد ہے۔اسی نے یمن کا مشہور شہر معارب بسایا تھا اور وہاں تین پہاڑیوں کے درمیان میں ایک بہت بڑا بند باندھا تھا۔اس بند میں بہت سے چشموں کا پانی آ کر جمع ہوتا تھا جس سے بلند مقامات کے کھیتوں اور باغوں کو سیراب کیا جاتا تھا۔یہ بند کچھ مدت بعد کمزور ہو کر ٹوٹ گیا تھا جس سے سارے ملک میں بہت بڑا سیلاب آ گیا تھا اس سیلاب کا ذکر قرآن کریم میں بھی آیا ہے اور عرب کی کہانیوں اور شعروں میں بھی جا بجا موجود ہے۔اس سیلاب سے تباہ ہو کر یمن کے اکثر خاندان دوسرے مختلف مقامات پر جا بسے تھے۔عربی زبان کے اصل بانی یمنیوں کے یہی بزرگ تھے جو اپنے دور میں کافی مشہور تھے۔

ابتداء میں یہ لوگ یمن کے علاقے میں آباد ہوئے مشہور ملکہ سبا یعنی حضرت بلقیس کا تعلق بھی بنو قحطان کی ایک شاخ سے تھا۔کچھ دنوں کے بعد بنو قحطان کو سرزمین عرب کے دوسرے علاقوں میں نقل مکانی بھی کرنا پڑی۔اس کی ایک وجہ تو وہ مشہور سیلاب ہے جو "مارب بند" ٹوٹ جانے کی وجہ سے آیا جس کے نتیجے میں ان لوگوں کو جان بچانے کے لیے دوسرے علاقوں کا رخ کرنا پڑا جس کا ذکر قرآن مجید میں آیا ہے۔دوسری وجہ یہ کہ جب ان کی آبادی بڑھی تو مجبوراً ان کے مختلف قبائل کو یمن سے نکل کر اپنے لیے نئے علاقے تلاش کرنے پڑے جس کے نتیجے میں یہ لوگ جزیرہ نما عرب کے طول وعرض میں پھیل گئے۔کچھ قبائل شام، ایران اور عرب کے سرحدی علاقوں کی طرف بھی نکل گئے اور وہاں اپنی آبادیاں قائم کیں۔قحطانیوں کا ایک قبیلہ بنو جرہم مکہ کی طرف جا نکلا اور زم زم کے چشمے کی وجہ سے حضرت ابراہیم علیہ سلام کی زوجہ حضرت ہاجرہ رضی اللہ عنہا کی اجازت سے وہاں آباد ہو گیا تھا۔

بنو قحطان کا ہی ایک قبیلہ بنو ازد کا بھی تھا۔اس کا سردار ثعلبہ اپنے قبیلہ کے ساتھ یثرب (مدینہ) کی طرف آیا اور یہاں پر آباد بنی اسرائیل کو مغلوب کر لیا۔انہوں نے یہاں پر اپنے قلعے بنائے اور نخلستان لگائے۔مدینہ کے دو مشہور قبیلے اوس اور خزرج کا تعلق اسی قبیلے سے تھا جن کا تاریخ اسلام میں بہت اونچا مقام ہے۔ان دونوں قبائل کی پشتینی لڑائیوں کو ختم کرنے کا سہرا پیغمبرِ اسلام کو جاتا ہے۔ان دونوں قبائل نے آپس میں شیر و شکر ہو کر اسلام اور مسلمانوں کی بڑی خدمات انجام دیں۔

8.4.3 عرب مستعربہ

عربِ مستعربہ کو بنو عدنان بھی کہتے ہیں۔یہ حجاز کے وہ عرب ہیں جو عدنان کی نسل سے ہیں۔اور عدنان حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے تھے۔ان کو مستعربہ اس وجہ سے کہا جاتا ہے کیونکہ انہوں نے عربی زبان قبیلہ جرہم سے سیکھی تھی۔اسی وجہ سے ان کو مستعربہ یعنی (عرب بنی ہوئی) قوم کہا جاتا ہے۔یہ حجاز اور نجد وغیرہ کے باشندے۔ان میں بہت سے قبیلے ہیں جن میں، ربیعہ اور مضرؔ مشہور ہیں۔مضرؔ ہی کی ایک شاخ قریش بھی ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت ہوئی۔سرزمین عرب پر سب سے آخر میں آباد ہونے والے بنو اسمائیل ہی تھے جن کو عرب مستعربہ کہا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے حکم پر اپنی زوجہ حضرت ہاجرہ اور شیر خوار بیٹے حضرت اسمائیل علیہ السلام کو مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں تن و تنہا چھوڑ کر خود واپس چلے گئے۔یاد رہے کہ اس وقت نہ مکہ کی آبادی تھی اور نہ ہی خانہ کعبہ کا وجود۔خانہ کعبہ ویسے تو حضرت آدم علیہ السلام کے وقت تعمیر ہوا مگر خانوادہ ابراہیم علیہ السلام کی ہجرت کے وقت وہ تعمیر معدوم ہو چکی تھی اور پھر بعد میں جب حضرت اسمائیل علیہ السلام کی عمر 15 سال کی تھی تو حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ تشریف لائے تھے اور ان دونوں باپ بیٹے نے مل کر اللہ کے حکم پر اور حضرت جبرائیل علیہ السلام کی رہنمائی اور نگرانی میں خانہ کعبہ کو انہی بنیادوں پر از سر نو تعمیر کیا جن پر کبھی حضرت آدم علیہ السلام نے بنایا تھا۔ظہور اسلام کے وقت عربوں کی یہی دو اقوام (عربِ عاربہ اور عربِ مستعربہ) عرب میں موجود تھیں۔ان کے علاوہ چند یہودی قبائل بھی تھے جو مدینہ اور خیبر کے علاقوں میں آباد تھے۔

عربوں کا نظام زندگی اور طرزِ حیات

ماہرینِ علمِ الاقوام نے سکونت، رہائش اور طرزِ حیات کے اعتبار سے بھی عربوں کو دو زمروں میں تقسیم کیا ہے۔ایک وہ عرب جو خانہ بدوشیانہ زندگی بسر کرتے تھے دوسرے وہ جو شہروں میں سکونت پذیر تھے اول الذکر کو "بدوی عرب" اور موخر الذکر کو "حضری عرب" کہا جاتا ہے۔انہیں عربی زبان میں "اھل الوبر" اور "اھل المدر" بھی کہا جاتا ہے۔پروفیسر عبدالحلیم ندوی نے بھی سماجی اور معاشرتی اعتبار سے عربوں کو دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے۔ا۔بادیہ نشین، یعنی بدوی عرب ۲۔شہروں میں رہنے والے یعنی حضری عرب

بدوی یا بدّو عرب

بدو یعنی بادیہ نشین جو آسمان کی کھلی چھت کے نیچے کھلے ہوئے وسیع بیابانوں میں جہاں سبزہ اور پانی پاتے اپنے اونی اور چرمی خیمے لگا کر

قیام پذیر ہو جاتے اور جب اس جگہ پر ان کے مویشیوں اور جانوروں کا چارہ ختم ہو جاتا تو اپنے خیمے اور ساز و سامان اٹھا کر دوسری چراگاہوں کی تلاش پر نکل پڑتے۔ان کی طبیعت میں سادگی اور مزاج میں تندی اور گفتگو میں سختی ہوتی ہے۔ان کی زندگی کا دار و مدار ان کے جانوروں پر تھا۔ جو اونٹ ، بکری اور گھوڑے اور گدھے تک محدود تھے۔ یہ لوگ خانہ بدوش تھے۔چراگاہوں اور سبزہ زاروں کی تلاش میں ادھر اُدھر منتقل ہوتے رہتے تھے۔ان خانہ بدوش عربوں کی غذا عموماً اپنے جانوروں اونٹ اور بکری کا دودھ گوشت اور کھجور ہوتی تھی۔

حضری عرب

حضری عربوں سے مراد وہ عرب تھے جو شہروں، قصبوں اور بستیوں میں رہائش پذیر تھے۔بدوؤں (بادیہ نشینوں) کے مقابلہ میں ان کی تعداد کم تھی لیکن انہوں نے تہذیبی اور معاشرتی کردار کو فروغ دینے میں اہم کارنامہ ادا کیا تھا۔انہوں نے سیاسی، سماجی اور معاشرتی سطح پر ایک بہترین شہری سماج کی بنیاد ڈالی۔

8.5 عربوں کی سماجی حالت

بدوی سماج کا نظامِ حیات قبیلائی سماج پر مبنی تھا۔جہاں کسی ایک دادا کی اولادیں ایک قبیلہ بن گئیں۔ہر قبیلہ کی قیادت ایک سردار کرتا تھا جسے شیخ کہا جاتا تھا۔ شیخ یعنی سردار کا انتخاب اس کی خاندانی نسبت، بہادری، دانشمندی، اور مروت پر ہوتا تھا۔ان میں سے جو شخص عقلمند، قابل اور سیانا ہوتا اسے شیخِ قبیلہ منتخب کیا جاتا تھا۔بارش کی قلت کی وجہ سے عرب میں کھیتی باڑی کا رواج کم تھا۔اس لیے زیادہ تر لوگوں کا عام پیشہ تجارت تھا۔بدو تجارت کا سامان اپنے اونٹوں پر لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لاتے اور لے جاتے اور مزدوری حاصل کرتے تھے۔اس کے علاوہ وہ بھیڑ، بکریاں،اونٹ اور گھوڑے پال کر انہیں فروخت کرتے اور پیسہ کماتے۔

اسلام کی آمد سے قبل عرب قبائل ہمیشہ جنگ وجدال میں مصروف رہتے تھے۔لوٹ مار، قتل وغارت گری ان کا پیشہ تھا۔ان جنگوں کے جہاں برے اثرات مرتب ہوئے وہیں اچھے اثرات بھی مرتب ہوئے۔بدویانہ زندگی گذارنے کی وجہ سے وہ سیر و شکار کے بھی شوقین تھے۔اونٹ ان کی زندگی کی ریڑھ کی ہڈی تھا۔جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ وہ اس کا گوشت کھاتے ،دودھ پیتے،اس پر سفر کرتے،اس سے سامان ڈھوتے اور اس کی کھال اور اون سے اپنے کپڑے اور خیمے بناتے۔انہیں اونٹوں کے بدلے میں لین دین کرتے،ان کے بدلے میں اپنے قیدیوں کو چھڑاتے، مقتولین کا فدیہ دیتے اور انہیں کو مہر میں پیش کر کے شادی کرتے۔الغرض یہ کہ اونٹ ان کی زندگی کا وہ گراں قدر سرمایہ تھا جس کے بغیر ان کی زندگی مشکل تھی۔

عرب گھوڑوں کو بھی بڑے شوق سے پالتے تھے۔خالص گھوڑوں کی افزائش نسل کے خیال سے ان کا شجرۂ نسب یاد رکھتے تھے۔ چنانچہ اس دور میں اور اس کے بعد بھی عربی گھوڑوں کی دنیا کے بہت سے علاقوں میں خاص کر ایشیا میں بہت مانگ تھی۔غریبی اور بھوک مری بھی ان میں تھی۔واضح رہے چونکہ اس وقت اس میں کوئی خاص قسم کی تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔اس وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ ان کی

معاشی حالت میں کوئی خاص سدھار آیا ہوگا۔ چنانچہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان میں غربت وافلاس اور بھوک مری رہی ہوگی جس کا ذکر قرآن میں یوں کیا گیا ہے۔ "لَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَکُم خَشْیَۃَ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُھُمْ وَاِیَّاکُمْ "،لیکن موجودہ عہد میں حالات یکسر بدل گئے ہیں۔ خشک پہاڑوں اور نیم بنجر صحرائی علاقوں میں تو کوئی خاص تبدیلی نظر نہیں آتی ہے لیکن کویت، نجد، بحرین اور دوسرے خطوں میں تیل کے ایسے نایاب ذخیرے دریافت ہوگئے ہیں جن کی وجہ سے وہاں آج دولت وثروت کی بے حد فراوانی ہے۔آج وہاں پر ایک ایسے نئے تمدن نے جنم لیا ہے جس میں آرام وآسائش کی تمام سہولتیں موجود ہیں۔ سڑکوں کا جال بچھ چکا ہے موٹریں ریل اور کاریں چلنے لگی ہیں۔ کہیں کہیں ریلوے کا نظام بھی قائم ہو گیا ہے۔ تیل نکالنے والی کئی ملکی اور غیر ملکی کمپنیوں نے جابجا نئے نئے شہر آباد کر دیے ہیں۔ان میں عربوں کے لیے آرام وآسائش کے تمام سامان مہیا ہیں۔ عربوں کے قدیم معاشرہ میں شراب اور جوا عام تھا۔ چنانچہ اس کا تذکرہ جاہلی عہد کی شاعری میں بار بار آتا ہے۔انہیں کی شراب کی محفلوں میں گانے کی ایجاد ہوئی، جسے خاص قسم کی لونڈیاں گایا کرتی تھیں۔ مذہب اسلام کی اخلاقی تعلیمات نے ان کو سماجی برائی قرار دیتے ہوئے اس پر سخت پابندیاں عائد کیں۔اسلامی عہد میں ان پر سختی سے عمل کیا گیا، لیکن موجودہ عہد میں کئی عرب ملکوں میں ان سے بے اعتنائی برتی جارہی ہے۔

فال نکالنا

اسلام کی آمد سے پہلے جسے کچھ مورخین دور جاہلیت کہتے ہیں عرب میں تیروں کے ذریعہ اپنی قسمت جاننے کا رواج عام تھا۔ وہ اپنے ترکش میں دو طرح کے تیر رکھتے تھے ایک پر "نعم"(ہاں) لکھا ہوتا اور دوسرے پر "لا"(نہیں) لکھا ہوتا تھا۔ کسی کام پر جانے کے لیے یا کوئی اہم کام شروع کرنے سے پیشتر وہ اپنے اسی ترکش سے تیر نکالتے اگر ہاں والا تیر نکلتا تو وہ اسے اچھا سمجھتے اور اس کام کو انجام دیتے۔اور اگر نہیں کا تیر نکلتا تو اس کام کو کرنے سے پرہیز کرتے تھے۔ شریعت اسلامیہ نے استقسام بالازلام تیروں کے ذریعہ قسمت آزمانے کو حرام قرار دیا۔آج عرب معاشرہ میں اس کا وجود نہیں ہے

غذا

جاہلی عرب بدوؤں کی زندگی کا دارومدار مویشی پالن ہوتا تھا۔ اور وہ اونٹ کا دودھ اور گوشت نیز بکری کے دودھ، گوشت اور کھجور پر اپنا گذارا کرتے تھے۔ روٹی زیادہ ترجو کی ہوتی تھی۔ گیہوں مالداری کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ترکاریاں بھی پائی جاتی تھیں۔لوکی کی سبزی اللہ کے رسول ﷺ کو بہت پسند تھی۔ سرکہ بھی پایا جاتا تھا۔ موجودہ عہد میں تیل کی دولت کی فراوانی نے انہیں دنیا کی تمام آسائشوں سے مالا مال کر رکھا ہے۔

نقدی سکے

عربوں میں تمدن کم ہونے کی وجہ سے نقدی کا استعمال کم ہوتا تھا۔ اشیاء کے تبادلہ سے کام چل جاتا تھا۔ عام طور پر قیمتی اشیاء اور معاملات میں اونٹ کو سکہ کی حیثیت حاصل تھی۔ دیت میں بھی اونٹ ہی دیے جاتے تھے۔ ایک دیت سکوں میں آٹھ ہزار درہم مقرر

تھی۔ سکے روم اور فارس کے ڈھلے ہوتے تھے اور درآمد کیے جانے والے مال کی طرح ان کا استعمال ہوتا تھا۔ چاندی کے سکوں کے لیے ورق کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جو قرآن مجید میں بھی آیا ہے "فَابْعَثُوٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ" (سورۃ الکہف) جب اصحاب کہف نے آپس میں کہا کہ کسی کو اپنے اس سکے کے ساتھ بھیجو۔ ظہور اسلام کے وقت عربوں کے یہاں مستعمل سکے عام طور پر درہم اور دینار تھے جن کی قیمتوں کا تناسب ایک دس کا تھا۔

ناپ تول اور پیمانے

چونکہ مکہ ایک تجارتی شہر تھا اور کے زیادہ تر باشندے تجارت پیشہ تھے اور وہاں تجارت کا بڑا رواج تھا اور مدینہ نخلستانی علاقہ تھا چنانچہ یہاں پر زراعت کا رجحان زیادہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مکہ میں وزن کے پیمانوں کا استعمال زیادہ تھا اور مدینہ میں ناپ تول یعنی مکیال کا رواج زیادہ تھا جس کے بارے میں قرآن شریف میں آیا ہے: "اَوْفُوا الْكَيْلَ اِذَا كِلْتُمْ وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ" پیمانوں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ میں کچھ فرق بھی تھا اس وجہ سے وزن میں مکہ کا اور ناپ میں مدینہ کا صاع معتبر مانا گیا تھا۔

8.6 سیاسی حالت

اسلام کی آمد سے پہلے کبھی بھی پورا عرب کسی ایک حکومت کے ماتحت متحد نہیں تھا۔ عرب کے بعض مقامات پر تو کسی بھی طرح کی کسی بھی طرز کی حکومت کا کوئی نشان نہیں ملتا ہے۔ دور جاہلیہ میں شمالی عرب میں کچھ ریاستیں ایسی ضرور تھیں جو فارس اور روم کے ماتحت تھیں۔ اس کے علاوہ سبھی لوگ آزادانہ زندگی گذارتے تھے ان کے درمیان بڑی خوں ریز لڑائیاں ہوتیں جو کہ جانوروں، چراگاہوں اور چشموں کے اقتدار کے سوال پر ہوتی تھیں۔ ان میں لوٹ مار اور قتل وغارت گری کے کافی مواقع ملتے تھے۔ حالانکہ بدو یہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی لڑائی میں کسی کا قتل ہو۔ لڑائیوں میں اتنا خون خرابہ نہیں ہوتا تھا جتنا کہ شاعروں نے اپنی شاعری میں مبالغہ آرائی کرتے تھے۔ پھر بھی آپسی لڑائیوں کے ذریعہ عرب اپنی آبادی کے بڑھانے میں پابندی کرتے تھے۔ بدو پیٹ بھر کھانا نہیں کھا سکتے تھے، پھر بھی لڑائی کرنے کے لیے آپس میں تیار رہتے تھے۔ بدوں کی زندگی میں مذہبی، سماجی نظریات میں خاندانی دشمنی کا جذبہ سب سے زیادہ طاقتور تھا۔

عرب اقوام میں سے کسی قبیلے کا رہنما شیخ کہلاتا تھا جس کے لیے اس قوم کے سبھی لوگ وفاداری کا جذبہ رکھتے تھے۔ ایک ہی قوم کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ دوستی کا رشتہ رکھتے تھے۔ مختلف اقوام کے ممبر ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی برتتے تھے۔ عرب اپنی قوم کی عزت اور انا کے لیے سب کچھ یہاں تک کہ اپنی زندگی بھی قربان کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ دور جاہلیہ میں شب وروز اس طرز کے واقعات وحادثات پیش آتے رہتے تھے۔ پہلے دو قبیلوں کے کچھ تھوڑے سے لوگوں کے بیچ مارپیٹ ہوتی تھی۔ اس کی وجہ سرحد پر کے جھگڑے یا کسی کی ذاتی بے عزتی ہوتی تھی۔ پھر ان تھوڑے سے لوگوں کے بیچ جھگڑا قوم کے بیچ لڑائی کی شکل اختیار کر لیتا تھا۔ ان لوگوں کے بیچ کا جھگڑا کسی نیوٹرل گروہ کی مداخلت سے ختم ہوتا تھا، جس قوم کے لوگوں میں سے کم لوگ لہولہان ہوتے تھے۔ اسے مدمقابل کو بڑی تعداد میں لہولہان اس کے لوگوں کے لیے معاوضے کے طور پر رقم دینی پڑتی تھی عوام کی قوت برداشت اپنی قوم کے مارے گئے سورماؤں کی کہانیوں کو صدیوں

تک زندہ رکھتی تھی۔

عربوں میں کسی مرکزی حکومت کے نہ ہونے کی وجہ سے یہ قومیں ایک دوسرے کے ساتھ ہمیشہ برسرِ پیکار رہتی تھیں۔ یہ لڑائیاں بہت ہی معمولی وجوہات کو لے کر ہوتی تھیں۔ کبھی کبھی تو یہ لڑائیاں برسوں تک چلتی تھیں۔ بوات کی لڑائی کا معاملہ کچھ ایسا ہی تھا۔ یہ لڑائی مدینہ کی دو قبیلوں اوس اور خزرج کے بیچ محمد کے اس شہر میں آنے سے پہلے کچھ سالوں تک چلی تھیں۔ اسے ''الفجار'' کہا جاتا تھا کہ یہ لڑائی دو قوموں کے بیچ رمضان کے مہینے میں ہوئی جس وقت میں لڑائی جھگڑے پر پابندی لگی رہتی ہے۔ اس لڑائی میں ایک طرف پیغمبر محمد کا خاندان قریش اور ان کے حلیف تھے۔ اور دوسری طرف بنی حوازن تھے۔ اس طرح کی چار لڑائیوں میں سے ایک لڑائی میں ایک نوجوان کی شکل میں محمد نے حصہ لیا تھا۔

ابتدائی لڑائیوں میں سب سے پہلی اور سب سے زیادہ مشہور لڑائی ''بعث'' کی جنگ تھی جو کہ شمال مشرقی عرب کے دو قبیلوں ''بنو بکر'' اور ''بنو تغلب'' کے بیچ پانچویں صدی کے آخر میں ہوئی۔ یہ لڑائی ایک اونٹنی کو لے کر ہوئی۔ یہ اونٹنی ''بعث'' نامی ایک خاتون کی تھی جسے ''بنو تغلب'' کے شیخ نے زخمی کر دیا تھا۔ لڑائیوں کی تاریخ میں یہ ایک بڑی لڑائی تھی جو لگ بھگ چالیس سالوں تک چلتی رہی، جس میں لوٹ پاٹ اور حملہ ہوتے رہے۔ اس بھیانک جنگ کا خاتمہ ''النذر'' کی مداخلت سے ہوا۔ غیر اسلامی عہد کی جنگوں میں سب سے پہلی مشہور جنگ ''الدحیز'' اور ''الغبرا'' ہوئیں۔ اس طرح دور جاہلیت میں جنگوں کا ماحول روزمرہ کی زندگی میں شامل حال رہتا تھا۔

دور جاہلیت میں ایک ہی قوم کے درمیان مال و دولت کے جھگڑوں کا حل عام محفل میں کیا جاتا تھا۔ ایک سے زیادہ قوموں کے بیچ کے معاملے کسی عقلمند شخص کے ذریعہ کیے جاتے تھے۔ ہر قبیلہ اور خاندان اپنے قبیلے یا خاندان کے کسی بھی فرد کی امداد کو ضروری سمجھتا تھا۔ خواہ وہ حق پر ہو یا ناحق پر۔ قبیلے کے ایک آدمی کا آواز لگا دینا لڑائی کے لیے کافی ہوتا تھا۔ اور اگر اس میں کوئی پہلو تہی کرتا تھا تو شعراء اس کی ایسی ہجو کرتے تھے کہ وہ اپنے رتبے سے گر جاتا تھا۔

جن قبیلوں سے عہد و معاہدہ ہو جاتا تھا ان کو حلیف کہتے تھے۔ ان کے ہر فرد کی مدد اپنے قبیلہ کے فرد کی حیثیت سے لازمی ہوتی تھی۔ یہ معاہدہ کبھی بذریعہ افراد ہوتا تھا اور کبھی رؤسائے قبائل کرتے تھے لیکن باوجود اس کے کبھی بھی ایک ہی قبیلے کی دو شاخوں میں لڑائی ہو جایا کرتی تھی جس کے متعدد اسباب ہوتے تھے۔ مگر دو سبب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ا۔ پہلا یہ کہ عربوں کی معیشت اور کاروبار کا دار و مدار اونٹوں پر تھا۔ جن کے لیے وہ چراگاہوں اور پانی کے چشموں کو بہت عزیز رکھتے تھے۔ جہاں ان کے مویشی چریں اور پانی پی سکیں لیکن کوئی ایسا قانون ان کے یہاں موجود نہیں تھا جن کی رو سے ان چشموں اور چراگاوں پر کسی کا حقِ ملکیت مسلم ہو۔ اس لیے انہیں مضافات پر چرواہوں میں جھگڑے ہوتے تھے اور پھر وہ ان کے مالکوں تک متعدی ہو جاتے تھے۔ کمزور فریق کبھی کبھی ترک وطن کر کے دوسری جگہ چلا جاتا تھا۔ اس کی اولاد میں سلسلہ در سلسلہ وہ عداوت کے قصے منتقل ہوتے چلے جاتے تھے۔ یہاں تک کہ جب اس میں خود یا حلیف قبائل کی مدد سے طاقت پیدا ہو جاتی تھی تو وہ آکر اپنے بزرگوں کا انتقام لیتا تھا۔

۲۔ تنازع ریاست یعنی کبھی کسی قبیلے کا سردار مر جاتا اور اس کا بیٹا جانشین ہو جاتا تو اس کے بنی اعمام مقابلے کے لیے کھڑے ہو جاتے۔ اس طرح دونوں شاخوں میں باہم عداوت اور خصومت ہو جاتی۔ جیسے مدینہ کے قبائل ''اوس'' اور ''خزرج'' میں تھی۔

انہیں اسباب میں سے ایک ہی باپ کی اولادوں میں بڑی بڑی خوں ریز لڑائیاں ہو جایا کرتی تھیں اور ملک میں کوئی ایسی طاقت موجود نہ تھی جو ان جھگڑوں کا فیصلہ کرتی۔ اس لیے عرصہ دراز تک ان خصومتوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔ شعراء کی زبانیں دونوں طرف سے اس آگ پر تیل ڈالتی تھیں۔ اور ہر ایک دوسرے کے معائب بیان کر کے اس کی تحقیر کی کوشش کرتا تھا۔ شعرائے عرب کے مجموعہ اشعار پر نظر ڈالنے سے اہل عرب میں زیادہ تر عیب ہی عیب نظر آتے ہیں۔ یہاں تک کی جن قبائل کی شرافت عام طور پر مسلم تھی وہ بھی ان گمراہوں کی زبان سے بے داغ نہیں بچے ہیں۔ چونکہ اس قسم کی عداوتیں اکثر قبیلوں میں رہتی تھیں اس وجہ سے ان میں باہمی لڑائی کے لیے کسی قوی سبب کی ضرورت نہیں پڑتی تھیبلکہ تھوڑی سی تحریک پر بہت سے بچے یتیم اور بہت سی عورتیں بیوہ ہو جایا کرتی تھیں۔

8.7 عربوں کے مذہبی حالات

بدوی عرب میں بدویت جس قدر زیادہ ہوتی تھی، اسی قدر ان کا مذہب محدود اور نچلا ہوتا تھا، بدوی شخص، مذہبی معاملات میں گہرائی تک جانے والا اور غور و فکر کرنے کا عادی نہیں تھا۔ سیدھے سیدھے جو بات اس کو معلوم ہو جاتی یا وہ جو کچھ سیکھ لیتا پختگی سے اس کا پابند ہو جاتا۔ دلیل اور تاویل کی اس کو ضرورت نہیں تھی اپنے مزاج اور نسلی خصوصیات کی بنا پر جس چیز کو وہ مانتا، اس پر وہ پوری طرح سختی کے ساتھ قائم رہتا تھا، اور اس سے تغیر اس کے لیے آسان نہ ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ عام طور پر اپنے قبیلے کے اعتقادات و رسوم کا سخت پابند ہوتا، اور ان کو چھوڑنا اس کے لیے مشکل ہوتا، وہ اس کے علاوہ دوسری باتوں کو بہت کم توجہ سے سنتا اور ان پر مشکل سے ایمان لاتا تھا۔

اسی خصوصیت کی طرف قرآن مجید میں یہ اشارہ ملتا ہے۔ ''اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّنِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ'' یہی وجہ ہے کہ جزیرۃ العرب میں مذہب کی سب سے زیادہ سطحی شکل یعنی بت پرستی عام تھی، اور اس کے علاوہ دوسرے مذاہب نسبتاً قلیل تعداد میں اور کمزور پائے جاتے تھے۔ جزیرۃ العرب میں رسول اکرم ﷺ کی بعثت سے پہلے بت پرستی کے علاوہ مشہور مذاہب میں سے چار مذہبوں کا ایک حد تک رواج تھا، اور وہ تھے عیسائیت، یہودیت، مجوسیت اور صابئیت۔

یوں تو زیادہ تر عرب بت پرست تھے۔ وہ اللہ کو حاکم مطلق مانتے تھے اور تمام مسودات کے شروع (اوپر) اللہ کا نام ہوتا تھا لیکن اللہ عبادت کے لیے نہ تھا۔ قرآن میں تین مشہور بتوں کا نام لات، منات اور عزّا۔ اللہ کی بیٹیاں ہونے کی حیثیت سے شفاعت کے لیے ان کی مدد کی جاتی۔ دوسرے قبیلوں کے بتوں کے نام گنانا لاحاصل ہوگا۔ تقریباً آٹھ سو بت یا ان کی شبیہ کعبہ میں گنجائش کی کمی کے باوجود رکھے گئے تھے لیکن ان میں سے صرف ''ھبل'' کا ایک مجسمہ تھا۔ ''کسی ایک بت کی جانب پر خلوص اعتقاد کی شہادت کہیں نہیں ملتی۔'' ما قبل اسلام کے عربوں کا کوئی کوئی ذہبی صحیفہ نہ تھا اور نہ کوئی سوچا سمجھا علم الاصنام (دیومالا)۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی آبادیاں مختلف مقامات پر تھی لیکن

مشرک عربوں میں یہودیوں یا عیسائیوں کی جانب مخالفانہ جذبات نہ تھے۔ جہاں تک اسلاف کی دعوت کا تعلق ہے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ عرب خواہ وہ عیسائی ہوں یا مشرک وہ اپنے اسلاف کے مذہب کے پابند تھے۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کے روایتی خیالات میں خلل پڑے اور ان کے بزرگوں پر بہتان باندھا جائے۔ مشرک عربوں کا گو اپنے بتوں پر مکمل اعتماد نہیں تھا، پھر بھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کا وجود نہ رسلیم کیا جائے۔ علاوہ اس کے وہ پیغمبر کے مطالبہ کو ناپسند کرتے تھے کہ ہر یقین کو عربوں کی تاریخ کے پیش نظر بہت غور و فکر اور تحسین کے ساتھ قبول کیا جائے۔

اہل عرب زیادہ تر بت پرستی پر یقین رکھتے تھے۔ اور جزیرۃ العرب میں انہیں کی اکثریت اور غلبہ تھا عرب اول اول بت پرست نہ تھے۔ ان میں بت پرستی سب سے پہلے اس وقت آئی جب ان میں کا ایک شخص جس کا نام عمرو بن لحیہ تھا ملک عرب سے باہر کسی غرض سے گیا وہ وہاں سے بت پرستی دیکھ کر اور پسند کر کے واپس آیا۔ اس نے بت پرستی کی ابتدا کی جو آہستہ آہستہ سارے عرب میں پھیل گئی۔ قبیلے قبیلے نے اپنے مخصوص بت کو وہاں رکھنا ضروری سمجھا، اس طرح سے کعبہ بتوں سے بھر گیا۔ کعبہ میں بتوں کی تعداد تین سو ساٹھ (360) بتائی جاتی ہے۔ اور یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ بت مختلف قبائل کے دیوتاؤں کی نمائندگی کرتے تھے۔ عمرو بن لحہ نے جو بت لا کر نصب کیا تھا اس کا نام ہی ''ھبل'' تھا اور بتایا جاتا ہے کہ بنی اسمٰعیل میں بت پرستی اس طرح آئی کہ ان میں کوئی شخص جب مکہ سے ہجرت کرتا تو اپنے ساتھ احتراماً اور تقدیساً کعبہ کا ایک پتھر لے لیتا اور مکہ کے باہر اس کی عبادت کرتا اور اس کا طواف کرتا لیکن بعد کے نسلوں نے پتھروں کی عبادت مستقل مذہب بنا لیا، اور پھر ان کی بُت پرستی پتھروں ہی تک محدود نہیں رہی بلکہ بہت وسیع طریقوں سے عام ہو گئی۔ بعض لوگ اپنے جذبہ کی تسکین ہر جا و بے جا چیز کی عبادت کر کے کر لیا کرتے تھے۔ عدنانی قبائل کے تین بڑے بت تھے۔ ایک کنانہ و قریش کا مشترک بت عزّیٰ، دوسرا قریش کا خاص بت ''ھبل'' تھا تیسرے ثقیف کا بت ''لات''، قریش کا اصل بت ''ھبل'' تھا وہ کعبہ کے اندر نصب تھا۔ اور قرب و جوار کے بتوں میں سب سے بڑا سمجھا جاتا تھا۔ وہ عقیق سرخ کا بنا ہوا تھا، اور شکل انسان کی تھی، دایاں ہاتھ ٹوٹ گیا تھا جس کو قریش نے سونے کا بنا کر لگایا تھا۔ قریش و کنانہ کا مشترک بت ''عزّیٰ'' تھا ''عزیٰ'' مکہ سے ایک رات ک مسافت کی دوری پر مقام ''نخلہ'' میں ایک درخت تھا ''النخلہ'' اس علاقے میں دو تھے ایک النخلہ الشامیہ - النخلہ الیمانیہ۔ قبیلہ ثقیف کا بت لات تھا جو طایف میں نصب تھا۔ اوس اور خزرج کا بت ''مناۃ'' تھا جو مقام ''قُدید'' میں نصب تھا۔ قُدُید مکہ سے و مدینہ کے درمیانی راستہ پر ایک شاداب گاؤں تھا۔

کعبہ کے سامنے زمزم کے پاس اساف و نائلہ دو مشہور بت تھے۔ ان کے علاوہ مکہ میں ایک اور چھوٹا بت تھا جس کو مناف کہا جاتا تھا۔ ان بتوں کے علاوہ جزیرۃ العرب کے دوسرے مختلف قبائل میں حسب ذیل خاص خاص بت متعین تھے۔ یمن میں اہل جرش کا ''یغوث'' خیوا میں ''حمدان'' کا ''یعوق'' قبیلہ بنو الکلاع، حمیری کا نشتر، دومۃ الجندل میں، ہذیل کا ''سُواع'' وغیرہ۔ عرب اپنے بتوں کی سیٹی اور تالیاں بجا کر عبادت کرتے تھے۔ قرآن مجید میں ''وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً''۔ کچھ بتوں کا طواف کیا جاتا تھا ایسے بت دوار کہلاتے تھے۔ بتوں کے لیے قرآن مجید میں اصنام، اوثان اور تماثیل تین الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عربوں کو بتوں کی ایسی عادت ہو گئی تھی کہ جب کوئی بت نہیں ملتا یا سفر میں ہوتے تو کسی بھی چیز کا بت بنا لیا کرتے، مثلاً ریت پر بکری کا دودھ ڈال کر گولہ بنا لیتے اور بعض تو پیشاب سے یہ کام لیتے اور کام

نکال کر پھینک دیتے۔ کبھی مٹھائی کا بت بنا لیتے اور بعد میں کھا لیتے۔

کلبی کا بیان ہے کہ کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اترتا تو چار پتھر لے آتا اور جو پتھر اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دے دیتا۔ وہ بتوں کو لا محدود طاقت و قدرت کے خدا سمجھتے تھے۔ اصل اور سب سے بڑی قدرت کا مالک وہ بھی اللہ تعالی کو سمجھتے تھے لیکن اس کی قدرت و خدائی میں اپنے بتوں کو شریک و معاون اور نمائندہ سمجھتے تھے۔ قرآن مجید کی متعدد آیات کے بیان سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ بتوں کے علاوہ فرشتوں اور جنوں کی پرستش بھی کرتے تھے۔ کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزیمہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی جو جنوں کی پرستش کرتی تھی۔ فرشتوں کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اس لیے ان سے شفارش کے طلبگار ہوتے، ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے۔ اس کے علاوہ کچھ قبائل ستارہ پرست بھی تھے۔ ایک رویت یہ بھی ہے کہ قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتے تھے۔ بنو کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا بنو تمیم زہران ستارہ کی نحم وجذام مشتری کی، قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس ''شعری'' اور بنو اسد عقد کی پرستش کرتا تھا۔ بنی حنیفہ نے اپنا ایک بت حیس (کھجور اور گھی سے ملا کر) بنا رکھا تھا جس کی وہ پرستش کرتے تھے۔ ایک سال جب قحط پڑا تو وہ اس کو نوش کر گئے، چنانچہ ایک شاعر ان کی نسبت کہتا ہے کہ:

اَکَلتْ حَنِیفَۃُ رَبھُّمْ عَامَ التَقَحُّم والمَجَاعۃِ

لَمْ یَحْذَرُو ا مِنْ رَبِّھِمْ سُوء العَوَقِبِ وَالبَتَاعَۃِ

بنی حنیفہ نے قحط سالی کے ایام میں اپنے رب کو کھالیا اور اپنے خدا کا مطلق اندیشہ نہ کیا کہ انجام کار کیا ہوگا انہیں کیا سزا ملے گی۔ مختصرا یہ لوگ بت پرستی میں پوری طرح ملوث تھے اور اپنی تمام تر حاجتیں اور امیدیں انہیں بتوں سے رکھتے تھے اور وہ اس میں کسی طرح کی تبدیلی یا دخل اندازی پسند نہیں کرتے تھے۔ اسلام کی آمد کے بعد بت پرستی کا خاتمہ ہوگیا۔ آج تقریباً پورے عرب میں اسلام اکثریت کا مذہب ہے۔ یہاں پر کچھ یہودی اور عیسائی بھی پائے جاتے ہیں۔

8.10 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہونچے کہ زمانہ جاہلیت کے اس دور کے عربوں کے بارے میں خود عرب مورخین جیسے ابن ھشام، طبری اور ابن خلدون نے اور یونانی اور یہودی مورخین نے اہم تفصیلات پیش کی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کا ذکر تورت میں بھی آیا ہے۔ مگر ان سب روایتوں میں بڑا اختلاف ہے۔ اسی لیے اس زمانہ کی تاریخ حالات اور کوائف کے متعلق کوئی بات قطعیت کے ساتھ نہیں کہی جاسکتی ہے، سوائے ان واقعات اور تذکروں کے جن کا ذکر قرآن شریف میں اور حدیث شریف میں آیا ہے۔

واضح رہے کہ ہم جس دور کی تاریخ کا مطالعہ کر رہے ہیں ٹھیک آج کے دور کی طرح اس دور میں بھی افراد تھے۔ جن میں اچھے اور برے سب لوگ تھے۔ جہاں ان کے اچھے اخلاق وعادات کا تذکرہ ہے۔ اس سے یہ مطلق نہیں سمجھنا چاہئے کہ وہ برائی پورے سماج میں تھی بلکہ ہر دور اور ہر زمانے میں اچھے اور برے لوگ پائے جاتے تھے۔ اسی طرح دور جاہلیت میں بھی تھا بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ زمانہ جاہلیت کی

بعض اچھی خصلتوں کو اسلام نے بھی باقی رکھا اور اس کا خیر مقدم کیا۔

8.11 کلیدی الفاظ (Keywords)

بدوی عرب	:	دیہاتی عرب
حضری عرب	:	وہ عرب جو شہری زندگی گزارتا تھا
فال نکالنا	:	تیروں کے ذریعہ اپنی قسمت یا مستقبل کا حال جاننا۔
دیت	:	خون بہا، وہ رقم جو کسی جرم کے بدلے میں ادا کی جائے۔
درہم	:	عربوں میں رائج خالص سونے کا سکہ
دینار	:	عرب میں رائج چاندی کا سکہ
صاع	:	ناپنے کا ایک پیمانہ
فجار	:	رمضان میں لڑی گئے جنگ جو حرام کے مہینے میں لڑی گئی تھی۔
حلیف	:	معاون یا مددگار

8.12 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

8.12.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. جزیرہ عرب کے پہاڑی سلسلہ کا نام کیا ہے؟
2. طبعی اعتبار سے عرب کو کتنے حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے؟
3. تہامہ کا مفہوم کیا ہے؟
4. بحرِ قلزم سے کوہِ سراۃ تک کے علاقہ کا نام کیا ہے۔
5. نجران کس علاقے کا مشہور شہر ہے؟
6. ملکہ سبا کہاں کی رہنے والی تھی؟
7. قرآن میں کس آبی بند کا ذکر آیا ہے؟
8. عرب قبیلے کا سردار کیا کہلاتا تھا؟
9. قدیم عرب معاشرہ میں ۔۔۔اور۔۔۔۔۔۔ عام تھا؟
10. مذہبِ اسلام کی آمد سے پہلے کے دور کو کس نام سے جانتے ہیں؟

8.12.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. عربِ بائدہ سے مراد کون لوگ ہیں؟
2. عربِ مستعربہ کی وضاحت کیجیے۔
3. بدوی اور حضری عرب کی وضاحت کیجیے۔
4. عرب قبائل کی آپسی لڑائی کی اہم وجہ کیا تھی؟
5. قبیلے کا سردار کون ہوتا تھا اور اسے کس بنیاد پر منتخب کیا جاتا تھا؟

8.12.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. جزیرۂ عرب کی جغرافیائی حالات بیان کرتے ہوئے وہاں کے موسم اور آب وہوا پر روشنی ڈالیں؟
2. عربوں کی سماجی زندگی کیسی تھی؟ وضاحت کریں۔
3. عربوں کے مذہبی حالات کا تفصیل سے جائزہ لیجیے۔

8.13 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. پروفیسر عبدالحلیم — تاریخ ادب عربی
2. فلپ کے حتی — تاریخ ملت عربی
3. اکبر شاہ نجیب آبادی — تاریخ اسلام
4. رابع الحسنی — جزیرۃ العرب
5. فلپ کے حتی — عرب اور اسلام
6. محمد طلعت حرب — تاریخ دول العرب والاسلام
7. اسلم جیراج پوری — تاریخ الامت
8. طبری — تاریخ طبری
9. ابن خلدون — مقدمہ ابن خلدون
10. معین الدین — تاریخ اسلام

اکائی 9۔ غزنوی خاندان

(Ghaznavids)

اکائی کے اجزا

9.0 تمہید

9.1 مقاصد

9.2 سیاسی پس منظر

9.3 الپ تگین

9.4 امیر ناصر الدین سبکتگین

9.4.1 مہمات

9.4.2 سبکتگین کا کردار

9.5 سلطان محمود غزنوی

9.5.1 تخت نشینی

9.5.2 ہندوستانی مہمات

9.5.3 سومنات کا مندر

9.5.4 محمود کا کردار

9.6 محمود کے جانشین

9.6.1 سلطان مسعود اول

9.6.2 سلطان مودود

9.6.3 سلطان ابوالحسین

9.6.4 سلطان عبدالرشید

9.6.5 سلطان فرخ زاد

9.6.6 سلطان ابراہیم
9.6.7 سلطان مسعود سوم
9.6.8 سلطان ارسلان
9.6.9 سلطان بہرام
9.6.10 سلطان خسرو
9.6.11 سلطان خسرو ملک
9.7 غزنوی حکومت کا خاتمہ
9.8 اکتسابی نتائج
9.9 کلیدی الفاظ
9.10 نمونہ امتحانی سوالات
9.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
9.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
9.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
9.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

9.0 تمہید (Introduction)

ایشیاء کی تاریخ میں غزنوی سلطنت کو بے حد اہم مقام حاصل ہے۔اسلامی قانونی نقطہ نظر سے یہ پہلی سلطنت تھی۔ جو خلافت سے کئی معنوں میں مختلف تھی۔ محمود غزنوی اس سلطنت کا پہلا سلطان تھا۔در حقیقت غزنی کی چھوٹی سی امارت جو بخارا کے سامانی حکمرانوں کی ماتحت تھی، کو ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کرنے کا سہرا محمود کے سر ہے۔ہندوستان پر اس کے حملوں اور پنجاب کے غزنی سلطنت میں الحاق نے ہی بعد میں دہلی سلطنت کے قیام کی راہ ہموار کی۔ لیکن اس بات کو لیکر اس کی تنقید بھی کی جاتی ہے کہ اس نے تمام وسائل اور اسباب کے باوجود ہندوستان میں کسی باقاعدہ سلطنت کے قیام کی کوشش نہیں کی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ایشیائی مقبوضات کا خیال اپنے دل سے کبھی نہ مٹا سکا اور وہاں کی تلون پذیر سیاست میں الجھا رہا۔اس اکائی میں ہم غزنوی خاندان کے عروج و زوال پر روشنی ڈالتے ہوے، محمود کے شمالی ہند کی مہمات کے اسباب اور نتائج پر غور کریں گے۔

9.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- غزنوی خاندان کے قیام سے پہلے مسلم دنیا کی سیاسی صورت حال کا مجموعی جائزہ لے سکیں گے۔
- ایک معمولی غلام سے ایک طاقتور امیر بننے کے سلسلے میں سبکتگین کی جدوجہد پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- محمود غزنوی کی عسکری قابلیت اور ہندوستانی مہمات کے بارے میں جان سکیں گے۔
- اس کے جانشینوں کے دور میں سلطنت کے سکڑنے کے عمل کی نشاندہی کر سکیں گے۔

9.2 سیاسی پس منظر

بنو امیہ اور بنو عباس کی خلافت کے زمانہ عروج میں عربوں کی سلطنت کو زبردست عروج حاصل ہو گیا تھا۔ لیکن ہارون رشید کے انتقال کے بعد اس کی طاقت میں زوال کے آثار دکھائی دینے لگے۔ مختلف صوبوں کے صوبہ داروں نے اطاعت کا جوا اتار پھینکا اور خود مختار امیر کا لقب اختیار کر لیا، جبکہ بغداد کی خلافت صرف بغداد کے صوبے اور اس کے ماتحت علاقوں تک محدود ہو کر رہ گئی اور خلیفہ کو صرف مذہبی معاملات میں بااختیار سمجھا جانے لگا۔ طاہری خاندان جنھوں نے سب سے پہلے آزادی حاصل کی وہ خراسان اور ماوراءالنہر کے عظیم صوبوں میں آباد ہو گئے۔ 872ء میں ان کی جگہ صفاریوں نے لے لی۔ صفاری خاندان کی بنیاد سیستان کے ایک لوہار یعقوب لیث نے رکھی تھی۔ اسے اپنی عسکری مہمات کے باعث بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی۔ اپنی باری پر 903ء میں سامانیوں نے انھیں اپنا ماتحت بنا لیا۔ اس خاندان کا بانی اسماعیل تھا جس نے 263ھ خود مختاری کا اعلان کیا۔ وہ انصاف پسند اور رفاہی کاموں میں پیش پیش رہنے والا تھا۔ اس کی حکومت بخارا، ماوراءالنہر، خراسان اور ایران کے بڑے حصے پر تھی۔ سامانی خاندان نے 120 سال تک بڑے اطمینان کے ساتھ حکومت کی۔ پانچویں بادشاہ عبدالملک جس کا انتقال بخارا میں ہوا۔ اس نے اپنا وارث میں ایک کمسن شہزادے منصور کو بنایا۔

9.3 الپ تگین

مرحوم بادشاہ کا ایک ترک غلام الپتگین تھا جو خراسان کے وسیع و عریض صوبے پر حکومت کرتا تھا، اس نے نوجوان شہزادے کا چچا ہونے کا اعلان کر دیا لیکن مخالف دھڑے نے منصور کو تخت پر بٹھا دیا۔ نئے بادشاہ نے الپتگین سے ناراض ہو کر اسے بخارا حاضر ہونے کا حکم دیا۔ اپنی ہونے والی سزا کے ڈر سے وہ خراسان سے بھاگ کر غزنی چلا گیا۔ وہاں پر اپنے قدم جما کر اور شاہی فوجوں کو پسپا کرنے کے بعد اس نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ الپتگین نے اپنے جرنیل سبکتگین کے تحت اپنی فوجوں کو کئی مرتبہ کابل اور لمغان کے صوبوں کو زیر کرنے کے لیے بھیجا جہاں کے ہندو شاہی حکمران اکثر اس کے مخالفین کی مدد کرتے تھے اور انہیں پناہ دیتے تھے۔ سبکتگین نے ان صوبوں کو کافی تاخت و تاراج کیا اور واپسی پر بہت سے قیدیوں اور مال غنیمت کے ساتھ واپس آیا۔ اس علاقے کے ہندو شاہی حکمران جے پال نے جب یہ محسوس کیا کہ اس کے فوجی دستے شمالی حملہ آوروں کی فوجوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے تو اس نے بھاٹیہ کے راجا کے ساتھ اتحاد کیا لیکن پھر بھی وہ ترک حملہ

آوروں کو روکنے میں ناکام رہا۔ البتگین میں 15 سال تک بڑے سکون اور امن سے حکومت کے اور 976ء میں اس کے انتقال کے بعد اس کا بیٹا ابو اسحاق اس کا جانشین مقرر ہوا لیکن وہ دو سال میں ہی انتقال کر گیا لہذا سبکتگین جو اصل میں اس کا غلام اور ایک کامیاب سالار تھا، عمائدین سلطنت نے متفقہ طور پر اسے تخت پر بٹھادیا۔

9.4 امیر ناصرالدین سبکتگین

منہاج السراج کے مطابق سبکتگین ترک نسل کا ایک غلام تھا۔ ایک تاجر نصر حاجی نے اسے خرید کر الپتگین کے پاس فروخت کر دیا۔ سبکتگین نے الپتگین کے دیگر غلاموں کے ہمراہ تعلیم حاصل کی اور ہتھیاروں کا استعمال سیکھا۔ تعلیم پوری ہونے کے بعد وہ بادشاہ کے ذاتی محافظ دستے میں شامل ہو گیا۔ نہایت طاقت ور اور پھرتیلا ہونے کے باعث جنگل میں وہ اس کے لیے شکار کیا کرتا تھا۔ اوائل عمر میں ہی اس میں مستقبل کی عظمت کی جھلک نظر آرہی تھی۔ اس کا سرپرست اس کی صلاحیتوں کو بہت سراہا تھا اور بہت سی عسکری مہمات کے سلسلے میں اس پر بہت زیادہ اعتماد کرتا تھا۔ جلد ہی ہیں وہ فوج میں اہم عہدوں پر فائز کر دیا گیا۔ آخر کار غزنی میں شاہی اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس نے اپنے حمایتیوں کو خوب نوازا۔ سبکتگین نے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ناصرالدین کا لقب اختیار کیا مگر وہ خود کو امیر ہی کہلاتا رہا۔

9.4.1 مہمات

قندھار کو مطیع کرنے اور اپنی سلطنت میں شامل کرنے کے بعد اس نے زابلستان کی راجدھانی بست کے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ وہاں اس کی ملاقات مشہور زمانہ ابوالفتح سے ہوئی جنھیں ان کے علم و فضل اور ذہانت کے باعث سبکتگین نے اپنا مصاحب خاص بنالیا۔ اس کے بعد لاہور کے ہندو شاہی حکمرانوں سے مقابلہ کرنا پڑا جو سبکتگین کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو اپنے لیے خطرہ سمجھتے تھے اور اس کے مخالفین کی مدد کرتے تھے۔ اس وقت ہندو شاہی خاندان کی باگ ڈور ہسپال کے بیٹے جیپال کے ہاتھوں میں تھی۔ جس کی حکومت ایک طرف دریائے سندھ سے لمغان دوسری جانب کشمیر سے ملتان تک پھیلی ہوئی 977ء میں سبکتگین نے ہندو شاہی سرحدوں کے مضافات میں حملہ کیا اور اور متعدد فتوحات کے بعد بہت سے مال غنیمت کے ساتھ ساتھ غزنی واپس آیا۔

جے پال جو اس وقت بھٹنڈا کے قلعے میں رہائش پذیر تھا، اس نے محسوس کیا کہ ترکوں کے پے در پے حملوں نے ملک کے امن و امان کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ لہذا اس نے ایک بہت بڑی فوج تیار کی اور بے شمار ہاتھیوں کے ساتھ دریائے سندھ عبور کیا اور لمغان کی طرف پیش قدمی کی جہاں اس کی مڈبھیڑ سبکتگین سے ہوئی۔ اس جنگ میں سبکتگین کے لڑکے محمود نے جو ابھی نو عمر تھا، سپاہیانہ کارناموں کے جوہر دکھائے۔ رات کے وقت زبردست طوفان باد و باراں اولے پڑنے کی وجہ سے ہر طرف خوف و ہراس اور تباہی پھیل گئی لاہور کے راجا کے دستے جو اس سردی کے عادی نہیں تھے بری طرح متاثر ہوئے اور ان کے بے شمار مویشی ہلاک ہو گئے۔ راجا نے جب اپنی فوج کو منتشر ہوتے دیکھا اس نے امن کی تجویز پیش کی۔ سبکتگین اس درخواست کو قبول کرنے پر رضامند ہو گیا مگر نوجوان محمود جو کہ پرجوش جنگجو تھا صلح کے حق میں نہیں تھا، اس پر راجا نے سبکتگین کے پاس کہلوایا کہ اگر اب آپ نے ہمیں جنگ پر مجبور کیا تو اب ہم اپنے بیوی بچوں کو مار کر تم سے لڑتے

لڑتے مر جائیں گے یعنی راجپوتی رسم ورواج کے مطابق جوہر ادا کریں گے۔

سبکتگین جو راجا کو مایوسی کی حالت میں تصویر نہیں کرنا چاہتا تھا وہ شرائط ماننے پر تیار ہو گیا راجا بھی امن کی قیمت کے طور پر 10 لاکھ درہم اور پچاس ہاتھی دینے پر رضامند ہو گیا۔ راجا نے پوری رقم کو اپنے پڑاؤ میں رہتے ہوئے ادا کرنے سے معذور بتا کر اپنے ساتھ چند با اعتماد افراد کو لیا تا کہ لاہور سے باقی ماندہ تمام وصول کی جا سکے، جبکہ یرغمال کے طور پر کچھ لوگوں کو سبکتگین کے پاس رہنے دیا۔ تاہم راجا نے اپنی راجدھانی میں اپنے آپ کو محفوظ پا کر اپنے برہمن شیروں کی ہدایت پر عمل کیا اور معاہدے سے پھر گیا اور اس نے مسلمان افسران کو قید میں ڈال دیا۔ سبکتگین جو اس وقت تک غزنی پہنچ چکا تھا، اس نے جب یہ سنا تو سخت غضبناک ہو گیا۔ اس نے اسی وقت ہندو راجا کی طرف سے کی گئی توہین کا بدلہ لینے کے لیے بہت بڑی فوج کے ہمراہ لمغان کی طرف پیش قدمی کر دی۔

جے پال نے آنے والے طوفان کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کر لیا تھا۔ اس نے اپنے حلیفوں اور ماتحت باجگذاروں کا ایک لشکر جرار تیار کر لیا تھا۔ بقول فرشتہ اس کی متحدہ فوج دس ہزار گھڑ سوار اور بے شمار پیادہ افواج پر مشتمل تھی۔ اس نے ترک حملہ آوروں کو پیچھے دھکیلنے کے لیے لمغان کی سرحدوں پر اپنے لشکر کو ترتیب دیا۔ سبکتگین نے قریبی پہاڑی پر قبضہ کرنے کے بعد ہندوستانی لشکر کا جائزہ لیا۔ جس کے بارے میں بیان کیا جاتا ہے کہ وہ سمندر کی طرح لا متناہی تھا۔ اس نے اپنے سرداروں کی مستقبل کی شان و شوکت کے بارے میں حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اور ان سے شجاعت کا مظاہرہ کرنے کی درخواست کرتے ہوئے ہر ایک کو فرداً فرداً احکامات دیے اور تعداد میں کم اپنے سپاہیوں کو پانچ پانچ سو کے دستوں میں تقسیم کر دیا اور انہیں حکم دیا گیا کہ وہ مخالف لشکر کے کمزور مقامات پر پے در پے حملہ کریں۔ ہندوستانی سپاہی جو جم کر لڑنے کے عادی تھے اس طرح کے حملوں کے سامنے کمزور پڑنے لگے۔ وہ جب تک جنگ کے لیے تیار ہوتے تب تک دشمن ضرب لگاؤ اور بھاگو کے اصول کے تحت کافی نقصان کر کے جا چکا ہوتا تھا۔ اس طرح سے جے پال کے لشکر میں ابتری پھیل گئی۔ سبکتگین نے جب یہ دیکھا تو اس نے عام حملے کا حکم دے دیا۔ ہندوستانی سپاہی ہر مقام پر ہزیمت اٹھا کر بھاگ نکلے۔ ترک فوجی دستوں نے نیلاب کے کنارے تک ان کا تعاقب کیا۔ سبکتگین نے دریائے سندھ کے مغربی علاقوں سے بھاری تاوان وصول کیا اور لمغان اور پشاور کو اپنی سلطنت کی مشرقی سرحد بنانے کے بعد دس ہزار گھوڑ سواروں کے ہمراہ اپنے ایک افسر کو مفتوحہ علاقے کا نظم و نسق سونپا اور غزنی کی طرف لوٹ گیا۔

سبکتگین اپنی باقی ماندہ زندگی میں اپنی سلطنت کے شمال مغرب میں عسکری مہمات میں مصروف رہا۔ وہ اگست 997ء میں 56 سال کی عمر میں بیس سال حکومت کرنے کے بعد بلخ کے نزدیک نیمروز میں انتقال کر گیا۔ اس کی میت کو دفن کرنے کے لیے غزنی لے جایا گیا۔

9.4.2 سبکتگین کا کردار

سبکتگین ایک ایسا بادشاہ تھا جس میں غیر معمولی شجاعت اور ہوشمندی کے علاوہ مساوات و اعتدال پسندی بھی بدرجہ اتم موجود تھی۔ اس کا وزیر ابوالعباس فضل تھا جو حکومت کے معاملات کو بڑی ذہانت و قابلیت سے نپٹاتا تھا۔ ماثر الملک کے مصنف کے مطابق سبکتگین کے بیٹے محمود نے اپنے باغ میں ایک نہایت عالیشان گھر تعمیر کروایا اور ایک نہایت پر تکلف دعوت میں اپنے والد کو مدعو کیا۔ اس عمارت کی

خوبصورتی ذوق اور کمال فن نے نوجوان شہزادے کو اس بات پر اکسایا کہ وہ اس کے بارے میں اپنے والد کی رائے حاصل کرے۔ لیکن سبکتگین نے نہایت مایوسی کی حالت میں اپنے بیٹے سے کہا کہ اس نے اس مکان کو محض ایک کھلونے کی مانند دیکھا ہے جسے اس کی رعایا میں سے دولت کے ذریعے سے کوئی بھی تعمیر کر سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ ایک شہزادے کا کام یہ ہے کہ وہ شہرت کی ایسی دیرپا یادگار تعمیر کرے جو شان و شوکت کے ستونوں کی طرح ہمیشہ قائم رہیں۔ اچھے کارناموں کی طرح جو پیروی کے قابل ہوں اور اولاد ان پر سبقت لے جانے میں دشواری محسوس کرے۔

9.5 سلطان محمود غزنوی

9.5.1 تخت نشینی

جب سبکتگین کا انتقال ہوا تو اس کا سب سے بڑا لڑکا محمود نیشاپور میں تھا۔ اس کے دوسرے بیٹے اسماعیل نے آخری لمحات میں اپنے والد کے پاس ہوتے ہوئے اس سے اپنی جانشینی کے لیے رضامندی حاصل کرلی اور اپنے والد کے انتقال کے بعد نہایت سنجیدگی سے مسند حکومت پر بیٹھ گیا۔ تاہم تجربہ کار ہونے کی وجہ سے محمود بھی تخت وتاج پر اپنا دعویٰ رکھتا تھا لہذا اس نے اپنے چھوٹے بھائی سے کہا اگر وہ باقی ماندہ حصے سے دستبردار ہو جائے تو وہ اسے بلخ اور خراسان پیش کر دے گا اور اسکی خود مختار حیثیت بھی تسلیم کرلے گا۔ ناعاقبت اندیش بھائی نے اس پر خلوص پیش کش کو ٹھکرا دیا اور جنگ کی تیاریاں کرنے لگا۔ محمود بھی پوری تیاری کے ساتھ میدان میں آیا۔ اس کو اپنے چچا بوعزا اور سب سے چھوٹے بھائی ناصر الدین یوسف کی حمایت حاصل تھی۔ اسماعیل کے دستوں کے آگے ہاتھیوں کی قطار تھی جو اس کو اپنے باپ سے ورثے میں ملے تھے دونوں فوجوں میں غزنی کے قریب زبردست جنگ ہوئی۔ ایک مایوس جدوجہد کے بعد اسماعیل نے بذات خود اپنی شکست کو تسلیم کرلیا اور اپنے بھائی محمود کو قلعہ اور خزانے کی چابیاں پیش کر دیں جس نے اسے تاحیات نظر بند کر دیا۔

محمود جب تخت پر بیٹھا تو اس کی عمر تیس سال تھی اور وہ اس وقت عنفوان شباب میں تھا۔ فوجی مہمات میں اپنے والد کے ساتھ مستقل ساتھ دینے اور اس کی طرف سے خود مختار فوجی کمانیں سونپے جانے کے باعث اسے فن حرب وضرب میں زبردست تجربہ حاصل ہو گیا تھا۔ جبکہ امن کے فنون کے معاملے میں اس کے اندر ایک عظیم شہزادے کی سبھی صلاحیتیں موجود تھی۔ تخت پر بیٹھنے کے بعد اس نے سب سے پہلے بخارا میں سامانی حکمران کو اپنی اطاعت پیش کرنے کے لیے سفیر روانہ کیا لیکن اس کے تھوڑے عرصے بعد دشمنوں کے ہاتھوں سامانی خاندان کا خاتمہ ہو گیا، نتیجتاً 999ء میں محمود نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور سامانی خاندان کے دشمنوں سے جو بلخ اور خراسان پر قابض تھے، بدلہ لینے کی قسم کھائی۔ چند روز کی جنگ کے بعد یہ تمام علاقے محمود کی حکومت میں شامل ہو چکے تھے۔ ان مہمات کی وجہ سے اس کی شہرت بغداد کے دربار تک جا پہنچی۔ عباسی خلیفہ القادر باللہ نے اس کے لیے ایک نہایت قیمتی خلعت روانہ کیا اور اسے امین الملت اور یمین الدولہ کا خطاب عطا کیا۔ اس نے سلطان کا لقب اختیار کیا، ایسا کرنے والا وہ پہلا مسلم حکمران تھا۔ اس سے پہلے کے تمام حکمران اپنے آپ کو امیر کہلاتے رہے۔ محمود نے سامانی خاندان کے غاصب بخارا کے حکمران ایلق خان کی بیٹی سے شادی کر لی۔ اپنے باپ کی طرح محمود کو بھی بہت جلد

ہندوستان کی طرف توجہ دینا پڑی جہاں ہندوشاہی حکمران جیپال سبکتگین کے انتقال سے فائدہ اٹھاکر کر اپنے کھوئے علاقے واپس لے چکا تھا اور غزنی پر حملہ کرنے کے لیے تیاری کر رہا تھا۔

9.5.2 ہندوستانی مہمات

پہلا حملہ- اگست 1001ء میں دس ہزار منتخب گھڑ سوار فوج کے ساتھ اس نے غزنی سے پشاور کی طرف پیش قدمی کی۔ یہاں پر لاہور کا راجا جے پال 12 ہزار گھڑ سوار اور 30 ہزار پیدل فوج اور 300 ہاتھیوں کے ہمراہ اس کے مقابلے پر آیا۔ راجپوت فوجی بڑی بہادری سے لڑے لیکن آخر کار وہ محمود کے منظم گھڑ سوار دستوں کے سامنے پسپا ہو گئے اور انہیں شکست فاش کا سامنا کرنا پڑا۔ میدان جنگ میں ان کے پانچ ہزار سپاہی مارے گئے۔ جے پال اور اس کے 15 سر کردہ سرداروں کو محمود نے قیدی بنا لیا۔ اس فتح سے محمود کو بہت زیادہ شہرت اور دولت حاصل ہوئی مال غنیمت میں ہیرے جواہرات سے مزین 16 ہار بھی اس کے قبضے میں آئے جن کو صرف جیپال زیب تن کرتا تھا۔ ان کی مالیت 82 ہزار پاؤنڈ تھی۔ اس فتح کے بعد محمود نے بھٹنڈا کی طرف پیش قدمی کی اور اس کے قلعے پر حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ آئندہ موسم بہار میں اس نے جے پال کو اس شرط پر رہا کر دیا کہ وہ سالانہ خراج ادا کرے گا لیکن اس نے اس کی پنجاب کی طرف پیش قدمی کے دوران مخالفت کرنے والے والے افغان سرداروں کو تہہ تیغ کر دیا۔ ضعیف ہندو راجا جے پال نے محمود کی طرف سے ہونے والی شکست اور شکست کی وجہ سے ذلت محسوس کرتے ہوئے اور اپنے آپ کو حکومت کرنے کا نااہل سمجھتے ہوئے اپنے بیٹے اننگ پال کے حق میں دستبردار ہونے کا فیصلہ کر لیا اور اپنی تیار کردہ چتا پر اپنے دیوتاؤں کے لیے اپنی قربانی پیش کر دی۔

دوسرا حملہ- محمود نے 1004ء سیستان میں ایک فوجی مہم سے واپس آنے کے بعد یہ دیکھا کہ ہندوستان سے خراج مکمل طور پر ادا نہیں کیا گیا۔ لاہور کے راجا اندر ڈالنے اپنا حصہ ادا کر دیا تھا لیکن بھاٹیہ کے ایک باجگزار راجا وجے رآئے نے اپنا حصہ روک لیا اور مسلمانوں سے نہایت تلخ رویہ اختیار کرنے کے علاوہ ان گورنروں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگا جنہیں محمود نے ہندوستان میں تعینات کیا تھا۔ محمود ملتان کے راستے سے راجا کے علاقے میں داخل ہوا اس نے دیکھا بھاٹیہ کو ایک نہایت بلند فصیل سے قلعہ بند کیا گیا ہے اور اس کے ارد گرد ایک گہری اور کشادہ خندق ہے۔ جنگ شروع ہوئی راجپوت فوجی نہایت بے باکی سے لڑے اور ترک حملہ آوروں کو کئی بار پیچھے دھکیل دیا۔ یہاں تک کہ محمود کے فوجی جنگ سے منہ موڑنے لگے۔ محمود نے جب یہ دیکھا تو بذات خود لشکر کے سامنے آیا اور پرجوش جملوں سے اپنے لشکر کی حوصلہ افزائی کی۔ اس کے بعد کی جنگ کافی خونریز تھی۔ دونوں لشکروں نے پیچھے نہ ہٹنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ بالآخر ترکوں کے منظم دستوں نے راجپوت فوج کے قدم اکھاڑ دیے اور اور اسے قلعے میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔

اگلی صبح بھاٹیہ کے قلعے کو مکمل طور پر محصور کر لیا گیا کیا اور صرف چند دنوں میں چاروں طرف کی خندقوں وں کو بھر دیا گیا۔ وجے رائے نے جب یہ دیکھا کہ اپنی پوزیشن کو مستحکم رکھنا اب ناممکن ہو گیا ہے تو اس نے قلعہ خالی کر دیا اور اس کے دفاع کیلیے ایک مختصر سی چھاؤنی کو وہاں چھوڑنے کے بعد اس نے اپنے باقی ماندہ دستوں کے ہمراہ دریائے سندھ کے کناروں پر اگے جنگل میں پناہ لے لی۔ محمود کی فوج کے ایک

دستے نے جنگل میں اس کا تعاقب کیا۔انہوں نے اس کے مورچے پر حملہ کیااور اسے تنگ گھاٹیوں کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔اس کے بہترین دوست اس کا ساتھ چھوڑ گئے اور جب اسے قیدی بنایا جانے لگا تو اس نے اپنی تلوار سے اپنی زندگی ختم کرلی۔اس کے پیروکار جنہوں نے اپنے آقا کی موت کا بدلہ لینے کی کوشش کی ان میں سے بے شمار کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ایک حملے کے ذریعے بھاٹیہ پر قبضہ کر لیا گیا۔280 ہاتھی بہت سے غلام اور دیگر مال غنیمت بادشاہ کے ہاتھ لگا اور وہ ایک فاتح کی حیثیت سے غزنی کی طرف لوٹا۔

تیسرا حملہ- ملتان کے پہلے مسلمان حکمران شیخ حمید سعدی نے امی سبکتگین کی اطاعت قبول کرلی تھی اور اسے خراج ادا کرتا تھا۔اس کے بعد ناصر کا بیٹا اور اس کا پوتا ابوالفتح داؤد غزنی کے سلطان کا مطیع وفرمانبردار رہا۔لیکن 1005ء میں اس نے لاہور کے راجا انندپال سے ساز باز کر کے بغاوت اختیار کی اور سالانہ خراج ادا کرنے سے انکار کیا۔کل ہم نے ملتان کے دوبارہ فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔لہذا موسم بہار کے آغاز میں بہت بڑی فوج کے ہمراہ اس نے اس مقام کی طرف پیش قدمی کی۔پشاور کی پہاڑیوں میں انندپال کی فوجوں نے اس کا مقابلہ کیا لیکن غزنی کی فوج نے انہیں زبردست شکست سے دوچار کیا اور دریائے چناب کے کنارے پر سودرا کے قصبہ تک ان کا تعاقب کیا۔ننگ پال اپنے دارالحکومت کو چھوڑ کر کشمیر کی طرف بھاگ گیا۔محمود بھٹنڈا کے راستے ملتان کی طرف بڑھا اور سات روز تک اس کا مکمل محاصرہ کیا آخر کار داؤد کو گرفتار کر لیا گیا اور اسے اس وعدے پر معافی دے دی گئی کہ وہ بیس ہزار طلائی درہم سالانہ خراج کے طور پر ادا کرے گا۔ہوسکتا ہے سلطان ہندوستان میں اپنا قیام طویل کرلیتا مگر اس کے سسر اور کاشغر کے بادشاہ ایلق خان کیطرف سے اس کے مغربی علاقوں پر حملے کے باعث اسے مجبور غزنی کی طرف لوٹنا پڑا۔اس نے ہندوستان کے معاملات ایک ہندو شہزادے سیوک پال کے سپرد کیے جو پشاور کے حاکم ابوعلی کے اثر رسوخ سے مسلمان ہو گیا تھا۔

چوتھا حملہ- اس کے نائب سیوک پال کی بغاوت نے محمود کو 1005-06ء میں دوبارہ ہندوستان کی سرزمین پر لا کھڑا کیا کیونکہ اس نے سلطان کے تمام افسروں کو ان کے محکموں سے نکال دیا تھا۔محمود نے سب سے پہلے اپنے رسالے کے ایک حصے کو پیش قدمی کرنے کے لیے حکم دیا۔دستوں نے راجپوت فوج کے سامنے غیر متوقع طور پر ظاہر ہو کر انہیں زبردست شکست سے دوچار کیا۔سیوک پال کو قیدی بنا لیا گیا اور اسے چار لاکھ درہم جرمانے کے طور پر ادا کرنے پر مجبور کیا گیا اور باقی ماندہ ساری زندگی سرکاری قیدی کے طور پر رکھا گیا۔

پانچواں حملہ- ملتان کی بغاوت میں انندپال کی حمایت اور غدارانہ رویہ محمود کے سینے میں کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا۔چنانچہ 1008ء کے موسم بہار کے شروع میں ایک فوج لے کر وہ ہندوستان کی طرف چلا۔ترکوں کی طاقت سے گھبرا کر انندپال نے آس پاس کے تمام راجاؤں اور ماتحت جاگیرداروں سے مدد کی درخواست کی اور مشترکہ دشمن کے خلاف متحدہ محاذ بنانے کی پیشکش کی۔اس طرح اس نے کافی بڑی فوج تیار کر لی۔یہاں تک کہ پنجاب کے کے شمال مغربی پہاڑی علاقے کے طاقتور قبیلے گکھڑ کے بھی ہزاروں افراد اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔جنگ کی شروعات میں چھ ہزار مسلمان تیراندازوں نے راجپوت لشکر پر تیر برسانا شروع کیے،جس پر جواب میں راجپوت فوج بھی نہایت بہادری کے ساتھ ترک لشکر سے بھڑ گئی۔زبردست خوں ریزی شروع ہوگئی۔نہایت ہی مختصر وقت میں پانچ ہزار ترک فوجی مارے گئے،تاہم دشمن کی پیش قدمی کو روکنے کے لیے ترک فوج کے ایک منظم دستے نے ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا اور بے شمار کو قتل کر دیا۔دریں اثناء ایک ایسا واقعہ رونما ہوا جو راجپوت فوج کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوا۔وہ ہاتھی جس پر سوار ہو کر لاہور کا راجا ہندوستانی فوجوں کو احکامات دے رہا تھا،نفت کے

گولوں کی آواز اور اور تیروں کی بارش سے بے قابو ہو کر بھاگ نکلا۔اس سے راجپوتوں کے لشکر میں زبردست خوف وہراس اور ابتری پھیل گئی۔انہوں نے خیال کیا کہ شاید ان کا راجا بھاگ نکلا ہے لہذا وہ منتشر ہو کر پیچھے ہٹ گئے۔ترکوں نے ان کی ابتری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے عبداللہ طائی کی سرکردگی میں چھ ہزار عربی گھڑ سواروں اور ارسلان جاذب کی سربراہی میں دس ہزار ترک وافغان اور خلجیوں کے ہمراہ مورچوں کو پار کیا اور دشمن کا تعاقب کرتے ہوئے بہت زیادہ کشت وخون کیا۔ترکوں کے ہاتھ 30 ہاتھی اور بہت زیادہ مال غنیمت آیا۔اس فتح کے فورا بعد بعد شہر نگر کوٹ کی طرف چڑھائی کی گئیاور پہلی مرتبہ ان کے بتوں کو توڑا اور ان کے مندروں کو زمین بوس کر دیا۔شہر کو تاخت وتاراج کرنے کے بعد قلعے کا محاصرہ کیا گیا۔یہ ایک ڈھلوانیں پہاڑ کی چوٹی پر واقع تھا۔اس میں ایک انتہائی شاندار مندر تھا جس میں بہت سے راجاؤں کی بے شمار دولت جمع کی ہوئی تھی۔قلعہ سر کرنے کے بعد مندر پر قبضہ کر لیا گیا وہاں کے پجاریوں کو تو معافی دے دی گئی مگر وہاں کے مال ودولت کو جمع کر کے غزنی لے جایا گیا اور باقاعدہ نمائش کے ذریعے وہاں کے لوگوں کو دکھایا گیا۔درحقیقت ان مندروں میں برسوں سے چڑھاوے میں آنے والی بے شمار دولت جمع تھی جو کسی بھی فاتح کو اس کی طرف متوجہ کرنے کے لیے کافی تھی۔

چھٹا حملہ- 1011ء میں محمود نے تھانیسر کو فتح کرنے کا ارادہ کیا۔ہندو اس کا اسی طرح احترام کرتے تھے جس طرح مسلمان مکہ مکرمہ کا کرتے ہیں۔آنند پال نے محمود کو اس حملے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کافی رقم ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا، لیکن محمود نے اس کی پیش کش کو ٹھکرا دیا۔اس نے شہر پر قبضہ کر لیا،اس کے شہریوں کو لوٹ لیا ان کے بڑے بڑے عظیم الشان مندروں کو تباہ کر دیا اور بتوں کو پاش پاش کر دیا۔ان بتوں میں سب سے اہم بت کو "جگسوم" کہا جاتا تھا اور اس کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ یہ روز تخلیق سے موجود ہے۔اسے بے شمار ٹکڑوں کی صورت میں غزنی مکہ مکرمہ اور بغداد روانہ کیا گیا کیا تا کہ گلیوں میں پاؤں تلے روندا جاسکے۔تھانیسر کے مندروں سے محمود کو بے پایاں دولت حاصل ہوئی۔

ساتوں حملہ- 1013ء میں محمود نے ایک بہت بڑی فوج کے ہمراہ بلوات کی پہاڑیوں میں واقع نندونہ کے خلاف پیش قدمی کی اور بھرپور حملے کے بعد چھاؤنی کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔انند پال کے بیٹے اور جانشیں جے پال دوم نے جب یہ محسوس کیا کہ وہ سلطان کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ہے تو اس نے اپنی فوج کے ہمراہ کشمیر کا رخ کیا۔محمود نے پہاڑی علاقے میں ایک حاکم کو تعینات کیا اور بغیر کوئی دقیقہ فروگزاشت کیے کشمیر کی طرف روانہ ہوا۔اس پر لاہور کے راجا نے صوبے کو خیر باد کہا اور پہاڑوں کی طرف بھاگ گیا۔محمود نے کشمیر کی تمام عظیم الشان دولت کو لوٹ لیا اور لوٹ مار کے نہایت بیش بہا سامان کے ساتھ اپنی راجدھانی کی طرف لوٹ گیا۔

آٹھواں حملہ- دو سال کے بعد سلطان نے چند باغی سرداروں کو سزا دینے اور چند قلعوں کو فتح کرنے کے لیے جن پر گزشتہ ماہ کے دوران حملہ نہیں کیا گیا تھا دوبارہ کشمیر کا رخ کیا۔ان میں سب سے زیادہ اہم لوہ کوٹ کا قلعہ تھا جو اپنی بلندی اور مضبوطی کے لیے بہت مشہور تھا۔گرمی کے موسم کے دوران اس مقام کو فتح کرنے کے لیے سلطان کی تمام کوششیں ناکام ہو گئیں۔پھر جاڑے کی شروعات پر سلطان کو اس مہم کو چھوڑ کر مجبوراً غزنی واپس جانا پڑا۔

نواں حملہ-1017ء کے موسم بہار میں سلطان ایک لاکھ گھڑ سوار اور بیس ہزار پیادہ فوج کے ہمراہ قنوج کی طرح بڑھا۔ قنوج کا راجا بڑی شان و شوکت اور جاہ و جلال کا حامل تھا لیکن دفاع کیلیے پوری طرح تیار نہ ہونے کے باعث اس نے پر امن طور پر صلح کرلی۔ اس کے بعد اس نے میرٹھ کی طرف پیش قدمی کی۔ وہاں کے راجا ہری دت رائے نے بھی اطاعت قبول کرلی۔ اس کے بعد وہ جمنا کے کنارے پر آباد مہاون کی طرف بڑھا اور اسے تسخیر کرلیا۔ راجا کیل چند نے مایوسی کی حالت میں پہلے بیوی بچوں کو قتل کیا اس کے بعد اپنی تلوار کی نوک کو اپنی جانب کر کے اپنا خاتمہ بھی کرلیا۔ اس کے بعد اس نے متھرا کا رخ کیا جو واسودیو کرشن کا شہر تھا۔ قلیل مزاحمت کا سامنا کرنے کے بعد اس میں لوٹ مار شروع کردی گئی۔ کئی مندروں کو توڑ دیا گیا اور وہاں موجود زرو جواہرات کو لوٹ لیا گیا۔ محمود بیس دن تک قنوج میں ٹھہرا۔ چند چھوٹے راجا کو مطیع کرنے کے بعد سلطان لوٹ مار کی دولت اور بے شمار قیدیوں کے سمیت غزنی کی طرف لوٹا۔ محمود ہندوستان میں اپنے قیام کے دوران ہندوستان کے فن تعمیر کی خوبصورتی سے بڑا متاثر ہوا۔ اپنی راجدھانی پہنچنے کے بعد اس نے وہاں پتھر اور سنگ مرمر کی ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی۔ اس نے اسے قالین و جھاڑ فانوس اور سونے اور چاندی کے ساز و سامان سے مزین کیا۔ وہ اسے آسمانی دلہن کہتا تھا اس کے درباری عمرہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ وہ دارالحکومت کو نت نئی محلات و سرکاری عمارات سے مزین کرنے میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کرتے تھے۔ محمود نے سرکاری خزانے کی مدد سے شاہی مسجد کے قرب و جوار میں ایک عظیم الشان جامعہ نہایت عالم فاضل مصنفین کی کتب پر مبنی دار المطالعہ اور قدرتی عجائبات اور فن کے نمونوں پر مشتمل عجائب گھر تعمیر کرایا۔ فن تعمیر کے ذوق و شوق میں اضافہ ہوا اور ایک مختصر سے وقت میں محمود کا دار الخلافہ خوبصورت مساجد، بارہ دریوں، فواروں، تالابوں، محرابی نالوں اور چوبچوں سے مزین ہو گیا۔ وضع قطع اور کاریگری کے لحاظ سے گزشتہ ادوار کی کوئی عمارت ان کی برابری نہیں کرسکتی تھی۔ 1019ء میں سلطان محمود نے بغداد کے خلیفہ القادر باللہ کے پاس اپنی فتوحات کی ایک سرگزشت روانہ کی۔ اس نے اسے شہر کے مسلمانوں کے عظیم الشان اجتماع کے سامنے پڑھ کر سنایا۔ اس طرح محمود کا مقصد اپنی شہرت کو دور دراز جاز علاقوں تک پہنچانا تھا۔

دسواں حملہ-1021ء میں راجپوت راجاؤں کی متحدہ فوج نے قنوج کے راجا کنور رائے پر حملہ کردیا کیونکہ اس راجا نے محمود سے صلح کرلی تھی۔ محمود ہندوستان کی طرف پیش قدمی کیمگر اس سے قبل کے وہ قنوج پہنچتا اس پر کالنجر کے راجا نندا میں قبضہ کرلیا تھا۔ اس نے کنور رائے اور اس کے متعدد سرداروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کی موت کا بدلہ لینے کے لیے سلطان کالنجر کی طرف روانہ ہوا اور رائے نندا کو بھاگنے پر مجبور کردیا۔ اسکے بعد اس نے لاہور کی اہمیت کے پیش نظر اسے اپنی سلطنت میں شامل کرلیا۔ محمود کے خلاف وفاق میں شامل ہونے کی وجہ سے آنند پال اپنے انجام سے باخبر تھا لہذا محمود کے آنے سے پہلے ہی وہ بھاگ نکلا۔ محمود نے لاہور کا انتظام اپنے پسندیدہ مشیر اور جنرل ملک ایاز کے سپرد کیا۔ ملک ایاز نے لاہور کا قلعہ اور فصیل تعمیر کرائی اور شہر کو وسیع اور خوبصورت بنایا۔ محمود نے یہاں ایک ٹکسال بھی قائم کروائی لاہور کا نام بدل کر محمود پور رکھا۔

گیارواں حملہ- اس کے دو سال بعد محمود نے کالنجر کے راجا نندا کو مزہ چکھانے کے لیے دوبارہ ہندوستان کی طرف پیش کی، کیونکہ گزشتہ مہم کے دوران وہ سزا سے بچ گیا تھا۔ وہ اس کے خلاف لاہور کے راستے سے بڑھا اور گوالیار سے گزرنے کے بعد اس نے اس جگہ کے قلعے کا محاصرہ کر

لیا۔ لیکن راجا نے اطاعت کر لی اور اس طرح وہ محفوظ رہا۔ نندارائے نے بروقت اطاعت نعت اور قیمتی تحائف پیش کر کے اپنے آپ کو آفت سے بچا لیا۔ اسے قبول کر لیا گیا اور اس سے اپنے علاقوں کے قبضے پر بحال رکھا گیا۔

بارہواں حملہ۔ محمود کافی عرصے سے کاٹھیاواڑ کے ایک ساحلی شہر سومنات کے مشہور و معروف مندر کی دولت اور تقدس کے بارے میں سنتا چلا آ رہا تھا۔ وہاں پر ہندوستان کے سبھی حصوں سے پجاری جمع ہوتے تھے۔

9.5.3 سومنات کا مندر

ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ سوم دیوتا جس کے نام پر یہ مندر مشہور تھا، اس کو تمام ارواح پر مکمل اختیار حاصل ہے۔ اس کے بارے میں اس عقیدے کا اظہار کیا جاتا تھا کہ وہ تمام تناسخوں کو باقاعدہ بناتا ہے اور علیحدہ روحوں کو سزا و جزا دینے کی طاقت بھی اسی کے پاس ہے۔ مندر بہت عالی شان تھا اور تمام پجاری اس کی بڑی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ یہاں پر سارے ملک سے چڑھاوے اور نذرانے پیش ہوتے تھے۔ سلطان محمود نے 1024ء کی ستمبر کے مہینے میں غزنی سے ہندوستان کی طرف کوچ کیا۔ اس کے ہمراہ فوج کی تعداد تقریباً چالیس ہزار گھڑ سوار تھی۔ ملتان کے صحرا کو عبور کرنے کے بعد مغربی راجستھان ہوتے ہوئے، راستے کی رکاوٹوں کو دور کر کے وہ نہایت تیزی کے ساتھ سومنات پہنچا۔ مندر کے قلعہ کا راجپوتوں نے بڑی مضبوطی اور جواں مردی سے دفاع کیا اور تین دن ترک حملہ آوروں قلعے کے پاس تک پھٹکنے نہیں دیا۔ چوتھے روز اس نے اپنی جنگی حکمت عملی میں تبدیلی کی اور چاروں طرف سے محاصرہ کرنے کے بجائے ایک مقام پر تیز ترین یلغار کی۔ یہ حملہ کچھ اس قدر تیز تھا دشمن کے سنبھلنے سے پہلے ہی اس کے پانچ ہزار فوجی مارے جا چکے تھے۔ باقی ماندہ فوج اپنی جان بچانے کے لیے کشتیوں پر سوار ہو گئی لیکن ترکوں نے ان کا تعاقب کیا اور بے شمار کشتیوں کو ڈبو دیا۔ سلطان مندر میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ اس کے بیٹے اور چند امراء اور سردار تھے۔ جیسے ہی وہ ایک عظیم الشان ایوان میں داخل ہوا، اس نے اپنے سامنے پتھر کا ایک نو فٹ بلند بت دیکھا۔ برہمنوں نے سلطان کے سامنے پیشکش رکھی کہ اگر وہ بتوں کو چھوڑ دے تو سب سے بڑی مقدار میں سونا دیں گے۔ یہاں تک کے محمود کے درباریوں نے بھی اسے اس سے باز رہنے کے لیے کہا۔ لیکن محمود نے ان کے خیالات کو یہ کہتے ہوئے رد کر دیا کہ وہ تاریخ میں بت فروش کے بجائے بت شکن کہلانا زیادہ پسند کرے گا۔ بت کے اندر سے بیش قیمتی ہیرے جواہرات برآمد ہوئے۔ بت کے ٹکڑوں کو لے جا کر غزنی کی جامع مسجد کے دروازے اور شاہی محل کے دروازوں پر پھینک دیا گیا۔ سومنات میں مختصر قیام کے بعد سلطان نے کچھ میں گنداوا اور مشہور شہر انہل واڑہ فتح کیا۔ اس کے بعد سندھ کے راستے غزنی کی طرف لوٹ گیا۔ سومنات کی مہم اور گجرات کے معرکے میں اڑھائی سال صرف ہوئے۔

تیرہواں حملہ۔ ہندوستان کے لیے محمود کی آخری مہم کا آغاز 1027ء میں ہوا۔ یہ مہم دریائے سندھ کے کناروں پر آباد بعض جاٹ قبائل کے خلاف تھی۔ انہوں نے گجرات سے واپسی پر مسلمانوں کی فوج سے چھیڑ چھاڑ کی تھی جس کا خمیازہ انہیں اس مہم کے دوران بھگتنا پڑا۔ اس کے بعد ہندوستان پر بڑے پیمانے پر مزید کسی حملے کا ارادہ نہیں کیا گیا۔ تھوڑے عرصے بعد محمود پتھری کے باعث بری طرح بیمار ہو گیا اور 29 اپریل 1030ء کو 63 سال کی عمر میں 33 سال حکومت کرنے کے بعد انتقال کر گیا۔ اسے غزنی کے قصر فیروزی میں دفن کیا گیا۔

9.5.4 محمود کا کردار

ذاتی طور پر وہ میانہ قد و قامت، خوب طاقتور اور متناسب الاعضاء اور اپنے ساتھیوں سے زیادہ سخت جان تھا۔اس کی فوج میں صرف چند لوگ ہی اس کے گرز کو چلا سکتے تھے یا اس کا نیزہ پھینک سکتے تھے۔اس کے چہرے پر چیچک کے گہرے نشانات تھے۔ محمود کی نجی زندگی کے بارے میں بہت کم پتہ چل سکا ہے۔اس کی چہیتی بیوی کا نام حرم نور تھا جس سے بہت زیادہ حسین و جمیل ہونے کے باعث مہر شغل (خوبصورتیوں کا سورج) بھی کہا جاتا تھا۔وہ محمود کے دیرینہ دشمن اور کاشغر کے ازبک بادشاہ ایلق خان کی بیٹی تھی۔فرصت کے اوقات میں سلطان کٹر مذہبی ہونے کے باوجود انگور کی شراب سے بھی دل بہلا لیتا تھا۔وہ علم و ادب کا دلدادہ تھا۔ابوالفضل کے مطابق کوئی ایسا بادشاہ نہیں گزرا جس کے پاس اس کے دربار میں محمود کے مقابلے میں زیادہ علماء و فضلاء موجود ہوں، یا اتنی بہترین فوج کا انتظام ہو، یا اس جیسی شان و شوکت ہو۔اس کا انصاف بے لچک تھا جس میں وہ اپنے رشتے داروں اور دوسرے لوگوں میں کوئی امتیاز نہیں کرتا تھا۔شاہ محمود قریشی وفات کے وقت ایک ایسی سلطنت اپنے پیچھے چھوڑی جو کسی بھی زندہ بادشاہ کو مجھ سے بہت زیادہ بڑی تھی۔اس کی سلطنت کشمیر سے اصفہان اور بحیرہ خزر سے گنگا تک پھیلی ہوئی تھی۔وہ عالم اسلام کا پہلا سلطان تھا۔دنیا کے مشہور ترین فاتحین میں اس کا نام شامل ہے۔

9.6 محمود کے جانشیں

9.6.1 سلطان مسعود اول

سلطان محمود غزنوی نے اپنے ترکہ میں دو بیٹے محمد اور مسعود چھوڑے۔ مسعود باپ کے انتقال کے وقت اصفہان میں تھا لیکن محمود کے سسر کزل ارسلان کے بیٹے امیر علی نے محمد کو غزنی کے تخت پر بٹھا دیا۔تاہم محمد نے ابھی صرف پانچ ماہ حکومت کی تھی،اس کے بھائی مسعود نے اسے اندھا کر کے معزول کر دیا اور خود سلطان بن گیا۔

سلجوق ترکوں کو محکوم بنانے کے بعد مسعود نے ہندوستان کے معاملات کی طرف توجہ مبذول کی اور 1033ء میں اس نے کشمیر کے پہاڑوں میں سرسوتی کے قلعے پر حملہ کر دیا۔ محافظ دستے نے بھرپور مزاحمت کی لیکن مسعود نے دیوار کے ساتھ سیڑھیاں محصول ے کا حکم دیا اور ایک زبردست اور خونریز لڑائی کے بعد قلعہ پر فتح حاصل کر لی گئی۔ عورتوں اور بچوں کو چھوڑ کر پورے فوجی دستے کو تہ تیغ کر دیا گیا۔عورتوں اور بچوں کو غلام بنا کر لے جایا گیا۔ سلجوقیوں کے ہاتھ اپنے جرنیلوں کی شکست کی خبر نے مسعود کو مغربی علاقوں میں امن وامان بحال کرنے کے لیے واپس جانے پر مجبور کر دیا۔اس نے 1036ء میں ایک بار پھر ہندوستان کا رخ کیا اور شوالک کے قدیم دارالحکومت ہانسی کے قلعہ کو فتح کیا جسے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا۔اس کے بعد وہ دلی کے قریب سونی پت کی طرف بڑھا اور اسے بھی فتح کر لیا۔اس کا حاکم دیپال میری اپنے سبھی خزانوں کو چھوڑ کر جنگلوں کی طرف فرار ہو گیا یا۔یہ خزانے فاتح کے ہاتھ لگے۔

لاہور واپس پہنچنے کے بعد سلطان نے اپنے بیٹے مودود کو شاہی نشانات اور خطاب سے نوازا اور اسے اس صوبے کی حکومت کا انتظام سونپ دیا۔اس نے اس کے ہمراہ اپنے پسندیدہ مشیر اور وزیر خواجہ ایاز کو چھوڑا اور خود غزنی کی طرف لوٹ گیا۔تاہم 1042ء سلجوقوں کے

ہاتھوں دندنیقان میں ملی شکست سے دل برداشتہ ہو کر اس نے اپنا سارا ساز و سامان اور اپنی دولت کو غزنی کے قلعے سے اکٹھا کیا اور اسے اونٹوں پر لاد کر اس خیال سے لاہور کی طرف گامزن ہوا باقی ماندہ زندگی ہندوستان میں گزارے گا۔ لاہور پہنچنے پر اس نے اپنے بیٹے شہزادہ مودود کو گورنر بنا کر بلخ کے صوبے کی طرف روانہ کر دیا لیکن دریائے جہلم کے کناروں پر اس کی فوج اور غلاموں نے غداری کی اور اسے معزول کر کے اس کے نابینا بھائی محمد کو، جس سے وہ اپنے ساتھ لایا تھا، تخت حکومت پر بٹھا دیا۔ مسعود کو سخت قید میں رکھا گیا لیکن جلد ہی اس کے چچازاد بھائی سلیمان نے اسے قید خانے میں قتل کرا دیا۔ مسعود نے نو سال تک حکومت کی۔ وہ جنگجو طبیعت کا شہزادہ تھا اور بہت حوصلہ مند تھا۔ ساتھ ہی وہ حلیم الطبع اور فیاض بھی تھا۔ اپنے عظیم والد کی طرح وہ بھی علم و ادب کا سرپرست تھا۔ اس نے نہایت شاندار مساجد اور محلات تعمیر کرائے اور بہت سے مدرسہ اور کلیات وقف کیے۔

9.6.2 سلطان مودود

مودود نے اپنے والد کے قتل کے بارے میں سنا تو وہ تیزی کے ساتھ غزنی کی طرف بڑھا، جہاں سلطان کے طور پر اس کی تاج پوشی کی گئی۔ محمد جو نابینا تھا وہ اپنے کمسن بیٹے شہزادہ نامی کو پشاور اور ملتان کی حکومت تعینات کر کے مودود سے جنگ کرنے کے لیے بذات خود سندھ کی طرف روانہ ہوا۔ دھنتر کے مقام پر چچا اور بھتیجے کے درمیان زبردست لڑائی ہوئی جس میں بالآخر مودود کو فتح حاصل ہوئی۔ محمد کے بیٹے عبدالرحیم کو چھوڑ کر تمام خاندان کو قیدی بنا لیا گیا اور بعد میں تہ تیغ کر دیا گیا۔ مودود کو جس جگہ فتح حاصل ہوئی اس نے ایک شہر کی بنیاد رکھی اور حاصل شدہ فتح کی مناسبت سے وہ اسے فتح آباد کہتا تھا۔ مسعود اور اس کے اہل خانہ کی نعشیں خاندانی قبرستان میں دفن کرنے کے لیے غزنی بھیج دیں گئیں۔ نابینا بادشاہ کے بیٹے شہزادہ نامی نے ملتان میں بغاوت کر دی تھی چنانچہ اسے مطیع کرنے کے لیے وزیر احمد کی سرکردگی میں ایک فوج روانہ کی گئی۔ شہزادہ کو شکست ہوئی اور وہ قتل کر دیا گیا۔ مودود کا اپنے سگے بھائی مادود کے سوا کوئی مدمقابل نہیں تھا۔ وہ اس وقت لاہور کا حاکم تھا اور مودود کی اطاعت کرنے پر رضامند نہیں تھا۔ چنانچہ مودود اسے مطیع کرنے کے لیے ایک بہت بڑی فوج کے ہمراہ لاہور کی طرف روانہ ہوا لیکن اس سے پیشتر کہ وہ لڑائی کے لیے کوئی فیصلہ کن قدم اٹھاتا کہ عید قربان کی صبح کو مادود اپنے بستر پر مردہ پایا گیا۔ لہذا مخالفت بالکل ختم ہو گئی۔

1043ء میں شمالی ہندوستان کے راجپوت راجاؤں نے مودود کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھا کر حملہ آوروں کے خلاف ایک وفاق بنایا۔ ہانسی اور تھانیسر کو واپس حاصل کرنے کے بعد انہوں نے نگر کوٹ کے مندر کو از سر نو بڑی شان سے آباد کیا۔ اس کامیابی نے پنجاب کے راجا میں کچھ اس قدر جوش و جذبہ پیدا کیا کہ ان میں سے تین راجا دس ہزار گھڑ سوار اور کافی تعداد میں پیادہ فوج کے ہمراہ لاہور کا محاصرہ کرنے کے لیے روانہ ہوئے۔ شہر کا محا صرہ کر لیا گیا۔ لہذا شکستہ دیوار جلد ہی ملبے کا ڈھیر بن گئیں۔ لیکن قلعے کے اندر ترک فوج نے گلی گلی شہر کا دفاع کیا اور اتنی بے جگری سے لڑے کے سات مہینے تک قلعہ مفتوح نہیں ہوا لیکن اس دوران قلعہ میں قحط پڑ گیا۔ مجبور ہو کر قلعہ کے محافظین نے فتح یا موت کا ارادہ کر کے قلعے کے سارے دروازے کھول دیے اور اچانک دشمن پر آ پڑے۔ راجپوت فوج جس کو اس حملے کی امید نہ تھی حملے کی تاب نہ لا کر بھاگ نکلی۔ ان کا تعاقب کیا گیا اور بڑی تعداد میں انہیں قتل کیا گیا۔ مودود کی باقی زندگی میں سلطنت غزنوی کے ان علاقوں میں

بالکل امن رہا جو ہندوستان میں تھے۔اس کے کچھ عرصے بعد ہی مودود کو انتڑیوں کی سخت تکلیف شروع ہوگئی، لہذا وہ نو سال سے زائد عرصہ حکومت کرنے کے بعد 24 دسمبر 1049ء کو غزنی میں انتقال کر گیا۔

9.6.3 سلطان ابوالحسین

مودود کے انتقال کے بعد علی بن روبیعہ کے دھڑے نے اس کے چار سالہ بیٹے مسعود دوم کو تخت پر بٹھا دیا لیکن سلطان مسعود اول کے بیٹے ابوالحسین کے سردار حاجب الپتگین نے مسعود دوم کی فوج کو شکست دی۔اس طرح کمسن بادشاہ کی حکومت کا خاتمہ ہوا۔ باغی افسر علی بن روبیعہ نے غزنی میں شاہی خزانے کو لوٹنے اور مقامی فوجی دستوں کے ایک حصے کو اپنے ساتھ ملانے کے بعد پشاور کا رخ کیا اور وہاں کے باشندوں کے ساتھ مل کر ایک بڑی فوج تیار کی۔اس فوج کی مدد سے اس نے ملتان اور سندھ کو فتح کیا اور افغانوں کو مغلوب کیا جو اس ابتری اور انتشار کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک میں پھیل گئے تھے اور انہوں نے آزادی کا اعلان کر دیا تھا۔ابوالحسین پنجاب میں امن وامان بحال کرنے میں ناکام رہا تو سلطان محمود کے بیٹے عبدالرشید نے 1051ء کے اختتام پر اسے شکست دے کر معزول کر دیا۔

9.6.4 سلطان عبدالرشید

نئے سلطان کا پہلا کام علی بن روبیعہ کو مغلوب کرنا تھا، جس نے شمال مغرب میں غزنوی سلطنت کے ہندوستانی علاقوں پر غاصبانہ قبضہ کر لیا تھا۔اسے اطاعت پر مجبور کر کے پنجاب میں امن وامان قائم کیا گیا۔تغتاجن حاجب کو امیر کا منصب عطا کیا گیا اور دریائے سندھ کے مشرقی صوبوں کا حاکم مقرر کیے جانے کے بعد ایک بہت بڑی فوج کے ہمراہ لاہور روانہ کیا گیا۔ نگر کوٹ پر ہندوؤں نے دوبارہ قبضہ کر لیا تھا لیکن ترک فوجوں نے اس کا محاصرہ کر کے چھٹے روز اسے فتح کر لیا۔ عبدالرشید نے ایک سال حکومت کی ہوگی کہ مودود کے ایک امیر طغرل نے اسے قتل کر دیا۔ لیکن اس غاصب کو زیادہ دن حکومت کا موقع نہیں ملا، اس کی تخت نشینی کے چالیسویں روز ہی تغتاجن حاجب نے اسے اس وقت قتل کر دیا جب وہ دربار عام منعقد کرنے کے لیے تخت پر بیٹھا تھا۔

9.6.5 سلطان فرخ زاد

تغتاجن حاجب جو نئے بادشاہ کا وزیر اعظم بنایا گیا، اس نے سلطان مسعود اول کے بیٹے فرخ زاد کو غزنی کے تخت پر بٹھا دیا۔ فرخ زاد نے چھ سال حکومت کرنے کے بعد جہان فانی کو خیر باد کہا۔اس کا بھائی ابراہیم اس کا جانشین مقرر ہوا۔

9.6.6 سلطان ابراہیم

سلطان ابراہیم نے سلجوقیوں کے معاملات کو نمٹانے کے بعد ملک کے ان علاقوں کو فتح کرنے کے لیے جو ابھی تک غیر مفتوحہ تھے، پنجاب کی طرف پیش قدمی کی۔ چنانچہ 1079ء میں اس سے آجودھن پر قبضہ کر لیا۔اس کے بعد اس نے ڈھلوانی پہاڑی کی چوٹی پر واقع روپال کا محاصرہ کر لیا۔قرب وجوار کے جنگلات کو صاف کرنا بہت مشکل اور دقت طلب کام تھا لہذا اس کام پر ہزاروں سپاہیوں کو لگایا گیا۔اس کے بعد سرنگ محصولے والے اپنی سرنگوں کو فصیل کے نیچے لے گئے جو وقت کے ساتھ گرتی چلی گئی اور قلعہ پر قبضہ کر لیا گیا۔اس کے بعد سلطان

نے ڈیرہ کی طرف کوچ کیا۔ وہاں پہنچ کر سلطان نے جب دیکھا کے ڈیرا کو مضبوط فصیل کے ذریعے قلعہ بند کیا گیا ہے تو اس نے اس جگہ کا محاصرہ کرنے کے لیے مسلسل محنت سے راستے کو صاف کرادیا لیکن موسم برسات نے اسے اپنے جنگی منصوبوں پر عمل پیرا ہونے سے روک دیا۔ لہذا وہ تین ماہ تک کوئی کارروائی نہ کر سکا۔ تاہم جیسے ہی بارشوں میں کمی واقع ہوئی تو اس نے شہریوں سے کہا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور اطاعت قبول کر لیں۔ اس کی تجویز کو رد کر دیا گیا۔ چنانچہ شہر کا از سر نو محاصرہ کیا گیا جو چند ہفتوں تک قائم رہا۔ دونوں جانب سے زبردست نقصان ہوا۔ آخر کار ایک زبردست حملے کے بعد شہر فتح ہو گیا اور فاتحین کے ہاتھ بہت زیادہ مال غنیمت آیا۔ سلطان ابراہیم بیالیس سال حکومت کرنے کے بعد 1098ء میں انتقال کر گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا مسعود سوم اس کا جانشین بنا۔

9.6.7 سلطان مسعود سوم

سلطان ابراہیم کے بعد اس کا بیٹا مسعود سوم غزنی کے تخت پر بیٹھا۔ وہ عسکری جذبے کا حامل تھا اور عدل و انصاف اور خیر خواہی سے لگاؤ کی وجہ سے ممتاز سمجھا جاتا تھا۔ اس نے سلطنت کے تمام موجودہ قوانین پر نظر ثانی کی اور گزشتہ قوانین کے مقابلے میں بہتر اصولوں پر مبنی نیا مجموعہ قوانین مرتب کرایا۔ اس نے حاجب تغتگین کو حاکم لاہور مقرر کر کے اور ایک بڑی فوج دے کر ہندوستان کی طرف روانہ کیا۔ اس جرنیل نے گنگا کو پار کیا اور ترک فوجیوں کو وہاں تک لے گیا جہاں ماسوائے محمود غزنوی کی ماضی میں کوئی نہ لے کر گیا تھا۔ چند دنوں میں وہ بے شمار ساز و سامان سے لدا پھندا لاہور کی طرف واپس آ گیا۔ در حقیقت اس کا یہ حملہ ایک چھاپہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتا تھا۔ اس سلطان کے دور حکومت میں لاہور غزنوی خاندان کی اصل راجدھانی بن گیا۔ کیونکہ ایران اور اپنے بیشتر علاقوں سے محروم ہونے کے بعد شاہی خاندان ہندوستان میں رہائش پذیر ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ وہاں مفتوحہ علاقوں کو مربوط کر دیا گیا تھا۔ سولہ سال حکومت کرنے کے بعد مسعود 1118ء میں مر گیا۔

9.6.8 سلطان ارسلان

خرم بادشاہ کے ایک صاحبزادے ارسلان نے تخت نشین ہونے کے بعد اپنے بھائیوں کو قید میں ڈال دیا۔ لیکن برطرف کیے گئے شہزادوں کی حمایت سلجوقی سلطان سنجر بذات خود کر رہا تھا۔ اس نے ارسلان پر جنگ مسلط کر دی اور اور اسے شکست دے کر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ ارسلان پنجاب کی طرف آ گیا اور اپنی فوجوں کو جمع کرنے کے بعد اپنے دار الحکومت کو بازیاب کرانے کے لیے واپس ہوا۔ لیکن سلطان سنجر نے دوبارہ بذات خود جنگ کی قیادت سنبھالی اور دوسری مرتبہ اسے غزنی سے نکال دیا۔ شکست خوردہ بادشاہ نے افغانوں کے ساتھ پناہ حاصل کر لی لیکن اس کا بری طرح تعاقب کیا گیا اور قیدی بنا لیا گیا۔ اس کے کچھ عرصے بعد ہی 27 برس کی عمر میں اور حکومت کے تیسرے سال اسے اپنے بھائی بہرام کے ہاتھوں پر تشدد موت سے ہمکنار ہونا پڑا۔

9.6.9 سلطان بہرام

سلجوقیوں کے سلطان سنجر نے ارسلان کے بھائی بہرام کو غزنی کے تخت پر بٹھادیا۔لاہور کے حاکم محمد بھیلم نے اس کے بھائی ارسلان کی طرف داری کرتے ہوئے نئے بادشاہ کو اپنی اطاعت پیش کرنے سے انکار کر دیا۔ بہرام اسے مطیع کرنے کے لیے غزنی سے روانہ ہوا۔ لہذا شاہی فوج اور حاکم لاہور بھیلم کے درمیان جنگ شروع ہوگئی جس میں موخرالذکر کو شکست ہوئی اور پانچ دسمبر 1118ء کو اسے قید کرلیا گیا۔تاہم بھیلم نے اطاعت قبول کرلی اور سلطان اسے دوبارہ حکومت پر بحال کرنے کے بعد واپس غزنی لوٹ گیا۔بعدازیں بہرام کی روانگی کے بعد بھیلم نے پنجاب میں اپنی حالت کو مستحکم کیااور سوالک کے مقام پر ایک نیا قلعہ تعمیر کرنے کے بعد اپنی تمام دولت اہل خانہ اور عزیز و اقارب کو وہاں منتقل کر دیااور اپنی فوج میں بے شمار عربوں،ایرانیوں،افغانوں اور خلجیوں کو بھرتی کرنے کے بعد اس نے خود مختار سرداروں کے علاقوں میں بہت زیادہ غارت گری اور لوٹ مار شروع کر دی اور اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔یہ چیز بہرام کو دوبارہ پنجاب کی سرزمین پر لے آئی۔محمد بھیلم کے دس بیٹے تھے اور ان میں سے ہر ایک کو اس نے ایک علاقے کی کمان سونپ رکھی تھی۔ان سب نے اپنے تمام ذرائع کے سمیت اپنے والد سے شمولیت اختیار کرلی لہذا یہ متحدہ فوج ملتان میں حملہ آور فوج کے سامنے آئی۔ایک زبردست جنگ شروع ہوگئی جس میں بھیلم اور اس کے بیٹوں کو شکست فاش ہوئی اور وہ بھاگتے ہوئے گہری دلدل میں پھنس گئے اور اس میں غرق ہوگئے۔اس فتح کے بعد سلطان نے ابراہیم علوی کے بیٹے سالار حسن کو لاہور کی حکومت پر فائز کیااور خود واپس غزنی کی طرف روانہ ہوگیا۔

اس کے کچھ عرصے بعد بہرام نے غور کے شہزادے سیف الدین سوری کو اپنے بھائی ارسلان کا ساتھ دینے کے الزام میں مجرم قرار دیا۔سیف الدین دغاباز غزنوی دوستوں سے گھرا ہوا تھا،انہوں نے اسے گھیر لیااور قیدی بنا کر بہرام کے پاس لے گئے۔اس نے نہایت بربریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہوئے سیف الدین کو پھانسی کی سزادے دی۔غور کے افغان محمد قطب الدین کو بھی سیف الدین سوری کے ساتھ سازش میں ملوث ہونے کے باعث سرعام پھانسی دے دی گئی۔سیف الدین کا بھائی علاءالدین،جو غور کا حکمران تھا،اپنے بھائی کی موت کا بدلہ لینے کے لیے روانہ ہوااور ایک خونریز جنگ کے بعد اس نے غزنی پر قبضہ کرلیااور اس میں قتل و غارت گری کا زبردست بازار گرم کر دیا۔اس کی زیادہ تر عالیشان عمارات کو زمین بوس کر دیا گیا۔ سات روز تک شہر میں آتش زنی اور تلوار زنی ہوتی رہی۔علاؤالدین جسے جہان سوز کا خطاب دیا گیا تھااس کے انتقام کی آگ ابھی سرد نہیں ہوئی تھی۔وہ اپنی فتح کا جشن منانے کے لیے متعدد علماءاور صاحب علم حضرات کو پابہ زنجیر کرکے فیروز کوہ لے گیااور وہاں اس نے حکم دیا کہ ان کے گلے کاٹ دیے جائیں۔بہرام اس شکست کے بعد ہندوستان کی طرف روانہ ہوگیا اور شکستہ دل کے ساتھ 1152ء میں 35 برس کی حکومت کے بعد انتقال کر گیا۔

9.6.10 سلطان خسرو

بہرام کا بیٹا خسرو غزنی سے روانہ ہونے کے بعد حفاظت سے لاہور پہنچ گیا جہاں اسے بطور بادشاہ کے سلامی دی گئی۔جب علاءالدین اور کی طرف لوٹ گیا تو خسرو اپنی کھوئی ہوی سلطنت کو بازیاب کرانے کے خیال سے لاہور سے روانہ ہوا لیکن سلطان سنجر، جس سے اسے مدد کی توقع تھی،اس کے انتقال کے بارے میں اور غزنی پر غزترکمانوں کے حملے کے بارے میں سننے کے بعد اسے مجبوراواپس لاہور کی طرف آناپڑا جہاں اس نے سات سال تک پرسکون حکومت کی۔وہ 1160ء میں انتقال کر گیااور اس کا وارث اور جانشین اس کے بیٹے خسرو ملک کو بنایا گیا۔

9.6.11 سلطان خسرو ملک

مرحوم سلطان کا بیٹا خسرو ملک تخت نشین ہوا اور اس نے بڑے انصاف اور فیاضی سے حکومت کی۔ وہ پنجاب پر حکمراں غزنوی خاندان کا آخری حکمران تھا۔ اس کے دور حکومت میں غزنی کی سلطنت پر غور کے سلطان غیاث الدین کے بھائی سلطان معزالدین سام نے حملہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ سلطان معزالدین سام شہاب الدین غوری کے نام سے مشہور ہوا۔ اس فتح سے پوری طرح مطمئن نہ ہونے کے باعث شہاب الدین نے پنجاب کی طرف ایک فوج روانہ کی اور پشاور، ملتان اور سندھ کے صوبوں کو تاخت وتاراج کر ڈالا۔ 1180ء میں اس نے لاہور کا محاصرہ کر لیا لیکن خسرو ملک نے اس کو کچھ اس قدر مضبوطی سے قلعہ بند کیا ہوا تھا کہ اسے فتح کرنے کے لیے حملہ آور کی تمام تر تدابیر ناکام ہو گئیں۔ آخر کار دونوں دھڑوں میں امن پر صلح ہو گئی۔ محمد غوری بادشاہ کے چار سالہ بیٹے ملک شاہ کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لے کر وہاں سے روانہ ہو گیا۔ چار سال بعد محمد غوری نے دوبارہ پنجاب پر حملہ کیا اور لاہور کا محاصرہ کر لیا۔ شہر پر قبضہ کرنے میں ناکام ہونے کے بعد اس نے کھلے علاقے میں رسد اور کمک کے تمام ذرائع بند کر دیے۔ چنانچہ اس مقصد سے سیالکوٹ میں مستحکم چھاؤنی قائم کرنے کے بعد وہ غزنی کی طرف پلٹ گیا۔ شہاب الدین کی روانگی کے بعد خسرو ملک نے گکھڑوں کے ساتھ مل کر سیالکوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ لیکن وہاں کے گورنر حسین فرمالی نے زبردست مزاحمت کی اور محاصرین کی طرف سے حملے کے ذریعے قلعہ پر قبضہ کرنے کی تمام کوششیں ناکام کر دیں۔ نتیجۃً محاصرہ اٹھالیا گیا۔

9.7 غزنوی حکومت کا خاتمہ

اس کے تھوڑے عرصے بعد 1186ء میں شہاب الدین تیسری مرتبہ لاہور کی طرف پیش قدمی کی۔ تاہم اس نے یہ باور کرایا اس کی اس مہم کا مقصد سلجوقیوں کو مغلوب کرنا ہے اور اپنے اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے اس نے سلطان کے بیٹے ملک شاہ کو بھی ایک نہایت عالی شان حفاظتی دستے کے ہمراہ لاہور روانہ کر دیا۔ خسرو ملک جو آپ نے کافی عرصے سے بچھڑے ہوئے بیٹے سے ملنے کو بے چین تھا۔ اس نے کسی قسم کی دغابازی وفریب کا خیال نہ کیا۔ اپنے بیٹے سے ملنے کے لیے ایک مختصر سی خادموں کی جماعت کے ہمراہ لاہور سے روانہ ہوا۔ لیکن شہاب الدین، خسرو کی مختصر سی فوج کو پیچھے چھوڑتا ہوا بیس ہزار سواروں کی فوج کے ہمراہ تیزی سے پہاڑوں کی طرف پلٹا۔ اس نے خسرو کے لیے لاہور واپس جانے کا راستہ بند کر دیا اور رات کو اس کے پڑاؤ کا گھیراؤ کر لیا۔ خسرہ جب صبح کے وقت بیدار ہوا تو اس نے اپنے آپ کو دشمنوں کا قیدی پایا۔ چنانچہ شہاب الدین نے بادشاہ کو اپنی حفاظت میں لے کر لاہور کے فوری قبضے کا مطالبہ کیا۔ شہر کے دروازے کھول دیے گئے اور شہاب الدین نے اپنے بھائی سلطان غور کے نام پر بلا مزاحمت پنجاب کے دارالحکومت کا قبضہ حاصل کر لیا۔ اس طرح خاندان غزنوی کی حکومت جو 962ء سے 1186ء تک تقریباً 224 سال قائم رہی، اس کا خاتمہ ہو گیا۔ خسرہ ملک کو بمع اہل خانہ غور روانہ کر دیا گیا اور وہاں اسے قید میں ڈال دیا گیا۔ اس نے اٹھائیس سال حکومت کی۔

9.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

وسطی ایشیا کی تاریخ میں غزنوی خاندان کو اہم مقام حاصل ہے اور سلطان محمود وہ پہلا حکمراں تھا جسے الماوردی نے سلطان کا لقب دیا اور ایک ادارے کے طور پر سلطنت کا ذکر کیا۔ غزنی کی سلطنت ایک سامانی خاندان کے ایک معمولی امیر الپتگین کے ذریعے قائم کی گئی جسے اس کے جانشین سبکتگین اور سلطان محمود غزنوی نے پروان چڑھایا اور ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کر دیا۔ سلطان محمود کا ہندوستان کی تاریخ میں بے حد اہم کردار ہے کیوں کہ اس نے کشمیر اور کابل کے ہندوشاہیوں کا خاتمہ کر کے شمالی ہند کی فتوحات کا راستہ کھول دیا۔ پنجاب کا غزنوی سلطنت میں شامل ہونا غوری حکمرانوں کے لیے گنگا کے میدانوں کی طرف بڑھنے کے لیے بے معاون ثابت ہوا۔ راجپوتوں کی طاقت اور اقتدار کو توڑنے کا سہرا سلطان محمود کو جاتا ہے کیونکہ اس سے ترک حملہ آوروں کی ایسی دھاک راجپوت حکمرانوں پر بیٹھی کہ بعد کے دور میں ہر ایک حکمراں ترشکا اور ملیچھا کو شکست دینا اپنا سب سے بڑا کارنامہ سمجھنے لگا۔

سلطان محمود کے تیز رفتار حملے اور فتوحات اس کی اعلیٰ ترین فوجی صلاحیت کو ظاہر کرتی تھی، االبتہ اس پر لٹیرا ہونے کا الزام اس لیے لگا چونکہ اس نے ہندوستان میں کوئی مستقل حکومت قائم کرنے کی کوشش نہیں کی اور وسطی ایشیا کی پیچیدہ سیاست میں الجھا رہا۔ اسے یہ ذرا بھی اندازہ نہ تھا کہ وسطی ایشیا کی جن زمینوں کے لیے وہ ہم عصر طاقتوں سے الجھ رہا ہے وہ اس کے مرتے ہی اس کے جانشینوں کے ہاتھ سے چھن جائیں گی اور انہیں ہندوستانی مقبوضات کی طرف ہی لوٹنا پڑے گا۔

سلطان محمود نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے جن میں ابتدائی حملے جوابی یا مدافعت کے لیے تھے کیونکہ کابل کے حکمراں غزنی میں اس کے اقتدار کے لیے چنوتی بنے ہوئے تھے۔ جیسے ہی وہ وسطی ایشیا کی طرف مڑتا یہ لوگ اس کے مقبوضات پر حملہ کر دیتے۔ ہندوشاہی حکمرانوں کے خلاف اپنی کامیابی نے اسے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ وہ اس علاقے میں مزید پیش قدمی کر سکتا ہے اور فتوحات اور مال غنیمت بھی حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح اس کے ہندوستان پر حملوں کا سلسلہ شروع ہوا، جن میں سب سے اہم اور شدید سومنات کی مہم تھی، کیونکہ راجپوت حکمراں اسے اپنی عزت و شان کی علامت سمجھتے تھے اور اس کے لیے باقاعدہ حفاظتی فوج بھی متعین تھی۔

سومنات کی چالیس ہزار فوج کے خلاف سلطان ستائیس ہزار فوج لے کر میدان میں آیا اور یہ وہ فوج تھی جو راجستھان کے صحرائے تھار سے گزر کر آئی تھی اور سخت بھوکی پیاسی تھی۔ اس وجہ سے یہ کہنا کہ یہ حملہ مال و دولت کے لیے تھا مناسب نہیں کیونکہ سلطان کوئی آسان ہدف چن کر وہاں سے بھی مال و دولت حاصل کر سکتا تھا۔ سلطان محمود دراصل راجپوت حکمرانوں کو نیچا دکھانا چاہتا تھا اور ان کے جنگی جذبے کو چکنا چور کرنا چاہتا تھا۔ بہر حال وہ اس جنگ میں کامیاب رہا۔

سلطان محمود کی اس عظیم الشان سلطنت کو اس کے کمزور جانشین سنبھال نہیں سکے اور تخت کی لڑائی میں الجھ گئے۔ ادھر سلجوقیوں نے پے در پے انہیں شکست دے کر ہندوستان کی طرف لوٹنے پر مجبور کر دیا جہاں وہ لاہور تک سمٹ کر رہ گئے۔ غور کے حکمرانوں سے بھی ان کی دشمنی غزنی سلطنت کے لیے تباہ کن ثابت ہوئی اور وہ افغانستان اور غزنی کے علاقے بھی ہار بیٹھے۔ آخری غزنوی سلطان خسرو ملک کو شہاب الدین غوری نے لاہور سے گرفتار کر کے غزنوی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ان کے بعد غوری خاندان ہندوستان کی سیاست کے افق پر نمودار ہوا۔

9.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

غزنی	افغانستان کا ایک شہر
طاہری خاندان	خلافت عباسیہ سے خود مختار ہونے والا پہلا خاندان جو خراسان اور ماوراالنہر پر حکمراں تھا۔
قندھار	افغانستان کا ایک شہر جو راجدھانی کابل سے کچھ دور واقع ہے۔
چتا	ہندوؤں کے یہاں مردے کو جلانے کا انتظام

9.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

9.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. عربوں کی سلطنت کو عروج کب حاصل ہوا؟
2. صفاری خاندان کی بنیاد کس نے ڈالی؟
3. الپ تگین کون تھا؟
4. سبکتگین کس نسل سے تھا؟
5. زابلستان کے دارالحکومت کا نام بتائیے۔
6. جے پال کے والد کا نام کیا تھا؟
7. سبکتگین کے انتقال کے وقت محمود کہاں پر تھا؟
8. کس سال میں محمود نے اپنے سلطان بننے کا اعلان کیا؟
9. 1011ء میں محمود کس مہم کا ارادہ کیا؟
10. سومنات کہاں واقع ہے؟

9.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. الپ تگین کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔
2. امیر سبکتگین کے کردار پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
3. سلطان محمود کی تخت نشینی کا مختصر جائزہ لیجیے۔
4. سومنات مہم کا مختصر تجزیہ کیجیے۔
5. غزنوی خاندان کے خاتمے پر روشنی ڈالیے۔

9.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. امیر ناصرالدین سبکتگین کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. سلطان محمود کی ہندوستانی مہمات پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
3. سلطان محمود کے جانشینوں کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

9.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Bosworth, Clifford Edmund (1963) *The Ghaznavids: Their Empire in Afghanistan and Eastern Iran 994–1040*, Edinburgh University Press, Edinburgh.
2. Bosworth, Clifford Edmund (1977) *The Later Ghaznavids: Splendour and Decay, The Dynasty in Afghanistan and Northern India 1040–1186*, Columbia University Press, New York.
3. Bosworth, Clifford Edmund (1998), "THE GHAZNAVIDS", in Asimov, M.S.; Bosworth, C.E. (eds.), *History of Civilisations of Central Asia*, UNESCO Publishing.
4. M. Ismail Marcinkowski (2003) *Persian Historiography and Geography: Bertold Spuler on Major Works Produced in Iran, the Caucasus, Central Asia, India and Early Ottoman Turkey* Pustaka Nasional, Singapore.
5. نظامی، کے اے، حبیب، ایم۔، جامع تاریخ ہند، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی۔

اکائی 10۔ غوری خاندان

(The Ghurids)

اکائی کے اجزا

10.0 تمہید

10.1 مقاصد

10.2 غور کا جغرافیہ

10.3 شنسبانی خاندان

10.4 غور میں تبلیغ اسلام

10.5 سلطان معزالدین کی ہندوستانی مہمات

10.5.1 ملتان

10.5.2 اچھ

10.5.3 نہر والا (انہلواڑہ)

10.5.4 پشاور

10.5.5 لاہور

10.5.6 تبرہند

10.6 ترائن کی پہلی جنگ

10.7 معزالدین کی تیاریاں

10.8 ترائن کی دوسری جنگ

10.9 شمالی ہندوستان کی فتح

10.9.1 چنداور کی جنگ

10.9.2 بیانہ اور گوالیار کی فتح

10.9.3 بختیار خلجی کے کارنامے

10.10 معزالدین کی آخری ہندوستانی مہم اور اس کی وفات
10.11 اکتسابی نتائج
10.12 کلیدی الفاظ
10.13 نمونہ امتحانی سوالات
10.13.1 معروضی سوالات کے حامل سوالات
10.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
10.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
10.14 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

10.0 تمہید (Introduction)

محمد بن قاسم کی 712 عیسوی میں فتح سندھ سے ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ سیاسی طور پر عرب دنیا سے جڑ گیا۔ لیکن اندرون ملک اس کے کوئی دیرپا اثرات مرتب نہیں ہوے۔ عرب خلافت کی کمزوری کے ساتھ اسلامی دنیا کے نقشے پر ترک حکومتیں حاوی ہو گئیں۔ ماورالنہر کے سامانی خاندان کے کھنڈروں پر غزنوی اقتدار کا سورج چمکا اور مسلم دنیا کے پہلے سلطان، سلطان محمود غزنوی نے چھوٹی چھوٹی ترک حکومتوں کو ملا کر ایک بڑی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اپنے دائرہ اقتدار کی توسیع کے سلسلے میں اسے کابل کے ہندو شاہیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جن کو شکست دے کر اس نے ہندوستان کے دروازے مزید فتوحات کے لیے کھول دیے۔ لیکن اسے تاریخ کی ستم ظریفی کہیے یا محمود کی حرمان نصیبی کہ سترہ کامیاب حملوں کے بعد بھی ہندوستان میں باضابطہ ترک اقتدار کا قیام اس کے نصیب میں نہیں تھا۔ ہندوستان میں اس کی واحد حصولیابی پنجاب کا غزنوی سلطنت میں الحاق تھا۔ ہندوستان میں ترک اسلامی اقتدار کی بنیاد رکھنے والا غور کا ایک حکمران معزالدین ابن سام تھا، جسے دنیا شہاب الدین غوری کے نام سے جانتی ہے۔ معزالدین رتبہ، علاقہ اور فن سپہ گری غرض کسی چیز میں محمود کا ہم پلہ نہ تھا۔ لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ مستقل مزاج تھا اور مشکلات یا شکست سے کبھی دل برداشتہ نہیں ہوتا تھا۔ مندرجہ ذیل میں ہم غور کے محل وقوع اور غوری یا شنسبانی خاندان کے عروج وارتقا کے بارے میں جانیں گے۔ شہاب الدین غوری اور اس کی ہندوستان کی فتح کے ساتھ ہی دہلی سلطنت کے قیام کے ابتدائی حالات کا ہم آئندہ صفحات میں جائزہ لیں گے۔

10.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- غور کے جغرافیائی محل وقوع اور اس کی علاقائی اہمیت کو سمجھ سکیں گے۔

- شنسبانی خاندان کے ابتدائی احوال دریافت کر سکیں گے۔
- غور کے مذہبی حالات اور وہاں اسلام کی اشاعت کی وضاحت کر سکیں گے۔
- ہندوستان میں سلطان معزالدین سام کی ابتدائی مہمات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- ترائن کی جنگوں کے اسباب اور نتائج پر غور کر سکیں گے۔
- شمالی ہندوستان میں ترک حکومت کے قیام پر روشنی ڈال سکیں گے۔

10.2 غور کا جغرافیہ

غور موجودہ افغانستان کے مغربی مرکزی حصے میں واقع ہے، اور یہ ہری رود، فرح رود، رود غور اور کش رود کی وادیوں اور پہاڑی سلسلے پر مشتمل ہے۔ طبقات ناصری کے مصنف مورخ منہاج سراج جوزجانی غور کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے قلم طراز ہیں۔

"غور کے ملک کو پانچ پہاڑی سلسلے منقسم کرتے ہیں اور غور کے باشندوں کے خیال میں یہ پہاڑیاں دنیا میں بلند ترین ہیں۔ پہلا پہاڑ مرغ مینداش میں ہے، جس کے نچلے حصے میں میں شہنشاہ کا دارالحکومت سلطنت اور قلعہ واقع تھا۔ دوسرا پہاڑ جس کو سرخ غار کہا جاتا ہے، یہ بھی مینداش علاقے میں تجز کے نزدیک ہے۔ تیسرا پہاڑ اشک جو کہ ضلع تمران میں واقع ہے، غور کے دیگر حصوں سے بلند اور رقبے میں بڑا ہے۔ تمران کا ضلع اس کے دونوں جانب اور اس کی گود میں واقع ہے۔ چوتھا ورنی کا بلند اور بڑا پہاڑی سلسلہ جو داور اور والشت کے اضلاع سے ہو کر گزرتا ہے اور جس پر کجورن کا شہر واقع ہے۔ بعض بیان کے مطابق روئن جو سارے غور میں اپنی دشوار گزار بلندی کے لیے مشہور ہے، پانچواں پہاڑی سلسلہ ہے لیکن بعض دوسرے بیانات کے مطابق پانچواں درہ خیبر کا پہاڑی سلسلہ ہے، جس کی لمبائی، چوڑائی اور بلندی انسان کی سمجھ سے باہر ہے۔

ان پہاڑی سلسلوں جن کی بلندی دس ہزار فٹ تک ہے اور جو مشرق کی جانب کوہ ہندوکش تک آتے آتے اور بلند ہو جاتے ہیں، کی وجہ سے غور میں داخلہ دشوار گزار تھا اور انہوں نے غور کو بیرونی دنیا کے تمام ثقافتی اور تجارتی تعلقات سے منقطع کر دیا تھا۔ آس پاس کے علاقوں سے ثقافتی علیحدگی کی حد کا اندازہ اس امر سے ہوتا ہے کہ سلطان مسعود غزنوی نے جب 1020 عیسوی میں غور پر حملہ کیا تو اسے ایک مقامی مترجم بحال کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ علاقائی لسانی اختلاف کی وجہ سے وہاں کے لوگوں کی بولی ناقابل فہم تھی۔ اس کے علاوہ جغرافیائی حالات نے بھی غور میں سیاسی اقتدار کو مختلف حصوں میں منقسم کر رکھا تھا اور ہر قلعہ کا مالک اپنے تابع علاقوں پر بلا شرکت غیرے حکمران تھا۔ قطب الدین محمد (م1146) کے زمانے میں غور کے ایک حصے ہری رود پر واقع ورشادا کی چھوٹی مملکت نے فیروز کوہ کو اپنا دارالسلطنت بنایا۔ اس کے قبل کوئی ایسا مرکزی مقام نہ تھا جہاں سے کوئی ایک حکمراں سارے علاقے کی نگرانی کر سکتا تھا۔

غور عام طور پر ایک زراعتی علاقہ تھا۔ آج کل اس کی وادیاں درختوں سے بھری ہیں۔ پتے ہر سال گر جاتے ہیں اور ان میں شہتوت، اخروٹ، خوبانی کے درخت اور انگور کی بیلیں لگی ہیں۔ یہ دسویں صدی میں بھی اس قدر زرخیز تھا کہ اصطخری نے اس کی زرخیزی، اس کی

نہروں، اس کے سبزہ زاروں اور اس کی کاشت کی تعریف کی ہے۔ یہاں کوئی قابل ذکر شہر نہ تھے بلکہ صرف زراعتی نو آبادیاں اور قلعہ جات اور مینارے (قصر، قلعہ، حصار، کوشک) تھے جو کہ ملک کے زمینی منظر کی سب سے نمایاں خصوصیت تھے۔ حدود العالم کے مصنف کے مطابق بدمزاج، سرکش اور جاہل قسم کے لوگ ان قلعوں میں اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکتے تھے۔ عمدہ گھوڑے پالنے کے لیے بھی یہاں کے لوگ مشہور تھے۔ اس کے علاوہ ہرات اور سیستان کے بازاروں کے لیے غلام مہیا کرانے کی وجہ سے بھی غورر کی شہرت تھی۔

اس علاقے کے پہاڑوں میں مختلف قسم کی دھات پائی جاتی تھیں اور یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غور میں لوہا کافی مقدار میں پایا جاتا تھا۔ کیونکہ غور کے باشندے اسلحہ اور جنگی سامان بنانے کے لیے مشہور تھے اور انسانوں کو آس پاس کے ممالک میں برآمد کرتے تھے۔ حدود العالم کا نامعلوم مصنف لکھتا ہے کہ اس صوبے سے غلام، زرہ، جوشن اور عمدہ اسلحہ منگوائے جاتے تھے۔ اس کے بقول طغان، غور اور کابل سے لے کر قرلوق تک کا سارا علاقہ دھات کی کاریگری کے لیے مشہور تھا۔ شاید اسی وجہ سے غور کے قلعہ کو پل آہنگران بھی کہا جاتا تھا۔ جب 1020 میں مسعود نے غور پر حملہ کیا تھا تو وہاں کے حکمران ابوالحسن خلف نے اس کو تلواریں اور ڈھالیں پیش کی تھیں اور جب جرداس کا قلعہ فاتح کیا گیا تھا تو خراج کے طور پر اسلحہ وصول کیے گئے تھے۔ غور کے اسلحہ کی وقعت کا اعتراف مسعود نے بھی کیا تھا اور اس نے غوری افسران کو محاصروں کے ماہرین کے طور پر بحال کیا۔ جب غور کے عزیز الدین (1100-1140) نے سلجوقی سلطان سنجر کو سالانہ خراج بھیجا تو اس میں خصوصی طور پر زرہ بکتر، آہنی خود اور دوسرے جنگی سامان شامل تھے۔ ساتھ ہی غور میں پالے گئے خونخوار کتے بھی۔ لہذا غور، جس نے مسلم ثقافتی اثرات حال ہی میں قبول کیے تھے کے پاس عہد وسطیٰ کے دو اہم ترین جنگی سامان موجود تھے یعنی لوہا اور گھوڑے۔

10.3 شنسبانی خاندان

سلطان معزالدین سام جو شہاب الدین غوری کے لقب سے مشہور ہوا، غور کے شنسبانی خاندان کا ایک فرد تھا۔ اس خاندان کی ابتدائی تاریخ اسرار اور افسانوی واقعات سے ڈھکی ہوئی ہے۔ حقائق کو افسانوں سے علیحدہ کرنا مشکل ہے اور اس موضوع پر ہماری معلومات کا انحصار تمام تر منہاج سراج پر ہے، اور وہ خود اپنی تصنیف طبقات ناصری میں اس بات پر اظہار افسوس کرتا ہے کہ کتاب لکھتے وقت وہ ان حوالہ جات اور ماخذ پھر سے نہ دیکھ سکا جو غور میں اس کے پاس تھے۔ جب وہ منگولوں سے اپنی جان بچانے کے لیے بھاگا تو وہ سب ماخذات وہیں رہ گئے اور اس کو اپنی یاداشت سے ہی کام لینا پڑا۔ لیکن پھر بھی تاریخ ناصری اور تاریخ ہیضم نبی اس کی دسترس میں تھیں اور وہ ان کو شنسبانی خاندان کے ابتدائی حالات مرتب کرنے میں کام میں لایا۔ جیسا کہ مشرق کے بعض اور ایسے حکمران خاندان جن کے ابتدائی حالات نامعلوم یا گمنام تھے، کے ساتھ ہوا۔ بالکل اسی طرح معزالدین کے خاندان کے لیے بھی ایک روایتی سورما ضحاک مہیا کیا گیا جو اس کا مورث اعلیٰ تسلیم کیا گیا۔

ایرانی علاقوں کی روایات میں میں ضحاک ایک مکروہ شخصیت تھی، مگر غزنی اور زابلستان کے علاقے میں اسے مقبولیت حاصل تھی۔ اس لیے غور کے ماہرین انساب نے اس کو معزالدین کے خاندان کے لیے چنا۔ زرتشتوں نے ضحاک کو جو اولاً ایک اسیریائی دیوتا تھا، کو مسکن شیاطین میں پھینک ڈالا۔ فردوسی جسے ایک ایسے نمونے کی نمائندگی کی تلاش تھی جس سے اسے شدید نفرت تھی مگر جس کو وہ نظرانداز

نہیں کر سکتا تھا، نے ضحاک کو ایک مشرقی عرب کی صورت میں دوبارہ پیش کرکے زندہ جاوید بنادیا۔ روایت یہ تھی کہ جب فمریدوں نے ضحاک کی ہزار سالہ مملکت کا تختہ الٹ دیا تب اس کے اخلاف غور میں آباد ہو گئے۔

شنسب جس نے اپنا نام خاندان کو دیا، ضحاک کی نسل سے تھا۔ بقول منہاج سراج وہ حضرت علی کے ہاتھوں مشرف بااسلام ہوا تھا جنہوں نے اس کو ایک علم اور ایک عہد نامہ عطا کیا تھا۔ یہ قرین قیاس معلوم نہیں ہوتا گرچہ تیسرے خلیفہ حضرت عثمان کے زمانے سے مسلمانوں نے غور پر چھوٹ پٹ حملے شروع کردیے تھے۔ یہ علاقہ باضابطہ مسلم حکومت کے تحت نہیں آیا اور اور طبری اور ابن اثیر نے نے جن مہمات کا ذکر کیا ہے وہ محض چھوٹی موٹی جھڑ پیں تھیں۔ بوسورتھ کے مطابق غور کی اہمیت محض غلاموں کی منڈی کی حیثیت سے تھی اور ان کا حصول وقتاً فوقتاً حملوں کے ذریعے ممکن تھا۔ اس علاقے پر واقعی عملداری اور اس کا الحاق بعد کا واقعہ ہے۔ حدود العالم کا مصنف جو فریغونی خاندان کی ملازمت میں تھا اور ملحقہ صوبے گورزگان میں رہتا تھا، اپنی کتاب (جو 982-3 میں مکمل ہوئی) میں لکھتا ہے، کہ اس کے آقاؤں کو غور پر اقتدار اعلیٰ حاصل تھا اور یہ کہ غوری لوگ جو اس سے پہلے کافر تھے اس کے زمانے میں زیادہ تر مسلمان ہو چکے تھے۔ مینورسکی کے خیال میں یہ بیان مبالغہ آمیز ہے۔ درحقیقت حدود العالم کے اس بیان سے اگر کوئی نتیجہ نکالا جائے تو اس علاقے میں محمود اور مسعود کی جنگیں بے مقصد نظر آئیں گی۔ اصطخری قطعی طور پر غور کو دارالکفر لکھتا ہے اور کہتا ہے کہ اس کے تذکرے میں اس علاقے کے شامل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں کچھ مسلمان تھے اور چونکہ یہ اسلامی حدود میں سب سے بڑا کافر علاقہ تھا۔ لیکن منہاج لکھتا ہے کہ شنسب خاندان کے ہر حکمران کو تخت نشینی سے پہلے حضرت علی کے عہد نامے کی تائید کرنی پڑتی تھی۔ غوریوں کو آل علی سے اس قدر عقیدت تھی کہ انہوں نے خلافت بنوامیہ کو تسلیم نہ کیا۔

طبری اور ابن اثیر کی تحریروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ 667 اور 725-6 میں میں غور کے خلاف جنگیں لڑی گئیں۔ دوسری جنگ کی قیادت ابو منظر اسعد کر رہے تھے۔ اس موقع پر غوریوں نے اپنے مال واسباب دشوار گزار غاروں میں چھپادیے۔ اسعد اس صورتحال سے پریشان نہ ہوئے۔ اس نے اپنے آدمیوں کو توابیت کے ذریعہ زنجیروں کے سارے نیچے اتارا اور ان مال اور اسباب پر قبضہ کیا۔ اس پورے عہد میں بنی امیہ کے چھٹہ پٹ حملے غور پر ہوتے رہے لیکن جغرافیائی دشواریوں کی وجہ سے مستقل طور پر سیاسی یا ثقافتی قبضہ قائم رکھنا ناممکن تھا۔ چونکہ پہاڑی راستے جن کو پار کرنا گرمی کے موسم میں بھی دشوار تھا سردیوں میں بالکل بند ہو جاتے تھے۔ منہاج لکھتا ہے کہ جب ابو مسلم خراسانی نے بنی امیہ کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تو شنسبانی خاندان کے ایک فرد امیر فولاد نے اس کی مدد کے لیے کوشش کیا۔ خلیفہ ہارون رشید کی حکومت کے دوران کچھ غوری قبائل نے اپنے اختلافات کے سلسلے میں خلیفہ سے ثالث بننے کی گزارش کی تھی۔ لیکن منہاج کا یہ بیان بھی قیاس پر مبنی لگتا ہے۔ منہاج مزید لکھتا ہے کہ یعقوب ابن لیث کے زمانے میں میں غوری سرداروں کی مسلم اور غیر مسلم پارٹیاں ایک دوسرے کی دشمن تھیں۔ لیکن غور کے مذہبی حالات کے متعلق استخری کے قطعی بیان کی روشنی میں یہ بات بھی صحیح نہیں معلوم ہوتی۔ گردیزی اور بیہقی لکھتے ہیں کہ 979-80 کے لگ بھگ سامانی حکمران امیر نوح بن منصور نے ابو جعفر زبیری کو غور کی فتح کے لیے بھیجا۔ لیکن لیکن صرف قلعہ فتح کرنے کے بعد اسے واپس ہونا پڑا۔ بعد میں جب سبکتگین سامانیوں کی جانب سے غزنی اور زابلستان کا گورنر تھا تو اس نے غور پر کئی حملے

کیے۔ عنصری کے ایک قصیدے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمود جو اس وقت کم سن تھا، نے بھی ایک مہم میں حصہ لیا تھا۔ سبکتگین نے ایک شنسبانی شہزادہ محمد بن سوری سے خراج وصول کیا تھا۔

محمد بن سوری نے سبکتگین کے انتقال کے بعد خراج روک کر اور کاروانوں کی آمد و رفت میں دخل اندازی کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس وجہ سے سلطان محمود غزنوی کو طیش آیا اور اس نے 1011 میں ہرات کے گورنر التونتاش اور طوس کے گورنر ارسلان جاذب کو پیشرو دستہ بنا کر بھیجا اور خود جغرافیائی مشکلات سے ڈرے بغیر غور کی جانب کوچ کیا۔ محمد بن سوری نے دشوار گزار پہاڑوں میں خود کو قلمبند کر لیا اور محمود کو ایک چال چلنی پڑی، اس نے پسپائی کا ڈھونگ رچایا۔ اس وجہ سے پہاڑی لوگ پسپا شدہ فوج کو لوٹنے کے لالچ میں نیچے اتر آئے۔ تب محمود نے محمد بن سوری کو شکست فاش دے دی اور اس کو اور اس کے بیٹے شیش کو گرفتار کر لیا۔ 1020ء میں محمود نے غور کے جنوب مغربی علاقے خوابین کی جانب کوچ کیا اور چند قلعوں کو فتح کیا۔ چند سال بعد مسعود کو غور کے شمال مغربی حصے طاب کی طرف بھیجا گیا۔ اس کی مدد ابوالحسن اور شیروان کے سرداروں نے کی جو علی الترتیب غورر کے جنوب مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کے منتظم تھے۔ مسعود نے غور کے بہت سے قلعوں کو فتح کیا اور ماسوائے اندرونی دشوار گزار علاقوں کے پورے غور کو غزنوی دائرہ اقتدار میں لے آیا۔ ابوالفضل بیہقی لکھتا ہے کہ کوئی بھی غور میں اتنی دور تک داخل نہ ہو سکا تھا اور اتنے کارنامے انجام نہ دے سکا تھا جتنا کہ مسعود نے انجام دیے۔ اپنی رضا یا مجبوری سے غور کے امیر اپنی اطاعت پیش کرنے اس کے پاس آئے۔ وہ اس کی کامیابی سے خوفزدہ اور دم بخود تھے۔ روایات یا تصنیفات کسی میں بھی یہ ذکر نہیں کہ غور کے لوگ کسی اور بادشاہ کے اتنے اطاعت گزار تھے جتنا کے مسعود کے تھے۔ جب کہ محمد بن سوری سلطان محمود کے خلاف بغاوت کر رہا تھا اس کا بڑا لڑکا ابو علی سلطان کو اپنی وفاداری اور خیر خواہی کا یقین دلا رہا تھا۔ اس غداری نے خاندان کا چراغ گل نہ ہونے دیا۔ محمود نے ابو علی کو اس کے باپ کے تخت پر بٹھا دیا۔ ابو علی سلطان محمود کی حکومت کے زمانے تک بر سر اقتدار رہا۔ منہاج لکھتا ہے کہ اس نے غور میں کئی ایک اسلامی اداروں کو قائم کیا۔ اس نے ملکی اور میں جامع مسجد اور مدرسے بنوائے اور ان کی دیکھ بھال کے لیے اوقات قائم کیے۔ وہ علماء کی اور مذہبی پیشواؤں کی بڑے عزت کرتا تھا۔ صوفیوں اور تارک الدنیا بزرگان کی خدمت کو اپنا فرض جانتا تھا۔ ابو علی نے اپنے چھوٹے بھائی شیش کو غور آنے اور اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دی۔ لیکن شیش کے بیٹے عباس نے اچانک بغاوت کی اور اپنے چچا کو قید میں ڈال دیا۔

عباس نے غور کے حصاروں کے استحکام، قلعہ بندی اور ان میں فوج تعینات کرنے کے لیے کافی کوشش کی۔ لیکن وہ بہت مطلق العنان اور ظالم تھا اور غور کے امیر اس کے بے رحم رویوں سے اس قدر بدظن تھے کہ انہوں نے سلطان مسعود کے بیٹے سلطان رضی الدین ابراہیم کو اس ظالم سے نجات دلانے کے لیے دعوت دی۔ ابراہیم نے عباس کو گرفتار کر لیا اور غزنی لے گیا۔ لیکن اس نے خاندان کو ختم نہیں کیا بلکہ سلطان محمود کے نمونے پر عمل کرتے ہوئے عباس کے بیٹے محمد کو تخت پر بٹھا دیا۔ محمد نے اپنے غزنوی حکمراں کے ساتھ بہت اچھے تعلقات قائم رکھے۔ قبل اس کے کہ معزالدین کے بر سر اقتدار آنے تک کی غور کی تاریخ کا ذکر آگے بڑھایا جائے ایک ضروری معاملے پر غور کرنا ہے اس وقت غور کی مذہبی صورتحال کیا تھی اور کن ذرائع سے یہ دائرہ اسلام میں داخل ہوا۔

10.4 غور میں تبلیغ اسلام

غور کے ماقبل اسلام مذہبی حالات کے متعلق ہمیں بہت کم معلومات ہیں اور غوریوں کے اسلام قبول کرنے کے متعلق کوئی ہمعصر تحریر دستیاب نہیں ہے۔ چونکہ طخارستان، بامیان اور کابل بدمذہب کے سرگرم مراکز تھے۔اس لیے یہ فرض کیا جاسکتا ہے کہ غور کے لوگ بھی شاید ایک قسم کے مہایان بدھ مذہب کے پیروکار رہے ہونگے اس سلسلے میں یہ بات بھی ملحوظ خاطر رکھنی ہوگی کہ غور کے جنوبی علاقے مثلا زمندوار، غزنی اور قصدار ہندوستان سے ملحق تھے اور دسویں صدی تک ثقافتی اعتبار سے اور اکثر سیاسی اعتبار سے بھی اس کا ایک حصہ تھے۔ کابل غزنی اور بست ہندوستان اور مشرقی اسلامی ممالک کے درمیان تجارتی سلسلے کی اہم کڑیاں تھیں اور اکثر جغرافیہ دان ان کو سوداگروں کی آماجگاہ اور ہندوستان کی منڈی کہتے تھے۔ غزنوی دور کی شروعات میں پہلے دو شہروں میں ہندوستانی تاجروں کی مستقل آبادی تھی۔اس لیے یہ بعید از قیاس نہیں کہ غور علاقہ زیادہ تر بدھ مذہب کے ماننے والوں سے آباد ہوگا۔

غور میں اسلامی سیاسی اور ثقافتی اثرات کی ابتدا سلطان محمود غزنوی (998-1030ء) کے زمانے میں ہوئی۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی 1011 کی مہم کے بعد معلمین کی تقرری کی تاکہ وہ غور کے لوگوں کو اسلامی ہدایات کی تعلیم دے سکیں۔ کرامیہ فرقہ محمد بن کرام سے منسوب ہے جو سجستان کا رہنے والا تھا۔ جس کو اپنی مذہبی تبلیغ کے شروعاتی دور میں بہت ظلم برداشت کرنا پڑا تھا۔ لیکن بعد میں اس فرقہ کے لوگ غور، گرجستان، بامیان اور متصل علاقوں میں پھیل گئے۔ بغدادی لکھتا ہے کہ نیشاپور کے مضافات کے ستم زدہ لوگ خصوصی طور پر اس فرقہ کی جانب متوجہ ہوئے۔ان کے مذہبی عقائد کے متعلق بغدادی لکھتا ہے کہ ابن کرام نے اپنے پیروں کو تاکید کی کہ وہ اپنے معبود کی جسمانیت یا مادیت پر عقیدہ رکھیں۔اس کا کہنا تھا کہ وہ ایک جسم مادی ہے جس کے حدود متعین ہیں اور جس کی زیریں حد اس کے تخت سے متصل ہے۔اس طرح کرامی لوگ اللہ اور اس کے تخت کو اس طرح تصور کرتے تھے جیسے گوتم بدھ کنول پر بیٹھتے تھے۔آہستہ آہستہ کرامی فرقہ کو اسلام اور بدھ مذہب کے بیچ ایک درمیانی مقام حاصل ہوگیا، اور وہ غور کی مذہبی زندگی میں ایک اہم عنصر بن گیا۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس فرقے کے پیروں نے شنسبانی حکمرانوں کو بھی اپنے زمرے میں شامل کرلیا تھا۔

جب سلطان علاؤالدین جہاں سوز نے اسماعیلی ملحدین کے مرکز الموت کے داعین کو اپنی مملکت کے سارے طول وعرض میں مذہبی تبلیغ کی اجازت دی، تو غور جہاں عمومی طور پر کرامیوں کا اثر تھا، کی مذہبی زندگی میں ایک گہرا بحران کھڑا ہوگیا۔بقول منہاج الموت کے ملحدین نے غور کے لوگوں کو اپنے عقیدے میں شامل کرلینے اور ماتحت بنالینے کی ٹھان رکھی تھی۔ علاؤالدین کا رویہ شاید سیاسی اسباب سے متاثر تھا۔اسماعیلیوں کو بلاکر شاید وہ کرامیوں کے مذہبی اثرات کو کم کرنا چاہتا تھا کیوں کہ کرامی باطنیوں کے مخالف تھے اس لیے دونوں کے درمیان ایک شدید تصادم شروع ہوگیا۔ سلطان علاؤالدین جہاں سوز کے بیٹے سلطان سیف الدین محمد نے اپنے باپ کی پالیسی کو بدل دیا اور اپنی مملکت میں تمام ملحدین کے قتل کا حکم صادر کردیا۔

بقول منہاج، غیاث الدین اور معزالدین دونوں بھائی پہلے کرامی تھے۔ بعد میں وہ علی الترتیب شافعی اور حنفی عقائد اور مذہب کے

پیروکار ہو گئے۔ جن حالات میں ان کی تبلیغ ہوئی اور ان کا جو رد عمل ہوا اس کو منہاج اور ابن دسیر نے بیان کیا ہے۔ منہاج لکھتا ہے کہ جب معزالدین تخت نشیں ہوا تو اس نے دیکھا کہ اس علاقے کے رہنے والے زیادہ تر لوگ امام ابو حنیفہ کے پیرو تھے اس لیے اس نے بھی حنفی عقائد قبول کر کے ان کی مطابقت حاصل کر لی۔ اس طرح یہ معلوم ہوتا ہے کہ سیدھے سادے حالات کے تحت کی سیدھا سادہ فیصلہ ہوا۔ لیکن جیسا کہ پروفیسر حبیب نے سوال کیا ہے ہے اگر واقعی ایسا تھا تو غور کے زیادہ تر شہری ابھی بدھ مذہب کے ماننے والے تھے، پھر تو اسے بدھ مذہب قبول کرنا چاہیے تھا۔

ابن اثیر نے قدرے مختلف بیان پیش کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اہل خراسان جو کرامیوں کے مخالف تھے کہ دباؤ کی وجہ سے ان دونوں بھائیوں نے کرامی عقائد کو چھوڑ دیا۔ غیاث الدین کا شافعی عقیدہ قبول کرنا گہری غور و فکر کا نتیجہ تھا جو عطا اور شیخ وجیہ الدین مرورودی کی کوششوں کی وجہ سے ہوا۔ حنفی علماء کو اس تبدیلی عقائد سے ناراضگی ہوئی اور ان کے رہنما امام صدر الدین علی ہیضم نیشاپوری جو افشن کے ایک کالج کے پروفیسر تھے، نے سلطان کی ایک ہجو لکھی اور وہ ہجو کچھ اس طرح تھی۔

"خراسان میں بہت سارے شافعی تاجر ہیں، اعلیحضرت انہیں اکثر شہزادوں کے محلوں کے آگے منتظر پائیں گے۔ لیکن آپ نہایت تکلیف کے ساتھ ڈھونڈنے پر بھی شافعی مذہب کا پیروکار بادشاہ نہیں پائیں گے۔ اگر آپ کو اپنا آبائی عقیدہ بدلنا ہی تھا تو آپ دیگر بادشاہوں کی طرح حنفی ہو سکتے تھے۔ بخدا ابو حنیفہ اور امام شافعی دونوں آپ سے قیامت کے روز سوال کریں گے"

10.5 سلطان معزالدین کی ہندوستانی مہمات (1175-92ء)

10.5.1 ملتان

سلطان معزالدین کی ہندوستان کی جانب پہلی فوجی پیش قدمی 1175ء میں ہوئی جب اس نے ملتان کے قرامطیوں پر حملہ کیا۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل سلطان محمود غزنوی نے قرامطی حکمراں پر کاری ضرب لگائی اور ان کو ملتان سے بے دخل کر دیا تھا مگر اس کی موت کے بعد انہوں نے پھر اقتدار حاصل کر لیا۔ معیزالدین نے دوبارہ ان کی طاقت کو اکھاڑ پھینکا۔ یہ معلوم نہیں کہ معزالدین نے ملتان کے لیے کس طرح کا انتظامی ڈھانچہ تیار کیا لیکن اس علاقے میں قرامتی اقتدار پھر کبھی قائم نہ ہو سکا۔ بہر حال اس کی وجہ سے کرامتیوں کے دل میں سخت نفرت پیدا ہوئی اور چونکہ ان کی خفیہ تنظیم بڑی موثر تھی اس لیے بالآخر انہوں نے معزالدین کو قتل کر ڈالا۔

10.5.2 اچھ

ملتان پر اپنا قبضہ جمانے کے بعد مرض الدین نے اچھ کی جانب توجہ کی ہو گی۔ منہاج نے اچھ کی مہم کا علیحدہ تذکرہ نہیں کیا ہے۔ لیکن جب وہ بعد میں سلطان کے انہلواڑہ کی مہم کا ذکر کرتا ہے تو وہ اچھ کا ایک غور مملکت کی حیثیت سے ذکر کرتا ہے۔ فرشتہ کے مطابق اچھ پر 1176ء میں قبضہ ہوا۔ سلطان نے اچھ کو علی کرمانی کے حوالے کیا۔ طبقات ناصری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اندخود کی جنگ کے وقت ملک ناصر

الدین ایتم اچھ کا گورنر تھا۔ بعد میں معزالدین نے اس کو قباچہ کے حوالے کیا۔

10.5.3 نہر والا (انہلواڑہ)

1178-79ء میں اچھ اور ملتان سے گزرتے ہوئے معزدین نے نہر والہ کی طرف کوچ کیا۔ کتبوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی راجپوتانہ میں ترکوں کا دباؤ پچھلے دس سالوں سے محسوس کیا جارہا تھا۔ بہرام کے مقرر کردہ پنجاب کے گورنر باہلیم نے ناگور فتح کر لیا تھا۔ لیکن اس فتح کی نہایت ایسی تھی کہ شیخ رضی الدین حسن صغانی جب اس علاقے کا دورہ کر رہے تھے تو انہیں اپنی پوشاک بدلنی پڑی تھی۔ تاکہ ان کا مسلمان ہونا ظاہر نہ ہو جائے۔ اس طرح یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان سپاہیوں کو گنگا کے دوآب کے مقابلے میں مغربی راجپوتانا سے زیادہ واقفیت تھی۔ معین الدین نے محمود کے کارنامے کو دہرانے کی کوشش کی اور جنوبی ہندوستان اور اس کے مندروں کی دولت تک راجپوتانہ اور گجرات ہو کر پہنچنے کی کوشش کی۔ ابو پہاڑ پہنچ کر محض دین کی فوج تھک کر پریشان ہو گئی ہو گی۔ کسی ہندوستانی حکمران سے اس کے مقابلے کا یہ پہلا موقع تھا۔ نہر والہ کے حکمران آپ کے پاس ایک طاقتور فوج اور ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد تھی ابو پہاڑ کے نزدیک ایک گاؤں کیادرا میں جنگ ہوئی۔ والدین کی فوج کو شکست فاش ہوئی اور وہ کسی طرح اپنی شکست خوردہ فوج کے ساتھ گجرات سے بھاگ نکلا۔

10.5.4 پشاور

نہر والا کی شکست معزالدین کے لیے فوجی حکمت عملی میں ایک سبق تھی۔ اگر وہ محمود کی برابری کی کوشش کر رہا تھا تو وہ غلط فہمی میں مبتلا تھا۔ ذرائع سر براہی اور تبدیل شدہ حالات نے بالکل نقشہ پلٹ دیا تھا۔ اپنے تجربات کی روشنی میں اس نے اپنی جنگی کارروائیوں کا پورا نقشہ بدل دیا۔ 1179-80ء میں میں اس نے پشاور جو غزنویوں کی ہندوستانی مملکت میں شامل تھا پر حملہ کیا اور اس پر قبضہ کر لیا۔

10.5.5 لاہور

پشاور ترائن کی جانب پہلا قدم تھا اور اس کے دو سالوں کے اندر اس نے لاہور کی جانب کوچ کیا۔ غزنوی خاندان کی حکومت جواب سمٹ کر صرف لاہور اور اس کے گردونواح تک رہ گئی تھی۔ اس کے آخری حکمران خسرو ملک یہ مدافعت کی طاقت نہ دیکھ کر معزالدین سے گفت وشنید کرنے کا فیصلہ کیا۔ اپنی نیک نیتی اور معزالدین کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم رکھنے کے ثبوت کے طور پر اس نے اپنے لڑکے کو مع ایک ہاتھی کے معزالدین کے پاس بھیجا۔ لیکن یہ وقتی مصالحت ہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ ملک کے اندر اپنے اقتدار کی توسیع کے لیے معزالدین کو لاہور پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔ اس کے علاوہ محمود کے خاندان اور شنسبانوں کے درمیان جو تعلقات رہے تھے اس کے پیش نظر سر یہ مصالحت زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتی تھی۔ 1182ء میں معزالدین نے دیبل (موجودہ کراچی) کی جانب کوچ کیا اور سمندر تک کا سارا علاقہ قبضہ کر لیا۔ مگر حکمران نے اس کی ماتحتی قبول کر لی اور اگلے تین سال تک سکون رہا۔ 1184-85ء میں معزالدین کی فوجوں نے لاہور کی جانب حرکت کی اور پورے علاقے کو تاراج کیا۔ خسرو ملک کو شہر پناہ کے اندر محصور ہونا پڑا۔ واپسی سے قبل سیالکوٹ کے قلعے کی تعمیر کا حکم دیا اور حسین بن خرمیل کو وہاں کا حاکم مقرر کیا۔ سلطان کے تبدیل شدہ جنگی نقشے میں سیالکوٹ کی بڑی اہمیت تھی اور ملک کے اندر مزید فوجی کارروائیوں کے

لیے معزالدین اس کو اور مستحکم بنانا چاہتا تھا۔ لیکن خسرو ملک ملک اپنے دارالحکومت کے اس قدر نزدیک غوری طاقت کے استحکام کو اپنی مملکت کے لیے خطرہ سمجھتا تھا۔ اس نے تمام دستیاب ذرائع کو اکھٹا کرکے اور کھوکھر قبیلے کی مدد سے سیالکوٹ کے قلعہ کا محاصرہ کیا۔ لیکن یہ محاصرہ اس کے لیے دشوار ثابت ہوا اور اس کو شرمندہ ہو کر لاہور واپس ہونا پڑا۔ اس طرح بغیر کوئی فائدہ حاصل کیے اس نے معزالدین کی مخالفت مول لی۔ 1186ء میں معزالدین غزنوی طاقت کے آخری آثار کو مٹانے کا ارادہ کرکے لاہور پہنچ گیا۔ اپنی کمزور حیثیت کا معائنہ کرنے کے بعد معزالدین سے گفتگو کرنے کے لیے وہ قلعے سے باہر نکل آیا۔ اس کے سرکشانہ سرگرمیوں کو پیش نظر رکھ کر معزالدین نے اس کو گرفتار کرلیا اور گرجستان کے ایک قلعہ میں بھیج دیا جہاں 1192ء اس کی موت ہوگئی۔ اس کی موت کے ساتھ ہی غزنوی خاندان کا نام ونشان مٹ گیا۔ اس طرح لاہور غوریوں کے قبضے میں آگیا۔ اب دیبل سے سیالکوٹ تک اور پشاور سے لاہور تک ہر طرف معزالدین کی فوجی چھاونیاں پھیلی ہوئی تھیں۔ اس کی فتح کا ایک اہم پہلو جو اکثر نظر انداز کر دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ راجپوت حکومتوں پر حملہ شروع کرنے سے پہلے اس نے سندھ اور پنجاب میں اپنی طاقت کو مضبوط کیا۔ یہ سارا علاقہ ایک ہی تھا۔ یہ بات اس سے ظاہر ہوتی ہے کہ علی کرماخ جو ملتان کا والی اور سپہ سالار تھا، وہ لاہور میں تعینات ہوا۔ بھلے ہی اس علاقے کا فوجی وانتظامی حاکم اعلی علی کرماخ تھا لیکن عدلیہ کا انتظام مولانا سراج الدین کو دیا گیا جو طبقات ناصری کے مصنف منہاج کے والد تھے۔ ان کے تحت کچھ اہلکار بھی بحال کیے گئے۔

10.5.6 تبرہند (بھٹنڈہ)

معزالدین کا اگلا ہدف تبرہند (بھٹنڈہ) کا قلعہ تھا۔ اس پر قبضہ کر لیا گیا اور اس کو ملک ضیاء الدین توکلی کے زیر انتظام کر دیا گیا، اور بارہ ہزار سواروں کی ایک فوج قلعہ کی حفاظت کے لیے متعین کی گئی، جو کہ ساری فوج میں سے بہترین دستوں پر مشتمل تھی۔ اس کے ذمے قلعہ کو آٹھ مہینوں تک سمبھالے رکھنے کی ذمہ داری تھی۔ معزالدین کا ایک ارادہ تھا کہ اس عرصے کے بعد وہ ہندوستان آئے گا تاکہ تبرہند میں اپنی طاقت کو اور مستحکم کرے اور مزید علاقوں کو فتح کرے۔ رآئے پتھورا (پرتھوی راج سوم) نے معزالدین کو استحکام کا موقع دینے کے خطرے کو محسوس کیا۔ اس کے سیاسی شعور نے اس کو فوری اقدامات اختیار کرنے پر مجبور کیا اور غوریوں کو ان کی فوجی اہمیت کے مقام سے ہٹانے کے ارادے سے وہ تبرہند کی جانب روانہ ہوا۔ معزالدین رائے پتھورا کا مقابلہ کرنے کے لیے واپس لوٹا۔ حالانکہ شاید اس نے اس جنگ کا اندازہ نہیں کیا تھا اور وہ اس وقت کسی راجپوت حکمراں کے خلاف بڑی جنگ کے لیے تیار نہیں تھا۔ مزید برآں رائے پتھورا بھی میدان جنگ میں نہیں آیا تھا۔ فرشتہ کے بقول "کولاہ کے رائے کے ساتھ ہندوستان کے تمام رانا شامل تھے۔ اس کی فوج میں دو ہزار گھوڑے اور 33 ہزار ہاتھی شامل تھے۔" حالانکہ یہ اعداد ناقابل یقین ہیں۔

10.6 ترائن کی پہلی جنگ

یہ جنگ ترائن میں ہوئی تھی۔ فرشتہ نے تمام فارسی ماخذ کے مطالعے کی بنا پر اس جنگ کا تذکرہ اس طور پر کیا ہے۔ "معزالدین کی فوج کے داہنے اور بائیں دستے منتشر ہوگئے تھے اور مرکز میں بھی بہت زیادہ آدمی باقی نہیں تھے۔ اس مقام پر سلطان کے ایک افسر نے عرض کیا کہ

داہنے اور بائیں جانب کے امراء جن کی پرورش آپ کے شاہی خاندان میں ہوئی منتشر اور فرار ہو چکے ہیں۔افغان اور خلجی امراء جو ہراول دستہ تھے اور برابر اپنی مردانگی اور شجاعت کی ڈینگ مارتے تھے،ان کا میدان میں کچھ اتا پتا نہیں ہے۔اس صورتحال میں سب سے مفید قدم یہ ہوگا کہ آپ فوراً لاہور کی جانب باگ موڑ دیں۔سلطان یہ مشورہ سن کر ناخوش ہوا۔اس نے اپنی تلوار کھینچی اور مرکزی دستہ لے کر دشمن پر حملہ کردیا دوست اور دشمن سبھی نے اس کی ہمت اور چابکدستی کی تعریف کی۔کھانڈے راؤ کی نظر سلطان پر پڑی تو اس نے اپنے بلند ہاتھی کو سلطان کی جانب بڑھایا۔سلطان بھی ہاتھ میں نیزہ لے کر کھانڈے راؤ کی طرف بڑھا اور اس کے منہ پر ایسا سخت وار کیا کہ اس کے بہت سے دانت اس کے منہ میں گر گئے۔لیکن پھر بھی رائے نے بڑی ہمت اور اطمینان سے کام لیا اور سلطان کے بازو پر ایسا وار کیا کہ وہ اپنے گھوڑے پر لڑکھڑا گیا۔اس موقع پر ایک خلجی پیدل سپاہی جس نے سلطان کی خطرناک صورتحال دیکھ لی تھی،اس کے گھوڑے پر سوار ہو گیا اور سلطان کے پیچھے بیٹھ کر گھوڑے کو ایڑ لگادی۔اس طرح وہ سلطان کو بھاگتے ہوئے غوری امیروں کے پاس لے گیا جو تقریباً بیس کروہ آگے جا چکے تھے۔منہاج کے مطابق کئی امراء اور غوری نوجوان اور دیگر معزز اشخاص نے سلطان کو اس خلجی سپاہی کے ساتھ دیکھا اور اس کے گرد جمع ہو گئے۔انہوں نے اپنے نیزے توڑ کر ایک پالکی (Stretcher) بنایا اور اس کو اپنی جائے قیام تک لے گئے۔معزالدین کو شکست دینے کے بعد رائے پتھورا کی فوج تبرہند کی جانب بڑھی۔ملک ضیاء الدین نے اس قلعہ کی 13 مہینوں تک محافظت کی مگر بعد میں ہتھیار ڈالنے پڑے۔اس درمیان معز الدین نے رائے پتھورا سے ایک اور مقابلے کی تیاریاں کی۔

10.7 معزالدین کی تیاریاں

معزالدین کی انتقامی تیاریوں کے متعلق منہاج نے اختصار سے کام لیا ہے۔لیکن فرشتہ ایسے ماخذ کی بنا پر جواب موجود نہیں یا زبانی روایات کی بنا پر کچھ تفصیلات مہیا کرتا ہے۔لیکن یہ تفصیلات معزالدین کے مزاج،کردار اور بعد کے کارناموں کے بالکل مطابق ہیں۔اپنے بھائی سے ملنے غور جانے سے پہلے اس نے اپنے غوری خلجی اور خراسانی امیروں کو سخت سزائیں دیں۔اس نے افغانوں کو کچھ نہیں کہا۔شاید اس لیے کہ جن علاقوں میں یہ قبیلہ آباد تھے وہ معزالدین نے حال ہی میں فتح کیے تھے،اور دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ ان کی غلطی کو نظرانداز کردیا جائے۔غوری خلجی اور خراسانی امیروں کی گردنوں میں غلوں کے تھیلے ڈال کر ان کو شہر میں گھمایا گیا۔اگر ان میں سے کوئی وہ غلہ کھانے سے انکار کرتا تو اس کا سر قلم کردیا جاتا۔جب معزالدین دارالسلطنت فیروز کوہ پہنچا تو وہ سخت غمگیں اور شرمسار تھا۔اس نے اپنے اوپر آرام حرام قرار دے دیا اور شب و روز جنگ کی تیاریوں میں مصروف رہنے لگا۔ایک سال کی تیاری کے بعد معزالدین نے ہندوستان کی راہ اختیار کی۔جب وہ پشاور پہنچا تو ایک پرانے وفادار افسر نے ہمت کر کے اس کی منزل مقصود کے بارے میں پوچھا۔سلطان نے اپنا ارادہ بتادیا اور یہ کہا کہ اس نے غوری، خلجی اور خراسانی امراء کو اپنے سامنے حاضر ہونے کی اجازت نہیں دی ہے اور ان کی مدد کے بغیر اللہ پر بھروسہ کر کے ہندوستان جارہا ہے۔اس افسر نے عتاب زدہ امراء کی طرف سے معافی کی درخواست کی جسے سلطان نے قبول کرلیا۔ملتان پہنچ کر اس نے ان امراء کو انعام دیا جو اس کی غیر حاضری میں ثابت قدم رہے تھے۔عصامی کا کہنا ہے کہ سندھ کے نزدیک 40 بہادر اور جنگجو ترک سوار فوج میں شامل ہوئے۔

تاج المآثر کے مطابق معزالدین نے قوام الملک رکن الدین حمزہ کو لاہور سے رائے پتھورا کے پاس روانہ کیا اور اطاعت قبول کرنے کا پیغام دیا۔ رائے سخت جواب دیا اور ہندوستان کی تمام راجاؤں سے مدد طلب کی۔ فرشتہ کے مطابق رائے کی فوج میں تین لاکھ راجپوت اور افغان تھے لیکن یہ تعداد مبالغہ آمیز معلوم ہوتی ہے اور قابل قبول نہیں۔ منہاج کو معین الدین اوشی نامی ایک بھروسہ مند آدمی نے بتایا تھا کہ اس وقت معزالدین کی فوج میں غور کے چار جانباز فوجی کمانڈر تھے جو کہ تجربہ کار اور ہوشیار تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے تحت ایک بڑی فوج تھی۔ ان کے علاوہ تاج الدین یلدوز، ناصر الدین قباچہ اور قطبِ الدین ایبک تھے۔ سلطان غور سے 1191ء میں روانہ ہوا۔ 1191-92ء میں ترائن پہنچا۔ اس نے اسی جگہ اپنا خیمہ نصب کیا جہاں ایک سال قبل اس کو شکست ہوئی تھی۔ فرشتہ کے مطابق رائے پتھورا کے ساتھ جنگ 150 ٹھاکر یا رانا تھے جو یہ سوچ کر نکلے تھے کہ یا تو دشمنوں کو کچل دیں گے یا خود اپنی جانیں گنوادیں گے۔

10.8 ترائن کی دوسری جنگ

اس مرتبہ معزالدین نے بہت سوچ سمجھ کر جنگ کا نقشہ تیار کیا تھا۔ اس نے کل بھی دستے کو جس میں اسباب، علم، جھنڈے اور ہاتھی شامل تھے، کئی میل پیچھے چھوڑ دیا تاکہ دشمن کو اس کی صحیح طاقت کا اندازہ نہ ہو سکے۔ یہ دستہ ایک طرح کا محفوظہ (Reserve Force) تھا اور یہ اس وقت میدان جنگ میں لایا جانا تھا جبکہ بقیہ فوج راجپوتوں سے نبرد آزما ہو چکی ہو۔ اس دستے کو پیچھے چھوڑ کر معزالدین کی بقیہ فوج آگے روانہ ہو گئی۔ فوج کے اس حصے کو جو ہلکے اسلحوں سے لیس گھوڑ سواروں پر مشتمل تھا، چار دستوں میں تقسیم کر دیا گیا تاکہ یہ ہندوستانی فوج پر چاروں طرف سے حملہ کر سکے۔ اپنی فوج کو یوں منقسم کر کے نواز دین نے دس ہزار گھوڑ سوار تیر اندازوں کو یہ حکم دیا کہ وہ دشمن کی فوجوں کو داہنے بائیں آگے اور پیچھے کی جانب سے الجھائے رکھے۔ دشمن کے ہاتھیوں اور گھوڑوں سے برابر کا فاصلہ رکھ کر ان پر تیر برساتے رہو۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کی فوج کو اس طرح حیران و پریشان رکھا جائے کہ اس کی فوج کی پوری تعداد میدان جنگ میں موجود رہے۔

اگلے روز میدان کارزار گرم ہوا۔ عصامی کے مطابق راجپوت فوجوں کے ہراول کا سالار گووند رائے تھا۔ وہ پتھورا کی فوج کے ہراول دستے میں لڑ رہا تھا۔ قلب میں رائے پتھورا موجود تھا۔ جب کہ اس کی فوج کی بایاں حصہ اس کے وزیر بھولا کی سرکردگی میں لڑ رہا تھا۔ دایاں حصہ کی قیادت بدمسار اول کے ہاتھ میں تھی۔ دوسری طرف معزالدین کی فوج کے قلب کی کمان معزالدین کے اپنے ہاتھ میں تھی۔ ہراول دستے کا سالار خربک تھا۔ داہنا دستہ سالار آلہا کے تحت اور بائیں دستہ کی سربراہی سالار کمیل کر رہا تھا۔ قطب الدین کے ذمہ فوج کی عام نگرانی تھی، اور وہ معزالدین کے نزدیک تھا۔ بقول عصامی سلطان کی فوج ایک لاکھ تیس ہزار سواروں پر مشتمل تھی اور اس کا ہر سپاہی آہنی زرہ اور ہتھیاروں سے لیس تھا۔ گووند رائے ہاتھیوں کے دستے کے ساتھ آگے بڑھ کر خربک پر حملہ آور ہوا۔ خربک نے اپنی حفاظت کے لیے منہ پر ڈھال رکھ لی اور اپنے تیر اندازوں کو فیل بانوں پر نشانہ محصول ے کو کہا۔ جیسے ہی تین چار فیل بان زخمی ہوئے ہاتھیوں کی صفیں بکھر گئیں اور ہاتھی میدان سے بھاگنے لگے۔ جب ہاتھی پیچھے ہٹ گئے تو خربک نے ان پر اپنا دباؤ بڑھا دیا۔ جب سلطان نے دشمن کی صفوں کو درہم برہم دیکھا تو اپنے داہنے اور بائیں جانب سے حملہ کروا دیا اور خود قلب کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ راجپوتوں کی صفیں ٹوٹ گئیں اور وہ بھاگنے لگے۔

معزالدین کی ترکیب کامیاب ہوئی اور رائے پتھورا کو سخت شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنے ہاتھی سے اتر گیا اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر فرار ہو ہی رہا تھا کہ سر سوتی کے نزدیک گرفتار کر لیا گیا۔ منہاج کے مطابق اس کو اسی وقت قتل کر دیا گیا۔ لیکن حسن نظامی کے مطابق اس کو اجمیر لے جایا گیا اور کچھ دنوں تک بحال رکھا گیا۔ بعد میں غداری کا الزام عائد ہونے پر وہ قتل کر دیا گیا۔ سکوں اور سنسکرت تذکروں کی شہادت سے اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ اس کو کچھ عرصے تک حکومت کرنے کا موقع دیا گیا۔ رائے پتھورا کے کچھ سکوں کے اوپر کی جانب "سری محمد سام" کندہ ہے۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے معزالدین کی ماتحتی قبول کر لی تھی۔ رآئے پتھورا کے قتل کے بعد بھی اجمیر کی حکومت کو اپنے اختیار میں نہیں لیا گیا اور اس کے بیٹے کو کچھ عرصے تک ماتحت حکمراں کی حیثیت سے کام کرنے دیا گیا۔

دہلی کا گووند رائے میدان جنگ میں مارا گیا۔ لیکن جو پالیسی اجمیر کے متعلق اختیار کی گئی تھی وہی دہلی کے متعلق بھی اپنائی گئی۔ گووند رائے کے جانشین نے معزالدین کی ماتحتی قبول کی۔ حسن نظامی لکھتا ہے کہ اس علاقے کے رائے اور مقدموں نے اطاعت اختیار کی اور جب انہوں نے مال گزاری اور مراسم خدمتی ادا کرنے کا وعدہ کیا تو انہیں انکی زمینوں میں برقرار رکھا گیا لیکن اندرپرستھ میں ایک لشکر گاہ قائم کر دی گئی۔

10.9 شمالی ہندوستان کی فتح(1192-1206ء)

اسرائیل راجپوتوں کے لیے ایک بڑا حادثہ تھا۔ راجپوتوں کی سیاسی عزمت کو عام طور پر اور چوہانوں کے اقتدار کو خاص طور پر سخت دھکا لگا۔ ساری چوہان حکومت اب حملہ آوروں کے قدموں میں تھی۔ جو کہ ترائن کی جنگ راجپوت شہزادوں کی ایک بڑی جماعت کی مشترکہ کوشش تھی اس لیے اس کے اثرات بڑے پیمانے پر محسوس ہوئے اور دور دور تک بددلی اور پست ہمتی پھیل گئی۔ ترائن میں اپنی کامیابی کے فورا بعد معزالدین نے شوالک کا پورا علاقہ جس میں ہانسی اور سر سوتی شامل تھے قبضہ کر لیا جبکہ کہرام کو ایبک کے حوالے کر کے معزالدین غور واپس چلا گیا۔ اس دوران قطب الدین ایبک نے اجمیر اور اس کے اطراف میں اٹھنے والی راجپوت بغاوتوں کی روک تھام کی اور ترک اقتدار کو مضبوطی سے قائم کیا۔ اس نے ہری رائے اور جھٹ راؤ کی بغاوتوں کو بھی دبا دیا۔ اس دوران اسے ایک بار غور بھی جانا پڑا۔ واپس ہونے کے بعد 1194ء ایبک نے جمنا پار کر کے کول (موجودہ علی گڑھ) فتح کیا۔

10.9.1 چنداور کی جنگ 1194ء

ایبک ابھی کول کی فتح سے فارغ ہی ہوا تھا، کہ معزالدین اس ارادے سے ہندوستان آپہنچا کہ گہڑوال اقتدار کا خاتمہ کیا جائے۔ اس نے دہلی میں فوجیوں کی بھرتی کی اور پھر پچاس ہزار فوج کے ساتھ قنوج اور بنارس کی جانب کوچ کیا۔ ایبک اور سپہ سالار عزالدین حسین بن خرمیل کے ذمہ ہراول دستے کی قیادت سونپی گئی۔ یہ جنگ چنداور کے پاس لڑیں گئی۔ سخت مقابلہ ہوا بلآخر معزالدین کو شاندار کامیابی حاصل ہوئی اور جو بھی فوری فوائد رہے ہوں مگر منہاج سب سے زیادہ خوشی اس بات کی ظاہر کرتا ہے کہ تین سو سے کچھ زائد ہاتھی معزالدین کے قبضے میں آئے۔ درحقیقت یہ فتح اور زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ اگرچہ پوری۔ گڑھوال سلطنت پر قبضہ نہ ہو سکا لیکن اس فتح کے بعد بنارس اور ہانسی جیسے

مقامات پر فوجی چھاونیاں قائم کرنا ممکن ہو سکا۔اب بھی کئی گڑھوال علاقے اپنی آزادی قائم کیے ہوئے تھے۔ مثلا قنوج پر 1198-99ء تک قبضہ نہ ہو سکااور اس وقت بھی مکمل طور پر قبضہ نہ جم سکا۔ کیونکہ ہم بعد میں التمش کو قنوج پر حملہ کرتے ہوئے پاتے ہیں۔ سلطان کے غور واپس ہونے کے بعد ایبک کو کول کے استحکام پر دوبارہ توجہ دینی پڑی۔

10.9.2 بیانہ اور گوالیار کی فتح

1195-96ء میں معزالدین پھر ہندوستان آیا۔اس مرتبہ اس نے بیانہ پر حملہ کیا،جو بھٹی راجپوت حکمراں کمار پال کے قبضہ میں تھا۔اس لیے آپ نے دارالسلطنت بیانہ میں جنگ سے بچنے کے لیے ٹھنکر میں جاکر قلعہ بندی کی۔ لیکن تھوڑی سی مزاحمت کے بعد اسے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بیانہ اور ٹھنکر پر قبضہ کر لیا گیااور اسے بہاوالدین طغرل کے حوالے کر دیا گیا۔اس کے بعد معزالدین نے گوالیار کی جانب کوچ کیا۔ لیکن پر تیہار خاندان کے حکمران سللچھن پال نے بنالڑے ہی سلطان کی ماتحتی قبول کرلی۔اس دوران ایبک اجمیر کی بغاوت کو کچلنے کے بعد نہر والہ یا انہلواڑہ کی طرف روانہ ہوااور آبو کے اسی چالوکیہ حکمران جس نے کچھ سال قبل معزالدین کو شکست دی تھی، ایبک نے شکست فاش دے کر انہلواڑہ سے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ لیکن یہاں مستقل ترک اقتدار قائم کرنے کی کوشش نہیں کی گئی کیوں کہ راجپوتانہ بھی ابھی ترک اقتدار سے باہر تھابلکہ مفتوحہ علاقے کو پرانے حکمران خاندان کے حوالے کر دیا گیا۔

10.9.3 بختیار خلجی کے کارنامے

اس دوران ایک ترک مہم جو بختیار خلجی نے شاہی افواج سے الگ بہار اور بنگال فتح کر لیا۔اس علاقے کی حکمرانی کی سند اسے ایبک سے حاصل ہو گئی جو کہ ہندوستان میں سلطان کا نائب سلطنت تھا۔ لیکن تبت اور آسام کی مہم میں اسے سخت نقصان اٹھانا پڑا۔اس کے صدمے میں وہ بیمار پڑ گیا۔اسی بیماری کی حالت میں موقع پاکر ایک دوسرے امیر علی مردان نے اس کا کام تمام کر دیااور خود بنگال اور بہار پر قابض ہو گیا۔

10.10 معزالدین کی آخری ہندوستانی مہم اور اس کی وفات

اندخود میں خوارزم شاہ کے ہاتھوں معزالدین کی شکست کی خبر پھیلتے ہی ساری مملکت میں شر پسند عناصر زور پکڑنے لگے۔ یہاں تک کہ سلطان کی موت کی جھوٹی افواہ پھیلائی گئی۔ حسن نظامی کے مطابق اس کے ایک افسر ایبک بیک نے اندخود کے میدان اس کا ساتھ چھوڑ دیااور ملتان پہنچ گیا۔ جہاں اس نے گورنر کا قتل کر کے اپنی خود مختار حکومت قائم کرلی۔

منہاج حسین خرمیل کے دھوکے سے بھاگنے کا ذکر کرتا ہے۔تاریخ گزیدہ کے مطابق معزالدین کے ایک افسر الاد گزنے اس موقع پر غور پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن کسی دوسری تحریر میں اس بیان کی تائید نہیں ملتی۔ گناہوں کا اثر ہندوستان میں بھی ہوا۔ کھوکھروں نے جو غزنی۔ لاہور شاہراہ کے علاقے میں رہتے تھے، پورے علاقے میں ہنگامہ برپا کر دیا۔ان کی حرکتوں کی وجہ سے غزنی اور لاہور کے درمیان مراسلات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔اس خطرے کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے معزالدین خود ہندوستان روانہ ہوا تاکہ کھوکھروں سے نپٹ سکے۔ کھوکھر بہادری

کے ساتھ لڑے لیکن ان کو ہرا دیا گیا اور پسپا ہونے پر مجبور کر دیا گیا۔ معزالدین نے لاہور کے معاملات طے کیے اور ایبک کو دہلی جانے کی اجازت دے کر غور کو روانہ ہوا۔ سفر کے دوران معزالدین دریائے سندھ پر واقع ایک مقام درمیاک پر ٹھہرا اور دریا کے کنارے ایک ٹھنڈے سبزہ زار میں خیمہ زن ہوا۔ جب وہ مغرب کی نماز ادا کر رہا تھا تو چند قاتل اس کے خیمے میں چپکے سے داخل ہو گئے اور 3 شعبان 602ھ/1206ء کو سلطان کو قتل کر دیا۔ اس طرح فاتح فوج کا ایک جلوس جنازے میں بدل دیا۔

10.11 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

آپ نے غور کے جغرافیائی حالات کے بارے میں جانا کہ غور پانچ پہاڑی علاقوں میں منقسم ہے اور یہ پہاڑ اس قدر دشوار گزار ہیں کہ ان کی وجہ سے غور باقی دنیا سے ثقافتی اعتبار سے کٹا ہوا ہے۔ یہاں پر انگور انار اور خوبانی کے کافی درخت ہیں، ساتھ ہی یہاں اعلیٰ قسم کا لوہا اور بہترین گھوڑے بھی پائے جاتے ہیں۔ ہم نے شنسبانی خاندان کے ابتدائی حالات کے بارے میں جانکاری حاصل کی اور غزنوی خاندان کے ساتھ انکے تعلقات کی بھی جانچ پڑتال کی ہے۔ زیادہ تر یہ رشتے تناؤ سے بھرپور رہے اور بالآخر شنسبانی خاندان کے ہاتھوں غزنوی خاندان کا چراغ گل ہو گیا۔ ہندوستان کی فتح میں معزالدین کو کیا مشکلات پیش آئیں، کس طرح انلہواڑہ کی شکست کے بعد اس نے اپنی جنگی حکمت عملی تبدیل کی۔ ترائن کی پہلی شکست کے بعد وہ لگاتار تیاریوں میں لگا رہا اور بالآخر اس میدان میں دشمن کو شکست فاش دی، ہم نے اس سب کو تفصیل سے جانا ہے۔

شمالی ہندوستان کی فتح میں ایبک اور بختیار خلجی کا غیر معمولی کردار تھا۔ ایبک نے معزالدین کی غیر موجودگی میں نہ صرف اجمیر کی مہر بغاوت کا قلعہ قمع کیا بلکہ انہلواڑہ کے راجا بھیم دوم کے ہاتھوں اپنے آقا اور سرپرست کی ہار کا بھرپور بدلہ لیا۔ دوسری طرف بختیار خلجی نے نہایت بے سروسامانی کے باوجود بنگال اور بہار جیسے وسیع علاقوں کو فتح کیا۔ سلطان معزالدین کی وفات کن حالات میں ہوئی، یہ بھی ہم اس اکائی کے مطالعہ کے بعد جان چکے ہیں۔

10.12 کلیدی الفاظ (Keywords)

محل وقوع	:	کسی چیز کے ہونے کی جگہ
فیروز کوہ	:	غور کا مرکزی مقام اور غوریوں کا پایہ تخت
اصطخری	:	دسویں صدی کا ایک سیاح
زابلستان	:	جنوبی بلوچستان
ہندوشاہی	:	دسویں صدی میں پنجاب، کابل اور قندھار کے علاقوں پر حکومت کرنے والا ایک خاندان
دسترس	:	پہونچ
مورث اعلیٰ	:	خاندان کا بانی

10.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

10.13.1 معروضی سوالات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. غور افغانستان کے کس حصہ میں واقع ہے۔
2. غور کے تیسرے پہاڑی سلسلہ کا نام بتائیے۔
3. منہاج سراج کی تصنیف کا نام بتائیے۔
4. پل آہنگران سے کیا مراد ہے۔
5. معزالدین کس خاندان کا فرد تھا۔
6. منہاج کے مطابق معزالدین اور غیاث الدین پہلے کس فرقہ کے ماننے والے تھے۔
7. ترائن کی دوسری جنگ کس سال میں لڑی گئی۔
8. معزالدین نے کس کو اپنا ایلچی بنا کر رائے پتھورا کے پاس بھیجا۔
9. کس سیاح نے غور کی زرخیزی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے۔
10. معزالدین نے ہندوستان میں اپنا نائب السلطنت کس کو بنایا۔

10.13.2 مختصر سوالات کے حامل جوابات (Short Answer Type Questions)

1. غور کے پانچ پہاڑی سلسلوں کے نام بتائیے۔
2. ترائن کی پہلی جنگ کے بارے میں مختصر نوٹ لکھیے۔
3. چنداور کی جنگ کا مختصر جائزہ لیجیے۔
4. معزالدین کی وفات پر روشنی ڈالیے۔
5. نہر والا کی شکست کے احوال بیان کیجیے۔
6. کرای لوگوں کے عقائد بتائیے۔
7. غور کے علاقہ میں ابو منظر اسعد کی مہم کے بارے میں بتائیے۔
8. معزالدین کی لاہور مہم اور خسرو ملک کے انجام کے بارے میں بتائیے۔

10.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. غور کے جغرافیائی حالات کے بارے میں ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. شنسبانی خاندان کے ابتدائی حالات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

3. غور میں اسلام کی اشاعت پر روشنی ڈالیے۔
4. ترائن کی جنگ سے پہلے تک معزالدین کی ہندوستانی مہمات پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
5. شمالی ہندوستان کی فتح کے مختلف مراحل کا جائزہ لیجیے۔

10.14 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Stanley Lan Poole, *Medival India Under Mohammedan Rule*
2. A.B.M. Habibullah, *Foundation of Muslim Rule In India*
3. Wolesley Haig(Ed), *Cambridge History of India*
4. John Briggs, *History of the Rise of the Mohammaden Power in India till 1612 AD*

5. تاریخ فرشتہ : محمد قاسم ابن ہندو شاہ فرشتہ استر ابادی
6. منتخب التواریخ : ملا عبدالقادر بدایونی/ڈاکٹر علیم اشرف خان
7. جامع تاریخ ہند : محمد حبیب، خلیق احمد نظامی

اکائی 11۔ ہندوستانی سیاست اور سماج پر اثرات

(Impact on Indian Polity and Society)

اکائی کے اجزاء

11.0 تمہید
11.1 مقاصد
11.2 ترکی حملوں کے وقت ہندوستان کی حالت
11.2.1 ذات کا نظام
11.3 ترکوں کی فتح کے اثرات
11.4 معیشت اور سماج پر اثرات
11.5 اکتسابی نتائج
11.6 کلیدی الفاظ
11.7 نمونہ امتحانی سوالات
11.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
11.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
11.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
11.8 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

11.0 تمہید (Introduction)

عربوں کی سندھ میں آمد سے ہندوستان کی سیاست پر بھلے ہی کوئی خاص اثرات مرتب نہ ہوئے ہوں لیکن ہندوستانی سماج اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔712ء میں محمد بن قاسم کے ہاتھوں سندھ کی فتح کے بعد سندھ اسلامی دنیا کا حصہ بن گیا۔متعدد صوفیوں اور ارباب علم کے آنے سے یہاں نو مسلموں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا۔بہت سے مورخین ان حملوں کے سیاسی اثرات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہندوستان کے پس منظر میں اس کو غیر اہم مانتے ہیں۔حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس واقعے کے بعد ہندوستان میں عرب تاجروں اور سیاحوں کی سرگرمیاں بڑھ گئیں۔ہندوستان میں بہت سی مسلم بستیاں ہندو راجاؤں کی سرپرستی میں وجود میں آئیں۔ان تاجر بستیوں کو شاہی سرپرستی بھی حاصل تھی کیونکہ ان کے ہونے سے ریاست کی آمدنی اور وقار میں اضافہ ہوتا تھا۔کچھ عرصہ کے بعد پنجاب بھی غزنوی خاندان کے ہاتھوں فتح ہو گیا۔اس طرح سیاسی طور بھی اثر اور نفوذ کا عمل شروع ہو گیا۔معزالدین سام جو شہاب الدین غوری کے نام سے تاریخ میں مشہور ہوا،نے شمالی ہندوستان فتح کر کے دہلی سلطنت یا یوں کہیئے کے ترک حکمرانی کی بنیاد ہندوستان میں ڈال دی۔اس طرح ہندوستانی سماج اور سیاست میں بڑے بدلاؤ آئے۔قدیم طرز کے نیم جاگیر دارانہ نظام کی جگہ ایک زیادہ بہتر اور منظم اقطاع نظام نے لے لی۔زر کی معیشت اور شہر کاری میں اضافہ ہوا۔نئے پیشوں اور اور ایک نئے قسم کے مسالے کے ذریعہ فن تعمیر کا ارتقاء ہوا۔دیہاتی سماج کے مقابلے میں شہری سماج پر ان تبدیلیوں کا اثر زیادہ تھا۔چشتی اور سہر وردی صوفیوں کی خانقاہیں بھی سماج پر نئے اداروں کی اہمیت کو زیادہ کر رہی تھیں۔بہر حال ہم اس اکائی میں عربوں اور ترکوں کی آمد سے قبل ہندوستانی سماج کا مختصر جائزہ لیں گے۔اس کے بعد ترکی فتوحات کے ہندوستانی سماج اور سیاست پر پڑنے والے اثرات کی تفصیل بیان کریں گے۔

11.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- ترکی حملوں کے ماقبل کے ہندوستانی سماج اور سیاست کو سمجھ سکیں گے۔
- عربوں کی فتوحات کا موازنہ کر سکیں گے۔
- دہلی سلطنت کے قیام سے پڑنے والے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- سماج اور سیاست میں تبدیلیوں اور تسلسل کا تجزیہ کر سکیں گے۔

11.2 ترکی حملوں کے وقت ہندوستان کی حالت

11.2.1 ذات کا نظام

ہندوستان میں سلطان محمود کی کارگزاریوں (1031-999ء) کے بعد کے ڈیڑھ سو سالوں کے عرصہ میں راجپوت سلطنتوں کی ابتدا ہوئی۔ذات کے نظام میں اور شدت پیدا ہوئی اور گنگا کے میدانی علاقہ میں ترکوں کا دباؤ بڑھا۔ان محرکات کی وجہ سے ملک کی سیاسی اور

سماجی زندگی میں جو صورت حال پیدا ہوئی اس نے ہندوستان میں غوریوں کی فتح کی راہ ہموار کردی۔ راجپوتی نظامِ سیاست (Polity) جاگیر دارانہ اداروں کو وجود میں لائی۔ ذات کے نظام نے سماج کو الگ الگ ٹکڑوں میں تقسیم کردیا اور ایک مشترکہ شہریت کے احساس کو مٹادیا اور ترکوں کی آزمائشی (reconnoitering) کارروائیوں نے ہندوستان کی بنیادی (فوجی) کمزوری کو ظاہر کرکے بڑے پیمانہ پر فوجی اقدامات کی حوصلہ افزائی کی۔

راجپورتوں کی ابتداء کے متعلق مختلف نظریات سے بحث اس موقع پر غیر ضروری ہے۔ البیرونی کی کتاب الہند میں راجپوتوں کا ذکر نہیں ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ البیرونی نے جس طبقہ کو چھتری کا نام دیا ہے وہ رفتہ رفتہ جنگجو قبیلہ کی حیثیت سے برسرِ اقتدار آگیا تھا۔ یہ لوگ شجاعت اور اولوالعزی کی رومانی روایت میں رنگے ہوئے تھے اور ان کو راجپوت یا راج پتر۔۔۔ یعنی شاہی نسل کے اخلاف کہا جانے لگا۔ انہوں نے دریائے ستلج سے سون تک کے علاقہ پر اپنا قبضہ جمالیا تھا۔ غوریوں کو اس نئے ذی اقتدار طبقہ سے نپٹنا پڑا۔ چونکہ بارہویں صدی کے سیاہی میدان میں سمبھر اور اجمیر کے چوہانوں، مالوہ کے پرمیرا۔ اور وچیدی کے کلاچوریوں، بندیل کھنڈ کے چنڈیلوں، گجرات کے چالوکیوں، قنوج کے گڑھوال، مگدھ کے پالوں اور مغربی بنگال کے سوروں اور پھر بعد میں سیناؤں کا دور تھا۔ متعدد خود مختار ریاستوں پر مبنی یہ سیاسی نظام بارہویں صدی کے آخری ربع کے ہندوستان کی ایک اہم خصوصیت تھی۔ ہندوستان متعدد ریاستوں کا ایک مجموعہ تھا جس کی ہر ریاست خود مختار تھی۔ آپس کی حاسدانہ چشمکوں اور جارحانہ اقدامات کی وجہ سے ریاستوں کی سرحدیں بدلتی رہتی تھیں اور ناقابل اصلاح گہری دشمنی کے جذبات کو دائمی بنادیا تھا۔

یہ راجپوت ریاستیں جاگیر دارانہ نوعیت کی تھیں، ہر سلطنت شاہی خاندان (کول) کے افراد کو دی ہوئی جاگیروں پر مشتمل تھی۔ اگلے دور میں اس طرح کے جاگیری ماتحتوں (Vassals) کی ذمہ داریوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر اے، ایس الٹیکر لکھتے ہیں کہ ان ماتحتوں کو سکہ جاری کرنے کا اختیار نہ تھا اور ان کو یہ کام انجام دینے پڑتے تھے۔ (الف) اپنے سربراہ کے نام کا (اپنے کتبوں) ذکر کرنا (ب) تقریب کے موقعوں پر دربار میں حاضر ہونا (ج) باقاعدگی سے خراج ادا کرنا (د) تقریب کے موقعوں پر اور لڑکیوں کی شادی کے موقعوں پر تحفے دینا (ہ) مقررتعداد میں افوجی دستہ فراہم کرنا لیکن زیرِ مطالعہ دور میں ان ذمہ داریوں سے تغافل برتا جانے لگا تھا اور اس کے برعکس جاگیر داروں کی طاقت بڑھ جانے اور اپنی فوج کو اکٹھا کرنے اور محصول عاید کرنے کی وجہ سے سیاسی اقتدار منتشر ہوگیا تھا اور مرکز گریز (Centrifugal) رجحانات کی حوصلہ افزائی ہوئی تھی۔ حکومت کے اعلیٰ عہدے زمیندار امرا طبقہ کے لیے مخصوص ہوگئے تھے اور اس کی وجہ سے بادشاہ کا اقتدار کمزور ہوگیا تھا۔ ذاتی فوجیں رکھنے کی وجہ سے جاگیر داروں میں بڑے پیمانے پر جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور اس کی وجہ سے مزید انتشار پیدا ہوتا تھا۔

جب ترک ہندوستان میں داخل ہوئے اس وقت جاگیر دارانہ نظام اپنی تاریخ کے آخری اور سب سے شورش انگیز دور میں داخل ہوچکا تھا اور جاگیروں کی تقسیم در تقسیم (Sub-Infeudation) کا طریقہ زیادہ مروّج ہوگیا تھا اور اکثر بڑے جاگیر داروں کے تحت ان

کے چھوٹے جاگیردار تھے۔ مثلاً سامنت، ٹھاکر، راوت وغیرہ ہوتے تھے۔ مثلاًراشٹر کوٹوں کے ماتحت گجرات کے راشٹر کوٹ اور سلاہار تھے اور پھران ماتحتوں کے اپنے ماتح تھے۔ کشمیر کے سیاسی میدان میں ڈمرا(جاگیردار، سردار) سب سے زیادہ پریشان کن عنصر تھے۔ وہ اپنے چھوٹے محلوں میں رہتے تھے۔ان کی ذاتی فوج تھی اور اپنے مفاد کے مطابق جب چاہتے مرکزی حکومت کی خلاف ورزی کرتے۔ در حقیقت ملک کی انتظامیہ خاص کر اندرونی علاقوں میں ان کے ہاتھوں میں تھی۔

یہ نظامِ سیاست ملک کے سماجی نظام کی بنیادی کمزوری کی عکاسی کرتا تھا۔ذات کی نظام نے جس پر گیارہوں اور بارہویں صدی کا ہندوستان سماجی نظام مبنی تھا۔ مشترکہ شہریت اور حب الوطنی کے تمام جذبات کو ختم کر دیا تھا۔اس نظام کی ابتداخواہ کسی بھی صورت حال میں ہوئی ہواس کے نتیجہ کے طورپر شہریت اور ملک سے وفاداری کے احساس کا مکمل فقدان تھا۔اس کے زیر اثر حالات میں جوانفرادی اور اجتماعی ابتری پیدا ہوگئی تھی وہ اپنے نتائج کے لحاظ سے تباہ کن ثابت ہوئی۔ڈاکٹر بینی پرشاداس پر تبصرہ کرتے ہیں کہ یہ(ذات کانظام) گروہ(جماعت) کو ترجیح دینے میں انفرادی اقدار کو قربان کر دیتاہے۔یہ انفرادیت کی جڑوں پر ضرب لگاتاہے اور یہ(انفرادی) شخصیت کے باجودانکار کے مترادف ہے۔ یہ اس حقیقت کو تسلیم کرنے سے انکار کرتاہے کہ ہر فرداپنی فطرت کے لحاظ سے عمومی(Universal)ہےاور نہ اس کو اپنی شخصیت کے اظہار کا، اپنی خواہشات کو طے کرنے کا اور اپنے مفاد کو حاصل کرنے کا اختیار ہے۔ذات کا اصول انسان کی مِن حیث الانسان عظمت کے منافی ہے۔

ہندوستانی سماج کی چوٹی پر چاورن یا ذاتیں تھیں۔

- برہمن
- چھتری
- ویش
- شودر

گرچہ یہ طبقے ایک دوسرے سے مختلف تھے، پھر بھی سب ایک ہی شہر اور گاؤں میں رہتے تھے۔البیرونی لکھتاہے کہ ”ہندواپنی ذات کو ورن یعنی رنگ کا نام دیتے ہیں اور نسبی اعتبار سے ان کو جاتک (یعنی پیدائشی) کہتے ہیں۔ شروع سے ہی یہ ذات صرف چار ہیں۔ برہمن، چھتری، ویش اور شودر۔ سماجی نظام میں سے سے اونچامقام برہمنوں کا ہے۔وہ تمام مخلوقات میں سب سے اولیٰ سمجھا جاتا تھا۔اور مذہبی معاملات اس کی اجارہ داری میں تھے۔البیرونی کے مطابق صرف برہمن اور چھتری وید کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ لہٰذا موکش(Moksha)یا نجات صرف اِن ہی کو حاصل ہوسکتی تھی۔

سماج کے درجاتی نظام(Social Hierarchy)میں دوسرامقام چھتریوں کا تھا۔ملک کاانتظام اوراس کی سرحدوں کی حفاظت کاکام ان کے ذمہ تھا۔بقیہ دوذاتیں ویش اور شودر کو سماج کے درجاتی نظام میں نیچامقام دیا گیا تھا۔ویش کا مخصوص کام یہ تھا کہ کھیتی کرے مویشی

پالے یا اپنا ذاتی یا کسی برہمن کی طرف سے کاروبار کرے۔ شودر کی حیثیت بقول البیرونی برہمن کے نوکر جیسی تھی۔ ویش اور شودر کو مقدس (مذہبی) علوم سے محروم رکھا گیا تھا۔ البیرونی کے مطابق اگر یہ ثابت ہو جاتا کہ کسی ویش یا شودر نے وید پڑھا تو اس کی زبان کاٹ لی جاتی تھی۔ اس پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر حبیب لکھتے ہیں ''ایسی پالیسی رگ وید کے عہد میں ضروری رہی ہو یا نہیں لیکن گیارہویں صدی میں البیرونی، بو علی سینا اور سلطان محمود کے دور میں یہ ایک حماقات اور پاگل پن تھا اور خودکشی کے مترادف اور خود برہمنوں کو، جو ایک منطقی اور بہت ہی روشن خیال طبقہ تھا، اس ناقابل معافی گناہ کی بہت بھیانک قیمت ادا کرنی پڑی۔

ان چار ورنوں کے نیچے غیر اہم معمولی انسانوں کا جم غفیر تھا جن کو انیتاجہ کہا جاتا تھا۔ ان کا شمار کسی ذات میں نہ تھا بلکہ ان کا تعلق پیشہ یا حرفہ سے تھا۔ ان کے آٹھ پیشہ ورانہ گروہ تھے۔(1) قصار (2) چمار (3) نٹ (4) (Juggler) نوکری اور ڈھال بنانے والے (5) ملاح (6) مچھلی فروش (7) جنگلی جانوروں اور طیور کے شکاری (8) جولاہے۔ یہ لوگ چار اعلیٰ ذاتوں کے بسنے والے شہروں کے نزدیک رہتے تھے لیکن ان کے باہر البیرونی لکھتا ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی ذات کے کام اور فرائض کو چھوڑ کر دوسری ذات کے کاموں اور فرائض کو اختیار کرنا چاہے تو اس کو گناہ سمجھا جاتا۔ خواہ اس سے اس ذات کی عزت افزائی ہی کیوں نہ ہو۔

سب سے کم درجہ کے لوگ ہادی، ڈوم، چانڈال اور بدھاتو تھے۔ ان کے ذمہ سب سے گندے اور ناپاک کام تھے۔ مثلاً گاؤں کی صفائی اور دیگر خدمات۔ البیرونی کے مطابق ان کو حرامزادوں (ناجائز بچوں) کی طرح سمجھا جاتا تھا اور ان کا شمار ذات کے باہر ہوتا تھا۔ وہ شہر کی چار دیواری کے اندر نہیں رہ سکتے تھے اور شہر کی صفائی وغیرہ کے لیے جس کے بغیر کسی قسم کی شہری زندگی شاید ناممکن تھی۔ شاید مقررہ اوقات پر اطلاع کے مطابق شہر کے اندر داخل ہوتے ہوں گے۔

عہد وسطی کے ہندوستان کے سماجی نظام پر سب سے مہلک اثر جسمانی ناپاکی (چھوت) کے اصول سے ہوا۔ البیرونی نے حیرت اور تنفر کے ساتھ لوگوں کی سماجی زندگی میں اس اصول کے اطلاق کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ہر شے جو نجاستمیں ملوث ہو جاتی ہے وہ پھر سے کامیابی کے ساتھ کوشش کرتی ہے کہ اپنی اصل پاک حالت کو حاصل کرلے۔ سورج اور ہوا فضا کی صفائی کرتے ہیں اور سمندر کے اندر نمک گندگی کو پھیلنے سے روکتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو اس کرۂ زمین پر زندگی ناممکن ہو جاتی لیکن برہمنوں کا چھوت کا اصول فطرت کے اس مسلمہ اصول کے خلاف ہے۔ اگر کوئی ہندو سپاہی کسی مسلمان کا قیدی بن جاتا اور بعد میں رہا کر دیا جاتا تو اس کی ذات والے یا اس کے ہم پیشہ اس کو اپنا ماننے سے انکار کر دیتے۔ البیرونی لکھتا ہے کہ ''یہ بات مجھ سے کئی مرتبہ کہی گئی کہ (مسلم ملکوں سے) جب ہندو غلام بھاگ کر اپنے ملک و مذہب کو واپس آتے ہیں تو مقامی ہندو یہ حکم دیتے ہیں کہ وہ لوگ پرائشچت یعنی کفارہ ادا کریں۔ تب وہ ان کو گوبر اور گائے کے دودھ کے ڈھیر میں کئی دنوں تک دبائے رکھتے ہیں، یہاں تک کہ وہ گندگی سڑنے لگتی ہے۔ پھر وہ ان کو اس گندگی سے باہر کھینچتے ہیں اور اس کو اس طرح کی غلاظت کھانے کو دیتے ہیں۔ میں نے اکثر برہمنوں سے دریافت کیا کہ کیا یہ بات صحیح ہے مگر وہ اس سے انکار کرتے ہیں کہ ایسے شخص کی نجات ممکن ہی نہیں اور اس کو اس مقام تک پھر کبھی نہیں پہنچنے دیا جاتا جس پر وہ قید ہونے سے پہلے تھا۔ اور یہ ممکن بھی کیسے تھا؟ اگر کوئی برہمن کسی شودر کے

گھر میں ہی داخل نہیں ہو سکتا تھ۔ایسے قیدی جن کو خود ان کے لوگ خارج کر دیتے تھے وہ اسلام قبول کر لیتے تھے۔

11.3 ترکوں کی فتح کے اثرات

شمالی ہندوستان پر غوریوں کی فتح تدریجاً لیکن یقیناً ملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی میں اہم تبدیلیاں لائی۔اس نے اس مختلف الریاستی نظام (Multi-state) جو کہ گیارہویں اور بارہویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی زندگی کی اہم خصوصیات بن گیا تھا، کے اختتام کے لیے راستہ ہموار کر دیا۔اوائل ترک سلاطین کا سیاسی مطمع نظر ایک مرکزیت پسند سیاسی تنظیم تھی تس کی دیکھ بھال ایک مطلق العنان بادشاہ کے ہاتھوں میں ہو۔ جاگیریت، مع اپنے دو بنیادی تصورات۔ انتظامیہ میں مقامیت (Localism in administration)اور جاگیر داری امیروں کا قوانین سے حق استثنا۔اس نئے سیاسی نظام کے لیے موزوں نہ تھی اور اس لیے اس کے خاتمہ کے لیے موثر اقدام کیے گئے۔مختلف علاقوں کی جاگیر دارانہ روایات کے اختتام کے لیے اور سلطنت کے دور دراز علاقوں کو ایک مرکز سے متحد کرنے کے لیے اقطاع کا ادارہ استعمال کیا گیا۔

صدیوں سے ہندوستان کے رائے ایک دوسرے سے ہر موسم سرما میں لڑتے آئے تھے (دشمن کے) قتل کی شہرت یا جذبہ جانبازی کے علاوہ ملک کا انتظامی اتحاد ہی اس ''خون دولت کی بربادی'' کا جواز ہو سکتا تھا لیکن ہرش کے بعد کوئی بھی ہندوستانی حکمراں شمالی ہندوستان کو انتظامی یکجہتی نہ دے سکا تھا۔اور اب بیرونی حملہ آوروں نے ایک پشت کے اندر وہ کام کر دکھایا تھا جس کو ایک ہندوستانی حکمراں کو پانچ یا چھ سالوں قبل (خود) کر لینا چاہئے تھا۔انہوں نے شمالی ہندوستان کے مرکزی علاقہ میں جو علاقہ آب و ہوا کے اعتبار سے بہت مناسب نہ تھا، ملک کا ایک دارالسلطنت قائم اور تبرکاً وہاں ایک مینارہ نصب کیا۔بڑے بڑے شہروں کو اور شاہراہوں کو شہر دہلی کے زیر اختیار کر کے انہوں نے ملک کے لیے ایک ہندوستان گیر انتظامیہ کا ڈھانچہ بھی تیار کیا۔غوریوں اور ترکوں کو (برخلاف ان رایوں کے جن کی جگہیں انہوں نے لے لی تھیں) ایک آسانی یہ تھی کہ انہیں ایک شہنشاہی (یا بڑے علاقہ پر محیط) انتظامیہ کے بنیادی حالات سے شناسائی حاصل تھی۔اعلیٰ درجہ کے شاہی نوکروں کے لیے ایک ہندوستان گیر سلسلہ ملازمت اور اس کے تحت، بادشاہ کی مرضی اور امراء کے ساتھ محتاط مشوروں کے مطابق ان کی تقرری، بادلے، ترقیاں اور معزولیاں۔اس قسم کے تصورات پر تھوی راج سوئم کے لیے اپنے ماتحت رایوں کے ساتھ ممکن نہ تھے۔

شمالی ہندوستان میں ایک مرکزیت پسند حکومت کے قیام نے سیاسی افق کا رنگ بدل دیا۔ سیاسی نقطہ نظر میں وسعت پیدا ہوئی اور علیحدگی پسندانہ رجحانات سمٹنے لگے۔ سر جادو ناتھ کہتے ہیں۔

''ہندوستان اور بقیہ ایشیائی ملکوں کے درمیان جو گہرے تعلقات بدھ مذہب کے اوائل دور میں قائم ہوئے وہ آٹھویں صدی عیسوی میں، جب کہ ہندو معاشرہ کی از سر نو تنظیم ہوئی اور اسے پکی عمارت کی طرح بے لوچ بنا دیا گیا، منقطع ہو گیا۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان محو باالذات بن کر رہ گیا اور اپنے فطری حدود کے باہر کی ترقی پذیر دنیا سے کٹ گیا۔بقیہ ایشیا اور افریقہ کے قریبی علاقہ جات سے اس (منقطع) تعلق کو بارہویں صدی کے اواخر میں مسلمانوں کی فتح نے پھر سے قایم کیا۔''

شمالی ہندوستان پر ترکوں کی فتح کا ایک دوسرا اہم پہلو وہ ہے جسے پروفیسر حبیب نے شہری انقلاب (Urban revolution) کا نام دیا ہے۔ راجپوتوں کے عہد کے شہر جن میں صرف اونچی ذات کے لوگ ہی رہ سکتے تھے (Caste-Cities) اب ہر طرح کے لوگ اونچے اور نیچے، مزدور اور کاریگر، ہندو اور مسلمان، چنڈال اور برہمن کے لیے کھل گئے۔ ترک حکومت نے ذات کے نظام کو معاشرتی درجہ بندی یا شہری زندگی کی بنیاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اجرت کمانے والا طبقہ، مزدور کاریگر، ذات سے باہر کے لوگ اور غیر سہولت یافتہ طبقے نے حکومت کے ساتھ بخوشی تعاون کیا۔ درحقیقت اوائلی ترک سلاطین کی اصلی طاقت وحمایت ان ہی شہروں میں تھی جنہوں نے اپنے کل مزدور طبقے کی محنتوں کا فاضل سرمایہ (Surplus) حکومت کے ہاتھوں سونپ دیا۔

فوجی اعتبار سے ترکی تسلط کا اثر ہندوستانی فوجوں کی نوعیت اور مسافت میں تبدیلیوں اور ان کی بھرتی اور خبر گیری کے (نئے) طریقوں میں ڈھونڈا جا سکتا ہے۔ جنگ اب کسی ایک ذات یا طبقہ کی اجارہ داری نہ رہی اور فوج میں داخلہ اب ان تمام مناسب طور پر تربیت یافتہ سپاہیوں کے لیے کھل گیا تھا جو جنگ کی صعوبتیں برداشت کر سکتے تھے۔ اس طرح ایسی ہندوستانی فوج وجود میں آئی جن میں جنگی جوہر اب مختلف ذرائع سے، بلا کسی تفریق ذات اور رنگ ومذہب مہیا ہوتے تھے۔ جاگیردارانہ دستوں کا طریقہ اب ترک کر دیا گیا اور مرکزی انتظام کے تحت اور مرکزی طور پر بھرتی کی ہوئی اور تنخواہ پانے والی ایک مستقل فوج قایم کی گئی۔ اس طرح فن حرب میں بھی ترکوں نے جلد ہی ہندوستان کو مرکزی ایشیا کی طاقتوں کے برابر لا کھڑا کیا۔ اب پایکوں دینے کی جگہ اب تیز رفتار اور ضرب محصولے کی صلاحیت فوجی تنظیم کی بنیاد بن گئی۔ درحقیقت صرف یہ نئے طور پر منظم ہندوستانی فوج ہی ملک پر (آئندہ) منگولوں کے حملوں کا مقابلہ کر سکی۔

باہری دنیا سے دوبارہ تعلقات قایم ہونے اور نئے مزدور طبقہ کے شہروں کے عروج سے تجارت کو فروغ ہوا۔ طرز قانون، طریقہ محصولات اور اسکول کے ایک مرکزی نظام نے تاجر کے دائرہ آمد ورفت کو بڑھایا اور ایک جگہ سے دوسری جگہ آنے جانے کی سہولت مہیا کی۔ ایک اور پہلو جو ترکی فتح سے متاثر ہوا وہ انتظامیہ کی زبان تھی۔ راجپوتی عہد میں انتظامیہ اور دیگر مقاصد کے لیے جو زبان مستعمل تھی وہ مختلف علاقوں میں الگ الگ تھی۔ تمام غوری مملکت کی انتظامیہ کی اونچی سطح پر فارسی کے استعمال کی ابتدا نے انتظامیہ کی زبان میں یک رنگی پیدا کی۔ ترکوں کے فیضان کے اس پہلو سے متاثر ہو کر امیر خسرو نے کہا۔

"لیکن تمام ہندوستان میں دریائے سندھ کے کناروں سے لے کر سمندر تک فارسی گفتار یکساں طور پر رائج ہے۔ ایسی عظیم زبان ہمارا ذریعہ اظہار ہے اور ہماری یہ فارسی اصلی فارسی (دری) ہے۔ ہندوستانی مقامی زبانیں ہر ایک سو کروہ پر بدل جاتی ہیں لیکن فارسی زبان ہزار فرسنگ کے علاقہ میں یکساں ہے۔ یہی وہ فارسی زبان ہے جس میں الفاظ کا تلفظ ان کے املے کے عین مطابق ہے۔

قبل کے ایک باب میں ترکی حملوں کی شروعات کے وقت ہندوستان میں مسلم نوآبادیات کا ذکر کیا گیا ہے۔ ترک فاتحین کا ان مسلم نو آبادیات کی جانب کیا رویہ تھا اور ترکوں کی جانب ان کا کیا انداز تھا۔ ہمارے مآخذ اس سوال پر خاموش ہیں لیکن امیر خسرو دکن کے مسلمانوں کے رویہ کا ذکر کرتے ہیں۔ جب علاؤالدین کی فوج نے ملک کافور کی سرکردگی میں رائے ویر پانڈیہ کے علاقوں پر حملہ کیا تو مسلمانوں نے جو اس کی

ملازمت میں تھے، حملہ آوروں کا مقابلہ کیا لیکن جب رائے نے خود فرار ہونے کا تہیہ کیا تو اس کے مسلمان سپاہیوں کو ہتھیار ڈالنا پڑا۔ شمال کے مسلمانوں کے (رویے) کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ اگر انہوں نے حملہ آوروں کا مقابلہ یا ان کی مدد کی ہوتی تو اس بات کا کچھ ذکر ضرور ملتا۔ چونکہ ہندوستانی مسلمان عام طور پر رائے کی ملازمت میں نہ تھے اس لیے ہمارے مآخذ کی خاموشی سے دو باتوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ انہوں نے اس جنگ میں کسی جانب سے بھی کوئی حصہ نہ لیا اور یہ کہ ان کو کسی خاص اہم عہدے پر تقرری کے قابل نہ سمجھا گیا۔ اوائل ترک سلاطین کے دور میں اس اصول سے الگ ایک ہی مثال ملتی ہے اور وہ ہے عماد الدین ریحان لیکن اس کا مختصر عروج اور زوال اس حقارت کی شہادت دیتا ہے جو ترک غلام، افسران، ہندوستانی قبائلی، کے افراد کی جانب اختیار کرتے تھے۔ پھر بھی دہلی سلطنت کا کام ان کی خدمات کے بغیر چلنا مشکل تھا۔ وہ طبقے جن میں سے سپاہی اور گھوڑ سوار بھرتی کیے جاتے تھے ان میں ہندوستانیوں کا قطعی ذکر ملتا ہے اور اس فقرہ کے معنی میں ہندوستانی مسلمان ضرور شامل ہوں گے۔

ہم لسانی مسئلہ کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ موجودہ ہندوستان کی تقریباً تمام ریاستی (سرکاری) زبانیں عہد وسطیٰ میں فروغ پائیں۔ التمش کے عہد میں عوام کی بول چال کی زبان ہر تین چار ضلعوں کے بعد بدل جاتی تھی۔ ترکی زبان ابھی بالکل خام تھی اور عربی بہت کم لوگ جانتے تھے۔ ہندوستان کے ہندو ایک دوسرے کے خیالات کو صرف سنسکرت کے ذریعے سمجھ سکتے تھے۔ دہلی کی حکومت کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ تھا کہ فارسی کو سرکاری زبان کے طور پر استعمال کرے لیکن ہندوستان کی مقامی زبانیں صرف وہ لوگ ہی جانتے تھے جو یہاں پیدا ہوئے تھے یا پلے بڑھے تھے۔ ترکوں کے پاس نہ تربیت یافتہ معلم تھے نہ لغت اور نہ صرف و نحو کی کتابیں۔ یہ ناقابل تصور معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو بڑے پیمانہ پر مترجموں کی حیثیت سے استعمال کیے بغیر ابتدائی ترک سلاطین پورے شمالی ہندوستان پر حکومت کر سکے ہوں۔ شروع میں ان ہی کی ایک ایسی جماعت تھی جو دو زبانیں جانتی تھیں۔

بارہویں صدی میں ہندوستان کی صورتِ حال پر ایک مجموعی نظر ڈالنے سے یہ ناقابل گریز حقیقت سامنے آتی ہے کہ ذات کا نظام اور چھوت کے تصور نے ہی ملک میں معاشرتی افراتفری (Social Anarchy) مچا رکھی تھی اور سیاسی اعتبار سے ملک کو مختلف العناصر (Political Heterogeneity) بنا رکھا تھا۔ ترک تسلط سے اس نظام کو ایک شدید جھٹکا لگا اور جس میں انہیں فطری طور پر ان عناصر کی حمایت حاصل ہوئی جو اس سے قبل کے معاشرتی نظام کے تحت مصیبتیں جھیل رہے تھے۔ ہندوستانی عوام کے ترک حکومت کو قبول کیے بغیر ہندوستان میں ترک حکومت کا طویل المدت قیام اور اس کے سیاسی اثرات کے دائرہ کا تقریباً مسلسل پھیلنا ناقابل توجیہہ بن جاتا ہے۔ اگر ہندوستانی عوام نے ان کی حکومت کے قیام کی مخالفت کی ہوتی تو غوری ہندوستانی علاقہ کے ایک انچ زمین پر بھی قبضہ قائم نہیں رکھ سکتے تھے۔

11.4 معیشت اور سماج پر اثرات

دہلی سلطنت نے اُن بہت سے سماجی اِداروں کو، جو اُنہیں ہندوستانی ''جاگیرداری'' نے ودیعت کیے تھے، جیوں کا تیوں رہنے دیا۔ گاؤں کی برادریوں (Village communities) کی ساخت اور ذات پات کے نظام کو پرانی ڈگر پر چلنے دیا گیا۔ کیونکہ یہ قابل توجہ

بات ہے کہ یہ تمام اِدارے سماجی حالات کو جیوں کا تیوں رکھ کر شاید زرعی استحصال میں مدد کرتے تھے۔ گو کہ نام کے لیے کسانوں کو آزاد اِنسانوں (حُر) کا درجہ حاصل تھا لیکن دراصل وہ کئی قسم کی غیر معاشی بندشوں اور زبردستیوں کا شکار تھے۔ پھر بھی دہلی سلطنت کے قیام کے ساتھ کئی معاشی تبدیلیاں وقوع پذیر ہوئیں۔ اُن میں سے ایک اہم تبدیلی نقد لین دین کے اضافہ اور بڑھوتری تھی یعنی کسان کو زرعی محصول نقد ادا کرنا پڑتا تھا اور اُس کے ساتھ اُس محصول کی شرح باقاعدہ معین ہو گئی، اِسی صورتِ حال کے نتیجہ میں تجارت کو پھیلنے کی ترغیب ملی۔ یہ تجارت غلے اور دوسری قسم کی زرعی پیداوار کو بڑے پیمانہ پر دیہاتوں سے شہروں کو لانے کا ذریعہ ثابت ہوئی۔ اِسی کے نتیجہ میں شہری افزائش کا ایک نیا باب شروع ہو سکا۔ چودھویں صدی میں دہلی اور دولت آباد (دیوگیر) دنیا کے دو بڑے شہروں میں شمار ہونے لگے تھے۔ اور بھی بہت سے بڑے شہر تھے، مثلاً ملتان، کڑہ، اودھ (یعنی ایودھیا)، گوڑ، کیمبے (یعنی کھمبایت) اور گلبرکہ۔ وِجے نگر کے دارالسلطنت یعنی وِجے نگر شہر کے بارے میں 1520ء میں ایک پرتگالی سیّاح نے لکھا تھا کہ وہ اتنا وسیع اور عریض ہے جیسے کہ روم (جس کی اُس وقت آبادی 60,000 کے لگ بھگ تھی)۔ اِس کے ساتھ ہی پرانے سکوں کی صورت میں مہیا تاریخی شواہد ایک ڈرامائی انداز میں متغیر ہوتے نظر آتے ہیں۔ تیرھویں صدی کے اوائل سے دہلی کے سلطانوں نے تانبے کے ساتھ سونے اور چاندی کے سکے جاری کرنے شروع کیے، جن سے ہم بڑی رقموں کی لین دین سے عبارت سوداگری میں اِضافہ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ اِس کے باوجود کہ ہندوستان کی شمالی مغربی سرحد پر واقع علاقوں کو منگولوں نے فتح کر لیا تھا، ہندوستان کی بیرونی تجارت، خشکی کے راستہ آنے والی اور سمندری، دونوں میں اِس دوران خاصہ اضافہ ہوا۔ عظیم الجثتہ چینی جنک جنوبی ہند کے بندرگاہوں میں آنے شروع ہو گئے جو خاص طور پر کالی مرچ لے جاتے تھے۔ مشہور چینی امیر بحر (Admiral) زینگ ہیؔ (Zing He) کے جہازوں نے، تجارتی مقاصد سے 1405ء اور 1423ء کے درمیان بار بار ملابار کے بندرگاہوں کا سفر کیا۔ اِسی طرح ایرانی جہاز خلیج فارس سے اور عرب جہاز بحرِ احمر سے بار بار ملابار کے بندرگاہوں کا سفر کرتے تھے لیکن 1498ء کے بعد پرتگالیوں نے اِس بحری تجارت کو جبراً منتشر کر دیا۔ یہ بات عام طور پر تسلیم کی جاتی ہے کہ ہندوستان میں بڑے پیمانہ پر سونے اور چاندی کی درآمد ہوتی تھی۔

ہندوستان کے بیرونی دنیا کے ساتھ تعلق کے نتیجہ میں ٹیکنکل مہارتوں کے پھیلنے کے غیر اختیاری اعمال (دیکھیں باب 2.2) کو تقویت ملی اور اُن سے دستکارانہ پیداوار میں اضافہ ہوا۔ چودھویں صدی تک چرخہ ہندوستان پہنچ کا تھا۔ اس آلہ کے ذریعہ سوت کاتنے کی صلاحیت چھ گنا بڑھ جانے کے نتیجہ میں سوت کی پیداوار میں اضافہ ناگزیر تھا۔ بعد میں اسی طرح بنکروں کے راچھ (loom) میں پیڈل شامل کر دینے سے کپڑا بننے کا عمل بھی تیز ہو گیا۔ پندرہوں صدی کے آتے آتے کچا ریشم پیدا کرنے کی صنعت (Sericulture) بنگال پہنچ چکی تھی۔ تیرھویں صدی میں کاغذ بنانے کی صنعت دہلی میں پوری طرح موجود تھی۔

تیرھویں صدی کے اواخر میں شراب کی کشید دہلی اور آس پاس کے علاقوں میں ایک وسیع پیمانہ پر جاری صنعت کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اینٹوں اور چونے کے استعمال کے نتیجہ میں عمارتی کارکردگی ایک نئے مرحلہ میں داخل ہو چکی تھی۔ اس عمل کا ڈاٹ والی چھت بنانے کے طریقہ کے اختیار کیے جانے سے مزید تقویت ملی۔

ان حالات کا ایک منفی پہلو بھی تھا۔ غلامی ہندوستان میں پہلے سے موجود تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تیرہویں اور چودھویں صدیوں میں اِس کا چلن بہت بڑھ گیا کیونکہ اب جنگوں کے دوران اور محصول نہ ادا کرنے والوں کو غلام بنانے کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ان غلاموں کو گھریلو خدمت کے علاوہ مختلف قسم کی دستکاریوں میں بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ چودھویں صدی کے اوائل کی دہلی کے بازار میں ایک ایسی غلام عورت کی قیمت جو گھریلو خدمات انجام دے سکے کسی دودھ دیتی بھینس سے زیادہ نہیں تھی۔ سلطان فیروز شاہ تغلق کے بارے میں مشہور ہے کہ اُس کے پاس 1,80,000 غلام تھے جن میں 12,000 کو دستکاروں کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ اُس کے خاص وزیر خان جہاں مقبول کی ملکیت میں 2000 غلام عورتیں شامل تھیں۔ غلام مزدوروں نے کسی حد تک مختلف جاتیوں سے تعلق رکھنے والے مزدوروں یا کاریگروں کی کمی کو پورا کرنے میں مدد دی لیکن ہندو معماروں نے جن اہم ''اسلامی'' عمارتوں کی تعمیر میں حصہ لیا اُن پر نشانات، کتبے اور ہاتھ سے لکھی ہوئی عبارتیں چھوڑی ہیں۔ اُن سے یہ عیاں ہے کہ ہندو جاتیوں سے تعلق رکھنے والے مزدوروں نے بہت جلد نئی طرزِ تعمیر سے عبارت مہارتوں کو بخوبی سیکھ لیا تھا۔

قطع نظر اِس کے کہ ذات پات نظام میں کسی قدر لچک پیدا ہو گئی تھی، سلطنت کے دور میں یہ نظام اور اُس کے ساتھ جُڑی ہوئی بہت سی ناانصافیاں عملاً جیوں کی تیوں رہیں۔ یہی حال عورتوں کے ساتھ برتاؤں کے سلسلہ میں تھا۔ چونکہ اسلام میں بیٹیوں کو اپنے والدین کی دولت میں حصہ دیا گیا ہے (گو کہ یہ حصہ لڑکوں کے حصہ کا آدھا ہو گا) اور بیوہ عورتوں کو دوبارہ شادی کی اجازت بھی ہے (یہ رسم ہندوستان کے نچلے طبقوں میں پہلے سے موجود تھی)، اِس لیے بیواؤں کو جلانے یعنی 'ستی' کی رسم اور بیواؤں کے ساتھ بدسلوکی کا مسلمانوں کے رسم و رواج سے کوئی واسطہ نہیں تھا لیکن ہندو شاستروں کی طرح اسلامی قانون میں بھی کثیر ازواج اور داشتہ رکھنے کی رسم کو گوارا کیا گیا ہے۔ اسی طرح عورتون کے پردہ اور عزلت گزینی پر زور دینے کے ساتھ اُن کی کم سنی میں شادی کی بھی اجازت دی گئی ہے۔ بعض اوقات قرآن پاک کی آیات کی ایسی تفسیریں بھی کی گئی ہیں جن سے عورتوں کی کمتری امر مسلمہ معلوم ہونے لگتی ہے۔ اخلاقیات کے مبلغین میں یہ شرط مشترک ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں امیر خسروؔ اور عسامیؔ نے عورتوں کو مشورہ دیا ہے کہ وہ عزلتت میں رہیں اور کبھی گھر کے باہر نہ نکلیں اور اپنا وقت سوت کاتنے اور اسی قسم کے دوسرے مشغلوں میں گزار دیں۔ یہ واقعہ کہ التمش کی بیٹی رضیہ نے سلطان بن کر اپنے بل پر حکومت کرنے کی جسارت کی (1236-40ء) ایک طرح کا اسکنڈل قرار دیا گیا تھا۔ گو کہ یہ صحیح ہے کہ ہمعصر کی نسبت اِس قسم کے اعتراضات بعد میں آنے والے مورخوں نے زیادہ اُٹھائے ہیں۔ بہر حال یہ بات پورے بھروسہ کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اسلام میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کی رو سے عورتوں کو پڑھنے اور لکھنے کی تعلیم دیے جانے کو معیوب سمجھا جائے۔ پندرہویں صدی عیسوی کے اواخر کی ایک لغت میں موجود کسی چھوٹی سی لڑکی کی تصویر ہم دیکھ سکتے ہیں جو اپنے ہم جماعت لڑکوں کے ساتھ بیٹھی اسکول ماسٹر سے سبق لے رہی ہے۔

تاریخی حالات اور تبدیلیوں کی بابت دستیاب نظریاتی کلیوں کی روشنی میں تیرہویں اور پندرہویں صدیوں کے درمیان موجود سماجی ڈھانچوں کی بابت کوئی فیصلہ صادر کرنا ایک مشکل کام ہے۔ اس دوران شہری آبادی میں اضافہ، بڑے پیانہ پر روپیہ کا استعمال اور تجارت کا فروغ، اُس زمانہ کی سماجی صورتِ حال کو ''ہندوستانی جاگیرداری'' سے ایک قطعی مختلف رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ زرعی محصول

اور لگان کے درمیان تفریق کا ختم ہو جانا یقینا اس صورتِ حال کو مارکس کے ''ایشیائی طرز''(Asiatic Mode) سے قریب کر دیتا ہے لیکن ایسا اُسی وقت ممکن ہے جب ہم مارکس کے متذکرہ ماڈل کی چند دوسری خصوصیات کو نظر انداز کرنے پر آمادہ ہوں، مثلاً محصول کا جنس کی صورت میں ادا کیا جانا اور شہری آبادیوں کا ناپائیدار ہونا۔ تین صدیوں کا وہ زمانہ جب دہلی سلطنت قائم رہی ایسا دور تھا جب روپیہ کا چلن (circulation) برابر بڑھ رہا تھا اور شہری آبادی میں بھی اضافہ ہوا۔ اس موقع پر شاید یہی بہتر ہوگا کہ اُس سیاسی اور معاشی ڈھانچہ کو جس کا ہم نے اوپر ذکر کیا ہے، ابھی کوئی نام نہ دیں۔

11.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ سے ہم نے ترکی فتوحات سے قبل کے ہندوستانی سماج کا جائزہ لیا۔ ذات کے نظام اور جاگیردارانہ طرز حکومت کو بھی ہم نے سمجھنے کی کوشش کی۔ راجپوتوں کے عسکری اور سماجی نظام پر بھی ہم نے روشنی ڈالی ہے۔ عربوں کے ہندوستان پر حملے کس نوعیت کے اور کس حد تک موثر تھے، یہ بھی ہم نے موازنہ کیا ہے۔ ترکوں کی فتح کے بعد متعدد بدلاؤ آئے۔ ان کا بھی ہم نے جائزہ لیا ہے۔ آئندہ اکائیوں میں ان چیزوں کو اور تفصیل سے بیان کیا جائیگا۔

11.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

اقطاع نظام	:	کسی علاقہ کے انتظام کے بدلے میں زرعی آمدنی کا مشروط عطیہ
جاگیرداری	:	کسی خطہ زمین کا مالکانہ حقوق کو وراثتی طور پر عطا کیا جانا جس کے بدلے میں عطیہ لینے والا عسکری اور انتظامی خدمات فراہم کرتا تھا۔
راجپوت	:	ایک قسم کا جنگجو نسلی طبقہ
رہٹ	:	پانی نکالنے والا گھڑوں کا ہار

11.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

11.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. سندھ کی فتح کس کے ذریعے ہوئی؟
2. ہندوستانی سماج کی چوٹی پر کتنی ذاتیں تھیں؟
3. البیرونی کے مطابق ہندو اپنی ذات کو کیا نام دیتے ہیں؟
4. انتیج کون تھے؟
5. انتیج کتنے گروہوں میں بٹے ہوئے تھے۔

6. سب سے کم درجے کے لوگ کون تھے؟

7. ترکوں کی فتح کو شہری انقلاب کس نے کہا؟

8. وجے نگر کو ایک پرتگالی سیاح نے یوروپ کے کس شہر سے ملایا تھا؟

9. فیروز شاہ تغلق کا خاص وزیر کون تھا؟

10. رہٹ کسے کہتے ہیں؟

11.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. جاگیروں کی ماتحت جاگیرداری(Subinfuedation)پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. سماج میں بالائی چار ورنوں کے مقام کا مختصر جائزہ لیجیے۔
3. ناپاکی کے تصور پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. محمد حبیب کے شہری انقلاب کا مختصر تجزیہ کیجیے۔
5. غلامی کے ادارے پر روشنی ڈالیے۔

11.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. ذات کے نظام پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. ترکوں کی فتح کی عمومی اثرات پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
3. ترکوں کی فتح کے معیشت اور سماج پر پڑنے والے اثرات کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

11.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Asghar Ali Engineer, Islam in India: The Impact of Civilizations. Shipra Publications, 2002.
2. Mohammad Mujeeb. Islam in South Asia: A Short History. Leiden and Boston: Brill, 2008.
3. Murray Thurston Titus, Indian Islam: A Religious History of Islam in India. Milford, Oxford university press, 1930.
4. جامع تاریخ ہند — محمد حبیب، خلیق احمد نظامی۔

اکائی 12۔ مملوک خاندان

(Mamluks)

اکائی کے اجزا

12.0	تمہید
12.1	مقاصد
12.2	دلّی سلطنت کا قیام / مملوک خاندان
12.3	قطب الدین ایبک
12.4	آرام شاہ
12.5	سلطان شمس الدین التتمش
12.6	رکن الدین فیروز شاہ
12.7	رضیہ سلطان
12.8	معزالدین بہرام شاہ
12.9	علاءالدین مسعود شاہ
12.10	ناصر الدین محمود
12.11	غیاث الدین بلبن
12.12	کیقباد
12.13	اکتسابی نتائج
12.14	کلیدی الفاظ
12.15	نمونہ امتحانی سوالات
12.15.1	معروضی جوابات کے حامل سوالات
12.15.2	مختصر جوابات کے حامل سوالات

12.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

12.16 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

12.0 تمہید (Introduction)

آٹھویں صدی سے گیارہویں صدی عیسوی کے دوران شمالی اور جنوبی ہندوستان میں کئی اہم اور طاقتور ریاستیں قائم ہوئیں جن میں پال، پرتی ہار اور راشٹر کوٹ کافی اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ تمام ریاستیں اپنی سرحدوں کی توسیع کی خاطر ایک دوسرے سے برسرِپیکار رہا کرتی تھیں۔ مرکزی نظام کے فقدان کے باعث ان میں آپسی اتحاد نہیں تھا جو انہیں کسی بیرونی حملہ سے محفوظ رکھنے میں معاون ثابت ہوتا۔ شمالی اور جنوبی ہندوستان کی تمام چھوٹی اور بڑی ریاستوں کے آپسی اختلافات سے فائدہ اٹھا کر ترکوں نے ان پر کئی کامیاب حملے کیے اور بالآخر گیارہویں صدی کی آخری دہائی آتے آتے ان باہری ترک حملہ آوروں نے یہاں کے راجاؤں اور مہاراجاؤں کو اس حد تک کمزور کر دیا کہ وہ یہاں پر اپنا اقتدار قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بارہویں صدی کے اختتام تک انہوں نے ہندوستان میں ایک ایسی مضبوط ریاست کی بنیاد ڈالی جس نے آنے والی کئی صدیوں تک ہندوستان کی تاریخ پر نہایت مضبوط مستحکم اور دیرپا نقوش مرتب کیے۔

1192ء میں ترائن کی دوسری جنگ میں فتح کے بعد محمد غور کے دو انتہائی معتبر اور قابل سپہ سالاروں قطب الدین ایبک اور بختیار خلجی نے شمالی ہندوستان کے کئی اہم علاقے فتح کر لیے۔ 1197ء میں بہار، 1199ء میں بنگال 1202ء میں بندیل کھنڈ بھی فتح ہو گیا۔ 1206ء میں محمد غوری کی وفات کے بعد اس کا آزاد کردہ غلام قطب الدین ایبک اس کے نمائندہ (وائسرائے) کی حیثیت سے دہلی کے تخت پر متمکن ہوا۔ اس کی سلطنت شمال میں دلی سے لے کر جنوب میں کالنجر تک اور مشرق میں لکھنوتی (بنگال) سے لے کر مغرب میں لاہور تک کافی وسیع و عریض علاقوں پر پھیلی ہوئی تھی۔ قطب الدین ایبک ایک آزاد کردہ غلام تھا لیکن لیاقت، شجاعت اور بہادری میں بے مثال تھا۔ اس کی قیادت میں ہی خاندان غلاماں یا مملوک سلاطین کو دہلی کے تخت پر بیٹھنے کا شرف حاصل ہوا۔ اس اکائی میں ہندوستان میں ترک سلطنت کے قیام میں مملوک سلاطین جنہیں کچھ دانشور غلام خاندان کے نام سے موسوم کرتے ہیں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ ان کی سلطنت کے استحکام، انتظام و انصرام کے ساتھ اس عہد کی تہذیبی اور ثقافتی پہلوؤں پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ مملوک سلاطین کی فتوحات، فوجی مہمات اور عسکری کارناموں کے ساتھ ان کی وضع کی گئی پالیسیوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

12.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت کے قیام سے پہلے شمالی ہند کے حالات سے واقف ہو سکیں گے۔
- مملوک سلاطین اور ان کے کارناموں کو بیان کر سکیں گے۔

- قطب الدین ایبک کے کارناموں کو بیان کر سکیں گے۔
- مملوک سلطنت کے قیام میں التتمش کے کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔
- رضیہ سلطان کے حالاتِ زندگی اور کارناموں سے واقف ہو سکیں گے۔
- سلطان غیاث الدین بلبن کے کارناموں کو جان سکیں گے۔
- مملوک سلاطین کی تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں پر گفتگو کر سکیں گے۔
- مملوک سلطنت کے زوال کی وجوہات کو بیان کر سکیں گے۔

12.2 دلّی سلطنت کا قیام / مملوک خاندان

بارہویں صدی عیسوی ہندوستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت کی حامل رہی ہے۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان کی اکثر ریاستیں آپس میں ایک دوسرے سے برسرِپیکار تھیں جس کا فائدہ اٹھا کر ترک فاتحین نے شمالی ہندوستان میں ایک ایسی مضبوط اور وسیع حکومت قائم کی جو تاریخ میں دلی سلطنت کے نام سے موسوم کی گئی۔ دلی سلطنت کے ابتدائی حکمراں آزاد کردہ غلام طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس طبقے نے 1206 سے 1290ء تک دلّی کی سلطنت پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ تاریخی کتابوں اور دستاویزوں میں اس دور حکومت کو ان کے خاندانی اور سماجی پس منظر کی بنیاد پر معزّی، قطبی، شمسی اور بلبنی وغیرہ کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں انہیں مملوک ترک، البری ترک وغیرہ بھی کہا جاتا ہے۔ ان سلاطین کو مذکورہ ناموں سے پکارنا درست ہے یا نہیں اس پر مورخین کی رائیں جداگانہ ہیں۔ کچھ مورخین کا کہنا ہے کہ انہیں البری کہنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ صرف التتمش کے بارے میں یہ کہنا درست ہے کہ وہ البری قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، جب کہ قطب الدین ایبک اور غیاث الدین بلبن کا تعلق البری قبیلے سے نہیں تھا۔ اس لیے جدید مورخین دلّی سلطنت کے ان ابتدائی حکمرانوں کو ابتدائی ترک یا مملوک سلاطین کے نام سے پکارتے ہیں۔ اکثر دانشوروں کا خیال ہے کہ انہیں ''مملوک'' کہنا زیادہ قرینِ قیاس ہے اور یہی بہتر بھی معلوم ہوتا ہے۔

معزالدین محمد غوری کے آزاد کردہ تربیت یافتہ غلاموں میں سب سے لائق، وفادار اور قابل اعتماد سالار قطب الدین ایبک تھا۔ اسے ہی دلّی سلطنت کا اولین بانی اور مملوک سلاطین کا بنیاد گزار تصور کیا جاتا ہے۔ ان مملوک حکمرانوں نے تقریباً ایک صدی تک شمالی ہندوستان پر اپنا اقتدار قائم رکھا اور یہاں کی سیاسی، سماجی، معاشی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی پر اپنی حکمرانی کے دیرپا اثرات مرتب کیے جس کے اثرات آنے والی دو صدیوں تک نمایاں طور پر نظر آتے ہیں۔ مملوک سلاطین میں یوں تو کئی حکمراں پیدا ہوئے لیکن سلطنت کے استحکام، وسعت اور اپنی بہترین قائدانہ صلاحیتوں کی وجہ سے قطب الدین ایبک، التتمش، رضیہ سلطان اور غیاث الدین بلبن کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ مملوک سلطنت کا پہلا قابل ذکر حکمراں جو دلی کے تخت پر بیٹھا وہ قطب الدین ایبک تھا۔

12.3 قطب الدین ایبک(1206-1210)

قطب الدین ایبک ترکستان کا باشندہ تھا اور ترکوں کے ایک اہم قبیلے ایبک سے تعلق رکھتا تھا۔ بچپن میں اسے نیشاپور کے بازار میں غلام کی حیثیت سے فروخت کیا گیا۔ قاضی فخر الدین عبد العزیز کوفی نے اسے خریدا اور اس کے ساتھ انتہائی نرمی اور شفقت کا برتاؤ کیا۔ اس کے لیے اپنے بچوں کی طرح ہی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جس میں تیر اندازی اور شہسواری بھی شامل تھی۔ اس کی ہنر مندی کو دیکھ کر اسے عمدہ تعلیم و تربیت دلائی۔ مختلف علوم و فنون کے علاوہ تیر اندازی اور گھوڑ سواری کے گر بھی سکھائے۔ اس نے قرآن کی تلاوت سیکھی اور ''قرآن خواں'' مشہور ہوا۔ کچھ دنوں بعد قاضی یا اس کے لڑکوں نے اسے کچھ تاجروں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ تاجر اسے غزنی کے غلام بازار لے گئے۔ اس کی صلاحیتوں کو پہچان کر معز الدین محمد غوری نے اسے خرید لیا۔ اسے جلد ہی قطب الدین ایبک کی قابلیت اور فنی صلاحیتوں کا اندازہ ہوا۔ محمد غوری نے اسے ''امیر آخور'' کے عہدے پر فائز کیا بعد میں وہ امیر خرد (شاہی اصطبلوں کا افسر) بنایا گیا جو اس دور میں ایک اہم عہدہ ہوا کرتا تھا۔ اس نے کئی اہم معرکوں میں سلطان کا بھرپور ساتھ دیا۔

1192 میں ترائن کی جنگ میں ایبک نے انتہائی اہم اور ممتاز کردار ادا کیا اور ہندوستان میں ترک سلطنت کے قیام، توسیع اور استحکام میں بہت اہم اور نمایاں رول ادا کیا۔ اس کے بعد اسے کہرام اور سامانہ کا انتظام و انصرام سونپا گیا۔ یہیں سے ہندوستان میں اس کی اصل سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی نے ہندوستان میں اس کی زندگی کو اجمالی طور پر تین ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ اول 1192ء سے 1206ء تک وہ معز الدین کی جانب سے شمالی ہندوستان کے بعض علاقوں کا انچارج آفیسر رہا۔ 1206ء سے 1208ء تک وہ غیر رسمی طور پر مکمل اختیار کے ساتھ معز الدین کی ان ہندوستانی املاک کا محافظ سپہ سالار تھا جو دہلی اور لاہور کے درمیان تھیں۔ سوم 1208ء سے 1210ء تک وہ ایک آزاد ہندوستانی ریاست کا ایک خود مختار حکمراں رہا۔

قطب الدین ایبک ایک بہترین فوجی قائد اور عمدہ عسکری لیڈر تھا۔ شمالی ہند کی فتوحات میں غوری کے عزمِ مصمم اور ایبک کی وفادارانہ جاں نثاری کا اہم کردار رہا ہے۔ معز الدین احکام مرتب کرتا اور ایبک اسے زمین پر نافذ کرتا تھا۔ اس نے غوری کے نمائندے کی شکل میں شمالی ہندوستان کے مفتوحہ علاقوں کا انتظام سنبھالا۔ راجپوت ریاستوں سے کامیاب لڑائیاں لڑیں۔ گڑھوالیوں کو ہرایا، گجرات، بیانہ، گوالیار کی جنگوں میں اہم کردار ادا کیا اور 1205 میں کھوکھروں کے خلاف محمد غوری کے ہمراہ رہا۔ کہا جاتا ہے کہ کھوکھروں کو کچلنے کے بعد محمد غوری نے قطب الدین ایبک کو ہندوستانی ریاستوں میں اپنا ''ولی عہد'' مقرر کیا۔ لیکن یہ بات قرینِ قیاس نہیں ہے۔ پروفیسر محمد حبیب اور پروفیسر خلیق احمد نظامی کے مطابق غوری نے کسی کو بھی اپنا نمائندہ یا جانشین مقرر نہیں کیا تھا۔

1206ء میں معز الدین محمد غوری کی وفات کے بعد قطب الدین ایبک 25 جون 1206ء میں لاہور میں اس کا جانشین بنا۔ اس نے لاہور میں چار سال تک قیام کیا۔ ابتدا میں اس نے اپنا راجدھانی لاہور کو بنائے رکھا تاکہ سرحدی علاقوں کے انتظام و انصرام پر مکمل نظر رکھے اور کسی کو ہندوستان پر حملہ کی جرائت نہ ہو سکے۔ اس دوران اس نے اپنے مقبوضات میں بہترین نظم و نسق قائم کیا۔ اپنی سلطنت میں امن

وامان بحال کیا ڈاکہ زنی اور لوٹ مار کا خاتمہ کیا۔ کچھ ہی عرصہ بعد اس نے اپنی حکومت کا راجدھانی دہلی کو بنایا۔ قطب الدین ایبک جس وقت سلطان بنا ہندوستان کے کئی اہم علاقے اس کی ماتحتی میں شامل تھے۔ سب سے پہلے اس نے ان علاقوں کی حفاظت کا بندوبست کیا ان کو محفوظ اور منظم کیا۔ تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ دونوں ایبک کے راستہ میں مشکلات پیدا کر رہے تھے۔ اس لیے اس نے تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ سے جنگ کی۔ یلدوز کو ہرا کر 1208ء میں غزنی پر قبضہ کر لیا۔ ناصر الدین قباچہ کے ساتھ اس نے دوستانہ رویہ اپنایا اور اس نے قباچہ کے ساتھ اپنی بیٹی کا نکاح کر دیا۔ چنانچہ قباچہ نے ایبک کی ماتحتی قبول کر لی۔ اس طرح قطب الدین ایبک نے اپنی پوزیشن مزید بہتر، مضبوط اور مستحکم کر لی۔ قطب الدین ایبک نے 1194ء میں گجرات کا راجدھانی پٹن فتح کر لیا۔ 1195ء میں چندراوتی، آبو اور ناگور کے راجاؤں کی مشترکہ افواج نے مل کر اجمیر کو اس سے چھین لینا چاہا لیکن ایبک نے ان کو شکست دے کر اجمیر پر اپنی گرفت مضبوط رکھی۔ گجرات جو کچھ دنوں کے لیے اس کے اقتدار سے نکل گیا تھا اسے اس نے 1196ء میں دوبارہ فتح کر لیا اور وہاں اپنا ایک نائب مقرر کر کے دہلی واپس آگیا۔ اس کے دہلی واپس آنے کے کچھ ہی دنوں بعد گجرات کے راجانے اپنی ریاست کو دوبارہ چھین لیا۔ ایک ترک مہم جو محمد بختیار خلجی نے ایک افسانوی انداز میں حملہ کر کے 1199ء میں بہار اور بنگال کو فتح کر لیا جسے اس نے بعد میں دلّی سلطنت میں شامل کر دیا۔

قطب الدین ایبک ایک بہترین فوجی قائد اور زیرک منتظم تو تھا ہی ساتھ ہی وہ اپنی دلی کیفیتوں اور دماغی صلاحیتوں کے لیے بھی ممتاز تھا۔ اکثر مورخین اس کی وفاداری، دلیری، بہادری عدل وانصاف کی تعریف کرتے ہیں۔ فخرِ مدبر کہتا ہے کہ اگرچہ اس کی فوج ترکوں، غوریوں، خراسانیوں، سلجوقیوں اور ہندوستانیوں جیسی مختلف اقوام پر مشتمل تھی لیکن کسی سپاہی کو یہ ہمت نہیں ہوتی تھی کہ وہ کھانے کا ایک لقمہ یا گھاس کا ایک ٹکڑا، باڑے سے کوئی بکری یا چڑیا زبردستی لے لے یا کسی دیہاتی کے گھر زبردستی قیام کرے۔ ایبک نہایت سخی اور بہادر تھا۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے اس کو "لکھ بخش" (لاکھوں کی بخشش دینے والا) بھی کہتے ہیں۔ اس کی فیاضی کے قصے دکن کے دور دراز علاقوں تک پھیل گئے تھے۔ پروفیسر محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ "اگرچہ ہندوستان میں اس کی پوری زندگی مسلسل عسکری سرگرمیوں میں گزری تاہم عوام کے دماغ پر اس نے جو تاثر چھوڑا وہ تباہی اور بربادی کا نہیں تھا بلکہ انصاف اور وسعتِ قلبی کا تھا۔" ابوالفضل اس کے کارناموں کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے ہوئے کہتا ہے کہ "اس نے عمدہ اور عظیم کارنامے انجام دیے ہیں۔ ڈاکٹر اے۔ بی۔ ایم حبیب اللہ کہتے ہیں کہ "اس نے ایرانیوں کے لطف وکرم میں ترکوں کی بہادری کی آمیزش کر دی تھی جس نے آگے چل کر ہندوستانی مشترکہ تہذیب وثقافت کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔" قطب الدین ایبک نے دہلی میں ایک عظیم الشان مسجد "قبتہ الاسلام" یا "قوت الاسلام" کے نام سے بنوائی۔ اسی مسجد سے متصل جنوبی علاقے میں ایک شاندار مینار کی تعمیر کا آغاز کیا جسے قطب مینار کے نام سے شہرت حاصل ہوئی۔ اس نے اجمیر میں "ڈھائی دن کا جھونپڑا" نامی مسجد بھی بنوئی۔ ایبک کی عمارتی سرگرمیوں کی جھلک آج بھی مہرولی اور اس کے آس پاس دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کی ابتدائی تعمیرات میں ہند اسلامی طرزِ تعمیر کی آمیزش نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ 1210ء میں لاہور میں چوگان (پولو) کھیلتے ہوئے گھوڑے سے گر کر اس کی وفات ہو گئی۔ اس کی وفات کے بعد آرام شاہ کو مملوک سلطنت کا حکمراں بنایا گیا۔

12.4 آرام شاہ (1210ء)

قطب الدین ایبک اپنی ناگہانی وفات کے باعث اپنا کوئی جانشین مقرر نہیں کر سکا۔ چنانچہ اس کی اچانک وفات سے اس نوزائیدہ ترک ریاست کے لیے جب حالات انتہائی نازک ہوئے تو کچھ ترک امراءاور سرداروں نے 1210ء میں آرام شاہ کو لاہور میں ایبک کا جانشین بنادیا۔ کچھ لوگ اس کو قطب الدین کا بیٹا کہتے ہیں لیکن یہ درست نہیں ہے۔ جوینی کا کہنا ہے کہ ایبک کا کوئی بیٹا نہیں تھااور منہاج السراج نے بھی صرف اس کی تین بیٹیوں کا ہی حوالہ دیا ہے۔ بہر حال آرام شاہ کوئی نامی گرامی شخصیت کا حامل نہیں تھااس کے باوجود اسے سلطان اس وجہ سے بنایا گیا کیوں کہ اکثر باصلاحیت ترک حکمراں شمالی ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اپنے فرائض انجام دے رہے تھے اور وہ لاہور میں موجود نہیں تھے۔ جب انہیں آرام شاہ کی تخت نشینی کی اطلاع ملی تو بہت سے ترک سرداروں نے اس کی مخالفت کی اور کئی مقامات پر بغاوتیں ہوئیں۔ قباچہ نے سندھ میں بغاوت کی اور اچ اور ملتان پر چڑھائی کر دی۔ اس نے بھکر اور سہون پر قبضہ بھی کر لیا۔ بختیار خلجی نے بنگال میں خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ آرام شاہ ایک کمزور حکمراں ثابت ہوااور اس کی تخت نشینی کو ترک امیروں کی مزاحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ ان ہنگامی حالات پر قابو نہ پاسکا۔ دلی میں موجود ترک امراءاور سرداروں نے بدایوں کے گورنر التتمش کو دلّی آنے کی دعوت دی۔ التتمش دلی آیااور آرام شاہ کو تھوڑے سے مقابلے کے بعد شکست دینے میں کامیاب رہا۔ التتمش نے آرام شاہ کو گرفتار کر کے قتل کر ڈالا۔ اس طرح آرام شاہ کی آٹھ مہینے کے مختصر دورِ حکمرانی کا خاتمہ ہوااور ایبک کے داماد التتمش نے اس کے جانشین کی حیثیت سے زمامِ حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔

12.5 سلطان شمس الدین التتمش (1210ء سے 1236ء)

سلطان شمس الدین التتمش ایک البری ترک تھا۔ اس کے والد ایلم خاں البری قبیلے کے سردار تھے۔ التتمش کے ابتدائی حالات اچھے نہیں تھے۔ اس کے بھائیوں نے اسے ایک غلام کی حیثیت سے بخارا کے بازار میں بیچ دیا تھا۔ بخارا سے وہ غزنی اور پھر بغداد لایا گیا۔ بعد میں دلّی میں قطب الدین ایبک نے اسے غلام کی حیثیت سے خرید لیا۔ ایبک کی طرح التتمش نے بھی اپنی زندگی کا آغاز ایک غلام کی حیثیت سے کیا تھا۔ وہ بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا۔ اپنی ایمان داری، محنت، سچی لگن اور جانفشانی کے باعث ترقی کی منزلیں طے کرتا گیا۔ اسے ''سر جان دار'' مقرر کیا گیا۔ اس کی انتظامی صلاحیت سے متاثر ہو کر ایبک نے اسے ''امیر شکار'' کا عہدہ پر فائز کیا۔ 1200ء میں اسے گوالیار کا امیر بنایا گیا۔ اس نے گوالیار، برن اور بدایوں کے اقطاع دار کی حیثیت سے بھی کام کیا۔ سلطان قطب الدین ایبک اس کی صلاحیتوں سے کافی متاثر تھا۔ اس نے اپنی ایک لڑکی کی شادی بھی التتمش سے کر دی تھی۔ 1210ء میں سلطان بننے کے بعد التتمش کے سامنے کئی اہم مشکلیں درپیش تھیں۔ اس کے سامنے بہت سے مسائل منہ کھولے کھڑے تھے۔ اس کے تین اہم حریف اور مخالف موجود تھے :

1. غزنی میں تاج الدین یلدوز
2. سندھ میں ناصر الدین قباچہ
3. بنگال میں علی مردان

ان کے علاوہ شکست خوردہ راجپوت حکمراں بھی دلّی سلطنت پر قابض ہونے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے تھے اور سلاطین دہلی کے لیے بدستور ایک اہم مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ دلّی سلطنت کو منگولوں کے حملے کا بھی خطرہ برابر لاحق تھا۔ معزی اور قطبی ترک امیروں کا ایک طبقہ بھی التتمش کا مخالف تھا۔ سلطنت کے اندرونی حالات بھی اطمینان بخش نہیں تھے۔ ان تمام مسائل کے باوجود التتمش نے انتہائی عزم، حوصلہ، جوانمردی اور بہادری سے ان مشکلات کا سامنا کیا اور اپنے تمام مخالفین پر قابو پانے میں کامیاب ہوا۔ اسی لیے اکثر مورخین ہندوستان میں ترک سلطنت کا حقیقی بانی التتمش کو ہی قرار دیتے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں ترکوں کی فتوحات کو وسیع اور مستحکم کرنے کا سہرا التتمش کے سر ہی باندھا جاتا ہے۔ اس کی تخت نشینی کے وقت علی مردان خان نے بنگال اور بہار کا حکمران بننے کا اعلان کر دیا۔ ناصر الدین قباچہ نے ملتان کا خود مختار حکمران ہونے کا اعلان کیا اور لاہور اور پنجاب کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا۔

سلطان شمس الدین التتمش نے 1210ء سے 1236ء تک دلّی کے تخت پر اپنی گرفت مضبوط رکھی اور کامیابی کے ساتھ حکومت کی۔ 1217ء میں ناصر الدین قباچہ نے پنجاب پر قبضہ کرنے کا ارادہ کیا مگر ناکام رہا۔ 1218ء میں غزنی کے امیر تاج الدین یلدوز نے پنجاب پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ التتمش نے پنجاب پہونچ کر یلدوز کو شکست دی اور اسے گرفتار کر لیا۔ 1210ء سے 1220ء کے دوران وہ اپنے دو اہم مخالفین تاج الدین یلدوز اور ناصر الدین قباچہ کی طاقت کو ختم کر کے اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے میں کامیاب رہا۔

سلطان شمس الدین التتمش نے منگولوں کے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ 1221ء سے 1227ء کے بیچ التتمش نے منگولوں کے حملہ سے سلطنت کو محفوظ رکھنے کی کامیاب کوشش کی۔ 1221ء میں چنگیز خاں، خوارزم کے شہزادے جلال الدین منگ برنی کا پیچھا کرتے ہوئے دریائے سندھ تک آیا۔ چونکہ التتمش نے مفرور شہزادے کو پناہ دینے سے انکار کر دیا اس لیے دہلی کی سلطنت منگولوں کے حملے سے محفوظ رہی اور چنگیز خان ملتان سے واپس چلا گیا۔ جب منگولوں کے حملوں کا خطرہ ٹل گیا تو 1225ء میں التتمش نے بنگال کے باغیوں کی سرکوبی کی طرف توجہ دی اور ان کو شکست دی۔

سلطان شمس الدین التتمش نے 1228ء سے 1236ء تک اپنی ریاست کو مضبوط کرنے کے ساتھ انتظامی ڈھانچہ کی اصلاح کی طرف بھی اپنا دھیان مرکوز کیا۔ اس کا حریف ناصر الدین قباچہ رفتہ رفتہ سندھ میں اپنی پوزیشن مستحکم کر رہا تھا۔ چنانچہ التتمش نے 1228ء میں سندھ پر دوبارہ چڑھائی کی اور ناصر الدین قباچہ کو میدانِ جنگ میں شکست دی۔ قباچہ نے اپنی جان بچانے کے لیے دریا میں چھلانگ لگائی اور دریا میں ڈوب کر جان دے دی۔ التتمش نے سندھ پر قبضہ کر لیا۔ پھر رنتھمبور کا قلعہ فتح کیا۔ 1231ء میں گوالیار بھی فتح کر لیا اور 1232ء میں مالوہ کا پورا علاقہ اس کے زیر نگین ہوا۔ 18 فروری 1229ء میں عباسی خلیفہ نے التتمش کو خود مختار اور قانونی سلطان تسلیم کر لیا اور اسے ناصر امیر المومنین کا خطاب عطا کیا۔ اس طرح وہ ہندوستان کا پہلا خود مختار سلطان بن گیا۔ مسلمانوں کی نظر میں اسے ایک آزاد حکمران کی حیثیت حاصل ہوئی۔ خلیفہ کے پروانۂ مسند نشینی سے اسے حکمرانی کا قانونی جواز حاصل ہو گیا۔ اگرچہ یہ محض ایک رسم تھی پھر بھی التتمش نے اس کے حصول کے بعد اپنی حکمرانی کے جواز کا ایک پر وقار جشن منایا۔ اس نے ترک امیروں کا ایک گروہ ''ترکانِ چہلگانی'' کے نام سے تشکیل

دیا۔ سلطنت کے زیادہ تر اہم عہدے انہیں ''ترکان چہلگانی'' کو سونپے گئے۔ التتمش نے اس وقت رائج سکوں میں کئی اہم اصلاحات کیں ۔پرانے سکوں کی جگہ عربی ٹنکہ چلایا۔ ٹنکہ سونے اور چاندی کا بنتا تھا۔ اپنے عہد میں جاری کیے گئے ٹنکوں پر ٹکسال کا نام کندہ کرانے کی روایت بھی التتمش نے ہی شروع کی تھی۔ اس کے علاوہ اس عہد میں پیتل کے جیتل بھی جاری کیے گئے۔ 1236ء میں التتمش کی وفات ہوئی۔

پشاور سے وندھیا چل تک اور ساحل سندھ سے برہم پتر تک سارا شمالی ہندوستان اس کی حکومت میں تھا۔ اس نے قطب الدین ایبک کے ادھورے کاموں کو پورا کیا اور دلّی سلطنت کو ایک خود مختار ریاست کی شکل دی۔ محمد حبیب و خلیق احمد نظامی کے لفظوں میں ''ایبک نے سلطنت (دہلی) کا محض ایک خاکہ اپنے ذہن میں قائم کیا تھا۔ التتمش نے اس خاکے کو انفرادیت، بلند درجہ اور قوت ارادی عطا کی اور اس کے لیے ایک نظام حکومت اور حکمراں طبقہ تیار کیا۔'' التتمش کی وفات کے فوراً بعد امراء خاص طور پر صوبائی افسروں نے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھا دیا۔

12.6 رکن الدین فیروز شاہ (1236ء)

سلطان شمس الدین التتمش اپنے جانشین کے بارے میں بہت زیادہ فکر مند تھا۔ وہ اپنے تمام لڑکوں میں سے کسی کو بھی جانشینی کا اہل نہیں سمجھتا تھا۔ بالآخر انتہائی غور و خوض کے بعد اس نے اپنی بیٹی رضیہ کو اپنا جانشین بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس بابت اس نے علماء اور امراء دونوں کو راضی کر لیا اور رضیہ کو اپنا ولی عہد نامزد کیا لیکن علماء اور امراء کو اس کی ولی عہدی قبول نہیں تھی چنانچہ اس کی وفات کے دوسرے ہی دن کچھ ترک امیروں اور سرداروں نے بڑی جلد بازی میں رکن الدین فیروز شاہ کو تخت نشین کر دیا۔ منہاج السراج کے مطابق رکن الدین فیروز شاہ میں تین ممتاز خوبیاں تھیں۔ ''خوبصورت قد و قامت، نرم دلی اور بے انتہا سخاوت کا خوگر تھا''، لیکن اس دور میں صرف یہ خوبیاں ایک کامیاب حکمران کے لیے کافی نہیں ہوتی تھیں۔ رکن الدین فیروز شاہ سلطنت پر کنٹرول نہ رکھ سکا۔ اقتدار اس کی ماں ''شاہ ترکان'' کے ہاتھ میں چلا گیا۔ رکن الدین نے انتظام حکومت سے کوئی دلچسپی نہیں لی۔ اس نے ملکی خزانے کو بڑی بے دردی سے لٹایا اور عیاشی میں مشغول ہو گیا۔ چونکہ شاہ ترکان ایک خود سر خاتون تھی، اس نے مطلق العنانیت کے ساتھ حکومت کرنے کی کوشش کی اور حکمراں خاندان کے لوگوں کو بے عزت کرنا شروع کیا۔ التتمش کے چھوٹے لڑکے قطب الدین کو اندھا کروا کر اسے قتل کروا دیا۔ رفتہ رفتہ عوام پر بھی ظلم و ستم ہونے لگا جس کی وجہ سے سلطنت کے مختلف حصوں میں بغاوتیں پنپنے لگیں۔ ان شورشوں سے نپٹنے کے لیے رکن الدین فیروز دہلی سے روانہ ہوا۔ ملکوں اور امیروں کی بغاوت دن بدن بڑھتی گئی۔ سلطنت میں بغاوت اور لاقانونیت کے واقعات سے رضیہ نے فائدہ اٹھایا۔ اس نے سرخ جامہ زیب تن کیا اور اپنے باپ کے نام پر دہلی کے لوگوں سے اپیل کی کہ وہ اسے ''شاہ ترکان'' کے ظلم اور سازشوں سے نجات دلائیں۔ بھیڑ نے محل پر حملہ کر دیا۔ شاہ ترکان کو قید کر لیا گیا اور رضیہ کو سلطان بنانے کا اعلان کیا۔ رکن الدین فیروز شاہ باغیوں سے خوف کھا کر دہلی واپس آ گیا۔ پہلے اسے قید میں ڈالا گیا اور کچھ ہی دنوں کے بعد قتل کر دیا گیا۔ اس طرح 1236ء میں سلطان التتمش کی بیٹی رضیہ دہلی کے تخت کی حکمران بن گئی۔ رضیہ ہندوستان کی پہلی مسلم خاتون تھی جو سلطان بنی۔

12.7 رضیہ سلطان(1236-1240ء)

رضیہ سلطان دہلی سلطنت کی پہلی خاتون سلطان تھی۔ منہاج السراج کے مطابق اس نے تین سال چھ مہینے اور چھ دن حکومت کی تھی۔ اگرچہ دہلی کی عوام اور کچھ ترکی امیروں کی مدد و حمایت سے رضیہ سلطان بن گئی لیکن بحیثیت سلطان اس کی پوزیشن مستحکم نہیں تھی۔ اس کے سامنے بہت سی مشکلات تھیں۔ اس کا بھائی بہرام شاہ سلطان بننا چاہتا تھا۔ وزیر ناظم الملک جنیدی کے علاوہ ملتان، ہانسی، لاہور اور بدایوں جیسے صوبوں کے صوبیدار اور سردار جن میں ملک جانی، ملک کوچی، ملک ایاز اور ملک سالاری وغیرہ اہم تھے، رضیہ کو تخت سے ہٹانے کی سازشیں کر رہے تھے۔ کئی راجپوت ریاستوں نے بھی علم بغاوت بلند کر رکھا تھا۔ غرض پوری ریاست انتشار و بدنظمی کا شکار تھی۔ رضیہ سلطان نے سب سے پہلے باغیوں کو اپنی حکمت عملی اور دوراندیشی سے زیر کرنے کی کوشش کی۔ سالاری اور ایاز کو جو اس کے شدید مخالف تھے اپنا ہمنوا بنالیا۔ ملک کوچی اور اس کے بھائی کو مروا دیا۔ ملک جانی کو بھی تہہ تیغ کروا دیا گیا۔ وزیر ناظم الملک جنیدی سرمور کی پہاڑیوں میں بھاگ کر روپوش ہو گیا۔ دوسرے سرداروں نے بھی انتقامی کارروائی سے ڈر کر رضیہ کو سلطان تسلیم کر لیا۔

راجپوت راجاؤں کی طرف سے بھی اسے کئی اہم مسائل اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ وہ مسلسل اس کے لیے درد سر اور چیلنج بنے ہوئے تھے اور ہمیشہ بغاوت پر آمادہ رہتے تھے۔ نہایت عزم و حوصلے، سیاسی سوجھ بوجھ اور دانشمندی سے رضیہ نے راجپوتوں کا مقابلہ کیا اور ان پر کنٹرول قائم کرنے میں بھی کامیاب ہوئی۔ رضیہ نے ملک قطب حسن غوری کو رنتھمبور کے رائے کے خلاف کاروائی کے لیے بھیجا۔ اس نے رنتھمبور پر حملہ کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ اسی طرح گوالیار پر بھی قبضہ کر کے سلطانی عظمت و وقار میں اضافہ کیا۔ انتظامی ڈھانچے کو بھی مضبوط کیا۔ تمام ملکوں اور امیروں نے بھی اس کے اقتدار کو قبول کر لیا تھا۔ دہلی سلطنت پر اپنا پورا تسلط قائم کرنے کے بعد رضیہ نے انتظامی امور کی جانب اپنی توجہ مرکوز کی۔

منہاج السراج کے مطابق ''سلطنت میں امن و سکون قائم ہوا اور اس کا قوت اور دبدبہ دور تک قائم ہو گیا۔ لکھنوتی سے دیبل تک کے تمام امیروں نے اس کی اطاعت قبول کر لی تھی۔'' انتظامی امور کی دیکھ ریکھ اور انتظامیہ سے براہِ راست رابطہ کرنے کے لیے اس نے اپنا نسوانی اور زنانہ لباس پہننا ترک کر دیا۔ وہ مردانہ لباس میں ملبوس ہو کر قبا و کلاہ پہن کر عوام کے سامنے بلا جھجھک آنے جانے لگی۔ اس کے ساتھ ساتھ کھلے چہرے کے ساتھ دربار میں آنا، ہاتھی کی سواری کرنا، شکار کھیلنا شروع کر دیا۔ دہلی سلطنت کے دیگر حکمرانوں کی طرح سلطنت کے تمام امور کی دیکھ ریکھ اپنی رہنمائی میں انجام دینا شروع کیا۔

ترک امیروں کو جن میں اکثر چہلگانی امراء تھے ایک عورت کی حکومت پسند نہ آئی۔ جلد ہی دہلی اور صوبوں کے امراء کے ایک مخصوص حلقے میں سازش کے تحت اس کی مخالفت شروع کی گئی۔ محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ''رضیہ نے محسوس کیا کہ ترک امراء کی حبِ جاہ، نظم وضبط کے قیام میں ایک زبردست رکاوٹ ہے۔ لہٰذا اس نے ترکوں کی کاٹ کے لیے ان کے مدِ مقابل غیر ترک امراء کا ایک طبقہ تیار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس پالیسی کے بعد جو مسلسل ردِ عمل ہوا اس نے رضیہ کو کچل ڈالا۔'' ستیش چندر لکھتے ہیں کہ ''اپنے وفادار امراء

کی ایک جماعت تشکیل دینے اور اعلیٰ عہدوں پر غیر ترکوں کو فائز کرنے کی اس کی کوشش کو ترک سردار برداشت نہیں کر سکے" ترک امیروں نے اس پر عصمت فروشی اور حبشی امیر یاقوت سے بے جا دوستی کا الزام لگایا اور رائے عامہ کو اس سے متنفر کرنے کی بھرپور کوشش کی جس کے نتیجے میں لاہور اور سرہند میں بغاوتیں ہوئیں۔ لاہور کے صوبے دار کبیر خان ایاز اور تبرہند (بھٹنڈا) میں امیر التونیہ نے بغاوتیں کیں۔ رضیہ نے لاہور جا کر کبیر خان ایاز کی بغاوت کو فرو کر کے اسے اپنا مطیع بنایا اور ملتان کا اقطاع دار مقرر کیا۔ ابھی وہ دہلی پہونچی ہی تھی کہ تبرہند کے گورنر التونیہ نے بھی بغاوت کر دی۔ رضیہ سلطان نے تبرہند کی طرف کوچ کیا اور ملک التونیہ سے جنگ کی مگر اس جنگ میں اسے شکست ہوئی۔ اس کے بھروسے مند سپہ سالار امیر جمال الدین یاقوت کو قتل کر دیا گیا اور رضیہ سلطان کو قید کر لیا گیا۔ عین ممکن تھا کہ اسے قتل کر دیا جاتا لیکن التونیہ نے رضیہ کے سامنے یہ پیش کش رکھی کہ اگر وہ اس سے شادی کر لے تو وہ اس کی جان بخش سکتا ہے اور دہلی کا تخت واپس دلانے میں اس کی مدد کر سکتا ہے۔ رضیہ کو اس بات کا شدید احساس تھا کہ کسی مضبوط سہارے کے بغیر اس کی رہائی اور حکومت ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اس نے بھٹنڈا کے صوبے دار التونیہ کی بات مان لی اور اس کے ساتھ شادی کر لی۔ شادی کے بعد رضیہ اور التونیہ نے اپنی منتشر فوجی قوت کو اکٹھا کرنا شروع کیا۔ ادھر دہلی میں چونکہ ترک امراء پہلے ہی رضیہ سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا منصوبہ بنا چکے تھے۔ لہٰذا اس کے تبرہند کی طرف کوچ کرتے ہی بغاوت شروع ہو گئی۔ ترک سازشی امیروں نے 1240ء میں التتمش کے بیٹے معزالدین بہرام شاہ کو دلّی کا نیا سلطان بنا دیا۔

رضیہ کے دہلی کی طرف کوچ کی خبر سن کر بہرام شاہ ستمبر یا اکتوبر 1240ء میں ایک فوج لے کر رضیہ سے مقابلے کے لیے دہلی سے روانہ ہوا۔ اس جنگ میں رضیہ اور التونیہ کو شکست ہوئی۔ دونوں نے جان بچا کر کیتھل (موجودہ کرنال) میں پناہ لی جہاں ڈاکوؤں کے ہاتھوں دونوں میاں بیوی مارے گئے۔ سلطان بہرام شاہ کے سپاہی جوان کی تلاش میں تھے ان کو پہچان کر دہلی لے آئے اور انہیں سپردِ خاک کیا۔ سرسید احمد خاں نے اپنی کتاب "آثار الصنادید" میں لکھا ہے کہ "شہرِ شاہجہان آباد میں محلہ بلبلی خانہ میں ترکمان دروازے کے پاس ایک ٹوٹی سی چار دیواری اور چھوٹی سی قبر رضیہ سلطان بنت شمس الدین التمش کی ہے۔" یہاں دو قبریں ہیں جن کو رجی سجی کی درگاہ کہا جاتا ہے۔ یہ قبریں رضیہ اور اس کی بہن شاذیہ کی بتائی جاتی ہیں۔ منہاج سراج کے مطابق "رضیہ کے اندر وہ تمام قابل تعریف خوبیاں موجود تھیں جن کا بادشاہوں کے اندر پایا جانا ضروری ہے، لیکن اس کا عورت ہونا ہی اس کی سب سے بڑی کمی تھی۔ یہ دشواری اس کے دل و دماغ کی پوری صلاحیتوں کے آزادانہ عمل کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی تھی۔" بہر حال یہ چیز اس کے زوال کا باعث نہ تھی۔

12.8 معزالدین بہرام شاہ (1240-1242ء)

جس وقت رضیہ تبرہند میں قید کی گئی تھی امرائے چہلگانی نے معزالدین بہرام شاہ کو اپریل 1240ء میں دہلی کے تخت پر بیٹھایا۔ بہرام شاہ کے بارے میں منہاج نے لکھا ہے کے اس میں کچھ ذاتی اوصاف تھے۔ وہ شرمیلا اور سادگی پسند تھا اس میں سلطانی شان و شوکت کی خواہش نہیں تھی۔ کئی ذاتی خوبیوں کے باوجود وہ صرف نام کا سلطان تھا۔ اصل طاقت "ترکان چہلگانی" کے ہاتھوں میں تھی جنہیں چالیس امیروں کا گروہ کہا جاتا ہے۔ حکومت پر اپنی گرفت مضبوط بنانے کے لیے ترکی امیروں نے نائب مملکت کا عہدہ قائم کیا اور ملک

اختیار الدین اتگین کو اس عہدے کے لیے منتخب کیا گیا۔ اتگین نے انتظام حکومت کی ساری باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر بہرام شاہ نے جولائی 1240ء میں قصرِ سفید میں ایک مذہبی مجلس کے دوران اس کو قتل کروا دیا۔ اس کے بعد بدر الدین سنقر رومی کو امیر حاجب بنایا۔ اس نے معزالدین بہرام شاہ کے قتل کی سازش رچی۔ اس سازش کا راز فاش ہو گیا اور بالآخر بدر الدین سنقر رومی کو بہرام شاہ نے قتل کروا دیا۔ جو امراء اس سازش میں شامل تھے انہیں بھی سخت سزائیں دی گئیں۔ کچھ کو ان کے عہدوں سے معزول کر دیا گیا اور کچھ قتل کروا دیے گئے جب کہ کچھ دوسرے چھپ گئے۔ سازشیوں کے خلاف سخت کاروائی سے دیگر ترک امراء خوف زدہ ہو گئے۔ اس میں وزیر مظہر الدین پیش پیش رہا۔ اس نے دھوکے سے سلطان سے ایک ایسا فرمان حاصل کر لیا جس میں لکھا تھا کہ سارے ترک امیروں کو قتل کر دیا جائے۔ وزیر نے یہ خط ترک امیروں کو دکھلا دیا جس کی وجہ سے ترک امیروں نے بہرام کے خلاف بغاوت کر دی۔ 10 مئی 1242ء کو ترک امراء نے شہر پر قبضہ کر لیا اور 13 مئی 1242ء کو بہرام شاہ کو مار ڈالا گیا۔ اس نے کل دو برس اور ڈیڑھ مہینہ حکومت کی۔

12.9 علاءالدین مسعود شاہ (1242-1246ء)

علاءالدین مسعود شاہ ایک کمزور، نااہل اور نام کا سلطان تھا۔ اس کے عہد میں ملک قطب الدین حسن نائب سلطنت اور ملک ابو بکر وزیر سلطنت بن گیا۔ بلبن کو ہانسی جیسا اہم اقطاع ہاتھ آیا۔ آہستہ آہستہ بلبن نے اپنی حیثیت میں اضافہ کیا۔ علاءالدین مسعود شاہ کے عہد میں جب 1245ء میں منگولوں نے اُچ پر قبضہ کیا تو بلبن نے ہی منگولوں کو مار بھگایا اور اچ پر دوبارہ قبضہ حاصل کیا۔ اس سے بلبن کے عزت و وقار میں اضافہ ہوا لیکن سلطان مسعود شاہ کی ناکامی اور نااہلی کی وجہ سے امیروں کی نگاہ میں اس کی قدر و منزلت گر گئی۔ لٰہذا تمام ملکوں اور امیروں نے اتفاق رائے سے سلطان ناصر الدین محمود شاہ کو خفیہ خطوط لکھ کر دہلی آنے کی درخواست کی اور بلبن کی سازش سے 10 جون 1246 کو چار سال ایک ماہ اور ایک دن کی حکومت کے بعد علاءالدین مسعود شاہ کو جیل میں ڈال دیا گیا جہاں اس کی وفات ہو گئی اور اسی دن ناصر الدین محمود کو اس کے جانشین کے طور پر تخت سلطنت پر فائز کر دیا گیا۔

12.10 ناصرالدین محمود (1246-1266ء)

سلطان ناصر الدین محمود 1246ء کو تخت پر بیٹھا۔ یہ التتمش کا پوتا تھا۔ اور اس کے بیٹے ناصر الدین کا فرزند تھا۔ نہایت متقی، پرہیزگار اور سیدھی طبیعت کا مالک تھا۔ اس نے پورا اقتدار "ترکان چہلگانی" کے سربراہ غیاث الدین بلبن کے ہاتھوں میں سونپ دیا۔ اس طرح ترک امیروں اور سلطان کے مابین چلی آرہی اقتدار کی کشمکش ختم ہو گئی۔ ناصر الدین محمود کے عہد میں سلطنت کا پورا اقتدار بلبن کے ہاتھوں میں مرکوز تھا۔ بلبن کی حمایت سے اس نے اندرونی اور خارجی حالات پر کنٹرول حاصل کر لیا۔ اگرچہ بلبن بہت مضبوط تھا پھر بھی سلطان کا وقار مجروح نہیں ہوا۔ بلبن ایک خادم کی حیثیت سے کام کرتا رہا۔ 1249ء کو اس نے بلبن کو "الغ خاں" کا خطاب دیا اور نائب مملکت کے عہدے پر فائز کیا۔ بلبن کی اس حیثیت کی وجہ سے شمسی خاندان کی سلطنت مضبوط ہو گئی اور باغی ترکوں کے حوصلے پست ہو گئے۔ سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں منگولوں کو دو بار شکست ہوئی۔ منگولوں نے دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے اپنا سفیر ایوان سلطنت بھیجا۔ اسے مرعوب

کرنے کے لیے ایک شاندار دربار میں اسے باریاب کیا گیا۔ ناصر الدین محمود امراء کے لیے ایک مناسب آلہ کار تھا اس لیے کہ اس کو سیاست و حکومت سے بہت کم دلچسپی تھی۔ اس نے اپنا زیادہ تر وقت عبادت میں صرف کیا۔ 1266ء میں ناصر الدین محمود کی وفات ہو گئی۔ اس کی وفات کی وجوہات کو لے کر مورخین کے مابین اختلافات ہیں۔

12.11 غیاث الدین بلبن (1266-1287)

بلبن کا تعلق البری ترک خاندان سے تھا۔ بچپن ہی میں بلبن کو غلام کی حیثیت سے بغداد میں بیچ دیا گیا۔ 1232 میں وہ دہلی لایا گیا۔ یہاں التتمش نے اسے خرید لیا رفتہ رفتہ وہ "ترکان چہلگانی" میں شامل ہو گیا۔ رضیہ سلطان کے عہد میں بلبن "امیر شکار" کے عہدہ پر فائز تھا۔ بہرام شاہ کے عہد میں "امیر آخور" کا عہدہ حاصل کیا۔ وہ ریواڑی اور ہانسی کا "اقطاع دار" بھی رہا۔ علاء الدین مسعود شاہ کے عہد میں اسے "امیر حاجب" کا عہدہ سونپا گیا۔ اسی عہد میں اس نے منگولوں کو شکست دے کر اچھ پر قبضہ کر لیا جس کی وجہ سے بلبن کی طاقت اور وقار میں اضافہ ہوا۔ بلبن نے مسعود شاہ کو تخت سے ہٹا کر سلطان ناصر الدین محمود کو گدی پر بیٹھنے میں کافی مدد کی تھی۔ چنانچہ ناصر الدین نے اسے نائب مملکت کے عہدے پر فائز کر دیا۔

بلبن بحیثیت نائب مملکت (1246-1266)

سلطان ناصر الدین محمود کے عہد میں بلبن کو نائب مملکت بنایا گیا اور الغ خاں کا خطاب دیا گیا۔ اپنی طاقت کو مزید مستحکم کرنے کے لیے بلبن نے اپنی لڑکی کی شادی سلطان سے کر دی۔ سلطان نے بھی اپنی ایک پوتی کی شادی بلبن کے بیٹے بغرا خاں کے ساتھ کر دی۔ رفتہ رفتہ بلبن نے قوت و اقتدار کے ساتھ فوج اور انتظامیہ پر مکمل اختیار حاصل کر لیا۔ اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو دیکھ کر امراء حسد کرنے لگے، ان میں قتلغ خاں، کچلو خاں اور عماد الدین ریحان پیش پیش تھے۔ ان لوگوں نے سلطان پر دباؤ بنا کر بلبن کو نائب مملکت کے عہدے سے ہٹوا دیا۔ بلبن کو دلی چھوڑ کر ہانسی اور ناگور جانا پڑا۔ بلبن کے دلی سے جاتے ہی انتظامی امور میں گڑبڑی پیدا ہو گئی۔ سلطان کے لیے حکومت کرنا مشکل ہو گیا۔ مجبور ہو کر سلطان ناصر الدین نے 1254ء میں بلبن کو دوبارہ اپنا نائب مقرر کر دیا۔ اس عہدے پر بلبن سلطان کی وفات تک کام کرتا رہا۔ بحیثیت نائب مملکت بلبن نے سلطنت کو منظم رکھا۔ انتظامی امور کو سنبھالا اور شاہی خاندان کے زوال کو روکے رکھا۔

بلبن بحیثیت حکمراں (1266-1287)

یوں تو غیاث الدین 1266ء میں تخت سلطنت پر بیٹھا، لیکن 1246ء سے اس کی موت 1287ء تک کا عہد بلبنی عہد کہا جا سکتا ہے، اس لیے کہ اس زمانے میں اسی کی طاقت کا غلبہ رہا جس وقت بلبن سلطان بنا اس وقت دلّی سلطنت انتشار کا شکار تھی۔ برنی کے مطابق دلّی کے آس پاس میواتیوں کا ظلم و جبر بڑھا ہوا تھا۔ سلطان بلبن نے دلی کے اطراف کے جنگلوں کو کٹوایا اور میواتیوں کے ظلم کو ختم کیا۔ اس نے متعدد میواتیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ گوپال گیر میں اس نے ایک قلعہ بنوایا اور وہاں پولیس چوکیاں بنوا کر انہیں افغانوں کے حوالے کیا۔ اس نے اودھ خاص طور سے کٹیہر (روہیل کھنڈ) کے باغیوں کو تہہ تیغ کیا۔ اس نے کمپل، پٹیالی، بھوجپور اور جلالی میں ڈاکوؤں کے جو بڑے

اڈے تھے، ختم کرا کے مضبوط قلعے اور وسیع مسجدیں تعمیر کرائیں۔ ترکان چہلگانی کے اثر کو ختم کیا اور اندرونی بغاوت پر بھی قابو پایا۔ خصوصاً بنگال میں 1279ء میں طغرل خاں نے جو بغاوت کی تھی اس کو کچل دیا اور اپنے لڑکے بغرا خاں کو وہاں کا حاکم بنایا۔ منگولوں کے حملوں سے دلّی سلطنت کو محفوظ رکھا۔ بلبن کے عہد میں منگول پنجاب سے آگے نہیں بڑھ پائے۔

بلبن کا نظریہ بادشاہت

سلطان غیاث الدین بلبن دلّی کا پہلا حکمراں تھا جس نے حکمرانی کا ایک نیا نظریہ پیش کیا جس ے مورخین بلبن کا "نظریۂ بادشاہت" کہتے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ بادشاہت یا حکمرانی ایک ایسا منصب ہے جو خدا کی جانب سے کسی اہل فرد کو تفویض کیا جاتا ہے۔ اس کا نظریہ بادشاہت، ایران کے ساسانی بادشاہوں کے نظریے سے ملتا جلتا تھا۔ اس کے نظریہ حکمرانی کے بنیادی عناصر مندرجہ ذیل تھے:

- سلطانی زمین پر خدا کی نیابت ہے۔ سلطان روئے زمین پر خدا کا سایہ ہے (السلطان ظل اللہ فی الارض) اور اس کا دل خدائی ہدایات اور نور کا مخزن ہوتا ہے۔ سلطان کو اپنی ذمہ داریوں کی ادائیگی میں ہمیشہ خدا کی رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ سلطان کے اختیارات کا سرچشمہ صرف خدا کی ذات ہے۔ لہٰذا وہ صرف خدا کے سامنے جوابدہ ہے، عوام کے سامنے نہیں۔
- سلطانی کے لیے ظاہری وقار اور عظمت ضروری ہے۔ وہ اپنے پورے دور حکومت میں عام افراد سے بہت دور رہا۔ عام لوگوں سے گفتگو کرنا اس کے نظریہ سلطانی کے منافی تھا۔ اپنے پورے عہد حکومت میں اس نے عام لوگوں سے گفتگو نہیں کی تھی۔
- وہ درباری آداب اور مجلس کے رکھ رکھاؤ پر بہت زور دیتا تھا اور دربار میں اونچی آواز میں گفتگو کو ناقابل معافی جرم تصور کرتا تھا۔ اس کو کبھی بھی شاہی لباس کے بغیر نہیں دیکھا گیا۔
- برنی کے بقول بلبن نسلی برتری کا بھی قائل تھا۔ وہ اشراف (اعلیٰ نسل والے) اور اذلاف (نچلی ذات والے) کے درمیان امتیازی سلوک اپناتا تھا۔ ادنیٰ نسل کے لوگوں کو اعلیٰ عہدوں پر نہیں رکھتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ "اتفاقاً جب میں ادنیٰ نسل کے کسی فرد کو دیکھ لیتا ہوں تو میرے جسم کی تمام رگیں اور نسیں غصہ سے پھڑکنے لگتی ہیں اور میرا ہاتھ میری تلوار کو پہنچ جاتا ہے۔"
- غیاث الدین بلبن حسب و نسب پر بڑا زور دیتا تھا۔ اس نے اپنا سلسلہ نسب ایرانی بادشاہ افراسیاب سے جوڑا تھا اور بڑے فخر کے ساتھ اس کا ذکر دربار میں کرتا تھا۔ ایرانی درباری رسوم و رواج پر اس نے بہت زور دیا۔ اس نے سجدہ اور پائے بوس کی رسم جاری کی۔ اس نے اپنے پوتوں کے نام جو تخت نشینی کے بعد پیدا ہوئے تھے، ایرانی طرز پر کیقباد اور کیخسرو رکھے تھے۔

بلبن نے اپنے مذکورہ نظریہ حکمرانی کی بنیاد پر سلطان کے کھوئے ہوئے عزت و وقار کو بحال کیا۔ اس کا نظریۂ حکمرانی طاقت و قوت، عظمت و وقار اور عدل و انصاف پر مبنی تھا۔

سلطان غیاث الدین بلبن ایک مطلق العنان حکمران تھا، اس نے اپنی "مطلق العنانیت" کو اعتدال پر لانے کے لیے انصاف پر زور دینے کی کوشش کی۔ انصاف کے معاملے میں وہ اس قدر سخت تھا کہ وہ اپنے بھائی، بچے، دوست احباب اور ملازم کے ساتھ بھی کوئی رعایت

نہیں کرتا تھا۔ اس نے اپنی سلطنت کے تمام علاقوں میں جاسوس مقرر کیے تاکہ ریاست میں رونما ہونے والے حالات اور اس میں پیش آنے والے واقعات اور افسروں کے کاموں سے باخبر رہ سکے۔ بلبن نے مرکزی فوج کی تشکیل اور توسیع پر کافی توجہ دی۔ بہادر اور تجربہ کار ملکوں اور سرداروں کا تقرر سلطانی افواج میں کیا۔ انہیں اقطاع تفویض کیے۔ فوجوں کو کبھی بیکار نہیں رہنے دیا۔ شکار کے بہانے انہیں چاق وچوبند رکھتا تھا۔

بلبن نے بالائی گنگا کے میدانی علاقوں میں سختی کے ساتھ نظم ونسق قائم کیا اور وہ عناصر جو لاقانونیت کے ذمہ دار تھے انہیں سختی سے کچل دیا۔ بلبن نے سلطان بننے کے بعد کچھ امراء کے اقطاع ختم کردیے۔ بلبن کی توجہ کا مرکز ایک منظم فوج رہی، اس نے اپنے بیٹے بغرا خان کو ہدایت کی کہ فوج کے علاوہ آدھی آمدنی کو بچا کر رکھنا چاہئے تاکہ وقت ضرورت کام آسکے۔

غیاث الدین بلبن مملوک خاندان کا آخری باثر سلطان تھا۔ جس نے نہایت منظم اور باثر طریقے سے حکومت کی اور بالآخر 1287 میں اس کی وفات ہوگئی۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی مملوک خاندان کا زوال تیزی سے شروع ہوگیا۔ اس کا جانشین کیقباد اس لائق نہیں تھا کہ وہ زوال پذیر سلطنت میں جان ڈال سکے۔

12.12 کیقباد(1287-1290)

سلطان معزالدین کیقباد 1287ء میں تخت پر بیٹھا۔ اس وقت اس کی عمر سترہ یا اٹھارہ سال تھی۔ وہ ایک خوبصورت، شائستہ، حلیم اور بردبار نوجوان تھا۔ اس کی پرورش اس کے دادا (بلبن) کی سخت نگرانی میں ہوئی تھی۔ اس کے اتالیقوں نے اسے کبھی بھی شراب وشباب کی رنگ رلیاں منانے کی اجازت نہیں دی تھی۔ اسے عمدہ تعلیم و تربیت کے ساتھ تمام فنِ حرب وضرب سکھائے گئے تھے۔ وہ فنِ خطاطی، ادب، تیغ زنی، تیر اندازی، اور نیزہ بازی وغیر میں ماہر تھا۔ تختِ سلطانی پر بیٹھتے ہی اس کی زندگی کی جیسے کایا ہی پلٹ گئی۔ اس نے اپنے آپ کو عیاشیوں میں لگادیا اور شراب وکباب کی رنگ رلیوں میں مست رہنے لگا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی عیاشیوں کی خاطر کیلوکھڑی میں عظیم الشان محل بھی تعمیر کرایا تھا۔ اس کے دادا سلطان غیاث الدین بلبن کا دربار جو اپنے سخت نظم وضبط کا نمونہ اور سنجیدہ ماحول کے لیے مشہور تھا اب مسخروں، عیاشوں، رقاصاؤں اور سازندوں کا اڈہ بن گیا تھا۔

کیقباد نے حکومت کے تمام کام نظام الدین کے سپرد کردیے۔ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ "اگر ملک نظام الدین اور ملک قوام الدین نہ ہوتے تو ریاست ایک ہفتے سے زیادہ نہ چلتی" اس نے ان تمام ترک افسران کو قتل کرنا شروع کردیا جو اس کے رویے کے مخالف بنے۔ اس دوران نظام الدین کو بھی قتل کردیا گیا اور انتظامیہ بالکل ٹھپ ہوگئی۔ جلال الدین خلجی جو مختلف جنگی مہموں کا سربراہ تھا، اسے سلطنت کی مدد کے لیے بلایا گیا۔ اس نے صلاحیت اور تجربے سے فائدہ اٹھایا اور جلد ہی کیقباد سے نجات حاصل کرلی اور ایک نئے حکمران خاندان کی بنیاد ڈالی۔

12.13 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں آپ نے یہ پڑھا کہ 1206 سے 1290 عیسوی تک ہندوستان میں دہلی سلطنت پر جس خاندان کے افراد نے حکومت کی انہیں مورخین نے ''خاندانِ غلاماں'' یا ''مملوک سلاطین'' کے نام سے موسوم کیا ہے۔اس خاندان کا بانی شہاب الدین غوری کا سب سے بھروسے مند اور چہیتا غلام قطب الدین ایبک تھا۔ایبک معزالدین کی فوج کا سالار اور ہندوستان میں غوری مفتوحہ علاقوں کا منتظم تھا۔اس نے کئی اہم معرکوں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔1206ء میں شہاب الدین غوری کے انتقال کے بعد اس نے ہندوستانی مفتوحہ علاقوں میں اپنی حکومت کا اعلان کیا۔پہلے اس نے لاہور کو اپنا دارالحکومت بنایا اور پھر اپنی راجدھانی دہلی منتقل کردی۔1210ء میں چوگان کھیلتے ہوئے قطب الدین کا انتقال ہوگیا۔اس کی وفات کے بعد دہلی کے امراء نے انتہائی جلد بازی میں آرام شاہ کو تخت پر بٹھادیا۔آرام شاہ ایک نااہل حکمراں تھا جس کے عہد میں کئی علاقوں میں بغاوتیں ہوئیں۔ بالآخر قطب الدین ایبک کا داماد شمس الدین التتمش جو ایک ترک غلام تھا دہلی کے تخت پر بیٹھا۔ تخت نشین ہوتے ہی اس نے تمام باغیوں کی سرکوبی کی اور پنجاب ،بنگال اور سندھ کے باغیوں کو اپنا مطیع وفرمانبردار بنایا۔اس کے بعد اس نے رنتھمبور ،اجین، گوالیار، بندیل کھنڈ اور مالوہ کے علاقے فتح کیے۔اس نے دہلی سلطنت کو وسیع مضبوط اور مستحکم کیا۔اسی وجہ سے اسے دہلی سلطنت کا اصل بانی کہا جاتا ہے۔اس نے قطب الدین ایبک کے کئی منصوبوں کو پورا کیا۔قطب مینار کی تعمیر کی تکمیل ، قوت الاسلام مسجد کی توسیع ،حوضِ شمسی کی تعمیر کے ساتھ دہلی کو ایک مرکز کے طور پر فروغ دیا۔سلطان التتمش پڑھے لکھے افراد کا قدر دان اور صوفی سنتوں کا عقیدت مند تھا۔التتمش نے اپنی بیٹی رضیہ کو جو اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ قابل تھی اپنا جانشین نامزد کیا تھا لیکن دہلی کے علماء اور امراء کسی خاتون کی حکمرانی کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ التتمش کی وفات کے فوراً بعد امراء نے اس کے بیٹے رکن الدین فیروز کو تخت پر بٹھادیا۔فیروز کی نااہلی کی وجہ سے رضیہ تخت حاصل کرنے میں کامیاب رہی اور تقریباً چار سال کامیابی سے حکومت کی۔رضیہ کی ترک امراء کی طاقت توڑنے کی کوشش اس کے خاتمے کا سبب بنی۔رضیہ کے بعد معزالدین بہرام شاہ،علاؤالدین مسعود شاہ اور ناصرالدین محمود یکے بعد دیگرے سلطان بنے لیکن اصل سیاسی طاقت ،ترکان چہلگانی کے ہاتھوں میں رہی۔ مملوک خاندان کا آخری طاقتور حکمراں غیاث الدین بلبن تھا جو پہلے ناصر الدین محمود کا نائب تھا۔بعد میں ناصرالدین کے مرنے کے بعد اس نے حکومت سنبھالی۔ بلبن کے عہد میں بغاوتوں کو سختی سے کچل دیا گیا اور سلطنت کا وقار بحال ہوا۔ بلبن کے بعد اس کے پوتے کیقباد کے عہد میں اس کی عیاشیوں کی وجہ سے مملوک خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

12.14 کلیدی الفاظ (Keywords)

لکھ بخش	:	سخی،داتا،لاکھوں روپیے بخش دینے والا
چوگان	:	چوگان :اسے پولو کے نام سے بھی جانا جاتا ہے، جس میں گھڑ سواروں کی دو ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔
قوۃالاسلام	:	مہرولی(دہلی) میں اس مسجد کا نام جس میں قطب مینار واقع ہے۔
امیر آخور	:	شاہی اصطبل کا سردار

سر جاندار	:	شاہی حفاظتی دستے کا سالار اعلیٰ
امیر شکار	:	شکار پر جانے والی فوج اور عملے کا سربراہ
اقطاع	:	زمین کا وہ ٹکڑا جو کسی عہدیدار کو اس کی خدمات کے عوض دیا جاتا تھا اور یہ قابل منتقلی ہوتا تھا۔
امرائے چہلگانی	:	لفظی طور پر چالیس امیروں کا گروہ، ترک امراء کی وہ جماعت جو التتمش نے تیار کی تھی۔
دیوانِ عرض	:	دفاع کے محکمے کا افسر اعلیٰ
سجدہ	:	بادشاہ یا سلطان کو عزت اور تعظیم کے لیے سر جھکانا۔
پابوس	:	بادشاہ یا سلطان کو عزت اور تعظیم کے لیے اس کے قدم چومنا۔

12.15 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

12.15.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. قطب الدین ایبک کہاں کا رہنے والا تھا؟
2. ایبک کو "امیر آخور" کے عہدے پر کس نے فائز کیا تھا؟
3. دلی کے کس سلطان کو لکھ بخش کا خطاب دیا گیا تھا؟
4. اڑھائی دن کا جھونپڑا نامی مسجد کہاں پر واقع ہے؟
5. قطب الدین کی وفات کیسے ہوئی تھی؟
6. ایبک کے بعد دلی کا سلطان کسے بنایا گیا تھا؟
7. سلطان شمس الدین التتمش کے ترک امیروں کے گروہ کا نام کیا تھا؟
8. شاہ ترکان کون تھی؟
9. دلی سلطنت کی پہلی مسلم خاتون سلطان کون تھی؟
10. ناصر الدین محمود کے عہد میں بلبن کو کیا خطاب عطا کیا گیا تھا؟

12.15.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. شمس الدین التتمش کو دلی سلطنت کا اصل بانی کیوں کہا جاتا ہے۔؟
2. رضیہ سلطان کو اپنی تخت نشینی کے لیے کن مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا؟ بیان کیجیے۔
3. قطب الدین ایبک کے حالاتِ زندگی پر ایک مختصر نوٹ تحریر کیجیے۔
4. دوآب میں امن وامان قائم کرنے کے لیے غیاث الدین بلبن نے کیا اقدامات کیے تھے؟

5. التتمش نے اپنے مخالفین پر کیسے قابو حاصل کیا تھا؟ وضاحت کریں

12.15.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت کے استحکام اور توسیع میں شمس الدین التتمش نے کیا کردار ادا کیا تھا؟ بیان کیجیے۔
2. مملوک سلاطین کی تعمیری اور تہذیبی سرگرمیوں کا جائزہ پیش کریں۔
3. سلطان غیاث الدین بلبن کے نظریہ حکمرانی (بادشاہت) پر روشنی ڈالیے۔

12.16 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Mahajan V.D. *History of Medieval India* S. Chand Group. Bombay. 2001.
2. Mehta J.L., *Advanced study in the History of Medieval India*. Sterling Publishers Pvt. Ltd. New Delhi,2004.
3. Qureshi I.H., *Administration of the Sultanare of Delhi*, Munshiram Manoharlal Publishers, Bombay, 1995.
4. Chandra Satish, *Medieval India*, Vol. I&ll, Orient Longman Limited Hyderabad.2000
5. Habib Irfan, *Medieval India. The Study of a Civilization*, National Book Trust, Delhi, 2008.
6. Mujib Muhammad, *Indian Muslims*. London, 1967.
7. Nizami K.A., *Some Aspects of Religion and Politics in India 13th ccntury*. Bombay, 1961

8. محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی، جامع تاریخ ہند، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۱ء
9. ستیش چندرا، عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان (سلطنت سے مغل عہد تک) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۱ء

اکائی 13۔ خلجی حکمران

(Khalji Dynasty)

اکائی کے اجزا

13.0 تمہید
13.1 مقاصد
13.2 خلجی حکومت کا قیام
13.2.1 جلال الدین فیروز خلجی
13.2.2 جلال الدین فیروز خلجی کی فوجی مہمات اور کارنامے
13.2.3 ملک چھجو کی بغاوت کا خاتمہ
13.2.4 منگول حملے کا انسداد
13.2.5 رنتھمبور کے خلاف کاروائی
13.3 علاء الدین خلجی
13.4 توسیعِ سلطنت
13.4.1 شمالی ہند کا استحکام
13.4.2 جنوبی ہند کی جانب پیش قدمی
13.5 نظم و نسق
13.6 علاء الدین خلجی کی معاشی اصلاحات
13.6.1 مالگزاری نظام کی تشکیل
13.6.2 علاء الدین کی مارکیٹ کنٹرول پالیسی
13.6.3 مارکیٹ کنٹرول پالیسی کے مقاصد
13.7 سلطان قطب الدین مبارک خلجی
13.8 اکتسابی نتائج

13.9 کلیدی الفاظ

13.10 نمونہ امتحانی سوالات

13.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

13.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

13.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

13.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

13.0 تمہید (Introduction)

1286ء میں سلطان غیاث الدین بلبن کی وفات کے بعد کچھ عرصہ تک دہلی سلطنت انتشار کا شکار رہی۔ درباری سازشوں کی وجہ سے غیاث الدین بلبن کا بیٹا بغرا خان اور اس کے کم عمر اور ناتجربہ کار پوتے کیقباد، کیخسرو اور کیومرس اقتدار کو زیادہ دنوں تک سنبھال نہیں سکے اور بالآخر دہلی سلطنت کی باگ ڈور ایک ایسے خاندان کے ہاتھوں میں آئی جو تاریخ میں خلجی خاندان کے نام سے مشہور ہے۔ خلجی خاندان کے کئی افراد مملوک عہد میں نمایاں خدمات انجام دے چکے تھے۔اس کے باوجود کافی عرصہ سے وہ مرکزی حکومت سے باہر رہے۔ مملوک خاندان کے کمزور ہوتے ہی انہیں اقتدار پر قابض ہونے کا موقعہ ملا۔اس خاندان نے 1290ء سے 1320ء تک حکومت کی۔ خلجی حکمران غالباً ترک نژاد تھے لیکن کردار کے اعتبار سے افغانی بن چکے تھے۔ بعض مؤرخین انہیں ترکی قرار دیتے ہیں لیکن اس عہد کے ایک ہمعصر مستند مورخ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ خلجی سلاطین ترک حکمرانوں سے مختلف تھے۔ وہ لکھتا ہے کہ کیقباد کی وفات کے ساتھ ہندوستان میں ترکوں کی حکمرانی اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

13.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- خلجی سلطنت کے آغاز وارتقا کے بارے میں جان سکیں گے۔
- جلال الدین خلجی کے کارناموں کا جائزہ لے سکیں گے۔
- علاء الدین خلجی کی سیاسی فتوحات سے واقف ہو سکیں گے۔
- علاء الدین خلجی کی مالگزاری و معاشی اصلاحات بیان کر سکیں گے۔
- علاء الدین خلجی کے نظم ونسق کے بارے میں روشنی ڈال سکیں گے۔
- خلجی سلطنت کے زوال کے اسباب کی وضاحت کر سکیں گے۔

13.2 خلجی حکومت کا قیام

13.2.1 جلال الدین فیروز خلجی(1296 -1290)

جلال الدین فیروز خلجی کو دہلی سلطنت کی تاریخ میں خلجی خاندان کا بانی سلطان کہا جاتا ہے۔اس کا تعلق ایک ترک خلجی قبیلے سے تھا جس نے ترکستان سے ہجرت کر کے افغانستان میں تقریباً دوسو سالوں تک سکونت اختیار کی۔اسی وجہ سے دہلی کے ترک امراءانہیں ترکی نہیں بلکہ افغان تصور کرتے تھے۔ سلطان بننے سے پہلے وہ اور اس کا بھائی شہاب الدین خلجی مملوک عہد حکومت میں سلطان بلبن کے دربار میں اہم عہدوں پر فائز تھے۔ جلال الدین فیروز خلجی ''سرِ جاندار'' کے عہدے سے ترقی کر کے سامانہ کا صوبیدار بنا۔ سمانہ کے گورنر کی حیثیت سے اس نے انتہائی اہم خدمات انجام دیں۔اس نے منگولوں کے زبردست حملوں کا منہ توڑ جواب دیا اور انہیں پسپا ہونے پر مجبور کیا۔ سلطان بلبن کی وفات کے بعد درباری سازشی اور دہلی کے کوتوال ملک الامراء فخر الدین نے بلبن کے پوتے کیقباد کو ''معزالدین'' کے لقب سے دہلی کے تخت پر بٹھا دیا۔ کیقباد وجیہہ شخصیت کا مالک مگر ایک کمزور حکمراں تھا۔وہ شراب و شباب اور لہو و لعب کا دلدادہ تھا۔اس درمیان انتظام حکومت فخر الدین کے بھتیجے اور داماد نظام الدین کے ہاتھوں میں آگیا۔ نظام الدین کو جب اس کے کسی درباری دشمن نے زہر دے کر مروادیا تو کیقباد نے جلال الدین فیروز خلجی کو سمانہ سے دہلی طلب کیا اور شائستہ خان کا خطاب دے کر ''عارض ممالک'' کے عہدے پر فائز کیا اور برن کا صوبے دار مقرر کیا۔

سلطان معزالدین کیقباد کی حکومت میں جلال الدین خلجی ایک بااثر عہدے دار تھا۔ کیقباد اپنی بے انتہا شراب نوشی کے باعث جسمانی اور دماغی لحاظ سے مفلوج ہو کر نا قابلِ علاج ہو گیا تو ملک کچھن اور ملک سرخہ نے اس کے کم سن بیٹے کیومرس کو شمس الدین دوم کا خطاب دے کر تخت پر بٹھا دیا۔اس کے بعد ترکی ملکوں نے جس میں ملک کچھن اور سرخہ سرِ فہرست تھے فیروز خلجی اور اس کے گروہ کے خاتمے کا منصوبہ بنایا۔انہوں نے فیروز خلجی اور اس کے حامیوں کو سازش کے ذریعہ قتل کرنے کی ایک فہرست تیار کی جس میں فیروز خلجی کا نام سب سے اوپر تھا۔ فیروز خلجی کے بھتیجے ملک احمد چپ کو جو ''نائب امیرِ حاجب'' کے عہدے پر فائز تھا اس سازش کا علم ہو گیا۔اس نے فیروز کو اس سازش سے باخبر کر دیا۔اس نے فوراً اپنا کیمپ دہلی سے غیاث پور منتقل کر دیا اور اپنے تمام رشتے داروں کو منگولوں کے متوقعہ حملے کا خطرہ بتا کر برن (موجودہ بلند شہر) سے بلا لیا۔اس کے علاوہ کئی ترک افسران جو اس سازش کا شکار بننے والے تھے، وہ انتقام کی غرض سے خلجیوں سے جا ملے۔ ترک افسران کی سازش ناکام ہوئی اور مقابلے میں ملک کچھن مارا گیا۔ فیروز کے لڑکے محل میں داخل ہوئے اور نو عمر سلطان کیومرس کو پکڑ کر اپنے کیمپ میں لے آئے۔ کچھ ترک افسران جن میں ملک سرخہ بھی شامل تھا کمسن سلطان کو چھڑانے کے لیے ان کے پیچھے گئے۔ان کو پکڑ کر قتل کر دیا گیا۔ کیقباد کیلو کھڑی میں واقع اپنے محل کے ایک کمرے میں کسمپرسی کی زندگی گزار رہا تھا۔ فیروز نے ایک ملک کو جس کے باپ کو کیقباد نے مار ڈالا تھا، کیقباد کو قتل کرنے کے لیے بھیجا۔اس نے کیقباد کے مفلوج جسم کو ایک چادر میں لپیٹ کر جمنا میں پھینک دیا اور اسی کے ساتھ سلطان قطب الدین ایبک کے عہد سے قائم البری ترک حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ جون 1990ء میں کیلو گڑھی کے محل میں شائستہ خان عرف جلال الدین فیروز خلجی نے دہلی سلطنت کا اقتدار سنبھالا اور خلجی خاندان کا پہلا سلطان بنا۔

13.2.2 جلال الدین فیروز خلجی کی فوجی مہمات اور کارنامے

سلطان معزالدین کیقباد کے قتل کے بعد جب فیروز خلجی کو تخت سلطنت کے لیے منتخب کیا گیا تو اس وقت اس کی عمر 70 سال تھی۔ وہ علم و حکمت کا شیدائی رحم دل اور ایک نرم خو حکمران تھا۔ اس کی نرم خوئی، رحم دلی اور نظم و نسق کی ڈھیل نے فسادی عناصر کو سر اٹھانے کا موقعہ فراہم کیا۔ اس کے مخالفین نے شر پسندوں کی حوصلہ افزائی کی، چنانچہ کئی علاقوں میں بد نظمی اور بغاوت کی راہ ہموار ہوئی۔ جہاں ایک طرف دہلی کی عوام جلال الدین خلجی کو امن پسند، مہربان اور ہمدرد دل رکھنے والا انسان تصور کرتی تھی تو دوسری طرف کچھ امراء نے اس کی نرم دلی کو اس کی کمزوری خیال کیا اور اس کے خلاف بغاوت کر دی۔

13.2.3 ملک چھجو کی بغاوت اور اس کا خاتمہ

اگست 1290ء میں سلطان غیاث الدین بلبن کے بھتیجے ملک چھجو کشلی خان نے جو مملوک سلاطین کے خاندان کا ایک سردار تھا جلال الدین فیروز خلجی کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ وہ سلطنت کے مشرقی علاقوں کڑا مانک پور کو ریاستی کنٹرول سے الگ تھلگ رکھنا چاہتا تھا۔ اسے امید تھی کہ اس بغاوت میں وہ کیقباد کے باپ اور اپنے چچیرے بھائی بغرا خان کا جو 1287ء سے ہی مشرقی بنگال کے علاقوں کا خود مختار حکمران تھا اس کا تعاون حاصل کر لے گا۔ ملک چھجو نے سلطان مغیث الدین کا لقب اختیار کرتے ہوئے اپنی خود مختاری کا اعلان کیا۔ اس نے اپنے نام کا خطبہ پڑھوایا اور اپنے نام کے سکے بھی جاری کیے۔ اودھ کے صوبیدار علی حاتم خان اور مشرقی اضلاع میں تعینات دیگر امراء نے بھی اس کی حمایت کی۔ دوآب کے کچھ ہندو سرداروں نے بھی جو کچھ عرصے سے محصول نہیں دے رہے تھے ملک چھجو کی حمایت کی۔ اسے یہ یقین ہو چلا کہ وہ جلد ہی جلال الدین سے زیادہ مقبولیت حاصل کر لے گا۔ چنانچہ اس نے دہلی اور اس کے گرد و نواح کے قدیم امراء کا تعاون حاصل کرنے کے لیے دہلی کا رخ کیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ امروہہ کے راستے دہلی میں داخل ہو گا۔ اس بغاوت کی اطلاع ملتے ہی جلال الدین نے اپنے سب سے بڑے لڑکے خانِ خاناں کو دہلی کا انچارج بنایا اور باغیوں کی سرکوبی کے لیے کول (علی گڑھ) کے راستے بدایوں کی طرف روانہ ہوا۔ اپنے دوسرے بڑے بیٹے ارکلی خان کی مدد سے اس نے ملک چھجو کی فوج کو رام گنگا ندی کے ساحل پر روک دیا اور خود بھوجپور (فرخ آباد) کے قریب دریائے گنگا عبور کر کے ملک چھجو کے حامیوں کو شکست دی۔ بعد از آں ارکلی خان اور سلطان کی مشترکہ افواج نے ملک چھجو کے تمام حامیوں کو شکست دی۔ ملک چھجو گرفتار ہوا۔ روہیل کے سردار نے اطاعت قبول کی اور بھاری خراج ادا کیا۔ کھسن کا علاقہ تاراج کر دیا گیا۔ کچھ باغیوں کو پھانسی دے دی گئی اور کچھ کو غلاموں کی حیثیت سے فروخت کر دیا گیا۔ اس طرح چھجو کی بغاوت کو بری طرح کچل دیا گیا۔

13.2.4 منگول حملے کا انسداد

ملک چھجو کی بغاوت کو فرو کرنے کے کچھ ہی دنوں بعد دہلی سلطنت کی شمال مغربی سرحدوں پر منگول آدھمکے۔ دیپال پور، ملتان اور سنام کی سرحد پر جہاں ارکلی خان کا حال ہی میں تقرر ہوا تھا ہلاکو خان کے پوتے عبد اللہ کی قیادت میں منگولوں نے حملہ کر دیا۔ سلطان جلال الدین خلجی بذاتِ خود اپنی فوج کے ساتھ روانہ ہوا۔ ''بار رام'' کے مقام پر دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ معمولی لڑائی میں ہی دہلی کی فوج کا پلڑا

بھاری رہا۔ منگول بنالڑے واپس ہونے پر راضی ہوگئے۔اس طرح فیروز خلجی نے 1292ء میں منگولوں کے ایک زبردست حملے کے خلاف اپنی مملکت کا کامیاب دفاع کیا۔اس کے کچھ ہی وقت کے بعد ہلاکو خان کے ایک پوتے الغو خان کی قیادت میں کم وبیش 3000 منگولوں نے خودسپردگی کے بعد اسلام قبول کرلیا اور انہیں ''نو مسلم'' کہا جانے لگا۔منگولوں کو ان کی شدید قتل وغارت گری اور تباہی اور بربادی پھیلانے کی وجہ سے دہلی میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا،اس کے باوجود ان کی معافی طلبی کو سلطان نے قبول کیا اور ان کی خواہش پر انہیں ہندوستان میں آباد ہونے کی اجازت دے دی۔ضیاءالدین برنی کے مطابق ''انہیں مکان،وظائف اور سماجی مراتب عطا کیے گئے۔''

13.2.5 رنتھمبور کے خلاف کاروائی

اسی سال سلطان جلال الدین خلجی نے راجپوتانہ کے چوہانوں کے خلاف ایک مہم شروع کی جن کی قیادت رنتھمبور کا رانا ہمیر دیو یا رائے ہمیرا کر رہا تھا۔ وہ آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر کے اپنی طاقت بڑھانا چاہتا تھا۔اس نے دہلی کے اہم سرحدی علاقے ہریانہ پر اپنا دباؤ بڑھانے کی کوشش کی۔چوہانوں کی روک تھام ضروری ہوگئی۔ چنانچہ ریواڑی اور نارنول کے راستہ سلطانی افواج الور میں داخل ہوئیں اور ''منڈاور'' کا محاصرہ کر لیا۔منڈاور شمال میں چوہانوں کی آخری چوکی تھی۔یہاں کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی۔دیہاتی علاقوں سے کافی مالِ غنیمت اور مویشی ہاتھ لگے۔دو ہفتے کے اندر اندر سلطانی افواج چوہانوں کی راجدھانی تک جانے والے راستے کے اہم مقام ''جھابن'' تک پہونچ گئیں۔راجپوتوں نے قلعے کے باہر دوبدو مقابلہ کیا جس میں ان کا سالار مشہور جنگجو گردن سائنی مارا گیا اور نتیجتاً راجپوت ہراساں ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔کنواری،چمبل اور بنارس کے دریاؤں تک ان کا پیچھا کیا گیا۔جھابن کے سردار نے قلعہ خالی کردیا اور رنتھمبور چلا گیا۔

جھابن کے قلعے پر قبضہ کرنے کے بعد سلطان نے رنتھمبور پر چڑھائی کا منصوبہ بنایا۔لیکن رنتھمبور کا قلعہ ڈھلوان پہاڑی پر واقع ہونے کی وجہ سے ناقابل تسخیر ثابت ہوا اور یہ مہم کھنچنے لگی۔ادھر راجدھانی میں سازش کی اطلاع مل رہی تھی چنانچہ قلعہ فتح کیے بنا ہی واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا گیا۔رنتھمبور کی مہم کے دوران تاج الدین کوچی کے ذریعے سلطان کے قتل کے منصوبے کا راز فاش ہوا جس پر جلال الدین نے بڑی خوش اسلوبی قابو پالیا۔اس کے علاوہ وہ دہلی پہنچ کر سیدی مولا کی بغاوت کو بھی ناکام بنانے میں کامیاب ہوا۔

جلال الدین خلجی کے دور کا اہم ترین واقعہ دکن کی جانب مہم جوئی اور حملہ تھا جس کی قیادت سلطان کے بھتیجے اور داماد علی گرشاسپ نے کی تھی جو بعد میں علاءالدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا۔جلال الدین خلجی اپنے بھتیجے علی پر بہت ہی مہربان تھا اور اس پر بہت زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔اس نے علی کو کڑا کا صوبیدار مقرر کیا اور اسے مالوہ کی جانب پیش قدمی کرنے کی اجازت بھی دی۔بہر حال علی نے اپنی کاروائی کو سلطانی دربار سے مخفی رکھا اور جنوب کی سمت آگے بڑھتا رہا۔اپنے چچا کے ساتھ جھگڑے اور ایک جنوبی راجا کے تعاون کی خواہش کی افواہ پھیلا کر اُس نے اپنی تمام مخالفتوں کو پیچھے چھوڑ دیا۔اُس نے فوج کے ساتھ برار اور خاندیش سے گزرتے ہوئے اچانک یادو ریاست کی راجدھانی دیوگیری پر حملہ کردیا اور اس کے راجا رام چندر کو ایلچ پور (Ellichpur) سے دست برداری پر مجبور کیا۔اس کے بعد وہ 1294ء میں سونے اور جواہرات کی شکل میں کثیر مال غنیمت کے ساتھ کڑا (موجودہ الہ آباد کا گردونواح) لوٹ گیا۔

علی کا دکن پر اچانک حملہ اور مالِ غنیمت میں سلطان کو حصہ نہ دینا اس کے باغیانہ عزائم کو پہچاننے کے لیے کافی تھا، لیکن جلال الدین نے اپنے بھتیجے سے بے لوث اخلاص و محبت کی وجہ سے اس کے عزائم پر شبہ نہیں کیا۔ اس نے مال غنیمت میں اپنی حصے داری کا حق حاصل کرنے کی امید سے کڑا کا سفر کیا۔ اپنی فوج کے بیشتر حصے کو پیچھے چھوڑ کر صرف چند معاونین کے ہمراہ اُس نے دریائے گنگا پار کیا۔ اس طرح خالی ہاتھ جانے کا مقصد صرف یہ تھا کہ علاء الدین، سلطان کی جانب سے کوئی خدشہ محسوس نہ کرے اور فرار نہ ہو جائے، لیکن ہوا اس کے بالکل برعکس۔ 1296ء میں علی نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے چچا کو قتل کر کے سلطنت پر قبضہ کر لیا۔

13.3 علاء الدین خلجی (1296-1316ء)

علی گرشاسپ جو بعد میں علاء الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا سلطان جلال الدین کا بھتیجا اور اس کا داماد تھا۔ اس کے والد کا نام شہاب الدین تھا۔ تخت سلطنت پر قابض ہوتے ہی علاء الدین نے مرحوم سلطان کے تمام رشتے داروں اور حمایتیوں کو مار ڈالا اور ہر اُس شخص کو موت کے گھاٹ اتار دیا جو اس کے لیے خطرناک ثابت ہو سکتا تھا۔ اس نے چند طلائی (سونے کے) ٹکڑوں کی رشوت دے کر عوام کی ناراضگی کو بھی ختم کر دیا۔ تحفے تحائف اور دولت کی تقسیم کے ذریعے اس نے فوجیوں کا بھی دل جیت لیا۔ حالانکہ یہ بھی صحیح ہے کہ علاء الدین خلجی ایک لائق سپاہی اور طاقتور حکمراں تھا۔ اس نے دہلی سلطنت کی سرحدوں کو کافی حد تک وسیع کیا۔ منگولوں کی مداخلت کا سدباب کیا۔ سلطان کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں کئی سازشیں اور بغاوتیں ہوئیں۔ اولاً تو اسے خود اپنے سپاہیوں کی بغاوت کو کچلنا تھا۔ گجرات کی فتح کے بعد جو مالِ غنیمت اور لوٹ کا سامان اس کے قبضے میں آیا تھا اس کی مروجہ شرعی تقسیم کو وہ بدل ڈالنا چاہتا تھا جس کے سبب اس کے سپاہی دولت کے ایک بڑے حصے سے محروم ہو رہے تھے اور یہی ان بغاوت کا اصل سبب تھا۔ مال غنیمت کی تقسیم کا مروج طریقہ یہ تھا کہ اس کا صرف پانچواں حصہ مملکت یا ریاست کی ملکیت ہوتا اور بقیہ تمام فوجیوں میں تقسیم ہو جاتا۔ علاء الدین نے اسے یکسر بدل ڈالا اور ریاست کا حصہ 5/4 کر دیا جبکہ فوجیوں کے لیے صرف پانچواں حصہ اس نے طے کیا۔

اپنی حکومت کے ابتدائی ایام میں فوجیوں کی بغاوت کے علاوہ اسے خود اپنے بھتیجوں کی سازشوں اور منظم شورشوں سے نمٹنا پڑا۔ ایک سازش کا سرغنہ اس کا بھتیجا اکت خان تھا۔ اکت خان نے علاء الدین خلجی پر قاتلانہ حملہ کیا جس میں سلطان شدید زخمی ہو گیا۔ سلطان کو قریب المرگ سمجھ کر اکت خان نے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا اور طبقۂ اشراف سے عقیدت و احترام کا طالب ہوا لیکن جلد ہی علاء الدین کی صحت بحال ہوئی اور وہ فوج کے سامنے نمودار ہوا۔ فوج نے اس کے ساتھ وفاداری کا حلف لیا اور بالآخر اکت خان کو ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے دو بھتیجوں نے بھی علمِ بغاوت بلند کیا لیکن انہیں بھی موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ علاء الدین کو ایک غلام حاجی مولا کی بغاوت کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اس نے التتمش کے ایک پوتے کو تخت نشین کیا۔ جیل کے دروازے کھول ڈالے اور کئی دنوں تک اودھم مچاتا رہا لیکن اس کی بغاوت بھی کچل دی گئی اور حاجی مولا سمیت اس کے آقا کا پورا خاندان موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ سابق حکمرانوں کی طرح علاء الدین کو بھی منگولوں کے حملوں کا سامنا کرنا پڑا۔ 1297ء سے 1307ء کے عرصے میں کم و بیش پانچ چھ بار منگولوں نے دہلی سلطنت پر حملے کیے۔ بعض حملے تو انتہائی شدید تھے۔

علاء الدین کے کمانڈار ظفر خان نے منگولوں کے خلاف جرأت مندانہ کاروائیاں کیں۔ تاہم منگولوں نے دہلی کے گردونواح میں متعدد بار لوٹ مار کی لیکن شہر دہلی ان کے قابو میں آنے سے بچ گیا۔ اس صورت حال نے علاء الدین کو موئثر اقدامات کرنے پر متوجہ کیا۔ اس نے دہلی کی قلعہ بندی میں کئی اہم فصیلوں کا اضافہ کیا۔ سرحدی علاقوں پر محافظ دستے مقرر کیے۔ اپنی فوج کی تعداد میں اضافہ کیا اور انہیں مزید فعال اور سریع الحرکت بنایا۔ ان موثر اقدامات کے بعد جب منگولوں نے دوبارہ چھاپہ مار کاروائیاں شروع کیں تو ان کا منہ توڑ جواب دیا گیا۔ اس طرح علاء الدین خلجی کے باقی ماندہ دورِ حکومت میں ہندوستان کو منگولوں سے نجات حاصل ہوئی۔

13.4 توسیعِ سلطنت

13.4.1 شمالی ہند کا استحکام

سلطان علاء الدین خلجی ایک جنگجو اور جاہ طلب حکمران تھا۔ اس کے عہد میں ہی دہلی سلطنت کی توسیع پسندانہ کاروائیوں کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے اُس نے شمالی ہند پر اپنا مضبوط تسلط قائم کیا اور پھر جنوب کی طرف فاتحانہ پیش قدمی کی۔ اس کا اہم ترین کارنامہ یہ ہے کہ اس نے پورے ہندوستان کو اپنے قبضہ میں کرنے کی کوشش کی تھی۔ اس کی پہلی فوجی مہم گجرات کے خلاف تھی جس پر کرن دیو نامی ایک بگھیل راجپوت فرمانروائی کر رہا تھا۔ 1297ء میں علاء الدین نے اپنے بھائی الغ خان کی ماتحتی میں ایک لشکر روانہ کیا جس نے گجرات کو فتح کر کے راجا کی بیوی کملادیوی کو گرفتار کر لیا۔ بعد ازاں یہ خاتون بادشاہ کی معزز شریکِ حیات بنی۔ علاء الدین کو اسی مہم میں ایک غلام ملک کافور حاصل ہوا جو بعد میں اس کی فوج کا ایک عظیم سپہ سالار بنا۔

گجرات کی مہم سے فارغ ہونے کے بعد علاء الدین خلجی کو رنتھمبور کے مضبوط قلعے پر حملہ کرنے کا جواز مل گیا اور اس نے اپنی فوج اور اسلحہ خانے کا رخ رنتھمبور کی راجپوت ریاست کی طرف موڑ دیا۔ بہانہ صرف یہ تھا کہ اس قلعے کے حکمران ہمیر دیو نے دلی سلطنت کے کچھ باغیوں اور حکومت کے مخالف نو مسلموں کو پناہ دے رکھی ہے۔ 1299ء کے اس حملے میں قلعے والوں نے سلطانی فوج کا زبردست مقابلہ کیا اور قلعہ کا کامیاب دفاع کیا۔ سلطان کے بہادر سپاہیوں کو پسپا ہونا پڑا۔ اس صورت حال کے پیش نظر علاء الدین خود ایک زبردست فوج لے کر میدان میں آیا۔ اس نے براہِ راست خود قلعہ پر لشکر کشی کی اور 1301ء میں ایک سال کے طویل محاصرہ کے بعد رنتھمبور کے اس ناقبلِ تسخیر قلعہ کو بالآخر فتح کر لیا۔

اس کے بعد سلطان نے میواڑ کے راجدھانی چتوڑ پر چڑھائی کی۔ چتوڑ پر حملے کی وجوہات کی تفصیل کسی ہمعصر مورخ کے ذریعے نہیں ملتی، البتہ 1540ء میں ملک محمد جائسی کے ذریعے لکھے گئے من گھڑت افسانے ''پدماوت'' میں علاء الدین کو رانا رتن سنگھ کی رانی پدمنی کے عشق میں گرفتار دکھایا گیا اور یہ کہ وہ بہر صورت اُسے اپنے حرم میں لانا چاہتا تھا۔ لیکن علاء الدین کے قبضے میں آنے سے پہلے ہی دیگر راجپوت خواتین کے ساتھ پدمنی رسمِ جوہر ادا کرتے ہوئے آگ میں جل گئی۔ یہ افسانہ مکمل طور پر فرضی معلوم ہوتا ہے کیوں کہ اس کا ذکر کسی بھی ہم عصر مورخ نے نہیں کیا۔ بہر حال اس موقع پر گورا اور بادل نامی دو راجپوت قائدین نے چتوڑ کا بڑی جرأت مندی سے دفاع کیا لیکن ان کی

مزاحمت ناکام رہی۔ 1303ء میں چتوڑ کو فتح کرنے کے بعد مالوہ کی تسخیر عمل میں آئی اور اُجین، مانڈو، اور چندیری کے شہر بھی علاءالدین نے معمولی مزاحمت کے بعد فتح کرلیے۔ اس طرح 1305ء کے اختتام تک علاءالدین خلجی عملاً پورے شمالی ہند کا حکمراں بن گیا تھا۔

13.4.2 جنوبی ہند کی جانب پیش قدمی

شمالی ہند فتح کرنے کے بعد اس نے جنوب کی طرف پیش قدمی کی۔ تخت و تاج کا اصل مالک بننے سے قبل ہی، علاءالدین دیوگیر پر چھاپہ مار چکا تھا جس میں اسے کافی دولت ہاتھ آئی تھی۔ دیوگیر کے رام چندر دیو نے گجرات کے کرن دیو کو پناہ دے رکھی تھی اور وہ تین برسوں سے باج گزاری کی وعدہ کردہ رقم کی ادائیگی کے سلسلے میں شدید کوتاہی کا مظاہرہ کررہا تھا۔ چنانچہ علاءالدین کو اس پر حملہ کرنے کا بہانہ اور جواز مل گیا۔ اس نے 1307ء میں ملک کافور کی زیر قیادت ایک فوج روانہ کی۔ ملک کافور نے راجا کی سرحدوں میں بے تحاشا تباہی مچائی اور اُسے شکست تسلیم کرنے پر مجبور کیا۔ بالآخر رام چندر دیو سلطان کا تابع اور فرمانبردار بن گیا اور سلطان کو وقت پر خراج ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ دیوگیر کو تابع اور مسخر کرلینے کے بعد ملک کافور کو وارنگل کے کاکتیہ حکمراں پرتاپ رودر دیو کے خلاف روانہ کیا گیا۔ معمولی مزاحمت کے بعد رودر دیو، سلطان کا باج گزار بننے پر راضی ہوگیا۔ ملک کافور کثیر مال و دولت لے کر جس میں ہاتھی اور گھوڑوں کے علاوہ ہیرے موتی اور زر و جواہرات بھی شامل تھے، دوبارہ دہلی روانہ ہوا۔

علاءالدین خلجی کے حکم پر ملک کافور 1310ء میں ایک اور اہم مہم پر روانہ ہوا۔ یہ مہم دوار سمدر کے ہوئے سال حکمراں راجا ویر بلاّل کے خلاف تھی۔ کافور کے اچانک حملے نے اُسے بلا مزاحمت ہی دہلی سلطنت کی اطاعت قبول کرنے پر مجبور کردیا۔ بعد ازاں ملک کافور دوار سمدر سے کورومنڈل ساحل کی جانب بڑھا۔ اس وقت یہاں پانڈیا راجاؤں کی حکمرانی تھی۔ شاہی خاندان میں تخت کی جنگ کے دوران ایک فریق نے ملک کافور سے مدد طلب کی۔ چنانچہ 1311ء میں کافور مدد کے لیے مدورائی پہنچا اور اس مدد کے عوض میں کافی خزانہ حاصل کرکے دہلی کو واپس ہوا لیکن پھر 1312ء میں رام چندر دیو کے بیٹے شنکر دیو کی سرکوبی کے لیے اسے دیوگیری جانا پڑا۔ شنکر دیو نے اپنے باپ کی طے شدہ خراج کی رقم روک رکھی تھی۔ بالآخر شنکر دیو کو شکست ہوئی اور وہ مارا گیا۔ دکن کی جانب یہ کافور کی آخری مہم تھی اور اس کے ساتھ ہی پہلی بار جنوبی ہند کی طاقتوں نے دہلی کے سلطان کی عظمت اور برتری کا احساس کیا اور اطاعت قبول کی۔

شمالی ہند کے برخلاف، جنوبی ہند کی سرحدوں کو علاءالدین نے اپنی سلطنت میں ضم نہیں کیا بلکہ وہاں کے راجاؤں کو اس بات کا موقع دیا گیا کہ وہ اپنے علاقوں پر حکومت کرتے رہیں اور سلطان کے اقتدار کو تسلیم کرتے ہوئے اُسے سالانہ خراج ادا کرتے رہیں۔ یہ بڑی حد تک ایک دانش مندانہ فیصلہ تھا کیونکہ اُس دور میں جنوب کے دور دراز علاقوں پر کنٹرول قائم رکھنا اور نظم و ضبط کو بحال رکھنا قطعاً آسان نہیں تھا۔ اگر جنوبی ہند کے حکمرانوں کو تابع دار نہ رکھا جاتا تو بے چینی اور بے اطمینانی بلکہ ناراضگی کے متعدد مراکز جنم لے لیتے۔

13.5 نظم و نسق

سلطان علاءالدین خلجی نے ایک شورش زدہ سلطنت پر قبضہ کیا تھا۔ اس نے اپنے چچا کو قتل کرکے تخت و تاج حاصل کیا تھا۔ یہ بات

گزر چکی ہے کہ ابتدائی سالوں میں اس کو بھی کئی سازشوں اور بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔احوال واسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ دہلی سلطنت میں بد نظمی کے چند بنیادی اسباب ہیں۔

- مرکز کی جانب سے جاسوسی کا ناقص نظام۔
- طبقۂ اشراف کا بکثرت شراب کی لت میں پڑ جانا۔
- امراء کا مضبوط سماجی تعلق اور ان کی آپسی رشتے داری۔
- دولت وثروت کا بعض افراد کے ہاتھوں میں اکٹھا ہو جانا جس کے سبب بغاوت کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے۔

علاء الدین نے غدّاری اور سازشوں کی تہہ تک پہنچنے کے بعد ان کے خاتمے کے لیے بروقت ضروری اور سخت اقدامات کیے۔ پہلا اقدام یہ تھا کہ دولت اکٹھا کرنے کا جو چکر امرا کے درمیان چل رہا تھا اس کو ختم کیا۔ تمام مذہبی اوقاف کا خاتمہ کیا۔ اراضی کی عطیوں اور وظائف کو منسوخ کر دیا۔اس کا خیال تھا کہ اگر عوام روزی روٹی کی تلاش میں سرگرداں ہو جائیں گے تو بغاوت کا خیال دل میں نہیں لائیں گے۔ دوسرا یہ کہ اس نے جاسوسی کا ایک وسیع تر نظام تشکیل دیا اور واقعہ نویسوں اور جاسوسوں کے ذریعہ لوگوں کے چال چلن پر نظر رکھی۔ کہا جاتا ہے کہ جاسوسوں سے اشراف طبقہ اتنا گھبرایا ہوا تھا کہ ان کی آپسی گفتگو سرگوشیوں اور اشاروں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ تیسرا اقدام یہ اٹھایا کہ اس نے شراب نوشی کے اڈوں کو یکلخت ختم کر دیا۔ کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ مقامات دراصل سازشوں اور بغاوتوں کے گڑھ ہیں۔ چنانچہ اس نے شراب کے استعمال اور اس کے کاروبار کو قطعاً ممنوع قرار دیا اور بذات خود اپنی شراب کو سر بازار پھینک کر اور اس کے ظروف کو توڑ کر اس نے ایک عمدہ مثال قائم کی۔ آخری اقدام کے طور پر اس نے گھریلو (گھریلو) اجتماعات اور نجی محفلوں پر پابندی لگا دی اور اُس نے اعلیٰ طبقے کے افراد کو سلطان کی اجازت کے بغیر آپس میں شادی بیاہ کرنے سے روک دیا تاکہ مخصوص خاندان کے افراد حکومت کے خلاف متحد نہ ہو سکیں۔ نتیجتاً مرکز کی خوشی و مسرت کی فضاء کے بجائے آپسی بے اعتمادی اور شبہ کے بادل چھا گئے لیکن وقتی طور پر سازشوں کا بازار سرد پڑ گیا۔

علاء الدین خلجی کا اگلا قدم درمیانی اشخاص یا بچولیوں کی قوت اور ان کی آمدنی کو کم کرنا تھا۔ عہدِ وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں ریاست کسانوں سے سیدھے طور پر محصول وصول نہیں کرتی تھی بلکہ یہ کام بچولیے انجام دیتے تھے جنہیں خوط، مقدم اور چودھری کہا جاتا تھا۔ یہ بچولیے دیہی سماج کا ہی حصہ تھے لیکن ریاست کے سماجی و معاشی نظام میں ان کو خاص مقام حاصل تھا۔ وہ کسانوں سے محصول لے کر اسے مرکز تک پہنچاتے تھے۔ بدلے میں انہیں نقد کمیشن مل جاتا یا پھر خود ان پر عائد ہونے والے محصول میں کمی کر دی جاتی تھی۔

چونکہ یہ لوگ بھی کسان طبقے کا ہی ایک حصہ تھے۔ اصولاً ان پر بھی لازم تھا کہ محصول کا اپنا حصہ بھی ادا کریں لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ بچولیے خود اپنے محصول کا بوجھ کسانوں پر ڈالنے لگے۔ اس طرح کسانوں پر محصول کا دوگنا بوجھ پڑنے لگا۔ چونکہ ان پر کوئی مالی ذمہ داری عائد نہیں تھی لہٰذا یہ درمیانی لوگ کافی مال دار ہو گئے تھے۔ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ وہ لوگ اتنے امیر ہو گئے تھے کہ ریشم کا لباس پہنتے، عربی گھوڑوں پر سواری کرتے اور پان چبایا کرتے تھے۔ یہ سب اس عہد میں عیش پرستی کی علامتیں تھیں۔ علاء الدین خلجی نے کچھ

ایساانتظام کیا کہ اب انہیں اپنا بوجھ کسانوں پر ڈالنے کا کوئی موقع نہیں رہا۔ضیاءالدین برنی مزید رقم طراز ہیں کہ خوط، مقدم اور چودھری علاء الدین کے اقدامات کے بعد اتنے کنگال ہو گئے کہ ان کی بیویاں دوسروں کے گھروں میں خادمائیں بننے پر مجبور ہو گئیں۔ چونکہ محصول وصول کرنے والے افراد زیادہ تر غیر مسلم تھے جو علاءالدین کے اقدامات سے شدید متاثر ہوئے اس لیے بہت سے مورخین نے ضیاءالدین برنی کی دی ہوئی تفصیلات کے جزوی استعمال کے سبب یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان اصلاحات کے ذریعہ علاءالدین خلجی ہندوؤں کو زک پہنچانا چاہتا تھا لیکن یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ ان سخت اقدامات کا فائدہ بھی اکثریتی ہندو کسانوں کو ہی ہوا تھا۔ لہٰذا واقعات کی فرقہ وارانہ توجیہہ کرنا درست نہیں ہے۔ غالباً اسی وجہ سے محمد حبیب نے اسے دیہی انقلاب کا نام دیا ہے۔

13.6 علاءالدین خلجی کی معاشی اصلاحات

13.6.1 مالگزاری نظام کی تشکیل

مالگزاری نظام کو نئے سرے سے منظم کرنے سے علاءالدین کا اصل مقصد سلطنت کی آمدنی میں اضافہ اور اپنی عوام کو فاضل دولت سے دور رکھنا تھا تاکہ وہ انقلاب و بغاوت کے بارے میں سوچ ہی نہ سکیں۔ اس نے کسانوں سے سیدھے تعلقات قائم کیے تاکہ وہ اس بات سے واقف رہے کہ مالگزاری کے طور پر وہ کل کتنا ادا کرتے ہیں۔ کسانوں سے راست تعلق کے اس معاملے میں علاءالدین کو دیگر سلاطین دہلی پر اولیت حاصل ہے۔ بہر حال ان اقدامات کے ذریعے علاءالدین اس آمدنی پر بھی کنٹرول کرنا چاہتا تھا جو خوط، مقدم اور چودھری جیسے بچولیے کسانوں سے وصول کر رہے تھے۔ ان تمام مقاصد کے حصول کے لیے علاءالدین نے یہ حکم نامہ جاری کیا کہ پورے دوآب میں ریاست ہی سیدھے طور پر مالگزاری وصول کرے گی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ کسی بھی دیہی علاقے کو اقطاع کے طور پر نہیں دیا جائے گا۔ اور دوآب کے علاقے میں حکومت کے کارندے جن کو عامل کہا جاتا تھا، مالگزاری وصول کریں گے۔ البتہ اس کام میں بچولیے عاملوں کا تعاون کریں گے۔ تمام کسانوں پر یہ بات لازم تھی کہ بلا تفریق و رعایت اپنی پیداوار کا نصف حصہ سلطنت کے حوالے کریں اور زمین کی آمدنی، فی بسوا کے حساب سے مقررہ مقدار میں ادا کریں۔ اس ادائیگی میں خوط اور بلہار کے درمیان کوئی امتیاز نہیں تھا۔ ایک دوسری قابل ذکر بات یہ ہے کہ تمام دودھ دینے والے مویشیوں کے لیے چراگاہ کا ایک حصہ متعین کیا گیا اور مویشیوں کے مالک سے چرائی محصول وصول کیا جاتا تھا۔ مورخ فرشتہ نے اس بات کا ذکر کیا ہے کہ عام کسانوں اور مقدم دونوں کے لیے مویشیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد مقرر تھی۔ زراعت کیلیے چار عدد بیل، دو عدد گائیں دو عدد بھینسیں اور ایک درجن بھیڑ بکریاں۔ خراج یا مالگزاری کی وصولی میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا تھا کہ کسی مالدار کا بوجھ کمزور پر نہ پڑے اور معاشی طور پر مضبوط کو غریب کے استحصال کا موقع نہ ملے اور سب پر ایک ہی قانون لاگو ہو۔

13.6.2 علاءالدین کی مارکیٹ کنٹرول پالیسی

اپنی ریاست میں بازار کی قیمتوں پر قابو پانا علاءالدین کے اہم ترین تجربات میں سے ایک تھا۔ چتوڑ کی مہم سے واپسی کے بعد اُس نے احکامات کا ایک سلسلہ جاری کیا۔ ان احکامات کے ذریعے اس نے غلّے سے لے کر گھوڑوں تک اور مویشیوں اور غلاموں سے لے کر قیمتی بیرونی

ممالک کے کپڑوں تک تمام اشیاء کی قیمتوں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے اس نے دہلی میں تین قسم کے بازار قائم کیے۔

- ایک منڈی غذائی اجناس سے متعلق تھی۔
- دوسری مویشیوں، گھوڑوں اور غلاموں سے متعلق تھی۔
- تیسری منڈی قیمتی اشیا سے متعلق تھی جس میں بیرونی ملبوسات بھی شامل تھے۔

سلطان علاء الدین خلجی کے لیے کھانے پینے کی قیمتوں پر کنٹرول رکھنا خصوصی توجہ کا طالب تھا کیونکہ شہروں میں کم قیمت پر غلّے کی فراہمی کے بغیر نہ تو داموں پر قابو رکھنا ممکن تھا اور نہ ہی یہ بات آسان تھی کہ رعایا اور سپاہیوں کی وفاداری کو برقرار رکھا جا سکے۔ علاء الدین خلجی کی مارکیٹ کنٹرول پالیسی کا اہم پہلو یہ ہے کہ اس نے یہ کام بڑی خوبی اور کمال کے ساتھ انجام دیا۔ دوآب یعنی دہلی تا اودھ کے علاقے کے کسانوں کو یہ حکم دیا کہ وہ حکومت کی مقرر کردہ شرح پر زمین کی مالگزاری بصورت جنس ادا کریں۔ غلّے کے تحفظ اور ذخیرے کے لیے شہروں میں گودام قائم کیے اور غلّے کی منتقلی کا کام بنجاروں کے ذمے کیا گیا۔ دکانداروں کو پابند کیا گیا کہ وہ قیمت میں ذرا بھی اضافہ نہ کریں۔ اپنے ان احکامات کی خلاف ورزی کو روکنے کے لیے اس نے اپنے آپ کو تمام معاملات سے باخبر رکھا۔ زیادہ قیمتوں، غلط اور ناقص پیمانہ جات نیز کاروبار میں دھوکہ دہی پر اس نے سخت سزائیں دیں۔ ضیاء الدین برنی نے لکھا ہے کہ قحط سالی کے زمانے میں بھی کسی کو ایک جیتل کا معمولی فرق کرنے کی بھی اجازت نہیں تھی۔ اس عہد میں اشیا، جانوروں اور غلاموں کی بازاری قیمتوں کی برنی نے جو فہرست دی ہے وہ کچھ اس طرح ہے:

اشیا کی قیمتیں		جانوروں کی قیمتیں		غلاموں کی قیمتیں	
گیہوں	7.5 جیتل فی من	اول قسم کا گھوڑا	100 سے 120 ٹنکہ	خوبصورت اور باصلاحیت جوان غلام	20 سے 30 ٹنکہ
جو	4 جیتل فی من	دوسری قسم کا گھوڑا	80 سے 90 ٹنکہ	خوبصورت لونڈی	20 سے 30 ٹنکہ
چاول	5 جیتل فی من	تیسری قسم کا گھوڑا	50 سے 70 ٹنکہ	باصلاحیت جوان غلام	10 سے 15 ٹنکہ
ماش	5 جیتل فی من	معمولی ٹٹو	16 سے 25 ٹنکہ	باصلاحیت غلام	7 سے 8 ٹنکہ
		بیل بوجھ ڈھونے والا	4 سے 5 ٹنکہ	گھریلو کام کاج کے غلام	5 سے 12 ٹنکہ
		گائے دودھ کے لیے	3 سے 4 ٹنکہ		
		گائے بیل برائے گوشت	1.5 سے 2 ٹنکہ		
		بھینس دودھ کے لیے	10 سے 12 ٹنکہ		
		بھینس برائے گوشت	5 سے 6 ٹنکہ		

اشیاء خوردنی کی قیمتوں پر کنٹرول کے ساتھ ساتھ سلطان کے لیے یہ بات بھی اہم تھی کہ اسے گھوڑے واجبی داموں پر حاصل ہوں۔ اس کی فوج کے استحکام اور عمدہ کارکردگی کے لیے یہ بات بہت ضروری تھی۔ گجرات کی فتح کے نتیجے میں گھوڑوں کی رسد میں کافی بہتری آئی تھی۔ ایک اول درجہ کے گھوڑے کی قیمت جو علاء الدین نے مقرر کی تھی وہ کم وبیش سو یا ایک سو بیس ٹنکا یا اس کے مماثل تھی۔ مویشیوں اور غلاموں کی قیمتوں کو انتہائی باقاعدگی کے ساتھ منظم کیا گیا تھا۔ برنی کی قیمتوں کی فہرست سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستانی دور وسطیٰ میں

غلاموں کی خرید وفروخت کا عام رواج تھا۔ سلطان کے لیے دیگر اشیا کی قیمتوں مثلاً کپڑوں اور عطریات پر کنٹرول رکھنا زیادہ اہم نہیں تھا لیکن ان کی قیمتیں بھی متعین کر دی گئی تھیں۔ کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ اگر ان اشیاء کے دام بڑھ جائیں تو دوسری اشیا کی قیمتوں کا توازن بگڑ سکتا ہے۔ کپڑے وغیرہ کی قیمتوں کا تعین شاید اس لیے کیا گیا تھا کہ طبقۂ اشراف کو مطمئن اور خوش رکھا جائے جو کہ اس نوع کی اشیا کے بڑے خریدار تھے۔ تاہم یوں محسوس ہوتا ہے کہ ان چیزوں کے دام مقرر کرنے میں تاجروں کو نسبتاً زیادہ آزادی حاصل تھی۔

عموماً خیال کیا جاتا ہے کہ اشیاء کی قیمتیں متعین کرنے کے پس پردہ علاءالدین کی یہ خواہش تھی کہ فوجیوں کو معمولی تنخواہ پر بھرتی کیا جاتا رہے۔ دور وسطیٰ میں عام طور پر دائمی اور مستقل فوج کی حیثیت سے حکومت کے یہاں ایک معمولی سا دستہ ہوتا تھا۔ البتہ جنگوں کے موقع پر کرائے کے فوجیوں کو بھرتی کر لیا جاتا تھا اور مالِ غنیمت کا کچھ حصہ ان کو دے دیا جاتا تھا (گویا یہ ان کی آمدنی یا تنخواہ تھی)۔ علاءالدین خلجی دہلی سلطنت کا وہ پہلا حکمراں ہے جس نے اپنے سپاہیوں کو تنخواہ پر رکھا تھا۔ ایک گھڑ سوار سالانہ 238 ٹنکا بطور تنخواہ پاتا تھا تاکہ وہ اس رقم کے ذریعہ اپنا اور اپنے گھوڑے کا خرچ صحیح سے پورا کر سکے۔ اس تنخواہ کو بالکل معمولی نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ شہنشاہ اکبر کے دور میں جبکہ اشیا کی قیمتیں سستی نہ تھیں ایک مغل گھڑ سوار کا ماہانہ بھتہ صرف 20 روپیے تھا۔ بہر حال تیرہویں اور چودہویں صدی عیسوی کے دوران ایک ترک سوار کو تقریباً ایک معزز شخص کی حیثیت حاصل تھی اور اس کی تنخواہ ایک باعزت زندگی کے لیے کافی تھی۔ ان ہی امور کے پیش نظر بازاروں پر یعنی اشیائے خرید وفروخت پر کنٹرول رکھنا ضروری تھا تاکہ فوجی اپنی مقررہ تنخواہ پر بآسانی زندگی بسر کر سکیں۔

13.6.3 مارکیٹ کنٹرول پالیسی کے مقاصد

ہمعصر مورخ ضیاءالدین برنی کے خیال میں بازاروں کو کنٹرول کرنے کے پیچھے علاءالدین کا خاص مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کو سزا دی جائے کیونکہ زیادہ تر تاجر ہندو ہی تھے اور انہوں نے ہی اشیائے خورد ونوش وغیرہ میں زیادہ سے زیادہ نفع خوری کو اختیار کیا ہوا تھا۔ تاہم یہ بات قابل ذکر ہے کہ زمینی تجارت کا بیشتر حصہ جو مغربی ایشیا سے لے کر وسطی ایشیا تک پھیلا ہوا تھا وہ خراسانیوں اور ملتانیوں کے ہاتھ میں تھا جن میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ علاءالدین کے قیمتوں پر نگرانی کے عمل کا اثر سوداگروں کے ان مسلم طبقات تک بھی پہنچنا لازم تھا لیکن پتہ نہیں کیوں برنی نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ بہر حال اول تو یہ بات ناقابل فہم ہے کہ کسی خاص گروہ کو ہی کیوں کر نشانہ سمجھا جائے۔ دوسرے یہ کہ یہ بھی واضح نہ ہو سکا کہ آیا قیمتوں کے تعین کا معاملہ مرکزی علاقہ دہلی ہی تک محدود تھا یا پھر سلطنت کے دیگر علاقے بھی اس قانون کی زد میں براہِ راست آتے تھے۔ ضیاءالدین برنی نے اتنا تو ضرور بتایا ہے کہ یہ قوانین دہلی میں نافذ ہیں پر عمل کا رجحان دیگر بستیوں میں بھی ہمیشہ پایا جاتا تھا۔ سلطان کی فوج صرف مرکزی علاقہ دہلی تک تو محدود نہیں تھی ریاست کے دیگر علاقوں میں بھی فوج کا قیام رہتا تھا۔ اگر قیمتوں سے متعلق قواعد فوج کی خاطر تھے تو پھر لازم ہے کہ دہلی کے علاوہ وہ دیگر علاقوں پر بھی نافذ ہوں۔ تاریخی مواد کی کم یابی کے باعث یقین سے اس معاملے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ البتہ تاجروں نے قیمتوں پر سخت نگرانی کے سلسلہ میں شکایات ضرور کی ہوں گی لیکن اشیاء خوردنی اور دیگر اشیاء کی ارزانی کے سبب نہ صرف فوج کو بلکہ بلالحاظ مذہب وملت سارے شہریوں کو براہِ راست فائدہ پہنچا ہو گا۔ علاءالدین کی وفات کے ساتھ ہی بازاری اصلاحات کا یہ معاملہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا لیکن اس کی زرعی اصلاحات جو اپنی نوعیت میں زیادہ مستقل اور پائدار تھیں برقرار رہیں۔ اس کی

وفات کے بعد اس کے کچھ جانشینوں نے بھی اس کے مذکورہ اقدامات کو جاری رکھا۔ چنانچہ یہ کہنا قطعاً بے بنیاد نہیں ہو گا کہ بعد کے ادوار میں شیر شاہ سوری اور اکبر کی اصلاحات کے لیے علاء الدین کے اقدامات یقیناً بنیاد ثابت ہوئے ہوں گے۔

سلطان علاء الدین کے آخری ایام پریشانی میں گزرے۔ ملک کافور جو کبھی سلطان کا سپہ سالار تھا ان دنوں بڑا بااثر ہو گیا اور خود سلطان کو اس کے بے جا حرکتوں کا شکار بننا پڑا۔ کافور نے سلطان کے قابل مشیروں کو مروا ڈالا یا قید کر دیا۔ گجرات اور دکن کے علاقوں میں بغاوتیں پھوٹ پڑیں اور چتوڑ پر راجپوت دوبارہ قابض ہو گئے۔ علاء الدین خلجی کی وفات کے بعد اقتدار کے لیے حسب معمول خونریز کشمکش شروع ہو گئی۔ عارضی طور پر امور حکومت ملک کافور کے ہاتھوں میں آ گئے تھے جس نے تخت سلطنت پر مرحوم سلطان کے شیر خوار لڑکے شہاب الدین کو بٹھا دیا اور اس طرح (بالواسطہ لیکن) حقیقی طور پر مقتدر اعلیٰ بن بیٹھا۔ اس نے علاء الدین کے بڑے بیٹے خضر خان کو اندھا کر دیا اور شاہی خاندان کے متعدد افراد کو یا تو قتل کر دیا یا قید کر دیا لیکن محل کے غلام محافظین اس کی حکومت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو گئے اور شیر خوار بچے کے نام پر چلنے والی یہ حکومت محض 35 دنوں بعد ہی اختتام پذیر ہو گئی۔

ہمعصر مورخین نے علاء الدین خلجی کے دور کو خوب سراہا ہے۔ ابن بطوطہ نے ایک بہترین سلطان کے طور پر اس کا حوالہ دیا ہے اور ضیاء الدین برنی لکھتا ہے "کہ اس کے دور حکمرانی میں ایسے کئی واقعات ظہور پذیر ہوئے جو کہیں نہ سننے میں آئے نہ دیکھنے میں اور شاید ایسے قابل دید و شنید حالات پھر کبھی رونما نہ ہو سکیں۔" بلاشبہ علاء الدین خود اپنی مملکت کی ضروریات سے پوری طرح واقف تھا۔ اس نے جدید نظم و نسق کو ان کی تکمیل کے لیے لگا دیا۔ اس کے کام خود اس کے تخلیق کردہ تھے اور ایک تعمیری تدبر کا اس نے مظاہرہ کیا۔ بازار اور اس کی قیمتوں پر کامیاب کنٹرول اس کا منفرد تجربہ ہے جس کی کوئی نظیر ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں نہیں ملتی۔ اس نے مذہب کو سیاست کے چنگل سے آزاد کیا اور نظم و نسق کو علماء کے اثر سے دور رکھا۔ اس نے علائی دروازے کی شکل میں فن تعمیر کو ایک نیا روپ بخشا۔ اسی کے کارہائے نمایاں کے سبب خلجی خاندان اصلاً ممتاز ہے اور کوئی حکمران اس کا ہم پلہ نہیں ہے۔

13.7 سلطان قطب الدین مبارک خلجی (1316-1320)

سلطان قطب الدین مبارک شاہ خلجی، سلطان علاء الدین خلجی کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ وہ دیوگیری کے راجا رام چندر کی بیٹی جٹیا پالی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ علاء الدین کی وفات کے بعد جب ملک کافور نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا تو اس نے مبارک خلجی کو گرفتار کر کے قید میں ڈال دیا۔ بالآخر سلطان علاء الدین خلجی کے محافظ دستے کے سپاہیوں نے جنہیں پائک کہا جاتا تھا، ملک کافور کو قتل کر دیا اور مبارک خلجی کو قید سے آزاد کرایا۔ چونکہ ملک کافور کے قتل کے بعد نائب ملک یا ریجنٹ کا عہدا خالی تھا، امراء نے مبارک خلجی کو نائب مملکت کی حیثیت دی۔ چند ہفتوں نائب کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد شہاب الدین کو قید کر کے گوالیار بھیج دیا اور 18 اپریل 1316ء کو بڑے تزک و احتشام سے مبارک خلجی، سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے لقب کے ساتھ دہلی سلطنت کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔

ضیاء الدین برنی لکھتا ہے کہ "اپنی تخت نشینی کے وقت اس نے ایک صالح شہزادہ ہونے کا ثبوت دیا" اپنی تخت نشینی کے پہلے دن ہی

اس نے تمام قیدیوں کو جن کی تعداد تقریباً سترہ ہزار تھی آزاد کرنے کا حکم دیا۔ان میں سیاسی جرائم پیشہ اور رشوت خور بھی تھے۔وہ تمام رہا کیے گئے قیدی نئے سلطان کے مشکور ہوئے۔مبارک خلجی نے اپنے والد کے سخت ضوابط کو منسوخ کیا۔ضبط کی ہوئی تمام زمینیں ان کے مالکوں کے حوالے کروائیں اور بازار کی قیمتوں پر کنٹرول کے نظام کو کالعدم قراد دیا۔ضرورت مندوں کی درخواستیں جسے علاءالدین نے قبول کرنے سے منع کیا تھا دوبارہ لیے جانے کا حکم دیا۔اس کے عہد میں سیدوں اور علماء کے عطیات میں اضافہ ہوا۔سپاہیوں کی تنخواہیں بڑھائی گئیں۔سلطان نے تمام بھاری ٹیکسوں کو معاف کر دیا اور سخت مطالبات کو ختم کر دیا۔ضیاءالدین برنی لکھتا ہے کہ ''سلطان قطب الدین نے علاءالدین کے کسی بھی قانون یا ضابطے کا نفاذ نہیں کیا۔''اس نے کچھ نئی تقرریاں بھی کیں اور نئے خطابات بھی عطا کیے۔ملک دینار کو ظفر خان کا خطاب دیا۔اس کی کچھ مہموں کا بھی ذکر ملتا ہے۔اس نے اپنے ایک عہدے دار 'عین الملک' کے ذریعہ گجرات کی بغاوت کو فرو کیا۔پھر اس نے اپنی افواج کا رخ دکن کی جانب کیا اور دیوگیر کے باغی راجا ہر پال کو شکست دے کر اسے دہلی سلطنت میں شامل کر لیا۔

دہلی واپس آنے کے بعد وہ بڑی کمزوریوں کا شکار ہو گیا۔سلطنت کے تمام امور ایک نو مسلم کے ہاتھ میں دے دیے۔اس نو مسلم کو اس نے خسرو خان کے لقب سے نواز کر بااختیار بنایا۔یہ شخص مبارک کے سارے جرائم اور غلطیوں میں شریک تھا۔اسی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے 1320 میں اپنے آقا کو قتل کر کے خود حکومت پر قبضہ کر لیا اور اس طرح خلجی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔اس نے اپنے لیے نصیر الدین خسرو شاہ کا خطاب اختیار کیا۔دہلی کے رذیل لوگ اس کے مددگار تھے اور کوئی پانچ ماہ تک یہ شہر بدامنی کا گہوارہ رہا۔تاہم یہ افراتفری زیادہ دنوں باقی نہیں رہی۔پنجاب کے گورنر غازی خان تغلق نے جو تاریخ میں غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہے، قدیم امرا طبقے کے تعاون سے خسرو شاہ کے خلاف پیش قدمی کی اور 1320ء میں اسے شکست دے کر قتل کر دیا۔اب چونکہ خلجی خاندان کا کوئی فرد باقی نہیں تھا اس لیے امیروں نے غازی خان تغلق ہی کو تخت سلطانی پر مسند آرا کیا اور اس کے ساتھ تغلق خاندان کی حکومت کا آغاز ہوا۔

13.8 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

خلجی حکمرانوں نے 1290ء سے 1320ء تک دہلی پر حکومت کی۔یہ اصلاً وسط ایشیا کے باشندے تھے۔خاندان غلامان کے زوال کے زمانے میں کیقباد نے ملک فیروز کو ''عارض ممالک'' کے طور پر مقرر کیا تھا۔ادھر بلبن کے جانشینوں کی نااہلی سے جو سیاسی خلا پیدا ہوا، اس صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک فیروز نے تخت سنبھال لیا۔اس نے جلال الدین فیروز شاہ کا لقب اختیار کیا اور 1296ء تک دہلی کی سلطنت پر حکومت کرتا رہا۔اس کے بھتیجے اور داماد علاءالدین خلجی نے سازش کے ذریعہ اپنے چچا کا کام تمام کیا اور سلطان بن گیا۔علاءالدین کے دور حکمرانی کو خلجی سلاطین کا سنہرا دور کہا جاتا ہے۔اس کی مالگزاری اور اشیاء کی قیمتوں سے متعلق اصلاحات تاریخ ساز ہیں۔اس کے نظم ونسق میں تخلیقی جدت پسندی اس کی امتیازی شان ہے۔ملک کافور علاءالدین کا انتہائی بھروسہ مند سپہ سالار تھا۔علاءالدین کی وفات کے بعد اس نے شہاب الدین عمر کو جانشین بناتے ہوئے اقتدار کو اپنے ہاتھ میں لینے کی کوشش کی لیکن خود ملک کافور کے ایک کارندے نے اسے ہلاک کر دیا۔ملک کافور کے بعد علاءالدین کے ایک اور بیٹے مبارک خلجی نے عمر کو تخت سے دست بردار کر دیا اور 1316ء میں خود اقتدار سنبھال لیا۔اس

نے قطب الدین مبارک شاہ کے لقب سے حکومت کی تھی۔اس کے آخری دور حکومت میں حقیقی اقتدار دراصل خسرو خان کے ہاتھ میں تھا جو کہ ایک معمولی ذات کا نو مسلم غلام تھا۔ مبارک نے اپنے شب و روز شراب و کباب اور رنگ رلیوں میں گزارنے شروع کر دیے۔ان حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خسرو نے مبارک شاہ کو ٹھکانے لگا دیا اور خود سلطان بن بیٹھا۔اس طرح خلجی دور کا پوری طرح خاتمہ ہو گیا۔

13.9 کلیدی الفاظ (Keywords)

سرِ جاندار	:	شاہی حفاظتی دستہ کا سالارِ اعلیٰ
عارض ممالک	:	عہدِ سلطنت میں تمام فوجی اور عسکری معاملات کی نگرانی کرنے والا افسر
نائب امیرِ حاجب	:	عہدِ سلطنت میں شاہی اور درباری امور کی دیکھ ریکھ کرنے والا نائب افسر
مالِ غنیمت	:	کسی جنگ میں جیتنے والی فوج کو ہارنے والے سے حاصل ہونے والا ساز و سامان
خمس	:	مال غنیمت کا پانچواں حصہ
اقطاع	:	زمین کا وہ ٹکڑا جس کی آمدنی کسی عہدیدار کو اس کی خدمت کے بدلے میں دی جاتی تھی۔
عامل	:	محصول کی وصولی پر مامور حکومتی کارندہ یا سرکاری افسر
خوط، مقدم	:	گاؤں کا مکھیا یا چودھری جو حکومت اور کسان کے درمیان بچولیے کا کام کرتا تھا۔
پائک	:	سلطان کے درباری محافظ یا باڈی گارڈ
اشرافیہ طبقہ	:	عہد وسطی کے ہندوستان میں اعلیٰ حسب و نسب والے لوگ
فصیل	:	قلعے کی چہار دیواری
اوقاف	:	وقف کی جمع، وہ جائداد جو مذہبی یا رفاہی کاموں کے لیے عطیہ کی جائے۔
وظائف	:	وظیفے کی جمع، وہ تنخواہ یا مشاہرہ جو کسی فرد کو مذہبی یا سماجی خدمات کے عوض دیا جائے۔

13.10 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

13.10.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. خلجی خاندان کا بانی کون ہے؟
2. خلجی خاندان ہجرت کر کے کہاں آباد ہوا تھا؟
3. شائستہ خان کس کا لقب تھا؟
4. ملک چھجو کون تھا؟
5. اقطاع کسے کہتے ہیں؟

6. کملادیوی کون تھی؟

7. ملک کافور کے حملہ کے وقت دیو گیر کا حکمراں کون تھا؟

8. مبارک خلجی نے کون سا لقب اختیار کیا تھا؟

9. خلجی خاندان کا آخری حکمران کون تھا؟

10. ملک دینار کو ظفر خان کا خطاب کس نے دیا تھا؟

13.10.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. خلجی حکومت کے قیام میں جلال الدین خلجی کے کردار بیان کیجیے۔

2. ملک چھجو کی بغاوت پر روشنی ڈالیے۔

3. جلال الدین خلجی نے منگول حملوں کا انسداد کیسے کیا تھا؟

4. رنتھمبور پر جلال الدین فیروز کی کاروائی کا جائزہ لیں گے۔

5. علاءالدین خلجی کے مالگزاری نظام کی وضاحت کیجیے۔

13.10.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سلطان فیروز خلجی کی عسکری مہمات کا تفصیلی جائزہ لیں گے۔

2. علاءالدین خلجی کی مارکیٹ کنڑول پالیسی پر اظہار خیال فرمائیں؟

3. سلطان قطب الدین مبارک خلجی کے عہد حکومت پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

13.11 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

---

1. Mahajan V.D., *History of Medieval India* S. Chand Group. Bombay. 2001
2. Mehta J.L., *Advanced study in the History of Medieval India*. Sterling Publishers Pvt Ltd. New Delhi,2004.
3. Chandra Satish., *Medieval India*. Vol. 1&ll. Orient Longman Limited Hyderabad.2000.
4. Habib Irfan., *Medieval India. The Study of civilization*. National Book Trust. New Delhi. 2008.

5. کے۔ایس۔لال، خلجی خاندان، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی۔

6. محمد حبیب، کے۔اے۔نظامی، جامع تاریخ ہند، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی۔

7. ستیش چندر، عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی۔

اکائی 14۔ تغلق خاندان

(Tughlaq Dynasty)

اکائی کے اجزا

14.0 تمہید

14.1 مقاصد

14.2 سلطان غیاث الدین تغلق

14.2.1 ابتدائی حالات

14.2.3 نظم ونسق کی بحالی

14.2.2 سیاسی مسائل

14.3 سلطان محمد بن تغلق

14.3.1 ابتدائی حالات اور تخت نشینی

14.3.2 مسائل اور ان کا حل

14.3.3 دکن پالیسی اور اقتدار کا انتہائے عروج

14.3.4 سیاسی اور انتظامی منصوبہ بندیاں

14.3.4.1 دوآب میں محصول کا اضافہ

14.3.4.2 راجدھانی کی دیوگیری منتقلی

14.3.4.3 علامتی سکے کا اجراء

14.3.4.4 خراسان مہم

14.3.4.5 قراچل پر حملہ

14.3.4.6 دیوانِ کوہی کا قیام

14.3.4.7 محمد بن تغلق بحیثیت حکمراں

14.4 سلطان فیروز شاہ تغلق
14.4.1 ابتدائی حالات
14.4.2 زرعی اصلاحات
14.4.3 آب پاشی ذرائع کی مرمت اور تعمیر
14.4.4 شہر کاری اور فن تعمیر
14.4.4 غلامی کا نظام
14.6.5 رفاہی اصلاحات
14.4.6 فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت کا جائزہ
14.5 اکتسابی نتائج
14.6 کلیدی الفاظ
14.7 نمونہ امتحانی سوالات
14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
14.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

14.0 تمہید (Introduction)

چودھویں صدی کے اوائل میں خلجی خاندان کے زوال کے بعد دہلی سلطنت پر ایک ایسا خاندان تخت نشین ہوا جس کو اس عہد کے دانشوروں امیر خسرو اور ابنِ بطوطہ نے تغلق خاندان کے نام سے موسوم کیا ہے۔ 1321ء میں غیاث الدین تغلق کی تخت نشینی سے تغلق دور کا آغاز ہوتا ہے۔ شمس سراج عفیف اور ابنِ بطوطہ نے لکھا ہے کہ تغلق خاندان علاء الدین خلجی کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا۔ ایک تاریخی روایت کے مطابق غیاث الدین تغلق، سلطان بلبن کے ایک ترک غلام کا بیٹا تھا جبکہ اس کی ماں ہندو جاٹ خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ اس نے خود کو خلجی سلاطین کے عہد میں ایک لائق اور قابل اعتماد سپاہی ثابت کیا اور ترقی کرتے ہوئے پنجاب کا صوبے دار بنا۔ پنجاب کے گورنر کی حیثیت سے اس نے منگولوں کے حملوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور انہیں دہلی سلطنت کی حدود میں داخل ہونے سے روکے رکھا اور بالآخر انہیں مار بھگانے میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ تخت نشینی کے بعد اس نے لوگوں کا بھرپور اعتماد حاصل کیا اور اپنی ریاست کو مضبوطی اور استحکام فراہم کیا۔

دہلی کے قریب تغلق آباد کے نام سے اس نے ایک مضبوط قلعہ بھی تعمیر کروایا۔

تغلق حکمرانوں نے شمال مغربی سرحدوں پر فوجی چوکیاں قائم کرکے انہیں مزید مضبوط کیا تاکہ منگولوں کی جانب سے بار بار ہونے والے حملوں کا کامیابی سے دفاع کیا جاسکے۔اس کے علاوہ ملک کے ایک بڑے حصے میں سیاسی انتشار کا خاتمہ کرکے ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کی۔ تغلق خاندان میں تین اہم اور قابل سلاطین ہوئے ہیں ایک خود غیاث الدین تغلق،دوسرا اس کا بیٹا محمد بن تغلق اور تیسرا اس کا بھتیجا فیروز شاہ تغلق۔پہلے دو سلاطین نے ایک ایسی سلطنت قائم کی جو کم و بیش پورے ملک پر محیط تھی۔

14.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- تغلق سلطنت کے آغاز وارتقا کے اسباب کو جان سکیں گے۔
- غیاث الدین تغلق کے کارناموں کو بیان کر سکیں گے۔
- محمد بن تغلق کی معاشی وزرعی پالیسی سے واقف ہو سکیں گے۔
- راجدھانی کی تبدیلی کے اسباب اور نتائج کو سمجھ سکیں گے۔
- فیروز شاہ تغلق کے دور میں ہونے والی زرعی اصلاحات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- تغلق عہد میں آب پاشی کے نظام (نہروں) کی تعمیر کے بارے میں جان سکیں گے۔
- تغلق عہد کی تعمیری و تہذیبی سرگرمیوں پر گفتگو کر سکیں گے۔
- تغلق سلطنت کے زوال کے اسباب سے واقف ہو سکیں گے۔

14.2 غیاث الدین تغلق

14.2.1 ابتدائی حالات

غازی ملک یا تغلق غازی کو جو بعد میں غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا ہندوستان میں تغلق خاندان کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔سلطان غیاث الدین تغلق کے سلسلۂ نسب کے بارے میں مورخین میں کافی اختلاف ہے۔ابنِ بطوطہ نے ملتان کے صوفی بزرگ شیخ رکن الدین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ "تغلق کا تعلق ترکوں کے قرونہ قبیلے سے تھا جو ترکستان اور سندھ کے درمیان پہاڑی علاقہ میں آباد تھا۔"تغلقوں کو مارکوپولو نے مخلوط نسل کا بتایا ہے جن کے باپ تاتاری اور مائیں ہندوستانی تھیں۔فرشتہ کہتا ہے کہ "غیاث الدین کا باپ،ملک تغلق،سلطان بلبن کا ایک ترکی غلام تھا اور اس کی ماں ایک مقامی جاٹ خاندان کی عورت تھی۔"بہر حال تغلق نے اس بات کا اقرار کیا تھا کہ وہ ابتداء میں کسی اہمیت کا حامل شخص نہیں تھا۔غالباً وہ ہندوستان میں پیدا ہوا تھا۔خسرو کے مطابق جلال الدین خلجی کے انتقال کے بعد ملک تغلق

کسی خاص عہدے پر نہیں تھا۔اس نے علاء الدین کے بھائی الغ خان کی ملازمت اختیار کی اور اس کا ملازمِ خاص بن گیا۔الغ خان کے انتقال کے بعد وہ علاء الدین خلجی کی ملازمت میں آگیا۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں ترقی کرتے ہوئے وہ کئی اہم عہدوں پر فائز ہوا۔اس نے جلد ہی سلطان کو اپنی شجاعت، بہادری اور عسکری ہنر مندی سے متاثر کیا۔اسے سرحدی علاقوں کا مشکل ترین انتظام وانصرام سونپا گیا۔اس نے انتہائی دانشمندی اور حسن اسلوبی سے اسے انجام دیا۔اس نے پہلے ملتان اور دیپال پور کے گورنر کی حیثیت سے عمدہ خدمات انجام دیں اور منگولوں کے حملوں کا کامیابی کے ساتھ دفاع کیا۔ سرحدی شہروں کی بہترین قلعہ بندی کی۔ابن بطوطہ نے لکھاہے کہ ''اس نے ملتان کی ایک مسجد میں ایک کتبہ دیکھا تھا جس میں منگولوں کے خلاف اس کی 29 فتوحات کا ذکر ملتا ہے لیکن امیر خسرو نے صرف اٹھارہ فتوحات کا ہی ذکر کیا ہے۔ بہر حال ان کامیاب کاروائیوں سے اس کی انتظامی صلاحیتوں، عسکری مہارتوں اور حسنِ تدبیر کا پتہ چلتا ہے۔

وہ اپنے سلطان علاؤالدین خلجی سے مکمل وفادار تھا۔اپنی تخت نشینی کے موقعے پر اس نے اپنے ساتھیوں سے اس بات کا برملا اظہار کیا کہ ''سلطان کی عنایتوں کی وجہ سے ہی اسے یہ مقام حاصل ہوا ہے۔'' مبارک خلجی نے بھی اس کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف کیا اور اس کے سابقہ عہدوں پر اس کو قائم رکھا۔ قطب الدین مبارک خلجی کے دور میں غازی تغلق نے قابل ستائش سفارتی خدمات بھی انجام دی تھیں۔ بالآخر ناصر الدین خسرو خان کے خلاف جنگی مہم میں بھی اس نے بڑی ہوشیاری اور جونمردی سے ایک نڈر اور پختہ تجربہ کار قائد کی حیثیت سے اپنا لوہا منوایا۔ چنانچہ امراء نے نئے سلطان کے عہدے کے لیے غازی ملک کا انتخاب کیا۔غازی ملک نے غیاث الدین تغلق کا لقب اختیار کیا۔

14.2.3 نظم ونسق کی بحالی

تخت نشینی کے وقت انتظامی اور مالی حالات خستہ تھے۔افسروں اور ماتحتوں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے رشوتیں دی گئی تھی۔ روپیوں کی بے تحاشہ تقسیم سے خزانہ خالی ہو گیا تھا۔ علاء الدین خلجی کا قائم کردہ محصول اور بازار کا نظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ چنانچہ حکومت کے مالی نظام کو شدید نقصان پہونچا تھا۔ غیاث الدین نے جلد ہی صورتِ حال کا درست اندازہ لگایا اور انتہائی موزوں اور جرأت مندانہ اقدامات کے ذریعے سلطنت کی سیاسی، معاشی اور انتظامی رفتار کو معمول پر لے آیا۔ برنی لکھتا ہے کہ ''جس کام کو انجام دینے میں دوسروں کو سالوں کی ضرورت ہوتی وہ اس کو دنوں میں کر دیتا۔'' اس نے جلد ہی ایک ایسی مضبوط اور چاق وچوبند انتظامیہ قائم کیا جس نے لوگوں کے لیے امن اور خوش حالی فراہم کی ضیاء الدین برنی کے مطابق ''لوگ یہ محسوس کرنے لگے کہ گویا علاء الدین دوبارہ زندہ ہو گیا ہے۔ ''

تخت نشینی کے بعد جلد ہی اس نے اپنی توجہ اپنے خالی خزانے کی بحالی، ریاستی مالیات کی فراہمی اور اس کو نئے سرے سے منظم کرنے پر مبذول کی۔اس نے محصول کے نظام میں ایک متوازن اور اعتدال پسند طریقہ اختیار کیا جس میں علاء الدین خلجی کے نظام کی سختی اور مبارک خلجی کے عہد کا ڈھیلا پن ہر گز نہ تھا بلکہ اس نے ایک درمیانہ راستہ اختیار کیا۔اس نے مقطیوں، مقدموں اور کسانوں کے ساتھ اس طرح کے سلوک کا حکم دیا کہ وہ نہ تو بہت زیادہ دولت مند اور باغی ہو جائیں اور نہ ہی بالکل مفلس ہو جائیں۔ غیاث الدین تغلق نے محصول کے معاملات کو سختی کے ساتھ مگر ہمدردی سے حل کرنے کی ایک کامیاب اور سنجیدہ کوشش کی۔اس نے کوشش کی تھی کہ 1/10 یا 1/11 سے زیادہ

محصول میں اضافہ نہ کیا جائے۔اس سے کسانوں کو راحت ملنے اور مالیات بحال ہونے کی توقع تھی۔افسروں کو ہدایت دی کہ زراعت میں ہر سال اضافہ ہونا چاہئے اور اسی تناسب میں محصول بھی بڑھنا چاہیے۔سلطان کی معاشی تدابیر سے شاہی خزانے کی آمدنی کافی بڑھ گئی اور سلطان کو اپنی سیاسی اور انتظامی اسکیموں پر عمل کرنے کا بھرپور موقعہ ملا۔

سلطان غیاث الدین ایک تجربہ کارآزمودہ فوجی رہنما تھا اس نے اپنی فوج کو موثر طور پر نئے سرے سے منظم کیا۔اس کی عسکری پالیسی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اپنے سپاہیوں کو معاشی اور دیگر لحاظ سے مطمئن رکھا جائے۔گھوڑوں کی حفاظت کے لیے اس نے حلیہ اور داغ سے متعلق علاءالدین خلجی کے ضوابط کا سختی سے نفاذ کیا۔

14.2.2 سیاسی مسائل

غازی ملک یعنی غیاث الدین تغلق جو سلطنت ملی تھی وسیع ہونے کی وجہ سے بہت سے مسائل سے گھری ہوئی تھی۔کئی صوبوں میں بغاوتیں ہو رہی تھیں۔سندھ پر برائے نام ہی کنٹرول تھا۔مرکز کی پریشانیوں سے فائدہ اٹھا کر وہاں کے امراءاور سرداروں نے تھٹھ اور سندھ کے نچلے حصے پر قبضہ کر لیا تھا اور سلطان بننے کا خواب دیکھ رہے تھے۔اسی طرح عین الملک ملتانی کی عدم موجودگی میں گجرات بھی شورش کا شکار ہو گیا تھا۔مشرق میں بنگال کی وفاداری وقتی نوعیت کی تھی اور سنار گاؤں اور لکھنوتی پر مرکزی اقتدار ڈھیلا ہو رہا تھا۔ترہٹ اور جاج نگر باغی ہندو رایوں کے قبضے میں تھے۔راجپوتانہ میں چتوڑ، ناگور اور جالور میں راجپوتوں نے اپنی طاقت بڑھانی شروع کر رکھی تھی۔دکن کے حالات بھی اطمینان بخش نہیں تھے۔علاءالدین نے ان علاقوں پر قبضہ کر کے ان کے حکمرانوں کو خراج کی ادائیگی کی شرط پر انہیں لوٹا دیا تھا۔ان کے حکمراں موقع کے منتظر تھے۔مبارک خلجی نے دیوگیری کے آخری یادو حکمراں کو شکست دے کر اسے دہلی سلطنت کا ایک صوبہ بنالیا تھا اور وہاں مرکزی قوانین نافذ کر دیے تھے۔تلنگانہ کو بھی مرکزی طاقت کا احساس کرایا گیا۔مبارک شاہ کی آنکھ بند ہوتے ہی تلنگانہ کے رائے پرتاپ رودر دیو نے دہلی کی ماتحتی کا جوا اتار پھینکا۔اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے غیاث الدین تغلق نے اپنے بیٹے جونا خان (بعد میں محمد بن تغلق) کو دکن کی جانب روانہ کیا۔ابتدا میں محمد بن تغلق کو کافی پریشانی اور راستے کی مشکلات کا سامنا پڑا لیکن اس نے ہمت نہیں ہاری اور اپنی کوششیں جاری رکھیں۔بالآخر اسے کامیابی نصیب ہوئی اور اس نے بیدر اور وارنگل کو فتح کر لیا۔

اس دوران سلطان غیاث الدین تغلق نے بنگال کی جانب پیش قدمی کی تاکہ اپنی عظمت کا سکہ شمال مشرقی علاقوں پر بھی قائم کر سکے۔وہاں اُس نے جانشینی کے ایک جھگڑے کو مسئلے کو سلجھایا۔اس نے سونار گاؤں تک اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔بنگال سے واپسی کے سفر میں اس نے ترہٹ کو اپنی سلطنت میں شامل کیا اور دہلی کی طرف روانہ ہوا۔بنگال کی مہم سے لوٹنے پر جونا خان نے اپنے والد سے ملاقات کے لیے دہلی کے نواحی علاقے میں ایک استقبالی شہ نشین تیار کروایا۔سلطان کے استقبال کے موقع پر ہاتھیوں کی پریڈ کروائی گئی تو یہ شہ نشین منہدم ہو گیا اور سلطان بھی اس حادثے میں جاں بحق ہو گیا۔کچھ دانشوروں کا خیال ہے کہ شہزادے جونا خان نے باپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے جان بوجھ کر ایسا کروایا، لیکن ایسا قرین قیاس نہیں لگتا کیونکہ شہزادہ پہلے ہی باپ کا پسندیدہ اور ولی عہد تھا۔ایسا کہا جاتا ہے کہ غیاث الدین

تغلق نے شیخ نظام الدین اولیاؒ کو درباری علماء کے کہنے پر محفل سماع (قوالی) کو بند کرنے کا حکم دیا تھا لیکن آپ نے شاہی فرمان کو تسلیم نہیں کیا۔ اس کے علاوہ آپ کبھی دربار میں سلطان کو تسلیم بجالانے نہیں جاتے تھے یہ بھی سلطان کو برا لگتا تھا۔ یہ تکرار بڑھتی گئی اور سلطان آپ سے ناراض رہنے لگا یہاں تک کہ اس نے بنگال جاتے وقت شیخ کے لیے آخری انتباہ جاری کیا کہ جیسے ہی وہ بنگال کی مہم سے واپس ہو اس سے پہلے شیخ دہلی چھوڑ دیں۔ یہ اطلاع جب شیخ تک پہنچی تو آپ نے بے ساختہ کہا "ہنوز دلّی دور است" (ابھی دلّی دور ہے)۔ بہر حال سلطان دہلی پہنچنے سے قبل ہی حادثے کا شکار ہوگیا۔ الغرض مرحوم سلطان غیاث الدین کی تدفین خود اس کے تعمیر کردہ مقبرے میں عمل میں آئی جو دہلی کے تغلق آباد میں واقع ایک فوجی نوعیت کا قلعہ معلوم ہوتا ہے۔

14.3 محمد بن تغلق 1325-1351ء

14.3.1 ابتدائی حالات اور تخت نشینی

غیاث الدین تغلق کا جانشین اور تغلق خاندان کا دوسرا سلطان محمد بن تغلق 1290ء میں دہلی میں پیدا ہوا۔ 20 مارچ 1351ء کو سندھ میں اس کی وفات ہوئی۔ اس نے 1325 سے 1351ء تک تقریباً چھبیس سال دہلی سلطنت پر حکومت کی۔ اسے فخر ملک، جونا خان اور الغ خان کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ سلطان محمد بن تغلق کو عہدِ وسطیٰ کی تاریخ میں ایک ممتاز شخصیت کا مالک تصور کیا جاتا ہے۔ اس کی ذاتی زندگی ان تمام برائیوں سے پاک صاف تھی جو اس عہد کے حکمرانوں کا خاصہ ہوا کرتی تھی۔ وہ انتہائی باصلاحیت اور ذہین تھا۔ ادب، تاریخ، فلسفہ، خطابت، شاعری، منطق، ریاضی، طب، ہیئت اور خطاطی جیسے علوم و فنون سے اچھی طرح واقف تھا۔ مضبوط اور توانا جسمانی ساخت کے ساتھ ساتھ نہایت جری اور بہادر تھا۔ تخت نشینی سے پہلے بھی اس کی بیشتر زندگی میدانِ جنگ میں گزری تھی۔ 1325ء میں اپنے والد غیاث الدین تغلق کے انتقال کے بعد اس نے محمد بن تغلق کے نام سے اپنی حکومت کا آغاز کیا۔ چونکہ غیاث الدین تغلق نے الغ خان کو اپنی زندگی ہی میں اپنا ولی عہد نامزد کر دیا تھا لہٰذا اس کی تخت نشینی کسی جھگڑے یا انتشار کے بغیر نہایت پرسکون ماحول میں ہوئی۔ اس نے اپنے والد کی موت پر چالیس دنوں کا ریاستی سوگ منانے کے بعد فروری 1325ء کو دہلی میں اپنی رسم تاج پوشی ادا کی۔ عوام میں اپنی حمایت اور مقبولیت حاصل کرنے کے لیے اس نے اپنی دولت بے دریغ عوام میں لٹائی اور وافر مقدار میں انہیں سونا اور چاندی تقسیم کیا۔

14.3.2 مسائل اور ان کا حل

محمد بن تغلق کو اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں کئی اہم مسائل اور دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ان تمام مسائل پر اس نے بڑی ہمت، جواں مردی اور سوجھ بوجھ سے قابو پایا۔ سب سے پہلے اس کے چچازاد بھائی بہاؤالدین گرشاسپ نے جسے دکن میں ساگر کی جاگیر ملی تھی اس کی جانشینی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا اور 1326ء میں اپنے سلطان ہونے کا دعویٰ کیا۔ سلطان محمد بن تغلق نے نہ صرف اس کی بغاوت کو سختی سے کچلا بلکہ سزا کے طور پر اس کی کھال ادھیڑ دی۔ اگلے ہی سال ملتان کے گورنر بہرام ایبہ کشلو خان نے بغاوت کر دی۔ محمد بن تغلق اس وقت دیوگیری میں تھا وہ تیزی کے ساتھ ملتان روانہ ہوا۔ بہرام کو شکست دے کر موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اسی دوران غیاث الدین

بہادر شاہ نے جو بھورا کے نام سے مشہور تھا سلطان کے خلاف بغاوت کر دی۔ یہ بغاوت سلطان کو خبر ملنے سے پہلے ہی ختم کر دی گئی۔ سندھ میں کمال پور کے باشندوں نے وہاں کے قاضی اور خطیب کے اشاروں پر بغاوت کی۔ سلطان کے حکم پر خواجہ جہاں نے ان کی بغاوت کو کچل دیا اور باغیوں کو عبرت ناک سزائیں دیں۔ اس کے فوراً بعد ہی ترماشیرین اپنی منگول فوج کے ساتھ ہندوستان پر حملہ آور ہوا اور پنجاب میں قتل و غارت مچاتے ہوئے دہلی کے مضافات میں میرٹھ تک پہنچ گیا۔ سلطان نے یوسف بغراخان کو دس ہزار گھوڑ سواروں کے ساتھ میرٹھ بھیجا اور خود بھی اس کے پیچھے روانہ ہوا۔ ترماشیریں کو بری طرح شکست ہوئی اور منگولوں کا قتل عام کیا گیا۔ کسی طرح ترماشیریں جان بچا کر بھاگنے میں کامیاب رہا حالانکہ سلطان نے کلانور تک اس کا پیچھا کیا۔

14.3.3 دکن پالیسی اور اقتدار کا انتہائے عروج

اس سے پہلے دکن کے علاقے کو علاء الدین نے فتح کیا تھا لیکن اُسے اپنے مرکز سے ملحق نہیں کیا۔ وہاں کے حکمرانوں کو علاء الدین نے مرکزی اقتدار تسلیم کر کے خراج ادا کرنے کے وعدے پر حکمرانی کرنے دی گئی۔ محمد بن تغلق نے اپنے پیشرو سلطان کے برخلاف ان علاقوں کا دہلی سلطنت میں الحاق کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح وہ مقامی حکمرانی کی جگہ مرکز کی براہ راست حکمرانی قائم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اپنی حکومت کے ابتدائی دور میں محمد بن تغلق نے کاکتیہ سلطنت کے علاقے وارنگل کو فتح کر کے اس کی حکمرانی اپنے ایک امیر کو سونپ دی۔ جب مدورائی فتح ہوا تو احسان شاہ کو اس کا گورنری مقرر کیا گیا لیکن بہر حال یہ دور دراز کے علاقے تھے اور ان پر مرکزی نگرانی آسان نہیں تھی۔ لہذا جب دکن کے صوبے دار بہاء الدین گرشاسپ نے بغاوت کی تو دکن کے علاقوں پر موثر کنٹرول کی ضرورت محسوس کرنے لگا۔ خود دولت آباد کو راجدھانی بنانے کا خیال ابھی اس کے ذہن میں اس لیے آیا کہ دکن کے غیر یقینی حالات پر قابو پایا جا سکے۔

مرکزی اقتدار میں اضافہ کرتے ہوئے محمد بن تغلق نے اقطاع داروں (گورنروں) کے معینہ وقت پر تبادلے پر زور دیا تاکہ وہ لوگ وہاں اپنی پکڑ مضبوط بنا کر خود مختار نہ ہو جائیں۔ اقطاع چونکہ قانونی طور پر قابل منتقلی زمینی محصول کا عطیہ ہوا کرتا تھا اور اقطاع دار اقطاع کا مالک نہ ہو کر منتظم ہوا کرتا تھا۔ سلطان کی اس پالیسی کی بھرپور مخالفت ہوئی۔ زیادہ تر امیر (گورنر) جو مالدار اور بڑے صوبوں جیسے بنگال ،مالوہ، گجرات، ملتان وغیرہ کے اقطاع دار تھے، وہ اپنے صوبے چھوڑنے کو تیار نہیں ہوتے تھے اور منتقلی کے شاہی فرمان کو ماننے سے انکار کر دیتے تھے۔ شاہی فرمان کی حکم عدولی کا مطلب عبرت ناک سزا کو دعوت دینا ہوتا تھا اس لیے یہ باغی امیر سلطان کے خلاف اپنی فوج تیار کرنے لگ جاتے تھے، تاکہ عتاب شاہی سے بچ سکیں۔ محمد بن تغلق کے پورے دور حکومت میں لگاتار بغاوتوں کے پیچھے یہی پالیسی کارفرما تھی۔

14.3.4 سیاسی اور انتظامی منصوبہ بندیاں

سلطان محمد بن تغلق ایک قابل، باصلاحیت، محنتی اور زیرک حکمران تھا۔ اس نے اپنے عہد میں کئی انتظامی اصلاحات کیں اور ان کو نافذ کرنے کے لیے بھرپور محنت کی لیکن عوام کی بے صبری اور افسروں کی سختی اور جلد بازی نے اس کی کئی اہم اصلاحات اور منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ ضیاء الدین برنی نے سلطان کی پانچ اہم منصوبوں کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے۔

1. دوآب میں محصول میں اضافہ
2. راجدھانی کی دیوگیری منتقلی
3. علامتی سکوں کا اجراء
4. خراسان پر حملہ
5. قراچل مہم

14.3.4.1 دوآب میں محصول کا اضافہ

کسی بھی حکمراں کے لیے محصول یا مال گزاری میں اضافہ اس کی اولین ترجیحات میں شامل ہوتا ہے۔سلطان محمد بن تغلق نے زمینوں کے محصول سے متعلق رجسٹروں کی ترتیب اور تیاری کا حکم جاری کیا۔صوبوں کے تمام گورنروں کو مال گزاری سے متعلق جملہ مواد اکٹھا کرنے کی ہدایات دیں۔حکومتی آمدنی بڑھانے کے مقصد سے اس نے گنگا جمنا دوآب کے زرخیز علاقے میں محصول کی شرح میں اضافہ کیا۔اس کے علاوہ اشیاء کی درآمد و برآمد پر محصول میں بھی بڑھوتری کی اور اس کی وصولی کے لیے مختلف چنگیاں قائم کیں۔جس وقت یہ فیصلہ لیا گیا اس وقت ملک شدید قحط سے دوچار تھا۔اس سب کے باوجود جب محصولوں کی وصولی میں عاملوں نے جابرانہ طریقہ اپنایا تو حالات اور بدتر ہوگئے اور یہ منصوبہ ناکام ہوگیا۔

سلطان نے کسانوں کے حالت کو سدھارنے کی بھرپور کوشش کی۔محصولات کو مناسب حد تک کم کیا۔آب پاشی کے لیے بہت سے کنوے کھدوائے۔غیر مزروعہ زمینوں کو زیر کاشت لانے کی سہولیات فراہم کروائی۔دہلی کے عوام کے لیے غذائی اشیاء کی فراہمی اور کسانوں کو تقاوی (قرض دینے کی سہولیات) کا بھی انتظام کیا لیکن اس کام کے نگراں افسروں کی بے ایمانی اور بددیانتی اور عوام کی جلد بازی اور صحیح جگہ قرضوں کے استعمال نہ کرنے کی وجہ سے کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ محصول کے بوجھ اور قرضوں کی سختی سے وصولی سے تنگ آگئے اور وہ اپنی مزروعہ زمینوں کو چھوڑ کر جنگلاتی علاقوں میں چھپنے لگے۔سرکاری افسروں نے کسانوں کو ان کے کھیتوں پر لوٹانے کے لیے مزید بے رحمی کا مظاہرہ کیا۔اس طرح کی ناقابل برداشت کاروائی سے سلطان کی مقبولیت روز بروز متاثر ہوتی گئی اور آخر کار سلطان نے اپنے منصوبے کو واپس لے لیا۔

14.3.4.2 راجدھانی کی دیوگیری منتقلی

سلطان محمد بن تغلق کے متعدد منصوبوں میں لوگوں کو سب سے زیادہ زحمت و پریشانی میں مبتلا کرنے منصوبہ راجدھانی کو دہلی سے دیوگیری منتقل کرنا تھا۔اس نے دیوگیری کو دولت آباد کا نام دیا اور اُسے راجدھانی بنانے کا فیصلہ کیا۔جغرافیائی عوامل کے حساب سے راجدھانی کی ہندوستان کے وسطی علاقے میں منتقلی درحقیقت نامناسب نہیں تھی۔دہلی شمالی سرحدی راہ داری سے قریب ہونے کے سبب حملہ آوروں کی زد میں رہتی تھی۔مزید یہ کہ دکنی علاقوں کو دہلی سلطنت میں شامل ہوئے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔لہٰذا یہ علاقہ مرکز کی

جانب سے زیادہ توجہ کا طالب تھا۔ راجدھانی کی تبدیلی سے جہاں ایک طرف سلطان نئے مفتوحہ علاقوں کو اپنی راست نگرانی میں رکھ سکتا تھا وہیں مرکز کو شمال مغرب کے حملہ آوروں سے کافی راحت مل سکتی تھی۔ بہر حال بتایا جاتا ہے کہ اپنے اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اس نے اپنے افسران، متمول لوگوں نیز صوفیا اور علمائے کرام کو دیوگیری جانے کا حکم دیا۔ البتہ عوام کو نئے مقام کی جانب منتقل ہونے کا حکم نافذ نہیں کیا گیا تھا۔ شاہی افسران نے فرمان شاہی کو سبھی لوگوں کے لیے سمجھ کر دہلی کے تمام باشندوں اور شہریوں کو ایک ساتھ دہلی سے دیوگیری کی جانب کوچ کے لیے مجبور کیا۔ اس جبر و ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دہلی کچھ عرصے کے لیے تقریباً ویران سی ہوگئی۔

محمد بن تغلق نے دہلی سے دولت آباد تک کشادہ سڑک تعمیر کروائی۔ اس کے دونوں جانب کارواں سرائیں بنوائیں تاکہ مسافر حسب ضرورت وہاں آرام کر سکیں۔ لیکن چونکہ منتقلی کا یہ عمل موسم گرما میں شروع ہوا تھا اس لیے کئی افراد سفر کی تکالیف اور بے انتہا گرمی کے سبب راستے ہی میں جاں بحق ہوگئے اور جو لوگ جوں توں کر کے نئی راجدھانی پہنچے انہیں وطن کی یاد نے بے چین کر ڈالا۔ وہ نسل در نسل دہلی دہلی کے قدیم باشندے تھے اور وہاں سے ان کی یادیں جڑیں تھیں۔ انہیں یہ نئی جگہ راس نہیں آئی۔ اس تعلق سے وی۔ اے اسمتھ عجیب و غریب دلیل دیتا ہے کہ ''راجدھانی کی اس تبدیلی کے پیچھے سلطان کا انتقام کا احساس کارفرما تھا۔ وہ دہلی کے باشندوں کو سزا دینا بلکہ دہلی کو برباد کرنا چاہتا تھا اور یہ اس وجہ سے تھا کہ دہلی کے بعض باشندوں نے اس کی پالیسیوں کی ہجو (برائی) لکھ کر کے اس کے دیوان عام میں پھینکنے کی جسارت کی تھی۔'' اسمتھ کا یہ خیال بہت سطحی مشاہدے کا نتیجہ ہے کیوں کہ کوئی بھی سلطان چاہے کتنا بھی جابر کیوں نہ ہو جان بوجھ کر اپنی خوشحال راجدھانی کو نہیں برباد کر سکتا۔ راجدھانی کی تبدیلی کو ابھی چند سال ہی گذرے تھے کہ محمد بن تغلق نے دولت آباد کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس عملی تجربے نے اُسے یہ بات پوری طرح سمجھا دی تھی کہ جس طرح وہ دہلی میں رہ کر دکن پر حکومت نہیں کر سکتا اسی طرح دولت آباد میں قیام پذیر ہو کر شمالی ہند کو اپنی حکمرانی میں نہیں رکھ سکتا۔

اگرچہ دولت آباد کو راجدھانی بنانے کی تمام تر کوششیں وقتی طور پر ناکام رہیں لیکن بڑے پیمانے پر لوگوں کی یہ منتقلی کئی طویل مدتی فوائد کا باعث بنی۔ شاہراہ اور کاروان سرایوں کی تعمیر سے لوگوں کے ادھر سے ادھر جانے میں اضافہ ہوا اور شمالی ہند اور دکن گویا قریب آ ملے۔ بیشتر عوام نے جن میں صوفیا بھی شامل تھے دولت آباد میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اس طرح شمالی ہند کی ہند اسلامی تہذیب یا ترک فارسی ثقافت کے دکن میں پھیلنے کا راستہ کھلا۔ شمالی اور جنوبی ہند کے درمیان اس ثقافتی تال میل سے جنوبی ہند میں مخصوص دکنی تہذیب کا ارتقا ہوا۔

14.3.4.3 علامتی سکے کا اجراء

محمد بن تغلق کا ایک اور منصوبہ کرنسی نظام میں تبدیلی اور نئی کرنسی کا آغاز تھا۔ چنانچہ اس نے کئی طرح کی نئی کرنسی جاری کرنے کا عملی تجربہ کیا۔ اس تجربے کی بنیاد پر ہی اسے ''شاہ رقومات'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس نے سکوں کے ڈھالنے کے پورے نظام میں ترمیم کرتے ہوئے مختلف النوع سکوں کو چاندی اور سونے کی تبدیل شدہ قدروں سے مربوط اور ہم آہنگ کیا ہے۔ اس کا سب سے بے باک قدم، اور قابل ذکر تجربہ ایک نئی کرنسی کی ابتدا ہے۔ عہد وسطیٰ کے پورے عرصے میں کرنسی کی قیمت کا تعین، سکے کی اصل دھاتی قدر کے

مطابق ہوتا تھا۔ یعنی کہ سکہ کی ظاہر قیمت (Face Value) اور اس کی اصل قدر ہمیشہ یکساں ہوا کرتی تھی یعنی دھات کی قیمت و قدر کو جس قدر نقصان پہنچتا سکے کی ظاہری قیمت میں بھی اتنی ہی کمی مان لی جاتی۔

محمد بن تغلق نے ایک چینی حکمران کی جانب سے جاری کردہ کاغذی کرنسی سے تحریک پا کر اختراعی انداز میں تانبے کے سکوں کی کرنسی کو متعارف کرنے کی کوشش کی۔ اس نے وافر مقدار میں تانبے کے سکے ڈھالنے کا حکم دیا اور ان تانبے کے سکوں کو رائج الوقت چاندی کے سکے ٹنکے کے بالمقابل پیش کیا، لیکن یہ اس کے بس میں نہ تھا کہ گھریلو طور پر تیار تانبے کے نقلی سکوں کی روک تھام کر سکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نقلی سکہ ڈھالنے کی ہوڑ لگ گئی۔ سرکاری محصول نقلی سکوں میں ادا کیا جانے لگا۔ نقلی سکے لاکھوں کی تعداد میں ڈھالے جا رہے تھے اور سرکاری خزانہ انہیں سے بھر رہا تھا۔ اس طرح سرکاری خزانہ اصلی سونے چاندی سے محروم ہوتا چلا گیا۔ بیرونی کاروبار میں جمود آ گیا تھا کیونکہ سرکاری خزانہ بے وقعت ہو چکا تھا۔ ان علاقوں میں جہاں سلطان کا حکم نہ چلتا تھا یہ کرنسی قابل قبول نہیں تھی۔ مجبوراً سلطان کو سکوں کے قدیم نظام کی جانب واپس آنا پڑا۔ عوام کو موقع دیا گیا کہ وہ اپنی کرنسی کا سرکاری خزانے میں موجود چاندی کے اصل سکوں سے مبادلہ کر لیں۔ نتیجتاً علامتی سکوں کے ساتھ ساتھ نقلی کرنسی بھی سرکاری خزانے میں جمع ہوتی چلی گئی اور حکومت کو زبردست خسارے سے دوچار ہونا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ عوام نے تغلق آباد میں علامتی سکوں کا ڈھیر لگا دیا تھا۔

14.3.4.4 خراسان مہم

دور وسطیٰ کے رائج طریقوں کے مطابق حکومت کی کوئی باضابطہ اور مستقل فوج نہیں ہوتی تھی۔ اصل فوج سپاہیوں کی محدود و مختصر تعداد پر مشتمل ہوا کرتی تھی۔ البتہ جنگ کے زمانے میں حسب ضرورت عارضی لشکر تشکیل دے دیا جاتا تھا جو کسی مہم کی تکمیل کے لیے وقف ہوتا اور متعلقہ جنگ میں جو مال غنیمت حاصل ہوتا اسی سے سپاہیوں کا معاوضہ بھی ادا کر دیا جاتا۔ علاء الدین خلجی کی طرح محمد بن تغلق بھی اپنے اقتدار کی دنیا بھر میں توسیع چاہتا تھا۔ جب بعض خراسانی سرداروں نے اس کے سامنے یہ بات رکھی کہ خراسان بآسانی قابل فتح ہے تو سلطان نے ایک محدود وقت میں عظیم الشان عارضی لشکر تیار کیا تا کہ خراسان اور عراق کو اپنے زیر نگیں لایا جا سکے۔ سال بھر کی تنخواہ فوج کو ادا کر دی گئی لیکن فوج عملی طور پر کچھ بھی نہ کر سکی۔ پھر سلطان کو یہ اندازہ ہو گیا کہ جغرافیائی رکاٹیں اس کے منصوبے کو برباد کر سکتی ہیں اور ایسے عظیم منصوبے کے لیے اس کے پاس مزید سرمایہ بھی نہیں ہے، تو اسے تسخیر عالم کی اس مجوزہ مہم سے دست بردار ہونا پڑا۔ مرکز کو اس اسکیم سے کوئی فائدہ تو نہیں ہوا البتہ اس ادھوری مہم نے مزید خزانہ خالی کر دیا۔

14.3.4.5 قراچل پر حملہ

قراچل کے بارے میں ابن بطوطہ نے لکھا ہے کہ "یہ علاقہ دہلی سے دس کوس کی دوری پر تھا۔" حبیب اور نظامی نے اس کی شناخت باوثوق طور پر وسطی ہمالیائی خطے میں ضلع کانگڑا سے کی ہے۔ ابن بطوطہ لکھتا ہے کہ "ہمالیہ کی آزاد راجپوت ریاستوں میں چینی مداخلت محمد بن تغلق کے لیے تشویش کا باعث تھی۔ چینیوں نے عسکری اہمیت کے ایک مقام پر ایک مندر تعمیر کیا تھا اور اس علاقہ میں اپنے اختیارات کی توسیع

کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ چنانچہ اس علاقہ کی قلعہ بندی سلطان کی ایک وسیع پالیسی کا حصہ تھی۔اس کے لیے سلطان نے اپنے بھانجے خسرو ملک کی قیادت میں تفصیلی ہدایات کے ساتھ دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل ایک فوج روانہ کی۔ یہ فوج جریال لہر پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو گئی۔ سلطان نے اپنے سپہ سالار کواس سے آگے نہ جانے کی تلقین کی لیکن کامیابی کے غرور میں اس نے سلطان کا فرمان نہیں مانااور تبت کی جانب آگے بڑھ گیاجہاں سنگلاخ چٹانوں اور پہاڑوں میں پیش قدمی ناممکن ہو گئی۔ فرشتہ کے مطابق یہ پورا لشکر ہمالیائی سلسلے میں ضائع ہو کر رہ گیا۔تاہم ایک ہمعصر مورخ ضیاء الدین برنی لکھتاہے کہ مذکورہ مہم جوئی چین کے خلاف نہیں بلکہ ہندوستان اور چین کے درمیان واقع کوہ قراچل کے ایک باغی سردار کے خلاف تھی۔اس مہم کافوری مقصد تو پورا ہو گیایعنی سرکش پہاڑی لوگ مصالحت پر راضی ہو گئے اور انہوں نے خراج کی ادائیگی تسلیم کی لیکن سلطان کا پورا لشکر راستے کی مشکلات کا شکار ہو کر تباہ و برباد ہو گیا۔

14.3.4.6 دیوانِ کوہی کا قیام

محمد بن تغلق نے زرعی ترقی کے لیے اپنی ذہانت کا بھرپور استعمال کیا۔ سائنسی انداز میں مسائل کی تہہ تک رسائی کی کوشش کی۔ دیوان کوہی کے نام سے ایک علاحدہ زرعی شعبہ قائم کیا جس کا مقصد غیر مزروعہ اراضی کو براہِ راست سرکاری نظم و نسق کے تحت زیر کاشت لانا تھا۔اس نے ایک وسیع زمینی علاقے کا انتخاب کیااور یہ جاننے کے لیے کہ کس نوع کی فصل کے لیے کون سی اراضی زیادہ موزوں رہے گی اس نے مختلف اقسام کی فصلوں کی کاشت کروائی۔اس اعلیٰ ترین منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لیے اس نے کافی خطیر رقم خرچ کی لیکن بدنظمی اور بدعنوانی کے منفی عناصر نے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ یہاں یہ بات ضرور ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ واقعی اس کے یہ تجربات لائق تحسین اور قابل قدر تھے۔ کیونکہ چند صدیوں بعد یعنی انیسویں صدی میں جب دنیا کے طول و عرض میں زراعتی شعبہ کے تربیتی ادارے قائم کیے جا رہے تھے اس وقت بھی زمینی پیداوار میں اضافے کی خاطر مختلف اراضی کی مناسب و موزونیت کا پتہ محصول ے کے لیے مماثل تجربات کیے گئے۔

14.3.4.7 محمد بن تغلق بحیثیت حکمراں

محمد بن تغلق کے جدید منصوبے اگرچہ نیک نیتی اور اخلاص پر مبنی تھے لیکن ان کو عملی جامہ پہنانے میں کئی کوتاہیاں سرزد ہوئیں۔ نتیجتاًاس کے منصوبے نہ صرف یہ کہ ناکام ہوئے بلکہ ان کے سبب رعایا کو نہایت ہی تکلیف دہ حالات سے دوچار ہونا پڑا۔ بجاطور پر یہ کہا جاسکتاہے کہ سلطان محمد بن تغلق ہندوستان کے دور وسطیٰ کا غیر معمولی اور نمایاں شخص تھا۔اس کی شخصیت کچھ ایسی پیچیدہ اور منفرد تھی کہ اس کے کردار کو کسی خاص متعین خانے میں نہیں رکھا جاسکتا۔ دور جدید کے ماہرین نے اس کی فطانت وذہانت کا کھلے طور پر اعتراف کیا ہے لیکن ساتھ ہی اس کو خبطی یا جنونی کہنے سے بھی احتراز نہیں کیا۔اس کا ذکر مرکب اضداد اور تضادات کے مجموعے کے طور پر کیا گیاہے۔ حالانکہ وہ ایک باصلاحیت اور مختلف صفات اور خوبیوں والا انسان تھا لیکن عملی زندگی میں وہ بری طرح ناکام رہا۔ وہ ایک جید عالم تھااور ایک قادر الکلام مقرر بھی تھا۔ فن خطاطی میں بھی اسے ملکہ حاصل تھا۔ علم منطق اور یونانی فلسفے پر اسے عبور حاصل تھا نیز علم ریاضی اور علوم طبعی سے اسے گہری دلچسپی تھی لیکن یہ سب خوبیاں اس کے کچھ کام نہ آسکیں اور اس کی پوری زندگی صرف فطری اور خیالی منصوبوں کی نذر ہو کر رہ گئی اور

عملی طور پر اس نے اپنی رعایا کو سہولیات فراہم کرنے کے بجائے مزید مسائل و مصائب الجھا دیا۔ الغرض اس کا عہد انسانیت سوز سختیوں کا ایسا دور ثابت ہوا کہ جس کے سبب سلطنت دہلی کا شیرازہ منتشر ہونے لگا۔

اپنے اسلاف کے بالمقابل محمد بن تغلق کو کافی وسیع، عظیم تر، اور خوش حال ریاست یا مملکت نصیب ہوئی تھی۔ ایک ہمعصر مصنف کے مطابق کل 23 صوبے جات اس کے زیر نگیں تھے۔ شمال مغرب میں پنجاب سے شروع ہو کر مشرق میں بنگال تک جبکہ جنوب میں اس کی ریاست، میسور کے علاقوں تک پھیلی ہوئی تھی اور ان علاقوں میں معبر یا کورومنڈل ساحل بھی شامل تھا۔ اپنی حکومت کے آخری ایام میں محمد بن تغلق کو ہر جانب سے بغاوتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ زندگی کے آخری سالوں میں بھی وہ بغاوتوں کو کچلنے میں مصروف تھا۔ 1350ء میں گجرات میں ہونے والی بدامنی کا اس نے ازالہ کیا اور دوسرے ہی برس 1351ء میں جبکہ وہ سندھ کے علاقے ٹھٹھ میں ایک باغی سردار کا تعاقب کر رہا تھا اس کا انتقال ہو گیا۔

4.4 سلطان فیروز شاہ تغلق 1351-1388ء

14.4.1 ابتدائی حالات

سلطان محمد بن تغلق کی وفات پر سندھ میں اس کی فوج کو قائد کی عدم موجودگی کی بنا پر سندھ کے باغیوں اور منگولی دستوں کے ہاتھوں شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ اس بدحالی کے عالم میں فوج کے سالاروں نے مرحوم سلطان کے بھتیجے کمال الدین فیروز کو اس کا جانشین منتخب کیا۔ کمال الدین فیروز، محمد بن تغلق کے چھوٹے بھائی ملک رجب کا بیٹا تھا۔ اس کی ماں دیپال پور کے رائے انمل بھٹی کی راجپوت بیٹی شہزادی انیلا تھی۔ فیروز انہیں کے گھر میں 1309ء کو پیدا ہوا۔ ابھی وہ سات برس کا تھا کہ اس کے والد ملک رجب کا انتقال ہو گیا۔

سلطان محمد نے اسے اپنے بیٹے کی طرح پال اور حکومت کے تمام سول محکموں جیسے ریاستی پالیسی، انتظامیہ، حساب کتاب اور تقرری وغیرہ کی مکمل تربیت دی۔ فیروز امیر حاجب یا باربک کے عہدے پر فائز تھا لیکن سلطان نے متعدد اہم فرائض اس کو سونپ رکھے تھے۔ فیروز نے اپنے چچا کی پُر خلوص اور وفادارانہ اطاعت کی تھی۔ ابتدا میں وہ سلطنت کی باگ ڈور سنبھالنے میں پس و پیش کا شکار تھا۔ امراء، فوجی افسران اور سلطان کے بہی خواہوں کے اصرار پر فیروز نے اپنی رضامندی ظاہر کی اور فوج کو واپس دہلی لے آیا۔ وہاں دہلی میں سلطان مرحوم کے ایک نقلی فرزند کو تخت و تاج حوالے کرنے کا ایک منصوبہ زیر غور تھا جو فیروز کے دہلی پہنچنے پر ناکام ہو گیا۔ اس وقت سے کوئی 38 سال تک ہندوستان میں پرامن طریقہ سے فیروز کی حکومت جاری رہی۔ اس کے دور میں مجموعی طور پر امن وامان قائم رہا۔ دہلی آنے کے بعد اکیس دنوں تک جشن اور خوشی منائی گئی۔

سلطان فیروز شاہ تغلق ایک رحم دل اور نیک طبیعت کا مالک اوسط ذہن کا آدمی تھا مگر وہ کمزور شخص نہیں تھا۔ اس کے تجربات الگ تھے اور وہ ظالم و جابر ہرگز نہیں تھا۔ البتہ اس دور میں قیادت و سالاری کے لیے جو صفات متوقع اور ضروری تھیں وہ اس میں مفقود تھیں۔ اس نے بنگال کو دہلی سلطنت کے تحت لانے کے لیے دو مرتبہ چڑھائی کی لیکن یہ کوششیں نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکیں۔ آخر کار 1360ء میں اس

نے بنگال کے ساتھ امن وامان کا معاہدہ کر لیااور اس طرح اس نے بنگال کی آزادی کو عملاً تسلیم کر لیا۔ دہلی کی طرف واپسی کے سفر میں اس نے جاج نگر (اڑیسہ) پر چھاپہ مارااور اس کے حکمران کو پابند عہد کیا کہ وہ ہر سال بطور خراج ہاتھیوں کی ایک مقررہ تعداد دہلی روانہ کرے گا۔ اس کا دوسرا اہم فوجی کارنامہ یہ ہے کہ اس نے نگر کوٹ (کانگڑہ) کے دشوار ترین قلعے پر قبضہ کیا۔ بعد ازاں اس نے سندھ پر چڑھائی کی۔ ابتدائی ناکامیوں کے باوجود فیروز نے اپنی کوششیں جاری رکھیں اور بالآخر سندھ کے حکمراں کو اطاعت تسلیم کرنی پڑی۔ دہلی آنے کے کچھ ہی دنوں بعد سلطان فیروز شاہ تغلق نے اپنی حکومت کی بہتری کے لیے کئی اہم قانونی انتظامی اقدامات بھی کیے۔

14.4.2 زرعی اصلاحات

سلطان فیروز شاہ تغلق کو اس کے کئی اہم منصوبوں اور اصلاحات کی بنا پر آج تک یاد کیا جاتا ہے۔ اُس نے کسانوں کے حالات سدھارنے کے لیے کئی مخلصانہ کوششیں اور اہم اقدامات کیے۔ اس نے مرحوم سلطان محمد کی جانب سے دور قحط سالی میں کسانوں کو جو قرضے دیے گئے تھے انہیں معاف کر دیا۔ پھر اس نے مال گزاری نظام کی اصلاح کی جانب توجہ مبذول کی۔ وہ زراعت اور اس کے نظام کو حیات تو بخشنا چاہتا تھا جو سابق حکومت کی تباہ کن محصول پالیسی کے سبب تقریباً تباہ ہو چکا تھا۔ اس نے کئی غیر واجبی محصولات کو ختم کر دیا اور محصول وصولی کے دوران ہونے والی زیادتیوں کا خاتمہ کر دیا۔ محصولات کو کم سے کم کر دیا اور حکومت کے متعینہ محصول کے علاوہ ریاست کے تمام غیر واجبی مطالبات کو معاف کر دیا۔ اس نے فاضل یا متروک زمینوں کو زیر کاشت لانے کے لیے آب پاشی کی سہولیات فراہم کیں اور زراعت کو فروغ بخشا۔ اس نے سرکاری نہروں سے استفادہ کرنے والی زرعی زمینوں کی پیداوار پر دس فیصد محصول عائد کیا۔ ان اقدامات کے ذریعے زراعت کو فروغ حاصل ہوا اور کسانوں کی خوشحالی لوٹ آئی۔

14.4.3 آب پاشی ذرائع کی مرمت اور تعمیر

تاریخِ مبارک شاہی میں فیروز شاہ کے نہر کے نظام کا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ 1355ء کو فیروز شاہ نے دیپال پور کا رخ کیا اور وہاں ستلج سے جہباز (Jahbaz) تک ایک نہر کھدوائی۔ دوسرے ہی سال، منڈل اور سرمور کے نواحی علاقے میں دریائے جمنا سے ایک نہر کھدوائی جس میں سات معاون نہروں کا پانی آکر ملتا تھا اور اصل نہر کو ہانسی تک پہنچایا پھر ہانسی سے بارہ لسان تک اور پھر مزید آگے حصار فیروز تک اسے بڑھایا اور حصار فیروزہ کے شاہی محل کے قرب وجوار میں ایک وسیع تالاب تعمیر کروایا جس میں مذکورہ نہر کے ذریعے پانی جمع ہوتا تھا۔ اس نے گھاگر سے ایک اور نہر کھدوائی جو سرتا قلعہ کی جانب سے گزرتے ہوئے ہری گھری تک پہنچتی تھی۔ نیز بدمنی کے پاس دریائے جمنا سے ایک اور نہر کھدوائی جو حصار فیروز کے قریب ایک تالاب میں شامل ہوتے ہوئے آگے بڑھ جاتی۔

ملتان کے گورنر کی حیثیت سے عین الملک ماہرو نے جو اصول وضع کیا تھا غالباً اسے پورے نہری نظام پر منطبق کیا گیا۔ بڑی نہروں کی تعمیر مرکزی حکومت کی ذمہ داری تھی اور ذیلی نالوں کی تعمیر، خواہ وہ معاون نالے ہوں یا کھیتوں تک پانی پہنچانے والے ذیلی نالے، ان کی تعمیر اور ان کا تحفظ سرکاری افسران کے ذمے تھا لیکن اس تعمیر و تحفظ کی قیمت کسانوں سے حاصل کی جاتی تھی۔ پانی استعمال کرنے کے لیے انہیں

اس کی قیمت ادا کرنا ضروری تھی۔

14.4.4 شہر کاری اور فن تعمیر

سلطان فیروز شاہ تغلق ایک قابل حکمراں اور تعمیرات کا شائق تھا۔ اس نے اپنی سلطنت میں کئی اہم عمارتیں، شہر اور نہریں تعمیر کروائیں۔ وہ مختلف شہروں، مسجدوں تعلیمی اداروں، شفاخانوں، باندھوں اور نہروں کی تعمیر کے لیے بجاطور پر مشہور ہے۔ اس نے دہلی میں فیروز آباد کے نام سے ایک نئی راجدھانی تعمیر کرائی اور حصار فیروزہ، فتح آباد اور جون پور شہروں کی بنیاد رکھی۔ دہلی کے آس پاس میں کئی باغ لگوائے جس سے نہ صرف اس کے جمالیاتی ذوق کی تسکین ہوئی بلکہ خزانے کو بھی فائدہ ہوا۔

14.4.5 غلامی کا نظام

سلطان فیروز شاہ نے غلامی کو ایک منظم ادارے کی شکل دی۔ اس نے اپنے افسران کو ہدایت دی کہ جنگ کے موقع پر زیادہ سے زیادہ قیدیوں کو گرفتار کر لیا جائے اور ان میں سے بہتر کو دربار کی خدمات کے لیے دہلی روانہ کیا جائے۔ اس نے غلاموں کی نگرانی اور تعلیم و تربیت کی جانب خصوصی توجہ دی۔ انہیں فوجی، محافظ اور کاریگروں کی حیثیت سے استعمال کیا۔ غلاموں کے لیے ایک علاحدہ محکمہ قائم کیا جس کے لیے الگ سے عہدے داروں اور خزانے کا انتظام کیا۔ جنگ میں پکڑے گئے غلاموں کو صوبائی دارالحکومت کے لیے روانہ کر دیا جاتا اور باقی کو دہلی میں ہی روک لیا جاتا۔ غلاموں کو یا تو فوجیوں کی طرح زمین کی مالگزاری سے حصہ ادا کیا جاتا یا ان کی نقد تنخواہ مقرر ہوتی۔ مختلف دست کاریوں کے لیے تقریباً بارہ ہزار غلاموں کو تربیت دی گئی تھی۔ تقریباً سبھی وزارتوں، محکموں اور کارخانوں میں غلام موجود تھے۔ اس پورے نظام کا مرکز چالیس ہزار غلاموں کا ایک جتھہ تھا جو شاہی محل کی نگرانی و خدمت پر مامور تھا۔ انہوں نے آپس میں اپنا ایک مضبوط اتحاد قائم کر لیا اور وہ شاہ دہلی کے وفادار نہ تھے۔

14.6.5 رفاہی اصلاحات

فیروز نے صوبوں کے مابین تجارت میں حائل چنگی کے بعض محصولات کو منسوخ کر کے داخلی تجارت کو فروغ دیا۔ اذیت رسانی اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کی سزاؤں کو خاتمہ کیا۔ شہر دہلی میں مفت شفاخانوں کا قیام، بے روزگاری کے مسئلہ سے نمٹنے کے لیے ایک دفتر روزگار کی تشکیل نیز ضرورت مند والدین کے لیے مسلم لڑکیوں کی شادی کے سلسلے میں مالی تعاون کی فراہمی وغیرہ اس کے دیگر رفاہی اور فلاحی کام ہیں۔ اس نے دوبارہ اپنے فوجی عہدیداروں کو نقد تنخواہوں کے بجائے مال گزاری کے ساتھ جاگیریں عطا کرنے کا طریقہ شروع کیا۔ علاءالدین خلجی نے سرکاری عہدیداروں کو تنخواہوں کی ادائیگی کا یہ طریقہ اس لیے منسوخ کر دیا تھا کہ اس کی وجہ سے بغاوتیں جنم لے رہی تھیں۔

14.4.6 فیروز شاہ تغلق کے عہدِ حکومت کا جائزہ

فیروز جب عمر طبعی کو پہنچا تو اس نے مملکت کے اکثر معاملات وزراء کے حوالے کر دیے۔ یہ منصوبہ اسی طرح ناکام ہو گیا جس طرح اس سے قبل اپنے بیٹوں کو حکومت اور اختیارات میں اپنے ساتھ شریک کرنے کی کوشش ناکام ہو چکی تھی۔ 1388ء میں یہ معمر سلطان نیک

نامی کے ساتھ اس دار فانی سے رخصت ہوا۔ اس کا دور حکومت نرم دلی، انسانیت اور روشن خیالی کے لیے مشہور ہے۔ ایک بہترین حکمراں ہونے کے باوجود وہ ایک اچھا سپہ سالار نہیں تھا۔ بنگال میں اس کی طویل ترین فوجی مہمات بے نتیجہ رہیں اور سندھ کی جانب اس کی پیش قدمی جزوی طور پر کامیاب رہی اور اس کا بھی کوئی مفید نتیجہ نہیں نکل سکا۔ اس نے دکن کو دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ذاتی طور پر اسے فتوحات سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی اور وہ شکار کا شوقین بھی نہیں تھا۔ اسے علم تاریخ اور تعمیرات سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔

اس کے چند اقدامات سے آئندہ دنوں میں چند مسائل کھڑے ہوئے۔ جاگیرداری نظام کا احیا، مرکز کی کمزوری کا سبب بنا اور جاگیردار مرکزی اقتدار کو چیلنج کرنے لگے۔ بڑی تعداد میں غلاموں کے تقرری کے باعث سرکاری خزانہ خالی ہو گیا اس کے علاوہ ان کی وفاداری بھی بھروسے کے قابل نہ تھی بلکہ ان کا وجود خود سلطنت کے لیے ایک خطرہ بنا ہوا تھا۔ اس کی وفات کے ساتھ ہی اس کے فرزندوں اور اس کے پوتوں میں حسب روایت جانشینی کے جھگڑے شروع ہو گئے۔ اقتدار کی خاطر آپسی کشمکش نے سلطنت کو انتشار اور پریشانی میں ڈھکیل دیا۔ دہلی سلطنت کی یہ کمزوری، 1398ء میں تیمور کے دہلی پر حملے کی وجہ سے اور بھی زیادہ ہو گئی۔ دہلی کی جانب پیش قدمی کرنے والی تیمور کی فوج نے راستے میں کئی شہروں کو بے رحمی سے تخت و تاراج کیا۔ بالآخر تیمور دہلی میں داخل ہوا اور بے دردی کے ساتھ اسے بھی تباہ و برباد کر ڈالا۔ اس موقع پر بے شمار مرد، عورت اور بچے مارے گئے۔ وہ دولت کے ساتھ ساتھ، ہندوستانی کاریگروں، ماہرین تعمیر، سنگ تراشوں اور نجاروں وغیرہ کو اپنے ساتھ لے گیا۔ تیمور کے اس حملے کے ساتھ دہلی سلاطین کے استحکام کا دور اپنے اختتام کو پہنچا حالانکہ تغلق خاندان کی حکومت 1412ء تک جوں توں کر کے چلتی رہی۔

14.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

تغلق سردار غازی ملک نے غاصب خسرو پر حملہ کر کے اسے ہلاک کر دیا۔ 1320ء میں غازی ملک دہلی کا سلطان بنا اور اس نے تغلق سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس نے اپنا خطاب غیاث الدین تغلق شاہ رکھا۔ اس نے بنگال فتح کیا اور دوسرے صوبوں میں بھی امن و امان قائم کیا۔ دہلی کی طرف واپسی کے وقت ایک عارضی شامیانے کے گرنے سے اس کی موت ہو گئی۔ دہلی کے قریب شہر تغلق آباد کا بانی غیاث الدین تغلق ہے۔ صحیح معنوں میں تغلق سلطنت کو پروان چڑھانے والا بادشاہ محمد بن تغلق ہے۔ کیونکہ وہ ایک نظری و فکری شخص تھا اس لیے اس نے کئی اہم منصوبے اور اسکیمیں بنائیں۔ کم و بیش اس کے سارے ہی منصوبے ناکام ہو کر رہ گئے۔ دہلی کے بجائے دولت آباد کو راجدھانی بنانے کی کوشش، نقالوں سے مناسب تحفظ کے بغیر تانبے کے سکوں کو رائج کرنے کا فیصلہ جیسی غلط پالیسیوں نے اسے عوام میں غیر مقبول کر دیا۔ محمد بن تغلق کے بعد فیروز شاہ تغلق تخت و تاج کا مالک بنا۔ اپنی حکمرانی کے 38 سالہ طویل دور میں فیروز شاہ نے قابل ذکر اصلاحات کے ذریعے کئی انتظامی خامیوں کو دور کیا۔ فیروز شاہ نے خود اپنی زندگی میں ہی اپنے بیٹے محمد شاہ کو اقتدار سونپ دیا۔ اس کے نااہل ثابت ہونے کے سبب غیاث الدین تغلق دوم کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور آ گئی لیکن شاہی گھرانے میں موجود اقتدار کے بھوکے شہزادوں کی آپسی کشمکش پر وہ قابو نہ پا سکا اور اقتدار کی خاطر یہ رسہ کشی تقریباً پچیس سال تک چلتی رہی۔ اس کے علاوہ 1398ء میں امیر تیمور کے دہلی پر حملے نے رہی سہی کسر پوری

کر دی۔ دہلی کی معاشی اور سیاسی پوزیشن برباد ہو کر رہ گئی اور اس طرح تغلق سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

14.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

قراؤنہ: ترکستان اور سندھ کے درمیان آباد ترکو کا ایک قبیلہ ، مارکوپولو کے مطابق اس سے مراد وہ مخلوط نسل جن کے باپ تاتاری اور مائیں ہندوستانی تھیں۔

شہِ رقومات : محمد بن تغلق کا لقب، چونکہ اس نے اپنے عہدِ حکومت میں کئی جدید قسم کے سکے اور کرنسیاں جاری کی تھیں اس وجہ سے اس کو یہ خطاب دیا گیا تھا۔

تنکہ: سلطان التتمش کے دور میں جاری کیا گیا چاندی کا ایک سکہ

قراچل: کماؤں اور گڑھوال کے قریب ضلع کانگڑا کا وسطی ہمالیائی علاقہ۔

دیوانِ کوہی: یا دیوانِ امیر کوہی، محمد بن تغلق کے زمانے میں زراعت کی ترقی کی خاطر قائم کیا جانے والا ادارہ۔

14.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Exanimation Questions)

14.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. تغلق خاندان کا بانی کون تھا؟
2. محمد بن تغلق نے کون سا زرعی شعبہ قائم کیا تھا؟
3. کس نے کہا تھا ''ہنوز دلی دور است ؟
4. الغ خان کس کا لقب تھا؟
5. کس سلطان نے علامتی سکے جاری کیے تھے ؟
6. محمد بن تغلق نے اپنی راجدھانی کہاں منتقل کی تھی ؟
7. غازی ملک کون تھا؟
8. دیوانِ کوہی کس سلطان نے قائم کیا تھا؟
9. غیاث الدین نے منگولوں کے خلاف کتنی جنگیں جیتی تھیں ؟
10. محمد بن تغلق کا جانشین کون تھا؟

14.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سلطان غیاث الدین تغلق کی ابتدائی مشکلات بیان کیجیے۔

2. سلطان محمد بن تغلق کی مالگزاری پالیسی پر ایک جامع نوٹ تحریر کیجیے۔
3. سلطان محمد بن تغلق کی کرنسی اصلاحات پر مختصر روشنی ڈالیے۔
4. سلطان فیروز تغلق کی زرعی اصلاحات کی تفصیلات بیان کیجیے۔
5. سلطان محمد بن تغلق کے دو اہم منصوبوں کا جائزہ لیجیے۔

14.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. سلطان غیاث الدین تغلق کے ابتدائی مسائل کیا تھے اور اس نے ان پر کیسے قابو پایا، وضاحت کیجیے۔
2. سلطان محمد بن تغلق کی راجدھانی منتقلی کے اسباب و وجوہات بیان کیجیے۔
3. سلطان فیروز شاہ تغلق کی زرعی اصلاحات پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

14.8 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Qureshi. I., *Administration of the Sultanare of Delhi*. Munshiram Manoharlal Publishers, Bombay. 1995.
2. Satish Chandra., *Medieval India*, Vol. I&ll, Orient Longman Limited, Hyderabad, 2000.
3. Irfan Habib., *Medieval India The Study of a Civilization*. National Book Trust. Delhi, 2008.
4. K.A Nizami., *Some Aspects of Religion and Politics in India 13th century*, Bombay. 1961
5. Mehdi Hasan., *Tughluq Dynasty*. Karachi. 1963.
6. محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی — جامع تاریخ ہند، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی ۲۰۱۱ء
7. ستیش چندرا — عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان (سلطنت سے مغل عہد تک) قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی ۲۰۱۱ء
8. محمد مجیب — ہندوستانی مسلمان، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی

اکائی 15۔ سید خاندان

(Syed Dynasty)

اکائی کے اجزا

15.0 تمہید

15.1 مقاصد

15.2 سید خاندان کا قیام

15.2.1 خضر خان کا عروج وارتقا

15.2.2 ملو اقبال کے خلاف کاروائی

15.2.3 محمود تغلق اور دولت خان کی سرکوبی

15.2.4 خضر خان کی دیگر مہمیں اور کارگزاریاں

15.2.5 خضر خان بحیثیت حکمران

15.3 سلطان سید مبارک شاہ

15.3.1 کھوکھروں اور راجپوتوں کی بغاوتیں

15.3.2 میواتیوں کی بغاوتوں کا خاتمہ

15.3.3 دیگر بغاوتیں اور ان کا خاتمہ

15.4 سلطان سید محمد شاہ

15.4.1 سرور الملک کی سازش اور اس کا خاتمہ

15.4.2 کھوکھروں کی بغاوت

15.5 سلطان سید علاء الدین عالم شاہ

15.6 اکتسابی نتائج

15.7 کلیدی الفاظ

15.8 نمونہ امتحانی سوالات

15.8.1 معروضی سوالات

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

15.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

15.0 تمہید (Introduction)

فیروز شاہ تغلق کی وفات کے بعد دلی سلطنت طوائف الملوکی کا شکار ہو گئی۔ سیاسی اقتدار کے حصول کے لیے امراء میں جنونی کشمکش کا دور شروع ہوا۔ سلطنت کی راجدھانی دہلی سے لے کر شمالی ہندوستان کی مختلف شقوں اور اقطاعات میں سیاسی کشمکش اور بدامنی کا دور دورہ تھا۔ ایسے حالات میں آخری تغلق حکمران محمود تغلق کو آخری دنوں میں مشکلات سے گزرنا پڑا کیونکہ رقبے کے اعتبار سے اس کا دائرہ حکومت کافی سمٹ چکا تھا اور اُسے مقطیوں اور جاگیرداروں کی بغاوتوں کا بھی سامنا تھا۔ 1412ء میں اس کی وفات کے ساتھ ہی تغلق خاندان کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ کچھ دنوں تک سیاسی اتھل پتھل کے بعد 1414ء میں ملتان کے گورنر خضر خان کو دہلی کے تخت پر قابض ہونے کا موقع ملا۔ اس کے دعوے کے مطابق وہ ایک سید یعنی حضرت محمدؐ کی نسل سے تھا۔ لہٰذا اس کی قائم کردہ حکومت کو سید سلطنت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سیدوں کی حکمرانی عہد سلطنت کے تمام خاندانوں میں سب سے مختصر مدت یعنی محض 37 سال تک قائم رہی۔ جس کی بنیاد خضر خان نے رکھی۔ خضر خان کے علاوہ سید مبارک شاہ، سید محمد شاہ اور سید علاءالدین عالم شاہ اس خاندان کے اہم حکمراں گزرے ہیں۔ سید حکمرانوں کا پورا عہد حکومت اقطاع داروں، جاگیرداروں اور مختلف سرداروں کی بغاوتوں سے بھرا پڑا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سید حکمرانوں کا زیادہ تر وقت اور ان کی پوری طاقت چھوٹے چھوٹے سرداروں اور زمینداروں سے نمٹنے میں ہی ضائع ہو گئی۔ ان کے کسی بھی حکمران میں دلی سلطنت کی قدیم مرکزیت بحال کرنے کا حوصلہ نہیں تھا۔ نہ ہی انہیں ایسے دور اندیش، مدبر اور فہم و شعور رکھنے والے معاون ملے جن میں دلّی سلطنت کو مستحکم اور وسیع کرنے کی صلاحیت ہو۔ چنانچہ دہلی سلطنت کا رقبہ کافی سمٹ گیا تھا۔

15.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- سید خاندان کی سلطنت کے قیام سے واقف ہو سکیں گے۔
- خضر خان کے کارناموں کو بیان کر سکیں گے۔
- خضر خاں کے مسائل اور پریشانیوں کا جائزہ لے سکیں گے۔
- سید حکمرانوں کے خلاف ہونے والی بغاوتوں پر روشنی ڈال سکیں گے۔

- مبارک شاہ کے دور حکومت کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- محمد شاہ کے حالات پر گفتگو کر سکیں گے۔
- سید حکومت کے خاتمے کے بارے میں بتا سکیں گے۔

15.2 سید خاندان کا قیام

15.2.1 خضر خان کا عروج وارتقا

سید خاندان سے واقفیت کا سب سے اہم ماخذ یحییٰ احمد سرہندی کی کتاب "تاریخ مبارک شاہی" ہے۔اس کے مطابق سید خاندان کے بانی خضر خان کا تعلق پیغمبر اسلام ﷺ کے خانوادے سے تھا۔ خضر خان سلطان فیروز تغلق کے ایک ممتاز امیر ناصر الملک مردان الدولہ کے گود لیے بیٹے ملک سلیمان کا بیٹا تھا۔ ملک سلیمان سلطان فیروز شاہ تغلق کے دورِ حکومت میں ایک اہم امیر تھا۔ ملک سلیمان کے انتقال کے بعد فیروز شاہ تغلق کے فرزند سلطان محمد شاہ نے خضر خان کو ملتان کا گورنر (اقطاع دار) مقرر کیا تھا۔ 1395-96ء میں ملو اقبال خان کے بھائی سارنگ خان سے جو لاہور اور دیپال پور کا گورنر تھا خضر خان کی زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ اس لڑائی میں خضر خان کو زبردست شکست کا سامنا کرنا پڑا نتیجتاً ملتان کی گورنری خضر خان کے ہاتھوں سے نکل کر سارنگ خاں کے ہاتھوں میں آگئی۔ خضر خان نے حالات سے مجبور ہو کر میوات کے مقطی بہادر ناہر سے پناہ طلب کی لیکن جلد ہی ہندوستان پر تیمور کے کامیاب حملے کے بعد اس کے دن لوٹ آئے اور اسے دوبارہ اقتدار حاصل کرنے کا موقعہ مل گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ جب تیمور نے دہلی پر قبضہ کیا تو میوات سے خضر خان، بہادر ناہر، مبارک خان اور زیرک خان کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لیے طلب کیا تا کہ وہ فاتح تیمور کی اطاعت کا اقرار کریں اور اس سے وفاداری کا حلف اٹھائیں۔ یحییٰ سرہندی نے لکھا ہے کہ تیمور خضر خان پر نہایت مہربان ہوا اور اسے دہلی کی حکومت بخش دی اور ہندوستان سے روانہ ہوتے وقت اسے ملتان اور دیپال پور بھی عطا کر دیے۔ اس واقعے کے باعث شمالی ہند میں خضر خان کی پوزیشن کافی مستحکم ہوئی اور سیاسی اقتدار کے دیگر خواہشمندوں پر اسے یقینی فوقیت حاصل ہوگئی۔ حالانکہ اس کے سیاسی راستے میں ابھی بھی بڑی دشواریاں تھیں جنہیں حل کرنا انتہائی ضروری تھا۔ تغلق خاندان کے کئی امرا خضر خان کی ترقی سے ناخوش اور اس کے خلاف مناسب موقع کی تلاش میں تھے۔ قحط اور وبائی امراض ہر خاص و عام کے لیے پریشانی کا باعث تھے۔ ہندوستان پر تیمور کے حملے کے وقت دہلی اور اس کے مضافات کے علاقے جہاں سے تیمور کا گزر ہوا تھا، قحط سالی اور وباؤں کا شکار ہو گئے۔ چنانچہ دلی سلطنت کے تخت تک پہونچنے کے لیے اس کو بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

15.2.2 ملو اقبال کے خلاف کاروائی

خضر خان کے لیے ملو اقبال خان کی دہلی کی جانب پیش قدمی ایک اہم مسئلہ تھی۔ ملو اقبال برن سے چل کر دہلی پہونچا اور نصرت شاہ کو دہلی سے نکال بھگایا۔ سیری اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں پر قابض ہو کر اس نے دہلی کو آباد کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ اس طرح جب

خضر خان ملتان، دیپال پور اور بالائی سندھ کے علاقوں میں اپنی پوزیشن مستحکم کر رہا تھا اس وقت اس کا سیاسی حریف ملو اقبال دہلی اور دوآبہ کے علاقوں میں اپنی گرفت مضبوط کرنے میں مصروف تھا۔ ملو اقبال اپنے تمام حریف اقطاع داروں کی قوت توڑ دینا چاہتا تھا۔ سب سے پہلے 06-1405ء میں اس نے خضر خان کے خلاف پیش قدمی کی۔ خضر خان نے اجودھن کے قریب دریائے دھندا کے کنارے اس کا مقابلہ کیا اور اس لڑائی میں ملو اقبال کو شکست ہوئی۔ اس نے میدان سے فرار کی کوشش کی لیکن کامیاب نہیں ہوا اور اس کا سر قلم کر دیا گیا۔ اس طرح خضر خان کے ایک زبردست حریف کا خاتمہ ہو گیا۔

15.2.3 محمود تغلق اور دولت خان کی سرکوبی

ملو اقبال کی موت کے بعد دہلی کے امرا نے سلطان محمود تغلق کو قنوج سے بلوایا۔ نااہلی اور عیش پرستی میں غرق ہونے کے باوجود اس نے دہلی اور اس کے گرد و نواح کے علاقوں پر 1412ء تک کسی نہ کسی طرح حکومت جاری رکھی۔ 12-1405ء کے دوران خضر خان رفتہ رفتہ اپنی پوزیشن مستحکم کرتا رہا۔ اس نے دیپال پور سے آگے تک کے وسیع علاقے کو اپنے دائرہ اختیارات میں لے لیا۔ سلطان محمود کی وفات کے موقع پر امرا اور اشراف نے دولت خان کی اطاعت قبول کی۔ خضر خان ان تبدیلیوں پر کچھ عرصے تک خاموش رہا اور مسلسل حالات کا جائزہ لیتا رہا۔ 1413ء کے آخری ایام میں اس نے دہلی کی جانب پیش قدمی کی۔ شہر کے داخلی دروازے پر فوجی کیمپ لگا کر پورے شہر کو محاصرے میں لے لیا۔ اس کا یہ محاصرہ لگاتار چار ماہ تک جاری رہا۔ شہر کے اندر ضروری اشیاء کی شدید قلت ہو گئی اور کچھ ہی دنوں میں حالات مزید بدتر ہو گئے۔ جب دولت خان کو اپنی کمزوری اور بے بسی کا شدید احساس ہوا تو اس نے خضر خان سے رحم کی درخواست کی۔ اس کی درخواست کو قبول کرتے ہوئے اسے قوام خان کی نگرانی میں حصار فیروزہ بھیج دیا گیا۔ اس طرح دہلی خضر خان کے زیر اقتدار آ گیا۔

محمد حبیب اور کے۔ اے۔ نظامی کے مطابق ''6 جون 1414ء کو خضر خان اپنی فوج کے ساتھ سری میں داخل ہوا اور سلطان محمود کے محل کو اپنی رہائش گاہ بنایا۔ دہلی آنے کے بعد خضر خان نے افراتفری اور بدامنی کے دور میں پریشان حال دہلی کے عوام کا دل جیتنے اور ان کا تعاون حاصل کرنے کی بھرپور کوششیں شروع کیں۔ عوام کو بڑے پیمانے پر تحفے تحائف دیے اور ان کے لیے وظیفے جاری کیے۔ یحییٰ سرہندی نے لکھا ہے کہ ''اس کے اس عمل نے عوام کو خوش حال اور مالا مال کر دیا تھا''۔ اپنے قریبی امراء اور اہم حمایتیوں کو عہدوں اور خطابات سے نوازا۔ ملک الشرق ملک تحفہ کو ''تاج الملک'' کے خطاب کے ساتھ وزیر مقرر کیا گیا۔ سہارنپور کا ''اقطاع'' سیّد سلیم کو دیا گیا اور اسے سلطان کا مشیر خاص بنایا گیا۔ ریاست کے اکثر امور اسی کے مشورے سے انجام دیے جاتے تھے۔ ملک سلیمان کے متبنیٰ ملک عبدالرحیم کو علاء الملک کے خطاب سے نوازا گیا اور اسے فتح پور کا ''مقطی'' اور ''شق دار'' بنایا گیا۔ ملک سرور کو ''شحنہ شہر'' اور ''نائب غیبت'' مقرر کیا گیا۔ ملک داؤد ''دبیر'' مقرر ہوا اور اختیار خاں کو دوآب کے علاقہ میں ایک شق عطا کی گئی۔ الغرض خضر خان کی انتظامیہ مختلف سیاسی، سماجی اور ثقافتی گروہوں کے افراد پر مشتمل تھی۔ تاہم اس کا سیاسی نظام سابقہ حکمرانوں کی بنسبت کمزور تھا۔

15.2.4 خضر خان کی دیگر مہمیں اور کار گزاریاں

خضر خان کا پورا عہد حکومت مخالفین سے نمٹنے اور باغی عناصر کی سر کوبی میں گزرا۔ کٹیہر، بدایوں، اٹاوہ، پٹیالی، گوالیار، بیانہ، چندوار، ناگور اور میوات کے علاقے کافی شورش زدہ تھے۔ ان علاقوں میں نیم آزاد مقامی سرداروں کا ایک نیا طبقہ وجود میں آیا جو اقطاع دار زمیندار کہلاتے تھے۔ اس طبقے نے اپنے مخصوص جغرافیائی محلِ وقوع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مرکزی اقتدار کو اپنے مقبوضہ علاقوں سے بے دخل کرنے کی بار بار کوششیں کیں۔ مشرقی علاقوں میں کارروائی کے لیے خضر خان نے تاج الملک کو نگران مقرر کیا اور مغربی علاقوں کے باغیوں کی بیخ کنی کے لیے زیرک خان کو ذمہ دار بنایا۔ 1414-15ء میں خضر خاں نے سب سے پہلے اپنے وزیر تاج الملک کی قیادت میں کٹیہر کی جانب ایک فوج روانہ کی۔ وہاں کے رائے ہر سنگھ نے سلطان کی ماتحتی قبول کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ خضر خان کی فوج کی آمد کی اطلاع ملتے ہی وہ آنولہ کی گہری گھاٹی کی جانب فرار ہو گیا۔ تاج الملک نے اس کا پیچھا کیا اور اس پر شدید دباؤ ڈالا۔ چنانچہ جب بچنا ممکن نہیں رہا تو خراج، نقدی اور تحائف (محصول، مال و خدمتی) ادا کرنے پر راضی ہو گیا۔ بدایوں کے امیر مہابت خان نے بھی خود سری اختیار کرنے کا ارادہ کیا۔ تاج الملک نے اس کے خلاف بھی کاروائی کی چنانچہ اس نے وزیر کے آگے ہتھیار ڈال دیے۔ اس کے بعد تاج الملک نے کھور (شمس آباد) اور کمپیل (ضلع فرخ آباد میں فتح گڑھ سے ۲۸ میل مغرب میں ایک گاؤں) کے سرداروں کی سرزنش کرتے ہوئے گوالیار، سپور اور چندوار کے راجپوت سرداروں کے خلاف جنہوں نے محصول ادا کرنے سے منع کیا تھا پیش قدمی کی اور انہیں سلطان کی اطاعت اور محصول ادا کرنے پر آمادہ کیا۔ بالآخر اٹاوہ کے سرغنوں کو سزا دیتے ہوئے وہ دہلی واپس آگیا۔

1415-16ء میں بیرم خان کی وفات کے بعد خضر خان نے تمام مغربی صوبے جن میں فیروز پور اور سرہند وغیرہ شامل تھے اپنے بیٹے شہزادہ مبارک شاہ کے اختیار میں دے دیے۔ ملک سدھونا کو شہزادہ کا نائب مقرر کیا۔ جون 1416ء میں بیرم خان ترک بچہ نے سلطان کے خلاف بغاوت کی اور ملک سدھونا کو قتل کر کے سرہند پر قبضہ کر لیا۔ خضر خان نے ملک داؤد اور زیرک خان کو ان باغیوں سے نمٹنے کے لیے بھیجا۔ بیرم خان ترک بچہ نے دہلی کی فوج سے ٹکرانا مناسب نہیں سمجھا اور پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ دہلی کی فوج نے دو ماہ تک ان کا تعاقب کیا اور جب وہ ہاتھ نہیں لگے تو تعاقب چھوڑ دیا گیا۔

اگست 1416ء کے آتے آتے گجرات کے حاکم سلطان احمد نے ناگور پر حملہ کر دیا۔ اس حملے کی اطلاع ملتے ہی خضر خان ناگور کے لیے روانہ ہوا۔ خضر خان کی آمد کی خبر سے خائف ہو کر سلطان احمد دھار کی طرف کوچ کر گیا۔ اس کے بعد خضر خان نے ''جھائیں'' کے امیر الیاس خاں سے وفاداری کا حلف اٹھوایا۔ ادھر بیانہ اور گوالیار سے بھی شورش کی خبریں مل رہی تھیں چنانچہ 1416-17ء میں سلطان خضر خان نے اپنے وزیر تاج الملک کو بیانہ اور گوالیار کی مہم پر روانہ کیا۔ تاج الملک کی آمد کی اطلاع ملتے ہی شمس خان اوحدی کا بھائی کریم الدین بیانہ آیا اور دہلی سلطنت کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ بعد ازآں تاج الملک نے گوالیار کی جانب پیش قدمی کی۔ شہر کو تاخت و تاراج کیا اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ قلعہ بلندی پر واقع ہونے کی وجہ سے فتح نہیں کیا جا سکا لیکن وہ گوالیار سے کچھ خراج وصول کرنے میں کامیاب ہو گیا۔

1417-18ء میں طغان رئیس اور بیرم خاں ترک بچہ نے ایک بار پھر سرہند میں بغاوت کر دی اور سرہند میں شہزادہ مبارک کے نمائندے ملک کمال بدھن کا گھیراؤ کر لیا۔ سلطان نے اس شورش کو دبانے کے لیے سامانہ کے امیر زیرک خان کو روانہ کیا۔ زیرک جب وہاں پہونچا تو ان لوگوں نے محاصرہ اٹھا لیا اور دوبارہ پہاڑوں میں جا چھپے۔ امیر زیرک نے پایل تک جو سرہند کی سرکار میں ایک پرگنہ تھا ان کا تعاقب کیا اور طغان کو تین شرطیں ماننے پر مجبور کیا۔

1. جرمانہ ادا کرنا۔
2. بیرم خان ترک بچہ کو ملک بدر کر دینا جو ملک سدھونا کے قتل میں ملوث تھے۔
3. اپنے بیٹے کو یرغمال کے طور پر دہلی بھیجنا۔

طغان نے تمام شرائط مان لیں اور اطاعت کا وعدہ کیا۔ ابھی مغربی علاقے کے حالات قابو میں آئے ہی تھے کہ مشرقی علاقے میں ایک بار پھر شورش برپا ہو گئی۔ کٹیسر کے رائے ہر سنگھ نے 1418ء میں ایک بار پھر بغاوت کا اعلان کر دیا۔ اس سے نمٹنے کے لیے خضر خان نے تاج الملک کو بھیجا۔ ہر سنگھ شکست نے کھا کر آنولہ کی گھاٹیوں میں روپوش ہونے کی کوشش کی لیکن اسے وہاں سے نقصان اٹھا کر بھاگنا پڑا۔ بہر حال وہ کماؤں کی پہاڑیوں میں چھپنے میں کامیاب ہوا۔ اس کے تعاقب میں بیس ہزار فوج بھیجی گئی۔ کافی تگ ودو کے بعد بھی کچھ مال غنیمت کے حصول کے علاوہ سلطانی فوج کو رائے کے خلاف کوئی ٹھوس کامیابی نہیں ملی۔

1420ء میں تاج الملک کو خبر ملی کہ اٹاوہ میں حالات دن بدن خراب ہو رہے ہیں۔ اس نے برن اور کول کے سرداروں کی بیخ کنی کرتے ہوئے اٹاوہ کی طرف پیش قدمی کی اور اٹاوہ کے رائے سبیر کا محاصرہ کر لیا۔ رائے نے اطاعت قبول کرتے ہوئے سالانہ خراج ادا کرنے کی پیشکش کی جسے قبول کر لیا گیا۔ اس کے بعد تاج الملک نے چنداور کی طرف کوچ کیا اور اسے تاراج کیا۔ 1421ء میں خضر خاں میوات کی جانب متوجہ ہوا جہاں بہادر ناہر نے ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ چنانچہ سلطان نے کوٹلہ کے قلعہ کا محاصر کر لیا جس میں بہادر ناہر چھپا بیٹھا تھا۔ قلعہ کے باہر کے لوگوں نے اطاعت قبول کر لی اور کچھ دن بعد بہادر نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ کوٹلہ کا قلعہ تاراج کر دیا گیا۔ وہاں سے خضر خان گوالیار اور اٹاوہ کی جانب متوجہ ہوا۔ اٹاوہ کے سردار رائے سبیر مر چکا تھا۔ اس کے بیٹے نے پابندی سے محصول دینے کا وعدہ کیا۔ جنوری 1421ء میں خضر خان کے بہادر اور باصلاحیت وزیر تاج الملک کا انتقال ہو گیا۔ خضر خان نے تاج الملک کی جگہ اس کے بڑے بیٹے ملک الشرق ملک سکندر کو اپنا وزیر نامزد کیا۔ تاج الملک کی وفات کو ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے کہ 20 مئی 1421ء کو خود خضر خان بھی اس عالم فانی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔

15.2.5 خضر خان بحیثیت حکمران

خضر خاں کا دور بہت مختصر تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت بغاوتوں کو کچلنے میں ہی صرف ہو گیا۔ اس کے باوجود وہ نہایت لائق اور دور اندیش حکمران تھا۔ وہ اپنی مخصوص صلاحیتوں اور لیاقتوں کے ذریعے ایک ادنی پوزیشن سے ترقی کرتے ہوئے دہلی کا تخت سلطانی حاصل کرنے میں

کامیاب ہوا۔ سلطان بننے کے بعد اُسے کئی مسائل اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ کٹیہر، میوات، سرہند، بیانہ، گوالیار اور بدایوں جیسے باغیانہ علاقوں میں نظم و نسق قائم کرنا اور ان کو سلطنت کی انتظامی اکائیوں سے جوڑ کر رکھنا کوئی آسان بات نہیں تھی۔ باغیوں کو ان کے علاقے کے جغرافیائی محلِ وقوع کے باعث ایک طرح کی فوقیت حاصل تھی اور سلطان کے لیے ان کے خلاف سخت اقدام کرنا کافی دشوار تھا۔ تاج الملک جیسے امراء کے تعاون اور مدد سے اس نے ان علاقوں پر مرکزی اقتدار کا رعب و دبدبہ قائم کرنے کی بھرپور کوشش کی اور اس میں کچھ حد تک کامیاب بھی رہا۔ حالانکہ اس کی یہ تمام کاوشیں وقتی اور عارضی ثابت ہوئیں۔ جیسے ہی سلطان کی مرکزی افواج وہاں سے کارروائی کر کے آگے بڑھتیں باغی سردار اپنی آزادی یا بغاوت کا دوبارہ اعلان کر دیتے۔ بہر حال خضر خاں نے ساری سلطنت کو متحد اور مستحکم رکھنے کی کوشش جاری رکھی اور اپنی رعایا کو عادلانہ اور منصفانہ نظم و نسق سے فیضیاب کیا۔ مؤرخ فرشتہ لکھتا ہے کہ رعایا اس کی ماتحتی میں خوش تھی اور بادشاہ سے اس کی محبت کا اظہار اس امر سے ہوتا ہے کہ اس کی وفات پر رعایا میں نوجوان، بوڑھے، غلام اور آزاد سبھی نے سیاہ لباس زیب تن کر کے اپنے رنج و الم کا اظہار کیا تھا۔

15.3 سید مبارک شاہ (1421-1433)ء

سید خاندان کا اہم ترین حکمران خضر خان کا بیٹا سید مبارک شاہ (1421-1433) تھا۔ اس کا نام مبارک خان تھا۔ حکمراں بننے کے بعد اس نے معزالدین مبارک شاہ کا لقب اختیار کیا اور تاریخ میں مبارک شاہ کے نام سے مشہور ہوا۔ 1415ء میں خضر خان نے اسے اپنی ریاست کے مغربی علاقوں کی کمان سونپی تھی۔ اپنی وفات سے تین دن قبل خضر خاں نے اُسے اپنا ولی عہد نامزد کر کے تخت پر بٹھایا تھا۔ اس کے تمام اہم اور بااثر امیروں اور ملکوں نے اس کی ولی عہدی کو منظور کیا تھا۔ خضر خاں کے انتقال کے بعد تمام امراء اور ملکوں نے از سرِ نو اس کی وفاداری اور اطاعت کا حلف اٹھایا۔ اس طرح بقول حبیب اور نظامی 22 مئی 1421ء کو مبارک شاہ باضابطہ تخت و تاج کا وارث بنا۔ دہلی کے تخت پر مسند نشین ہونے کے بعد مبارک شاہ نے اپنے امرا اور ملکوں کے درمیان ان کے سابقہ اقطاعات اور ذمہ داریوں کی نہ صرف توثیق کی بلکہ بعض امور کو از سرِ نو ترتیب دیا۔ حالات کے دباؤ کے پیشِ نظر یہ ترتیب نو ضروری تھی۔ حصار فیروزہ اور ہانسی کے اضلاع کی ذمہ داری ملک رجب سے لے کر ملک الشرق ملک بدھ کے سپرد کر دی گئی اور ملک رجب کو دیپال پور کی شق میں ایک اقطاع دے دیا گیا۔

مبارک شاہ نے اقطاعات کی تبدیلی کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اسے انتظامیہ پر مکمل اعتماد حاصل تھا۔ غالباً اس کی یہ کوشش تھی کہ ملک میں ایک ایسا طبقہ قائم کیا جائے جو بادشاہ اور ریاست کا وفادار ہو۔ یہ کہنا بھی غلط نہیں ہوگا کہ شاید وہ مردم شناس نہیں تھا اور اس نے غلط لوگوں پر اعتماد کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے پورے دور میں مسلسل بغاوتیں ہوتی رہیں۔

15.3.1 کھوکھروں اور راجپوتوں کی بغاوتیں

انتظامیہ میں ابتدائی ردوبدل کے بعد شمال مغربی علاقوں میں نظم و نسق کی صورتِ حال بحال کرنے پر اپنی توجہ مبذول کی جہاں کے حالات قطعاً اطمینان بخش نہیں تھے۔ سرکش عناصر کی بیخ کنی کے لیے پنجاب کی جانب فوری توجہ کی ضرورت تھی۔ لٰہذا مبارک شاہ نے جون

1421ء میں جسرتھ کی بغاوت کو ختم کرنے کے لیے سرہند کی جانب پیش قدمی کی۔ جسرتھ لدھیانہ کی طرف پسپا ہو گیا۔ مبارک شاہ اور اس کی فوج نے اس کے خلاف لدھیانہ کی طرف کوچ کیا اور دشمنوں کا تعاقب جاری رکھا۔ جگہ جگہ ان کو نشانہ بنایا اور ان کے خلاف سخت کاروائیاں کیں۔ جسرتھ کے ایک مضبوط قلعہ تلسر کو تباہ و برباد کر دیا گیا اس کے باوجود اس کی طاقت کو پوری طرح کچلا نہیں جا سکا۔ اس کے باوجود مورخین کا ماننا ہے کہ مجموعی طور پر جسرتھ کے خلاف اس کی یہ کاروائی بظاہر کامیاب رہی۔ کچھ دنوں کے لیے کھوکھروں کی ریشہ دوانیوں سے نجات ملی۔ چنانچہ ان کی بغاوت کو ختم کرنے کے بعد مبارک شاہ لاہور واپس لوٹ آیا۔

جسرتھ کے خلاف کامیاب کاروائی کرنے کے بعد مبارک شاہ نے ویران اور اجڑے شہر لاہور کو بحال کرنے کی جانب توجہ کی جو تیمور کے حملے کی تباہ کاریوں کے بعد بے توجہی کا شکار تھا۔ مبارک شاہ کے احکام پر وہاں گھروں کی تعمیر نو اور مرمت کا کام شروع ہوا اور لوگوں کو وہاں از سرِ نو آباد کیا گیا۔ قلعہ اور دروازوں کی مرمت پر تقریباً ایک ماہ کا وقت اور کثیر رقم خرچ ہوئی۔ لاہور کے اقطاع کی ذمہ داری ملک الشرق محمود حسن کے سپرد کی گئی۔ لاہور کی عسکری پیش بندی، کھوکھروں کی پے در پے بغاوتوں اور ترکوں کی مسلسل شورشوں کے پیش نظر وہاں دو ہزار گھوڑ سواروں کا ایک مستقل فوجی دستہ تعینات کیا گیا۔

دسمبر و جنوری 23-1422ء کے دوران مبارک شاہ نے کٹیہسر کی جانب اپنی توجہ مبذول کی اور وہاں سے خراج وصول کیا۔ بدایوں کا امیر مہابت خاں جو خضر خاں کے عہد میں شاہی افواج سے خوفزدہ ہو گیا تھا، شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی اطاعت اور وفاداری کا اعلان کیا۔ اس کے بعد سید مبارک شاہ نے راٹھور راجاؤں کی سرحدوں کی جانب پیش قدمی کی اور بدعہدوں اور باغیوں کو سزا دی اور کچھ دنوں تک گنگا کے کنارے کے علاقے میں مقیم رہا۔ راٹھوروں سے نمٹنے کے لیے زیرک خاں اور کمال خاں کو کمپل میں ہی چھوڑ دیا۔ اسی دوران اٹاوہ کے سردار رائے سبیر نے بغاوت کر دی لیکن جب مبارک شاہ کے آنے کے بارے میں سنا تو خوفزدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ملک خیر الدین خانی کو ایک بڑی فوج کے ساتھ اس کے تعاقب میں بھیجا گیا۔ خیر الدین اسے پکڑنے میں ناکام رہا لیکن اس کی جاگیر کو تباہ کر دیا تھا۔ مبارک شاہ تیزی سے اٹاوہ پہونچا اور رائے کو اطاعت کرنے اور خراج (مال و خدمتی) ادا کرنے پر مجبور کیا۔ اپریل 1423ء میں سلطان مبارک شاہ دہلی لوٹ گیا۔ اسی دوران خبر آئی کہ پنجاب اور سیوستان (سندھ) کے حالات ناسازگار ہو رہے ہیں اور وہاں فوجی کاروائی اور فوری اقدامات ضروری تھے۔ سلطان نے ملتان اور سیوستان کو ملک الشرق ملک محمود حسن کی زیر نگرانی کیا۔ عارض الممالک کا عہدہ ملک خیر الدین خانی سے لے کر ملک الشرق محمود حسن کے سپرد کیا۔ محمود حسن نے ملتان کے حالات پر فوری توجہ دی اور ایک عظیم فوج لے کر ملتان پہنچ گیا۔ وہاں اس نے بغاوتوں اور شورشوں سے خوفزدہ لوگوں میں کھویا ہوا اعتماد بحال کیا۔ فیاضانہ انعامات، وظائف اور خصوصی عطایا کے ذریعے مقامی قائدین کو مبارک شاہ نے اپنے حق میں ہموار کیا۔ اس نے ملتان کے قلعہ کی مرمت کروائی اور دفاعی انتظامات کو مزید مضبوط کیا ساتھ ہی کسی بھی ناگہانی حملے کا مقابلہ کرنے کے لیے سپاہیوں کی ایک بڑی فوج بھرتی کی۔ اس طرح عارض ممالک محمود حسن کے ہاتھوں اس علاقہ کو چین و سکون حاصل ہوا اور رعایا اور عوام کی ترقی کی راہیں ہموار ہوئیں۔ 1424ء میں سلطان گوالیار کی تسخیر اور وہاں سے مالگزاری وصول کر کے دہلی لوٹا۔ اسی سال یعنی 1424ء کے اواخر یعنی نومبر اور دسمبر میں وہ کٹیہسر گیا۔ سلطان نے دریائے گنگا عبور کی اور باغیوں اور بدعہدوں کو سزا دی۔ پھر وہاں سے

کماؤں کی پہاڑیوں کے دامن کی جانب پیش رفت کر کے وہاں کچھ عرصہ مقیم رہالیکن وہاں کی ناقابل برداشت سردی کے باعث اُسے گھر کی راہ لینی پڑی۔ کمپل کے قریب دریائے گنگا کو پار کر کے وہ قنوج کی طرف بڑھالیکن سخت قحط سالی کے سبب مزید پیش قدمی سے وہ رکا رہا۔

15.3.2 میواتیوں کی بغاوتوں کا خاتمہ

مبارک شاہ کے عہد میں میواتی بہت زورآور اور باغی ہو گئے تھے انہوں نے کئی بار بغاوتیں کیں۔ سلطان نے میواتی سرداروں کی بغاوت کو کچلنے کے لیے کئی بار میوات کا رخ کیا۔ اس کی پہلی کاروائی میں کئی دنوں کے محاصرہ سے تنگ آکر میواتیوں نے اپنی زمین کو خود ہی ویران کر دیا۔ میواتی سرداروں نے الور کی پہاڑیوں میں چھپ کر اپنی جان بچائی۔ ایک سال بعد یعنی 1425ء میں میواتیوں نے ایک بار پھر بغاوت کا جھنڈا بلند کیا۔ سلطان نے دوبارہ میوات کی طرف پیش قدمی کی اور ان کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان کی آمد کی خبر پا کر میواتی سردار بہادر ناہر کے پوتے جلو اور قدّو اپنے علاقوں کو تباہ و برباد کر کے اندور کی پہاڑیوں میں چھپ گئے۔ مبارک شاہ نے اندور کے قلعہ کو مسمار کر دیا اور باغی میواتی سرداروں کی تلاش میں الور کی جانب پیش قدمی کی۔ جلو اور قدّو نے اپنے آپ کو الور کے قلعہ میں بند کر لیا۔ شاہی فوجوں نے ان پر سخت دباؤ ڈالا شاہی افواج کے دباؤ کے سبب میواتی سرداروں نے ہتھیار ڈال کر اطاعت قبول کر لی لیکن قدّو نے اپنے پہاڑی علاقوں میں بھاگ جانے کی کوشش کی۔ اسے پکڑ کر قید کر دیا گیا اور میوات کو تاخت وتاراج کر دیا گیا۔

ان تمام کوششوں کے باوجود میواتی اپنی شر پسندیوں سے باز نہیں آئے اور ابراہیم شرقی کے ساتھ اس کی کشمکش میں انہوں نے شرقی سلطان کا ساتھ دیا۔ چنانچہ 1428ء میں مبارک شاہ نے ان میواتیوں کے خلاف جنہوں نے شرقی حکمرانوں کی حمایت کی تھی سخت کاروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے ملک قدّو کو شرقی سلطان کا ساتھ دینے کے الزام میں سزائے موت دے دی۔ ملک سرور الملک کو ان کے تمام قلعوں کو تباہ کرنے کا حکم دے دیا۔ اس کاروائی سے علاقہ کے تمام میواتی سردار خوفزدہ ہو گئے۔ قدّو کا بھائی جلال خان، اور دیگر سردار جیسے محمد خان، ملک فخر الدین، ملک علی اور اس کے رشتے دار اندور کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو گئے۔ جب سرور الملک نے ان پر سخت دباؤ ڈالا تو وہ خراج ادا کرنے پر راضی ہوئے۔

1429ء میں میواتیوں نے ایک بار پھر سرکشی کی۔ چنانچہ ان کے خلاف کاروائی کرنے کے لیے مبارک شاہ نے ہندواری کے قلعے کی جانب پیش قدمی کی۔ جلال خان میواتی اور دیگر سرداروں نے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگاتے ہوئے واجب الادا محصول، تحفے تحائف اور خراج ادا کر کے اپنی گلو خلاصی کروائی۔ 1432ء میں جلال خان میواتی نے ایک بار پھر سر ابھارا۔ سلطان میوات کی پہاڑیوں کی جانب پیش قدمی کرتا ہوا "متاوڑو" پہونچا جلال خان میواتی اندور کے قلعہ میں محصور ہو گیا۔ سلطان نے قلعہ کا محاصرہ کرنے کا حکم دیا۔ جلال خان میواتی قلعہ میں آگ لگا کر کوٹلہ بھاگ گیا۔ سلطان کے ہاتھوں بڑی مقدار میں غلہ اور ساز و سامان جو جلال خان نے اکٹھا کر رکھے تھے ہاتھ لگے۔ اس کے بعد سلطان نے تجارہ کی طرف رخ کیا۔ میوات کے علاقے کو لوٹ لیا۔ جلال خان نے اطاعت گزاری کا فیصلہ کیا اور خراج ادا کر کے مطیع ہوا۔

15.3.3 دیگر بغاوتیں اور ان کا خاتمہ

1426ء کے اواخر میں مبارک شاہ نے بیانہ کا رخ کیا۔ بیانہ کے امیر محمد خان نے پہاڑی پر تعمیر شدہ بیانہ کے قلعے میں پناہ لی۔ سولہ دنوں کے شدید محاصرے کے بعد امیر بیانہ نے اطاعت قبول کر لی اور جنگ کے ہر جانے کے طور پر اس نے نقدی، قیمتی اشیاء اسلحے گھوڑے اور دیگر ساز و سامان سلطان کی خدمت میں پیش کیے۔ پھر فوج کے ساتھ مبارک شاہ گوالیار پہنچا۔ گوالیار کے سردار ٹھنکر اور چندوار نے اطاعت اختیار کر کے مالگزاری اور خراج کی ادائیگی قبول کر لی۔ مارچ 1427ء کو سلطان دہلی واپس ہوا۔ بعد کے سالوں میں اُسے بار بار میواتیوں، کھوکروں اور گوالیار کی جانب سے شورشوں کا سامنا کرنا پڑا۔ علاوہ ازیں مملکت کے قدیم خادم سید سلیم کے لڑکوں کی بغاوت سے نمٹنا اور کابل کے شیخ علی کے حملوں کا مقابلہ بھی کرنا پڑا۔

یکم نومبر 1433ء کو اُس نے شہر مبارک آباد کا سنگ بنیاد رکھا اور عمارتوں کی تعمیر کے لیے وسیع تر انتظامات کیے۔ اسی ماہ تبرہند کے دورے کے سبب وہ مرکزی شہر سے غائب رہا۔ والد کی موت اور تبرہند کے قلعہ کو اپنے زیر اثر لانے کے بعد وہاں کے معاملات کی یکسوئی کے لیے اس کا وہاں جانا ناگزیر تھا، لیکن شہر سے اس کی دوری نے سازشی ذہنوں کو اس کے قتل کی سازش کرنے کا موقع فراہم کیا۔ 19 فروری 1424ء کو جب سلطان نماز جمعہ کے لیے جانے والا تھا، میران صدر نے سرورالملک کی مدد سے شاہی محافظ دستہ کو ہٹوا دیا اور رخصتی سلام کے بہانے سے مسلح گھڑ سواروں کو لے آیا اور اس طرح بے خبری کی حالت میں سدھی پال نے نیزے کے ذریعے سلطان کا کام تمام کر دیا۔ محمد حبیب اور کے۔اے۔ نظامی لکھتے ہیں کہ یحییٰ سرہندی کے مطابق "مبارک شاہ نے سترہ (17) سال تین ماہ اور سولہ دنوں تک حکومت کی۔" اس کا عہدِ حکومت متواتر فوجی کارروائیوں سے بھرپور تھا۔ فرشتہ کا کہنا ہے کہ وہ ایک مہذب و شائستہ اور کئی ایک خوبیوں کا مالک حکمران تھا۔

15.4 سید محمد شاہ (43-1434ء)

سید خاندان کا تیسرا قابل ذکر حکمران سید مبارک شاہ کا بھانجہ سید محمد شاہ تھا۔ سرورالملک نے محمد شاہ کی تخت نشینی کی حمایت کر کے اسے یہ باور کروانے کی کوشش کی کہ وہ مبارک شاہ کے قتل کے جرم میں شریک نہیں ہے۔ چونکہ مرحوم بادشاہ نے محمد شاہ کو گود لیا تھا، اس لیے 19 فروری 1434ء کو فرید شاہ کا بیٹا اور خضر خاں کا پوتا محمد شاہ تمام امرا، ملکوں، ائمہ، مشاہیر، علما اور قضاۃ کی منظوری اور حمایت سے تخت و تاج کا مالک بنا۔ نئے سلطان نے سرورالملک کو خاں جہاں کا خطاب دیا اور میران صدر کو اس نے معین الملک کے خطاب سے سرفراز کیا۔

15.4.1 سرورالملک کی سازش اور اس کا خاتمہ

سرورالملک اپنے ان اہم منصب افسروں سے چھٹکارہ حاصل کرنا چاہتا تھا جو مرحوم سلطان کے وفادار تھے۔ چنانچہ محمد شاہ کی تخت نشینی کے دوسرے دن اس نے مبارک شاہ کے کچھ اعلیٰ افسران اور غلاموں کو جنہیں ماہی مراتب کی مراعات حاصل تھیں سلطان سے بیعت کے بہانے بلایا۔ امیرِ کوہی ملک سورا کو قتل کر دیا گیا اور ملک کرم چند، ملک مقبول، ملک فتح اور ملک بیرا کو قید کر دیا۔ ان امرا سے چھٹکارہ پانے کے بعد اس نے انتظامیہ کی از سر نو تنظیم کے ذریعہ اپنے حمایتیوں کا ایک گروہ بنانے کی کوشش کی۔

کمال الملک اور بعض امراء مبارک شاہ کے ناحق قتل کا بدلہ لینے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ دوسری طرف ملکوں کے تئیں سرور الملک کے باغیانہ اور سرکش رویے نے امرا کے ایک بڑے طبقے کو شدید بے چینی اور ناراضگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ لہٰذا خضر خان کے تقرر شدہ کئی امرا اور ملکوں نے اپنے اپنے زیر انتظام علاقوں میں سرور الملک کی سخت مخالفت کی اور اس کے خلاف بغاوت شروع کر دی۔ کچھ مؤرخین کے خیال میں سلطان محمد شاہ خود دل ہی دل میں سرور الملک کا مخالف تھا اور وہ بھی مبارک شاہ کے خون کا بدلہ لینا چاہتا تھا۔ دوسری جانب سرور الملک اور اس کے شرکاء کار بھی نئے سلطان کی جانب سے اندیشہ میں لگے ہوئے تھے کہ کہیں سلطان انہیں دھوکہ نہ دے دے۔ الغرض 14 اگست 1434ء کو سرور الملک اور میراں صدر کے بیٹے سلطان کو قتل کرنے کی نیت سے حجرۂ سلطانی میں اچانک داخل ہوئے۔ سلطان کو پہلے سے ہی اس بات کا اندیشہ تھا اسی لیے وہ پوری طرح تیار تھا۔ لہٰذا اس موقع پر نہ صرف یہ کہ سرور الملک اپنے حملے میں ناکام ہوا بلکہ میراں صدر کے فرزندان کے ساتھ اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ باغی عناصر سے نجات پانے کے بعد باقی تمام امرا نے سلطان محمد شاہ کے ساتھ مکمل وفاداری کا از سر نو عہد کیا۔ اس بیعت ثانیہ کے بعد سلطان محمد حقیقی طور پر دہلی سلطنت کا حکمراں بنا۔

15.4.2 کھوکھروں کی بغاوت

1436ء میں سمانہ کے کھوکھروں نے سر اٹھانا شروع کیا۔ سلطان محمد شاہ نے سمانہ کا رخ کیا اور جسرتھ کھوکھر کے خلاف ایک فوج روانہ کی۔ اس فوج نے کھوکھروں کے علاقوں میں بڑی تباہی مچائی لیکن اس کے خلاف کوئی ٹھوس کاروائی نہیں کر سکے۔ 1441ء میں جسرتھ کھوکھر نے ایک بار پھر سر ابھارا۔ محمد شاہ نے ملک بہلول لودھی کو دیپال پور اور لاہور کے علاقہ عطا کرتے ہوئے اُسے جسرتھ کھوکر کی سرزنش کرنے کی ہدایت دی لیکن جسرتھ نے چپکے سے بہلول کے ساتھ امن معاہدہ کرتے ہوئے مصالحت کر لی اور اس کے شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کی۔ چنانچہ بہلول لودھی کی وفاداری کے قدم لڑکھڑانے لگے۔ وہ تذبذب کا شکار ہو گیا اور سلطان کی توقعات پوری نہ کر سکا بلکہ اس کے برعکس اس نے دہلی کی سرحدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے پانی پت تک کے علاقے اپنے قبضہ میں کر لیے اور شہر دہلی کو بھی متاثر کیا۔ وہ راجدھانی کو اپنے زیر اقتدار تو نہ کر سکا البتہ واپسی کے موقع پر سرہند میں اس نے کھلی بغاوت کر دی۔ ان تبدیلیوں نے سلطان کی توقعات کو مجروح کر دیا۔ دہلی کے نواحی علاقوں کے امرا بھی سلطان کے مخالف ہونے لگے۔ بہر حال 1443ء کو سلطان کی وفات ہو گئی اور ساتھ ہی سیاسی اتھل پتھل اور انتشار سے بھرپور اس کا دس سالہ دور حکومت اپنے اختتام کو پہونچا۔

15.5 سلطان سید علاء الدین عالم شاہ (1443-1451)ء

محمد شاہ کی وفات پر اس کے فرزند علاء الدین عالم شاہ کو تخت نشین کیا گیا۔ ملک بہلول لودھی اور دیگر امرا نے اس کی اطاعت قبول کی اور اس کے ساتھ وفاداری کا حلف اٹھایا لیکن جلد ہی یہ معلوم ہو گیا کہ وہ کوئی مؤثر حکمراں نہیں ہے اور اپنے باپ سے بھی زیادہ نااہل ہے۔ اس کے 7 سالہ دور حکومت میں کوئی امتیازی کارنامہ نظر نہیں آتا۔ 1445ء میں اس نے بدایوں کا رخ کیا جہاں وہ پہلے صوبہ دار کی حیثیت سے رہ چکا تھا۔ اس کا خیال ہوا کہ مستقل یہاں ٹھہر جائے۔ وزیر حسام خان نے پوری خیر خواہی سے مشورہ دیا کہ وہ ایسا نہ کرے اور دہلی سے دور نہ

رہے۔ سلطان کو وزیر کی یہ نصیحت کڑوی لگی لہٰذا وزیر کی بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اس نے دہلی میں اپنی بیوی کے دو بھائیوں کو دو اہم عہدوں پر فائز کر دیا۔ ایک کو شحنہ شہر اور دوسرے کو امیر کوہی مقرر کیا۔ سلطان خود 1448ء میں بدایوں میں رہائش پذیر ہو گیا۔ ادھر دہلی میں سلطان کے مقرر کردہ دونوں افسران آپس میں لڑ پڑے اور ایک نے دوسرے کو قتل کر دیا۔ دوسرے روز حسام خان کی ترغیب پر باشندگان دہلی نے دوسرے کا بھی کام تمام کر دیا۔ دہلی کی حکومت پر قبضہ جما کر اس نے حکومت کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے بہلول لودھی کو دعوت دی۔ بہلول لودھی نے سلطان کو یہ پیغام روانہ کیا کہ سلطان کے لیے اس کے قلب میں جذبات خیر خواہی اور نیک تمناؤں کے سوا کچھ نہیں۔ علاءالدین نے جواباً عرض کیا کہ بدایوں کا ایک پرگنہ اس کے لیے کافی ہے اور وہ برضا و رغبت بقیہ سلطنت بہلول کے لیے چھوڑ رہا ہے۔

الغرض بہلول نے علاءالدین کو بدایوں میں قائم رکھا اور وہ 1451ء میں اپنی وفات تک وہاں پر حکومت کرتا رہا۔ علاءالدین کی موت کے بعد اس کے داماد سلطان حسین شاہ شرقی نے علاءالدین کے بیٹوں کے دعووں کو نظر انداز کرتے ہوئے ان علاقوں کو جون پور کی مملکت میں ضم کر لیا۔ اس طرح سید خاندان کا سلسلہ حکومت اپنے اختتام کو پہنچا۔ ملتان سے ظہور پانے والی ریاست جو دہلی سلطنت پر محیط تھی بدایوں کے ایک پرگنہ تک سمٹ کر رہ گئی۔ سید خاندان کا عہد حکومت دہلی سلطنت کی تاریخ میں کمزوری، انتشار، تعمیر نو اور شیرازہ بندی کے عمل کی ایک اہم کڑی ہے۔

15.6 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

عہد سلطنت کی تاریخ میں سب سے مختصر دور سید حکمرانوں کا رہا ہے۔ اس خاندان کی بنیاد تغلق عہد میں ملتان کے گورنر رہے خضر خان نے رکھی۔ اس خاندان میں کل چار قابل ذکر حکمران گزرے ہیں جنہوں نے 1414ء سے لے کر 1451ء تک یعنی محض 37 سال حکمرانی کی ہے۔ ان کا پورا دور حکمرانی بغاوتوں کو کچلنے میں صرف ہوا۔ اس دوران کافی انتشار اور پریشان کن سیاسی سرگرمیاں عمل میں آئیں جس نے مرکزی نظام حکومت کو مستحکم ہونے کا موقعہ نہیں دیا اور وہ محض صوبائی یا علاقائی انتظامیہ بن کر رہ گیا۔ سید حکمرانوں کی پوری قوت چھوٹے چھوٹے سرداروں اور زمینداروں کی بغاوتوں کو ختم کرنے میں ضائع ہو گئیں۔ چنانچہ سید حکمراں اپنے اسلاف کے ذریعہ قائم کردہ سرحدوں کا تحفظ نہیں کر سکے۔ ان کے عہد میں دہلی سلطنت کا رقبہ کافی حد تک سمٹ کر رہ گیا تھا۔

سلطنت کے خلاف سرکش اور باغی عناصر کے خلاف لڑی جانے والی مہمیں دیرپا اور بامقصد ثابت نہیں ہوئیں کیونکہ مجرم اور باغی سرداروں کو اطاعت کا وعدہ اور خراج لے کر معاف کر دیا جاتا تھا۔ ان سب کے باوجود سیدوں نے چند باصلاحیت اور مخلص افسر اور امراء اکٹھا کر لیے تھے لیکن بقول حبیب اور نظامی ''وہ امراء کی ایسی جماعت نہیں بنا سکے جو اپنے مزاج میں مخلص اور اپنی فطرت میں وفادار ہو۔'' یہی وجہ ہے کہ ان کی پوزیشن کافی کمزور ہو گئی تھی۔ ان کے طبقہ امرا میں یکسانیت نہیں تھی۔ ان میں ایسے مختلف النوع افراد موجود تھے جو اپنے اپنے علاقوں میں مختلف پوزیشن اور اختیارات استعمال کر رہے تھے۔ امراء، مقطی، زمیندار اور سلطان ان سے مختلف قسم کے محصول (مال، خدمتی، خراج) وصول کرتے تھے۔ اقطاعات میں شقوں کی مزید تقسیم سے انتظامیہ میں سیاسی اتحاد کا احساس رفتہ رفتہ ختم ہو گیا۔ رایات عالی (چھتر شاہی) کے

مبہم خطاب کے حامل سید حکمرانوں کی حیثیت ایک اعلیٰ اقطاع دار سے زیادہ نہیں تھی۔

15.7 کلیدی الفاظ (Keywords)

کٹیہر	:	روہیل کھنڈ، مغربی یوپی میں بریلی، مرادآباد، بدایوں کا علاقہ
عارض ممالک	:	وزیر دفاع
قضاۃ	:	عدالتی محکمہ کے افسران
شحنہ شہر	:	نگرانِ شہر، کوتوال
امراء	:	امیر کی جمع ہے حکومتی افسر یا اہلکار
ضابطہ	:	دستور، قانون
مال	:	سلطانی خدمت کے عوض ماتحتوں سے لی جانے والی دولت، مال واسباب
خراج	:	محصول یا محصول، کسی مزروعہ زمین سے وصول کی جانے والی محصول
شق	:	عہد سلطنت کی ایک انتظامی جو کسی پرگنہ کے ماتحت ہوتی تھی۔
شق دار	:	کسی بھی پرگنہ کی ایک شق کا اہلکار۔
اقطاع	:	زمین کا وہ ٹکڑا جو عہدِ سلطنت میں افسران کو ان کی تنخواہ میں دے دیا جاتا تھا۔
مقطی	:	وہ فرد جس کو اقطاع دیا جاتا تھا۔
اقطاع دار	:	اپنی خدمت کے بدلے میں زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے والا فرد
رایاتِ عالی	:	شاہی چھتر

15.8 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

15.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دلی کا حکمران بننے سے پہلے خضر خان کہاں کا گورنر تھا؟
2. سید خاندان کا بانی کون تھا؟
3. تاریخ مبارک شاہی کس کی تصنیف ہے؟
4. تاج الملک کون تھا؟
5. مبارک شاہ کا قاتل کون تھا؟
6. سید خاندان کا تیسرا حکمراں کون تھا؟

7. محمد شاہ نے سرور الملک کو کیا خطاب دیا تھا؟

8. محمد شاہ کی وفات کے بعد سید خاندان کا حکمراں کون بنا؟

9. علاءالدین کس کے حق میں حکومت سے دستبردار ہوا تھا؟

10. مبارک شاہ کے قتل میں کون لوگ ملوث تھے؟

15.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. خضر خان کب اور کیسے دہلی کا حکمراں بنا، وضاحت کیجیے۔
2. حکمراں بننے کے بعد اس کے سامنے کون سے اہم مسائل تھے؟
3. کھوکھروں کے خلاف مبارک شاہ کی عسکری کاروائی پر روشنی ڈالیے۔
4. سید محمد شاہ کے حالات زندگی پر ایک نوٹ تحریر کیجیے۔
5. سید حکمرانوں کے عہد میں میواتیوں کی بغاوت کا جائزہ لیجیے۔

15.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. خضر خان کے عہد حکمرانی پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
2. مبارک شاہ کے عہد حکمرانی کے مسائل اور دشواریوں کا جائزہ لیں گے۔
3. سید حکمران دہلی سلطنت کی سابقہ مرکزیت قائم کرنے میں ناکام کیوں رہے، وضاحت کیجیے۔

15.9 تجویز کردہ کتابیں

1. Quereshi.I. H., *Administration of the Sultanate of Delhi*. Munshiram Manoharlal Publishers, Bombay. 1995.
2. Satish Chandra, *Medieval India*. Vol. 1&ll. Orient Longman Limited Hyderabad.2000.
3. Irfan Habib, *Medieval India. The Study of a Civilization*. National Book Trust. Delhi, 2008.

4. شیخ یحییٰ سرہندی : تاریخِ مبارک شاہی
5. محمد حبیب، کے۔اے۔ نظامی : جامع تاریخ ہند، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی
6. ستیش چندر : عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئی دہلی

اکائی 16۔ لودھی خاندان

(Lodi Dynasty)

اکائی کے اجزا

16.0 تمہید
16.1 مقاصد
16.2 ہندوستان میں افغانوں کی آمد
16.2.1 حصول اقتدار
16.3 بہلول لودھی
16.3.1 ابتدائی حالات اور تخت نشینی
16.3.2 تدبیر مملکت اور سلطنت کی تقسیم
16.3.3 شرقی سلطنت کے خلاف مہم
16.3.4 دیگر فتوحات
16.3.5 مرکز کی جانب واپسی اور وفات
16.3.6 بہلول لودھی بحیثیت حکمراں
16.4 سکندر لودھی
16.4.1 تخت نشینی
16.4.2 ابتدائی حالات
16.4.3 بہار اور بنگال کی جانب پیش قدمی
16.4.4 آگرہ شہر کا قیام
16.4.5 انتظامِ حکومت
16.4.6 تہذیب وثقافت کا فروغ

16.5 ابراہیم لودھی
16.5.1 تخت نشینی
16.5.2 امراء کی ناراضگی اور بغاوتیں
16.5.3 بابر کا حملہ اور لودھی حکومت کا خاتمہ
16.6 اکتسابی نتائج
16.7 کلیدی الفاظ
16.8 نمونہ امتحانی سوالات
16.8.1 معروضی سوالات
16.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
16.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
16.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

16.0 تمہید (Introduction)

لودھی خاندان کا تعلق روہ کے افغان قبیلے سے تھا جس نے دہلی سلطنت پر 1451ء سے 1526ء تک حکومت کی تھی۔ دہلی سلطنت پر حکومت کرنے والے سلاطین کا پانچواں اور آخری اور افغانوں کا پہلا حکمراں خاندان تھا۔ اس خاندان کا 75 سالہ دورِ حکمرانی جدوجہد، آپسی کشاکش اور ریشہ دوانیوں کی ایک طویل داستان ہے۔ اس کے باوجود ان کے کارنامے مملوک، خلجی، تغلق اور سید حکمرانوں سے کسی بھی طرح کمتر نہیں ہیں بلکہ اگر مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو کچھ معنوں میں ان سے بھی شاندار ہیں۔ لودھی حکمرانوں میں مرکزیت پسند حکومت کے قیام کا رجحان ناپید تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا دورِ اقتدار بڑی حد تک لامرکزیت کا شکار رہا۔ ان کی قبائلی انانیت، خودپسندی اور گھمنڈ نے انہیں ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم کرنے نہیں دیا۔ افغان قبائل آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ برابری کا برتاؤ رکھنے کے قائل تھے۔ افغانوں کو مساوات زیادہ پسند تھی اور تمام افغانوں کو ملک کہہ کر پکارا جاتا تھا۔

ہندوستان میں لودھیوں کی آمد کا سلسلہ دہلی سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی شروع ہو گیا تھا۔ لیکن سلطان ناصر الدین محمود کے دور میں انہیں بڑی تعداد میں فوج میں بھرتی کیا گیا۔ سلطان غیاث الدین بلبن کے عہد سے ہندوستان میں ان کا زور بڑھنا شروع ہوا۔ بلبن نے میواتیوں کے خلاف مہم میں تین ہزار (3000) افغان سپاہیوں کو اپنی ملازمت میں رکھا۔ بلبن نے دہلی اور اس کے قرب وجوار میں افغان فوجی چوکیاں قائم کیں۔ جو بعد میں افغان اقتدار کے قیام میں بڑی معاون ثابت ہوئی اور بتدریج انہوں نے "امیرانِ صدہ" کی حیثیت سے اپنی

پوزیشن مستحکم کرنی شروع کردی اور بالآخر ۱۴۵۱ءمیں انہوں نے دہلی میں اپنی حکومت قائم کرلی۔لودھی افغانوں کی یہ حکومت 1526ءتک قائم رہی۔اس خاندان کا پہلا حکمراں سلطان بہلول لودھی تھا۔

16.1 مقاصد(Objectives)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ

- ہندوستان میں افغانوں کی آمد سے واقف ہوسکیں گے۔
- افغانوں کی قبائلی خصوصیات کو بیان کرسکیں گے۔
- ہندوستان میں افغان ریاست کے قیام پر گفتگو کرسکیں گے۔
- بہلول لودھی کے ابتدائی حالات اور کامیابیوں کا جائزہ لے سکیں گے۔
- سکندر لودھی کی مہموں اور کاروائیوں کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ابراہیم لودھی کے حالاتِ زندگی پر گفتگو کرسکیں گے۔
- لودھی حکمرانوں کی انتظامی سرگرمیوں پر بحث کرسکیں گے۔
- لودھی حکومت کے زوال کے اسباب ووجوہات کا جائزہ لے سکیں گے۔

16.2 ہندوستان میں افغانوں کی آمد

16.2.1 حصول اقتدار

عہد وسطیٰ میں بہت سے افغان تجارتی قافلے کاروانوں کے ساتھ ہندوستان آیا کرتے تھے۔ایک بار ملک بہرام نام کا ایک تاجر ملتان آیا اور یہیں پر سکونت اختیار کرلی۔وہ اپنے وطن واپس نہیں جانا چاہتا تھا کیونکہ اس کے بڑے بھائی سے اس کے تعلقات انتہائی ناخوشگوار ہوچکے تھے۔اس نے ملتان کے گورنر ملک مروان دولت کے یہاں ملازمت اختیار کی اور یہیں مستقل آباد ہوگیا۔اس کے پانچ بیٹے تھے۔

۱۔ملک سلطان شاہ ۲۔ملک کالا ۳۔ملک فیروز ۴۔ملک محمد ۵۔ملک خواجہ

اپنے باپ کے انتقال کے بعد بھی یہ لوگ ملتان میں بدستور مقیم رہے۔خضر خان ملتان کا گورنر مقرر ہوا تو ملک سلطان شاہ نے اس کی ملازمت اختیار کی اور ملو اقبال کے خلاف کاروائی کے لیے خضر خان روانہ ہوا تو ملک سلطان شاہ بھی خضر خان کے ساتھ تھا۔اس نے میدان جنگ میں بڑی ہمت، جرأت وبہادری کا مظاہر کیا اور ملو اقبال کو قتل کردیا۔اس کی شجاعت، بہادری اور مخلصانہ خدمات کے اعتراف میں خضر خان نے اسے ''اسلام خان'' کے خطاب سے نوازا اور سرہند کی صوبےداری عطا کی۔اس کے دیگر بھائیوں کو بھی جو اس کے ساتھ رہتے تھے عہدے اور ترقیاں دی گئیں۔حبیب اور نظامی کے مطابق ''ملک کالا کو ''دورالا'' کی گورنری سونپی گئی''۔دورالا ہی میں بہلول لودھی کی ولادت ہوئی تھی۔

16.3 بہلول لودھی (۱۴۵۱ءتا۱۴۸۹ء)

16.3.1 ابتدائی حالات اور تخت نشینی

بہلول لودھی جو آگے چل کر ہندوستان میں لودھی خاندان کا بانی ہوا سرہند کے گورنر سلطان شاہ کا داماد اور اس کا بھتیجا تھا۔ اسکے والد کا نام ملک کالا تھا۔ بہلول کی ولادت سے پہلے ہی اس کی والدہ حالت حمل میں ایک حادثہ کا شکار ہوئی اور ناگہانی طور پر ایک چھپر گرنے سے شدید زخمی ہو کر فوت ہو گئی۔ اس کی مدد کو پہونچے لوگوں نے آپریشن کر کے بہلول کو ماں کے پیٹ سے باہر نکالا۔ اس کے والد نے بڑی شفقت و محبت کے ساتھ اس کی پرورش کی۔ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ کچھ ہی دنوں بعد نیازی افغانوں کے ساتھ ایک جنگ میں اس کے والد ملک کالا کا انتقال ہو گیا۔ چنانچہ وہ اپنے چچا ملک سلطان شاہ کے ساتھ رہنے کے لیے سرہند چلا گیا۔ اس کے چچا سلطان شاہ نے اپنے بھتیجے کی دیکھ ریکھ میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ بہلول لودھی میں بچپن سے ہی بلا کی ذہانت، تیز طراری اور بہترین خوبیاں جھلکنے لگیں تھیں۔ اس کے چچا نے اس کی صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی۔

سلطان شاہ (اسلام خان) ایک دور اندیش اور جرأت مند افغان تھا اس نے اپنے بیٹوں کے دعوے کے باوجود ایک جرأت مندانہ فیصلہ کیا اور بہلول لودھی کو اپنا جانشین نامزد کر دیا۔ لیکن اس کی وفات کے بعد اس کے وارث اور معاونین تین گروہوں میں بٹ گئے۔ ایک گروہ اسلام خان کی وصیت کے مطابق بہلول کی حمایت کر رہا تھا۔ دوسرا اسلام خان کے بھائی ملک فیروز کی حمایت میں تھا۔ تیسرا گروپ اسلام خان کے بیٹے قطب خان کا حامی تھا۔ بہلول لودھی نے بڑی ہوشیاری اور دانشمندی کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور اپنی تمام ابتدائی مشکلات سے بڑی دور اندیشی اور چالاکی سے نجات حاصل کی۔ قطب خان، سید محمد شاہ، ملک سکندر تحفہ اور جسرتھ کھوکھر کی مشترکہ کاروائی میں فیروز لودھی گرفتار ہوا اور کئی افغان مارے گئے۔

بہلول لودھی نے بڑی دور اندیشی سے حالات کی سنگینی کا اندازہ لگایا اور اپنے جانباز سپاہیوں کے ساتھ انتہائی سرعت سے شوالک کی پہاڑیوں کی طرف چلا گیا۔ بہلول کے مخالفین کی سازش تو ناکام ہو گئی لیکن بہلول کو اس سے اتنی تکلیف پہونچی کہ اس نے تجارتی قافلوں کو لوٹنا شروع کر دیا اور لوٹ سے حاصل مالِ غنیمت کو اپنے حامیوں میں تقسیم کیا تاکہ دہلی پر حملہ کے لیے انہیں تیار کر سکے۔ مغلوں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ ملک فیروز اور قطب خان بھی اپنے کیے پر پشیمان ہوئے اور اس کے ساتھ جا ملے۔ کچھ ہی دنوں میں اس نے اپنی طاقت مضبوط کر لی اور اپنے تمام مخالفین سے چھٹکارہ حاصل کیا اور سرہند میں اپنی پوزیشن مستحکم کر لی۔ اس نے سلطان محمد شاہ کے وزیر حسام خان سے بھی جلد ہی نجات حاصل کی اور بڑی چالاکی سے سرہند اور اس سے ملحق علاقے جاگیر میں حاصل کر کے اپنے عسکری وسائل میں اضافہ کیا اور اپنی پوزیشن مزید مستحکم کر لی۔

اسی دوران مالوہ کے سلطان محمد خلجی نے دہلی پر حملہ کر دیا اور سلطان سیّد محمد نے بہلول سے مدد مانگی۔ وہ افغانوں اور مغلوں پر مشتمل بارہ یا بعض روایات کے مطابق بیس ہزار سپاہیوں کے ساتھ سلطان کی مدد کے لیے دہلی روانہ ہوا۔ بڑی دلیری سے دشمن افواج کا مقابلہ کیا اور

اپنی شجاعت و بہادری سے سلطان کا دل جیت لیا۔ سلطان نے اسے خانِ خاناں کا خطاب عطا کیا۔ سرہند لوٹتے ہوئے ملک بہلول نے دیپال پور، لاہور، سنام اور کئی دیگر پرگنوں کو سلطان کی اجازت کے بغیر اپنے قبضہ میں کر لیا۔ اس سے بہلول کی پوزیشن اور مضبوط ہو گئی۔ چنانچہ اس کے کچھ ہی دنوں بعد 1441ء میں اس نے دہلی شہر کا محاصرہ کر لیا لیکن اسے فتح کرنے میں کامیاب نہیں ہوا اور مایوس ہو کر سرہند لوٹ گیا۔ اسی زمانے میں سلطان سیّد محمد کا انتقال ہو گیا اور اس کا بیٹا سلطان علاء الدین عالم شاہ اس کا جانشین ہوا۔ بہلول نے دہلی پر قبضہ کرنے کی سازش تیز کر دی اور ایک بار پھر دہلی پر حملہ کیا اس بار بھی اسے ناکامی ہوئی۔ چنانچہ وہ سرہند لوٹ آیا۔

سلطان علاء الدین کو اس حملے میں حمید خان کی سازش کا شبہ ہوا جسے بہلول کی سفارش پر رکھا گیا تھا۔ علاء الدین نے اپنے چند امراء سے مشورہ کیا۔ انہوں نے اس کو برطرف کر کے قید میں ڈالنے اور اس کی اقطاع کو جو چالیس پرگنوں پر مشتمل تھی ''خالصہ'' زمین میں منتقل کرنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ حمید اپنے بھائیوں کی مدد سے قید خانے سے فرار ہوا اور جوش انتقام میں محل میں گھس کر سلطان کی دولت و جائیداد پر قبضہ کر لیا۔ سلطان علاء الدین بے بسی میں بدایوں چلا گیا اور مناسب وقت کا انتظار کرنے لگا۔ ادھر حمید خان دہلی پر قبضہ کرنے کی خاطر جون پور یا مالوہ کے سلطان کو دعوت دینے کی فکر میں تھا۔ جب یہ بات بہلول کو معلوم ہوئی تو وہ پوری قوت کے ساتھ دہلی روانہ ہوا۔ بہلول نے جنگ کے بجائے حکمت عملی، جھوٹے وعدے اور غلط یقین دہانی کے ذریعے حمید خان کا اعتبار حاصل کر کے اسے قتل کرا دیا۔ اس طرح دہلی کی حکومت ملک بہلول کے ہاتھوں میں چلی گئی۔ بالآخر وہ 19 اپریل 1451ء کو دہلی کے تخت پر جانشین ہوا اور بہلول شاہ غازی کا لقب اختیار کیا۔ خلیق احمد نظامی لکھتے ہیں کہ ''فرشتہ کے بیان سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تاجپوشی دو بار ہوئی۔ ایک تو سلطان علاء الدین سے اس کی خط و کتابت ہونے سے پہلے اور دوسری اس کے بعد۔'' جب تک علاء الدین باضابطہ طور پر تخت سے دستبردار نہیں ہو گیا بہلول نے خطبہ میں اس کا نام باقی رکھا۔ سید خاندان کے آخری بادشاہ کی جگہ لینے اور دہلی کے تخت پر جانشین ہونے سے قبل وہ پنجاب کا صوبے دار رہ چکا تھا۔ اس کی تخت نشینی کی وجہ سے دہلی کا مختصر اور محدود علاقہ پنجاب کے الحاق کے سبب کافی حد تک وسیع ہو گیا تھا۔

16.3.2 تدبیر مملکت اور سلطنت کی تقسیم

سلطان بہلول لودھی نے فوری طور پر ریاست کے اقتصادی مسائل کو کنڑول کرنے پر اپنی توجہ مبذول کی۔ سب سے پہلے اس نے ریاستی خزانے پر قبضہ کیا اور راجدھانی میں نظم وضبط قائم کیا۔ اس نے خزانے کی حفاظت، شاہی ذخائر، گھوڑوں اور اصطبلوں کا انتظام اپنے افغانی افسروں کے سپرد کیا۔ قلعہ کی حفاظت اور تمام فوجی اور عسکری اہمیت کی حامل جگہوں پر افغان سپاہیوں کو مقرر کیا۔ 1458ء میں بہلول لودھی نے اپنی سلطنت کو اپنے بیٹوں اور افغان قرابت داروں کے درمیان تقسیم کیا۔ اس وقت بہلول کے نو بیٹے تھے۔ باربک شاہ کے حصے میں جون پور کا علاقہ آیا۔ مبارک خاں نہانی کو کڑا اور مانک پور دیے گئے۔ شیخ محمد قربان قرمولی کو بہرائچ کا علاقہ ملا۔ لکھنؤ اور کالپی اعظم ہمایوں کو ملے۔ جبکہ خان جہاں لودھی کے حصے میں بدایوں آیا۔ پنجاب اور دوآب کے حصے نظام خاں کے ہاتھ آئے لیکن اس تقسیم کا اصل محرک متعین کرنا آسان نہیں۔ کیا افغانیوں کی قبائلی روایات اس کا سبب بنیں یا پھر یہ بہلول کے سیاسی تجربات کا نتیجہ تھا جس کے سبب بادشاہ نے یہ سمجھا کہ چھوٹی اکائیوں میں اقتدار کو بانٹ دینا زیادہ مناسب ہے۔

16.3.3 شرقی سلطنت کے خلاف مہم

سلطان بہلول لودی کے لیے سب سے پریشان کن مسئلہ سید خاندان کے ایک جائزوارث علاءالدین عالم شاہ کی موجودگی تھی۔ اگرچہ وہ تخت سے دست بردار ہو گیا تھا لیکن ابھی بھی کچھ ایسے امراء موجود تھے جو اسے اپنا موروثی اور قانونی حکمراں تصور کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ جون پور کا شرقی سلطان دہلی کے سیّد سلطان کا داماد تھا۔ لہٰذا دہلی سلطنت کو وہ اپنی جائز ملکیت سمجھتا تھا۔ تیسرے حمید خان کا گروہ بھی موجود تھا جس سے نمٹنا ضروری تھا۔ بیرونی حملہ آوروں کا بھی خطرہ برابر لاحق تھا۔

سلطان بہلول لودھی کے عہدِ حکومت کا اہم ترین واقعہ جونپور کے خلاف فوجی کاروائی اور اس کی فتح ہے۔ اس فتح کی خاطر وہ جونپور کے آخری شرقی حکمراں حسین شاہ سے پورے چھبیس سال تک لڑتا رہا تھا۔ بالآخر 1479ء میں سومنہار (ضلع ایٹہ) میں لڑی گئی جنگ میں اسے ہرا کر اپنے فرزند باربک شاہ کو اس نے جون پور کا صوبیدار مقرر کیا۔ جونپور کی فتح سے ریاست دہلی کی سرحد مشرق میں بنارس تک پھیل گئی۔ اس کے بعد اس نے شرقی ریاست سے متعلقہ دیگر علاقوں کو اپنی ریاست میں شامل کرنے پر توجہ دی اور تمام مفتوحہ علاقوں میں اپنی فوج متعین کی۔ حسین شاہ شرقی سے نمٹنے کے فوراً بعد 1488ء میں سلطان نے دیگر علاقوں کی طرف رخ کیا۔

16.3.4 دیگر فتوحات

شرقی سلطنت کے الحاق کے بعد بہلول لودھی کالپی کے لیے روانہ ہوا۔ اس نے کالپی پر قبضہ کر کے اپنے پوتے اعظم ہمایوں کو اس کا نگراں مقرر کیا اور خود دھول پور کی جانب کوچ کیا۔ دھول پور کے رائے نے سلطان کی اطاعت قبول کی اور سونے کی ایک بھاری مقدار اس کے حوالے کی۔ دھول پور کے بعد وہ برن کے صوبہ دار اقبال خاں کی طرف متوجہ ہوا۔ اقبال خان نے بھی اس کی اطاعت قبول کر لی۔ سلطان نے اپنی فوج کے ساتھ حصار فیروزہ کا رخ کیا اور پھر گوالیار اور اٹاوہ کی جانب پیش قدمی کی۔ گوالیار کے راجا مان سنگھ نے اسی لاکھ تنکوں کے تحفہ کے بدلے امن وامان کی درخواست کی۔ وہاں سے وہ اٹاوہ کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں کے چوہان سردار سکت سنگھ کو برطرف کر کے اسے رائے داؤد کے سپرد کر دیا۔

16.3.5 مرکز کی جانب واپسی اور وفات

ان تمام مہموں سے فارغ ہونے کے بعد سلطان بہلول لودھی اپنے مرکز دہلی کی جانب واپس ہوا۔ دورانِ سفر وہ شدید لو کا شکار ہوا اور سخت گرمی کے اثر سے بیمار پڑ گیا۔ ملولی کے مقام پر مرض کی وجہ سے 12 جولائی 1489ء کو اس کی وفات ہو گئی۔ اس نے دہلی کے تخت پر 38 سال تک حکومت کی تھی۔

16.3.6 بہلول لودھی بحیثیت حکمراں

38 سال سے زائد عرصے تک بہلول نے حکومت کی۔ سلاطین دہلی کے لحاظ سے یہ سب سے طویل مدت ہے۔ ملک کے عمومی سیاسی حالات کے پس منظر میں سلطان بہلول لودھی کا اتنی لمبی مدت تک کے لیے حکومت پر قائم رہنا بجائے خود ایک عظیم کارنامہ ہے۔ آخری

تغلق حکمرانوں کے دور سے ملک میں غیر مرکزیت کا مسلسل رجحان رہا۔ صوبوں کے گورنروں سے لے کر مقامی زمینداروں تک ہر فرد اس بات کا خواہش مند تھا کہ خود صاحب اقتدار بن جائے اور مرکز کو کمزور کرے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ بہلول لودھی نے بڑی فہم فراست اور مہارت سے حالات کو سنبھالا۔ مخالفین سے نمٹنے میں افغانوں کی فوجی قوت میں اضافہ کیا اس کے باوجود اپنے شاہی اقتدار واختیار کو اس نے ان کے تسلط وغلبہ سے یکسر دور رکھا۔

سیاسی نقطہ نظر سے اس کا اقتدار پنجاب سے لے کر بہار کی سرحدوں تک محیط تھا۔ دہلی بدایوں، برن، کول، سنبھل، راپڑی کمپل اور پٹیالی جیسے شہر اس کی سرحدوں میں شامل تھے۔ راجستھان کے ایک حصہ پر بھی اس کا کنٹرول تھا۔ گوالیار، دھولپور اور باڑی کے راجپوت حکمراں اسے خراج ادا کرتے تھے۔ ایسے دور میں جب مرکز گریز رجحانات پنپ رہے تھے۔ اس نے دہلی سلطنت کی مرکزیت کو بڑی حد تک بحال کیا۔

ذاتی زندگی میں وہ بڑی متواضع شخصیت کا مالک، انصاف پسند، فیاض اور سادگی پسند تھا۔ وہ ان تمام بری عادتوں سے پاک تھا جو اس عہد کے حکمرانوں کا خاصہ ہوا کرتے تھے۔ وہ ایک بہترین جنگجو، سادگی پسند اور منکسر مزاج حکمران تھا۔ مذہبی فرائض کی ادائیگی کا پابند علماء اور صوفیاء کا قدر دان تھا۔ ہر ایک کو مسند عالی کہہ کر مخاطب کرتا تھا۔ اس نے دہلی اور آس پاس کے صوبوں کے ناراض و مضطرب سرداروں کو اپنی اطاعت پر مائل کرتے ہوئے حکومت کو قوت بخشی۔

16.4 سکندر لودھی (1489-1517ء)

16.4.1 تخت نشینی

بہلول لودھی کی وفات کے فوراً بعد اس کے جانشین کے انتخاب کے سلسلے میں امراء دہلی نے شمال میں پندرہ میل پر واقع دیہات ملولی میں ایک اجلاس منعقد کیا۔ ان کی نظر میں جانشینی کے لیے تین افراد موزوں تھے۔

ا۔ نظام خاں	۲۔ باربک شاہ	۳۔ اعظم ہمایوں

ان تینوں افراد کے حامی تین گروہوں میں منقسم ہو گئے۔ آخر 14 جولائی 1489ء کو نظام خاں دہلی کے تخت پر جانشین ہوا۔ اس نے اپنا لقب سلطان سکندر شاہ پسند کیا۔ یہ وہی سلطان سکندر شاہ ہے جو تاریخ میں سکندر لودھی کے نام سے مشہور ہوا۔

16.4.2 ابتدائی حالات

سکندر لودھی 21 نومبر 1417ء کو پیدا ہوا۔ سلطان بننے سے پہلے اس کا نام نظام خان تھا۔ اپنے والد بہلول لودھی کا دوسرا بڑا لڑکا تھا۔ اس نے دہلی کے تخت پر 1517-1489ء تک حکومت کی تھی۔ اسے لودھی خاندان کا کامیاب ترین حکمران تصور کیا جاتا ہے۔ اپنے والد بہلول لودھی کے انتقال کے بعد 16 جولائی 1489ء کو تخت پر بیٹھا۔ اس کی تاجپوشی کالی ندی کے کنارے ایک ٹیلے پر ادا کی گئی جو سلطان فیروز

شاہ تغلق کے دور میں اس کا شکاری خیمہ ہوا کرتا تھااور کوشک فیروز کے نام سے مشہور تھا۔اپنی تخت نشینی کے بعد سکندر دہلی روانہ ہوا۔اس کے سامنے سب سے اہم مسئلہ دہلی کے افغان امراءاور اپنے رشتے داروں کو اس کا اقتدار قبول کرنے پر راضی کرنا تھا۔

سکندر لودھی نے اپنی حکومت کے ابتدائی چند سال اپنی پوزیشن کو مستحکم کرنے اور ان تمام مخالفین اور باغیوں کو ختم کرنے میں صرف کیے جو اس کی ریاست کے مختلف حصوں میں سر اٹھا رہے تھے۔اس کے بڑے بھائی باربک شاہ نے جو جونپور کا حاکم تھا اسے سلطان ماننے سے انکار کر دیا۔ نظام خاں یعنی سلطان سکندر شاہ (سکندر لودھی) نے اُسے شکست دے دی اور اسے اپنی اطاعت کرنے پر مجبور کیا۔ باربک نے سلطان کی اطاعت قبول کر لی چنانچہ اس کو اس کا علاقہ اور عہدہ واپس کر دیا گیا۔ سکندلودھی نے جون پور میں اپنی پوزیشن کو مضبوط کرنے کے لیے پختہ اقدامات کیے۔اس نے وہاں کے کئی پرگنوں میں اپنے کئی معتمد امراء متعین کیے۔قدیم شرقی خاندان کے زمیندار وقفہ وقفہ سے اپنی ریاست کی بحالی کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ باربک کو جونپور کے زمینداروں کی ایسی ہی ایک بغاوت کو کچلنے کے لیے بھیجا گیا جس میں وہ ناکام رہا۔ چنانچہ اس کو اس کے عہدے اور منصب سے برخاست کر دیا گیا۔

16.4.3 بہار اور بنگال کی جانب پیش قدمی

سکندر لودھی نے جون پور میں اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے بعد بہار کی سمت پیش قدمی کی جہاں حسین شرقی اس کے خلاف کاروائی کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ بنارس کے قریب دونوں فوجوں کا تصادم ہوا جس میں حسین شرقی کو شکست ہوئی اور وہ بہار کی طرف بھاگ گیا اور پناہ کی تلاش میں ادھر سے ادھر بھٹکتا رہا۔ سکندر نے اس کا تعاقب کیا لیکن وہ ہاتھ نہیں آیا۔ چنانچہ اس نے مہابت خان کو بہار میں چھوڑا اور درویش پور کی طرف بڑھ گیا۔ بہار پر اپنا تسلط قائم کرنے کے بعد ملک کندو کو وہاں چھوڑ دیا اور خود بھاگلپور ہوتے ہوئے کہلگاؤں پہونچ گیا جو اس وقت بنگال کے حکمراں کے قبضہ میں تھا۔اس نے بنگال کے سلطان کے ساتھ عدم جارحیت اور جنگ بندی کا ایک معاہدہ کیا۔ بعدازاں ترہٹ پر چھاپہ مارتے ہوئے اس کے راجا سے خراج وصول کیا۔ پھر اس نے گوالیار، دھولپور، نروار اور چندیری کے راجاؤں کو اپنا تابع کیا۔اب اس کی سلطنت پنجاب سے لے کر بنگال کی سرحدوں تک وسیع ہو چکی تھی اور اس میں ستلج اور بندیل کھنڈ کے علاقے بھی شامل تھے۔ 1517ء میں رنتھمبور پر فوج کشی کی لیکن اس قلعے کو فتح نہ کر سکا۔تاہم رنتھمبور کے گورنر نے اس کی برتری قبول کر لی۔ 21 نومبر 1517ء کو خناق یا گلے کے سرطان (کینسر) کے سبب سلطان سکندر لودھی نے وفات پائی۔

16.4.4 آگرہ شہر کا قیام

سکندر لودھی نے 1506ء میں شہر آگرہ کی بنیاد رکھی۔اس نئے شہر کو بسانے کے لیے اس نے جگہ کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر تلاش و تحقیق کے بعد کیا تھا۔ چند تجربہ کار لوگوں کا ایک کمیشن بنایا۔ جو کشتیوں پر سوار ہو کر دہلی سے روانہ ہوا۔ دریائے جمنا کے دونوں کنارے کا معائنہ کرتے ہوئے آگے بڑھا۔ سلطان خود بھی کشتی پر سوار ہو کر اس جگہ کے معائنہ کے لیے آیا۔ کمیشن کے منتخب کردہ مقام کے قریب پہونچ کر اس نے کشتی کے نائک سے پوچھا ان دونوں بلندیوں میں سے کون بہتر ہے نائک نے جواب دیا آگے راہ (وہ جو آگے ہے) سلطان مسکرایا او کہا

اس شہر کا نام آگرہ ہو گا۔ دہلی سے اپنی راجدھانی آگراہ منتقل کرنے کے پیچھے کیے اہم مقاصد تھے۔ دراصل سکندر آگرہ میں رہ کر آس پاس کے علاقوں پر کنڑول رکھنا چاہتا تھا۔

16.4.5 انتظام حکومت

سکندر لودھی نے اپنے عہدِ حکومت میں ایک بہترین نظم و نسق قائم کیا اور عدل و انصاف پر توجہ دی۔ اپنی ریاست کی تمام شاہراہوں کو ڈاکوؤں اور قزاقوں کے خطرے سے آزاد کیا۔ لوگوں میں تحفظ کا احساس پیدا کرنے کے لیے ضروری اقدامات کیے۔ اس نے حکومت کے دور دراز علاقوں سے باخبر رہنے کے لیے ایک اعلیٰ اور کارگر جاسوسی نظام قائم کیا تھا۔ جاسوسی نظام کے قیام سے سلطان نہ صرف ریاست کے حالات سے باخبر رہتا تھا بلکہ عوام کی مختلف کارکردگیوں سے بھی واقف رہتا تھا۔ اس نظام کے ذریعہ اسے امرا اور سرداروں کی سرگرمیوں اور خفیہ سازشوں کی بھی جانکاری ملتی تھی۔ سکندر لودھی کے مستحکم نظم و نسق نے امن و خوشحالی اور انصاف کو رعایا کے لیے یقینی بنادیا تھا۔ اس کا عدالتی نظام بھی کافی عمدہ اور انتہائی منظم تھا۔ میاں بھوا کی رہنمائی میں عدالتی نظام کی تشکیل واضح اور موثر طریقے پر کی گئی تھی۔ وہ اہم معاملات جو سلطان کے روبرو لائے جاتے تھے ان کی بابت فیصلہ سلطان خود کیا کرتا تھا۔ اس نے عدالتی ذمہ داروں اور عہدے داروں کو بھی عوام کی شکایتیں سننے اور ان کی عرضیاں لینے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے افسران کو عدالتی امور سے وابستہ شکایات کی تحقیق و تفتیش کے لیے صبح سے شام تک دربار میں حاضر رہنا پڑتا تھا۔ دریا خان لوحانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ صبح سے دیر رات تک شکایات کنندگان کی درخواستیں وصول کرنے اور معاملات کی چھان بین کے لیے دربار میں دیر رات تک موجود رہتا تھا۔

لودھی عہد کے تقریباً تمام ہمعصر مورخین اس بات کے قائل ہیں کہ اس کا دورِ حکومت معاشی اور اقتصادی طور پر کافی خوشحال تھا اس عہد کی معاشی خوش حالی، دولت و ثروت کا تذکرہ ہمعصر تاریخ نویسوں نے بڑی تفصیل سے کیا ہے۔ ہر صبح بازاری نرخ کی تفصیلات سلطان کے سامنے پیش کی جاتی تھیں۔ اشیا کی قیمتیں عموماً زیادہ نہ تھیں۔ اشیا کی ارزانی یہ اس وجہ سے بھی ہو سکتی تھی کہ وہاں سونے چاندی کا ذخیرہ معمولی اور قلیل تھا اور چونکہ شہر کا کوئی بھی حصہ سمندر سے متصل نہیں تھا۔ لہٰذا تجارتی اشیا کی منتقلی یا مبادلے کے مواقع نہایت کم تھے۔ لودھی عہد میں زرعی پیداوار بھی بہتر ہوتی تھی اور سلطان ذاتی طور پر زراعت کی ترقی کے سلسلہ میں بڑی دلچسپی لیتا تھا۔ اس نے غلے پر لیا جانے والا محصول منسوخ کر دیا تھا اور پیمائش کے لیے ایک معیار مقرر کیا تھا جسے "گزِ سکندری" کہتے تھے۔ یہ پیمانہ مغل دور تک جاری رہا۔

16.4.6 تہذیب و ثقافت کا فروغ

اس کے عہد میں تہذیب و ثقافت، آرٹ اور فنون لطیفہ کو بھی کافی فروغ حاصل ہوا۔ تہذیب و تمدن کے میدان میں سکندر لودھی کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے۔ وہ اصحاب علم، فنکاروں اور شعرا کا بڑا قدردان تھا اور کھلے دل سے ان کی سرپرستی کرتا تھا۔ وہ شاعری کا دلدادہ تھا اور خود بھی شاعری کرتا تھا۔ اس کا تخلص 'گل رخ' تھا۔ اس کی سخاوت اور فیاضی سے ایران و عرب کے علماء اور دانشوروں کو اپنی جانب مبذول کیا تھا۔ اسی کی دعوت پر مشہور دانشور اور فلسفی شیخ عبداللہ اور شیخ عزیزاللہ دہلی آئے اور اُس وقت کے تعلیمی نصاب میں معقولات

کے ایک بڑے حصہ کا اضافہ کیا۔اس طرح اس نے مسلمانوں کے تعلیمی وتدریسی نظام میں بھی اصلاح کی بڑی کوشش کی۔اس کی کاوشوں سے زیر بحث عہد کے ہندوستان کے مروجہ تعلیمی نظام میں کافی اصلاحات ہوئیں۔اس نے بہت سے رفاہی اور اصلاحی کاموں کے ذریعہ لوگوں کی داد و تحسین حاصل کی۔اس نے راجدھانی میں غریبوں اور محتاجوں کے درمیان اشیاء خورد ونوش کی تقسیم اور لنگر خانے کا بندوبست کیا تھا۔اس کی سلطنت میں غرباء اور مساکین کے لیے چھ ماہی، سہ ماہی، ہفتہ واری اور روزآنہ کے بھتے اور وظیفے مقرر کیے تھے۔

سکندر لودھی مذہبی معاملات میں کسی حد تک تنگ نظر اور متعصب تھا۔ سماج میں غیر اخلاقی رجحانات کے فروغ کی روک تھام کی خاطر کئی اہم اقدامات کیے۔اس نے بہرائچ میں سالار مسعود غازی کے جلوس پر پابندی لگادی۔ بزرگوں کے مزاروں پر عورتوں کی آمد کی ممانعت کر دی۔ ستیلا جسے ضعیف الاعتقاد افراد چیچک کی دیوی خیال کر کے اس کی پوجا کرتے تھے اس کی ممانعت کر دی۔ الغرض غیر اخلاقی جرائم کی روک تھام کے لیے اہم اقدامات کیے تھے۔

وہ ایک قابل، دور اندیش اور انصاف پسند حکمراں تھا۔اس نے سلطنت کے عظمت و وقار کو سربلند کرنے کی سعی کی نیز نظم ونسق کا ایسا کارگر نظام عطا کرنے کی کوشش کی جس سے سماج کے سارے طبقات مستفید ہوسکیں۔ جسمانی اعتبار سے انتہائی پرکشش اور وجیہ ہونے کے علاوہ اسے زبان و بیان پر بھی قدرت حاصل تھی۔ شاعری اور موسیقی سے دلچسپی رکھتا تھا۔ ہندوستان کی دورِ وسطیٰ کی تاریخ میں سکندر لودھی بعض پہلوؤں سے نہایت ممتاز گزرا ہے۔اس نے ہندوستان میں افغان سیاست کو ایک نیا رخ عطا کیا۔ سلطان کے عہدے کو وقار وبلندی عطا کی۔ افغان جمہوری روایات کا پابند ہونے کے باوجود وہ اس کی سلطانی عظمت کے قائل تھے۔

16.5 ابراہیم لودھی (1517-1526ء)

16.5.1 تخت نشینی

سکندر لودھی کی وفات کے بعد اس کا بڑا فرزند ابراہیم 22 نومبر 1517ء کو تخت نشین ہوا۔اس موقع پر امرا نے یہ چاہا کہ سیاسی اقتدار فرد واحد کے ہاتھ میں مرکوز نہ رہے جیسا کہ سکندر لودھی کے دور میں تھا۔ لہٰذا انہوں نے سلطنت کو دو اکائیوں میں تقسیم کر دینے کا بندوبست کیا۔ ایک حصہ ابراہیم کے لیے اور دوسرا اس کے چھوٹے بھائی جلال خان کے لیے مخصوص کیا۔ جونپور کی سرحدوں تک ملک کا ایک حصہ ابراہیم لودھی کے لیے تجویز کیا گیا اور شرقی سلطنت کا علاقہ جلال خان کے لیے طے کیا گیا۔ راپڑی کے جاگیردار خان جہاں لودھی کے مشورے پر ابراہیم نے اس معاہدے کی پرواہ نہیں کی اور اس علاقے پر بھی اپنی حکمرانی کا دعویٰ کر دیا جو جلال خان کے لیے طے کیا گیا تھا۔ بعد ازاں 29 دسمبر 1517ء کو ابراہیم لودھی کی ایک اور رسم تاج پوشی کی گئی۔

16.5.2 امرا کی ناراضگی اور بغاوتیں

جب ابراہیم لودھی نے جلال خان کے لیے متعین کیے گئے علاقے پر اپنی حکمرانی کا دعویٰ پیش کیا تو جلال خان نے ابراہیم لودھی سے

ناراض کچھ امرا کے سہارے دہلی کے تخت پر قابض ہونے کی ناکام کوشش کی۔ جب اس کی یہ کوشش ناکام ہوئی اسے وہاں سے فرار ہو کر گوالیار کے راجا کے یہاں پناہ لینی پڑی۔ ابراہیم لودھی نے گوالیار کے راجا پر حملہ کر دیا اور اس کے قلعہ کا محاصرہ کر کے اسے فتح کر لیا۔ جلال خان نے ابراہیم لودھی سے بچنے کے لیے مالوہ کی جانب فرار ہو گیا لیکن راستے میں غنڈوں نے اسے پکڑ کر قتل کر ڈالا۔ اپنے چھوٹے بھائی سے چھٹکارہ پانے کے باوجود اس کا بقیہ دور حکومت بھی اضطراب و بے چینی میں گزرا۔ افغانی امرا سے اس کا سخت تنازع ہو گیا اور یہی جھگڑا آخر اس کی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ وہ خصوصی آداب شاہی کو امرا اور سرداروں پر نافذ کر کے شاہی دبدبے اور وقار میں اضافہ کرنا چاہتا تھا۔ افغانوں کے لیے آداب شاہی کی رسمیں ناپسندیدہ تھیں کیونکہ وہ سلطان کو اپنے جیسے سرداروں میں سے ایک سمجھتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ بے چینی، ناراضگی میں اور ناراضگی بغاوت میں بدلنے لگی۔ سلطان ان بغاوتوں کو جبر و تشدد سے روکنے لگا اور افغان امرا کے حق میں اس کی زیادتیاں بڑھتی چلی گئیں جو بغاوت کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں

16.5.3 بابر کا حملہ اور لودھی حکومت کا خاتمہ

ابراہیم لودھی کے خلاف افغان امراء کی ناراضگی دن بدن بڑھتی گئی۔ بنگال میں دریا خاں لوہانی نے بغاوت کر دی اور اس کے انتقال کے بعد اس کے فرزند نے اپنی خودمختاری کا اعلان کیا۔ حالات اس وقت انتہا کو پہنچ گئے جب سلطان کے چچا عالم خان اور پنجاب کے گورنر دولت خان لودھی نے مغل حکمران بابر کو ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ پانی پت میں دونوں افواج مقابل ہوئیں۔ بابر نے اپنی فوجوں کی حکمت و احتیاط کے ساتھ صف بندی کی۔ اس نے فوج کا ہراول یا اگلا حصہ اس طرح محفوظ کیا کہ کوئی سات سو (700) چھکڑے جو آپس میں رسیوں سے بندھے ہوئے تھے، بالکل سامنے رکھ دیے۔ اس طرح کئی مختصر سی عارضی حفاظتی دیواریں قائم کیں جو ہر چھ سات چھکڑوں کے عقب میں ہوتیں تھیں۔ ان دیواروں کے پیچھے بندوق بردار اور توپچی مقرر کر دیے۔ 12 اپریل 1526ء کو بابر شہر پانی پت پہنچا۔ فوج کا دایاں بازو شہر کی سمت میں ہونے کی وجہ سے محفوظ تھا۔ ایک خندق کھود کر اور کٹے ہوئے درختوں کے تنوں کے ذریعے بائیں بازو یا میسرہ کا تحفظ کیا۔ لشکر کے مرکزی حصہ کو حفاظتی پشتوں اور چھکڑوں کے ذریعے تقویت دی گئی اور ان حفاظتی دیواروں کے درمیان اتنا فاصلہ یا خلا رکھا گیا کہ ایک ساتھ پچاس تا سو گھڑسوار دوش بدوش ہو کر حملہ کر سکیں۔

ایک ہفتے تک مغل اور افغان افواج میدان جنگ میں لڑائی کے بغیر آمنے سامنے ٹھہری رہیں۔ 19 اپریل 1526ء کو بابر نے حملے کے آغاز کی ناکام کوشش کی۔ تاہم چند دنوں بعد آپسی حملے شروع ہوئے۔ باقاعدہ جنگ صبح 6 بجے شروع ہوئی اور نصف النہار تک افغان فوج بھگدڑ اور تباہی کا شکار ہو چکی تھی۔ پانی پت کا وسیع میدان ہزاروں افغان نعشوں سے پٹا پڑا تھا جن کے درمیان ابراہیم لودھی کا جسد خاکی بھی موجود تھا۔ عہد وسطیٰ اور چغتائی ترکوں کی روایات کے برخلاف بابر نے ابراہیم کی آخری رسومات ادا کیں۔ آج بھی اس کا مقبرہ پانی پت میں موجود ہے۔ 1192ء کو ترائن کے میدان میں ظہور پذیر ہونے والی دہلی سلطنت نے 1526ء میں ترائن سے چند میل دور پانی پت کے میدان میں اپنے اختتام کو پہونچی۔

16.7 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

بہلول لودھی کے دہلی پر قبضہ جمانے کے سبب 1451ء میں سید خاندان کا عہد اختتام کو پہنچا۔ 1451ء سے 1526ء تک لودھی خاندان حکمراں رہا۔ جنوبی ایشیا پر حکومت کرنے والا یہ پہلا افغان خاندان ہے۔ لودھی خاندان کا بانی بہلول لودھی، پنجاب کا صوبے دار تھا۔ یہ افغان بہادر دہلی سلطنت کے تخت پر قابض ہوا۔ اس نے سلطان ابوالمظفر بہلول شاہ غازی کا خطاب اختیار کیا۔ میواڑ، سنبھل اور گوالیار کو فتح کر کے دہلی سلطنت کے زیر نگیں کیا۔ بہر حال ہندوستان میں پہلی افغان ریاست اور لودھی خاندان کی بنیاد اسی نے رکھی۔ بہلول نے اپنے فرزند نظام خان کو اپنا جانشین نامزد کیا جس نے اپنا لقب سکندر شاہ رکھا۔ یہ شخص لودھی خاندان کا سب سے لائق حکمراں گزرا ہے۔ اس نے اپنے سیاسی تدبر کے نتیجے میں کئی افغان سرداروں کو اپنے قابو میں رکھا۔ اپنے صوبہ جات کے طول و عرض میں اس نے تعلیم اور تجارت کو فروغ دیا۔ ایک مضبوط نظم و نسق کے قیام کے ساتھ ساتھ بغاوتوں کو کچلنے میں بھی وہ کامیاب رہا۔ مشہور شہر آگرہ کی بنیاد اسی نے رکھی۔ سکندر شاہ کے انتقال کے بعد اس کے دو بیٹوں ابراہیم لودھی اور جلال خاں میں جانشینی کی جنگ چھڑ گئی اور یہی کشمکش بالآخر لودھی سلطنت کے زوال کا سبب بن گئی۔ ابراہیم لودھی اپنے باپ کا جانشین ہوا۔ وہ لودھی خاندان کا آخری سلطان تھا۔ اس نے 1517ء میں تخت حاصل کیا۔ ابراہیم نے گوالیار پر اپنا قبضہ بحال کیا اور رانا سانگا کو خوفزدہ کیا کیونکہ وہ اپنی ریاست میں مزید علاقوں کی توسیع کا ارادہ رکھتا تھا۔ 1526ء میں مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر نے دہلی پر چڑھائی کی۔ اور دہلی کے قریب، پہلی پانی پت کی جنگ میں ابراہیم لودھی کو شکست فاش دی اور اس طرح لودھی خاندان کی حکومت کا باب ختم ہوا۔ 1526ء کی اس جنگ سے مغل دور کا آغاز ہوتا ہے اور اسی جنگ کے سبب دہلی کے سلاطین کا 320 سالہ دور بھی اختتام پذیر ہوتا ہے۔

16.8 کلیدی الفاظ (Keywords)

ملک	:	عہدِ وسطیٰ میں افغان قبائلی سرداروں کا خطاب۔ تمام افغان قبیلائی سرداروں کو ملک کہتے تھے۔
امیرانِ صدہ	:	سو امیروں کا گروہ جن میں سے ہر امیر کی نگرانی سو افراد پر مشتمل ہوتی تھی۔
خناق	:	گلے میں ہونے والا سرطان (گلے کا کینسر)
پرگنہ	:	عہدِ وسطیٰ میں کسی علاقے کی علاقائی تقسیم کا وہ حصہ جو سرکار اور صوبہ سے چھوٹا ہوتا تھا۔
خانِ خاناں	:	خانوں کا خان عہدِ وسطیٰ میں کسی انتظامی یا فوجی افسر کو اس کی بہترین خدمات کے عوض دیا جانے والا خطاب۔
شوالک	:	شمالی ہندوستان کا ایک پہاڑی سلسلہ
اقطاع	:	وہ زمین یا زمین کا وہ ٹکڑا جو کسی فرد کو ریاستی خدمات کے بدلے دیا جائے۔
خالصہ زمین	:	زمین کا وہ ٹکڑا جو براہِ راست کسی حکمراں، راجا، مہاراجا، یا بادشاہ کے ماتحت ہو۔
گزِ سکندری	:	زمین کی پیائش کا وہ پیمانہ جسے سلطان سکندر لودھی نے متعارف کروایا تھا۔

16.9 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

16.9.1 معروضی سوالات

1. دہلی سلطنت کا پہلا افغان حکمران کون تھا؟
2. بہلول لودھی کے والد کا کیا نام تھا؟
3. بہلول لودھی کی پرورش کس کی ماتحتی میں ہوئی تھی؟
4. ملک سلطان شاہ کون تھا؟
5. ملک سلطان شاہ کو اسلام خان کا خطاب کس نے عطا کیا تھا؟
6. بہلول لودھی کا جانشین کون بنا تھا؟
7. سکندر لودھی کا نام کیا تھا؟
8. آگرہ شہر کی بنیاد کس لودھی حکمران نے رکھی تھی؟
9. سکندر لودھی کی وفات کس بیماری میں ہوئی؟
10. لودھی خاندان کا آخری حکمران کون تھا؟

16.9.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ہندوستان میں افغانوں کی آمد پر روشنی ڈالیے۔
2. افغانوں کی قبائلی خصوصیات بیان کیجیے۔
3. بہلول لودھی کے ابتدائی حالات اور تخت نشینی کے واقعات بیان کیجیے۔
4. سکندر لودھی کے نظم و نسق پر ایک نوٹ قلمبند کیجیے۔
5. ابراہیم لودھی کی بابر کے ساتھ کشمکش کا مختصر جائزہ پیش کیجیے۔

16.9.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

1. سلطان بہلول لودھی کے ابتدائی مسائل کیا تھے اور اس نے ان پر قابو کیسے کیا؟
2. سلطان سکندر لودھی کی انتظامی کاروائیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔
3. سلطان ابراہیم لودھی کے عہد کا تفصیلی جائزہ پیش کیجیے۔

16.10 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Mahajan V.D. *History of Medieval India*. S. Chand Group.2001.
2. Mehta. J.I. *Advanced study in the History of Medieval India*. Sterling Publishers Pvt. Ltd. New Delhi.2004.
3. Quereshi. I.H., *Adnunistration of the Sultanate of Delhi*. Munshiram Manoharlal Publishers. Bombay/1995.
4. Satish Chandr. *Medieval India*. Vol.1&II. Orient Lunguman Limited. Hyderaba.2000.
5. Irfan Habib. *Medieval India-The Study of a Civilisation.* National Book. Trust. Delhi-2008
6. محمد حبیب، خلیق احمد نظامی جامع تاریخ ہند، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئ دہلی ۲۰۱۱ء
7. ستیش چندرا عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان (سلطنت سے مغل عہد تک) قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئ دہلی ۲۰۱۱ء
8. محمد مجیب ہندوستانی مسلمان، قومی کونسل برائے فروغ زبان اردو، نئ دہلی

اکائی 17۔ دہلی سلطنت میں سماج اور اقتصاد

(Society and Economy during the Delhi Sultanate)

اکائی کے اجزا

17.0 تمہید
17.1 مقاصد
17.2 سماجی زندگی
17.2.1 حکمراں طبقہ
17.2.2 زمیندار طبقہ
17.2.3 انتظامی افسران اور علماء
17.2.4 تاجر اور سرمایہ کار طبقے
17.2.5 معیار زندگی
17.2.6 شہری زندگی
17.2.7 دیہی معاشرہ
17.2.8 غلامی
17.2.9 عورتوں کی حیثیت اور رسم ورواج
17.3 معاشی زندگی
17.3.1 زراعت
17.3.2 محاصل کا نظام
17.3.3 غیر زرعی پیداوار
17.3.4 کپڑے کی صنعت
17.3.5 دھات کا کام

17.3.6 عمارتی صنعت
17.3.7 دوسرے حرفے اور کاغذ سازی کی صنعت
17.3.8 اندرونی تجارت
17.3.9 غیر ملکی تجارت
17.4 اکتسابی نتائج
17.5 کلیدی الفاظ
17.6 نمونہ امتحانی سوالات
17.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
17.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
17.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
17.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

17.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کے قیام سے شمالی ہندوستان پر معاشی اور سماجی اعتبار سے کیا اثر پڑا، یہ بحث کا موضوع رہا ہے۔ برطانوی اور قوم پرست مورخین کے مطابق ایک اجنبی مسلم حکومت کے قیام سے معاشی اور سماجی و ثقافتی ڈھانچے کو شدید نقصان پہنچا۔ مغل عہد میں جاکر ہی حالات کچھ معمول پر آئے۔ چنانچہ یہ پورا دور ایک تاریک عہد تھا۔ بعض مورخین شمالی ہندوستان میں آبادی میں کمی کو بھی اسی سے جوڑتے ہیں۔ دوسری طرف مارکسوادی اور آزاد خیال مورخین یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ایک جامد اور تبدیلی کے مخالف ہندوستانی سماج پر دہلی کی ترک سلطنت کے قیام کا کوئی خاص اثر نہیں پڑا۔ جو ہلکے پھلکے نقصانات ہوئے ان کی تھوڑے ہی عرصے میں تلافی ہوگئی اور فتوحات کا سلسلہ ختم ہوتے ہی ترک سلطان عدل و انصاف اور عام لوگوں کے تحفظ کو یقینی بنانے کو فتوحات کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دینے لگے۔ البتہ عوام کی زندگی کے طرز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ کسان پہلے راجپوتوں کو محصول دیتا تھا، اب سلطنت کے افسران کو دینے لگا۔ ترک حکومت کے اثرات سابقہ حکمراں طبقے یعنی راجپوتوں اور برہمنوں نے محسوس کیے۔

تازہ طور پر ہندوستان کی تاریخ کے سلسلے میں ایک اور نقطہ نظر ابھرا ہے جو استقرار یا تسلسل کی جگہ تبدیلی کو زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ اس کے تحت ویدوں کے دور سے ہی سماجی ارتقا کے مختلف درجے یا ادوار متعین کیے جاتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ترقی، منزل اور جمود کے ادوار کے ساتھ ساتھ ہندوستانی سماج کی طویل تاریخ کے دوران سماجی ڈھانچے میں اہم تبدیلیاں رونما ہوتی رہی ہیں۔ زیر نظر عہد سے پہلے کے زمانے کا

مطالعہ اس وقت ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ شمالی ہندوستان میں گپت سلطنت کے تنزل کے بعد ایسا دور نظر آتا ہے جس میں شہروں اور دور دراز علاقوں سے تجارت میں کمی واقع ہوئی۔ سونے کے سکے تو فی الحقیقت ناپید ہوئے ہی چاندی کی کرنسی میں بھی ملاوٹ اور گھٹیا پن نظر آیا۔ علاقائی حد تک اعلیٰ زمیندار طبقے کی طاقت اور اس کا اثر صرف معاشی اور سماجی زندگی پر ہی نہیں بڑھا بلکہ حکومت کے انتظامی طریقہ کار پر بھی نظر آیا۔ اس کے لیے جاگیر داری (فیوڈل) کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جو کہ یورپی جاگیر داری مینر نظام (Manor System) اور تابع داری نظام (Vassalage) کی کچھ بنیادی خصوصیات اس نظام میں موجود نہیں تھیں۔

جدید دور کے ایک معروف تاریخ داں محمد حبیب کے قول کے مطابق ہندوستان میں ترک سلطانوں کی حکومت نے یہاں کی سوسائٹی اور معاشی زندگی میں دور رس تبدیلیوں کی راہیں کھول دیں۔ ان کے مطابق نئی ترک سلطنت نے وہ سماجی دھارے پیدا کر دیے جنھوں نے ایک ایسی معاشی تنظیم کو جنم دیا جو اس سے پہلے کی معاشی تنظیم سے بہتر اور اعلیٰ تھی، اس کی وجہ سے شہروں کے پھیلنے کے مواقع پیدا ہوئے اور زرعی رشتوں میں اہم تبدیلیوں کی راہیں کھلیں۔

17.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت کے سماجی حالات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- سماج میں مختلف طبقات کی حیثیت اور ان کے کردار پر روشنی دال سکیں گے۔
- سماج میں عورتوں اور غلاموں کی حیثیت پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- دہلی سلطنت کے معاشی اور اقتصادی حالات پر تبصرہ کر سکیں گے۔
- زراعت، تجارت اور صنعت و حرفت کے ارتقا کا تجزیہ کر سکیں گے۔

17.2 سماجی زندگی

17.2.1 حکمراں طبقہ

تیرھویں صدی میں شمالی ہندوستان میں جو سب سے اہم طبقہ اُبھرا وہ حکمراں طبقہ تھا جس میں امراء بھی شامل تھے۔ عام طور پر امراء کو تین درجوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ 'خان' جو سب سے اعلیٰ درجہ تھا، اور اس کے بعد 'ملک' اور 'امیر' آتے تھے۔ بہر حال یہ درجہ واری تقسیم کبھی بہت واضح یا صاف نہیں رہی۔ دربار میں، اور اس سے ملحق سب سے نچلے درجے کے عہدوں پر مقرر افراد۔ جیسے 'سر جاندار' (بادشاہ کی ذاتی فوج کے کمانڈر) 'ساقی خاص' (پانی اور دوسرے مشروبات کے منتظم) اور ان کے ساتھ کے کارکن بھی جو 'سپہ سالار'، 'سر خیل' (فوج کے جونیر کمانڈر) وغیرہ ہوتے تھے 'امیر' کے خانے میں آتے تھے۔ بعد میں 'امیر' کا لفظ کچھ آسان سے معنی میں استعمال ہونے لگا اور ہر وہ شخص جو کچھ دولت یا سرکار میں اثر ورسوخ رکھتا تھا امیر کہلایا جانے لگا۔ بہر حال سب سے اہم درجے 'ملک' اور 'خان' کے تھے۔ حکومت کے تمام

عہدے اسی زمرے سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے پاس ہوتے تھے۔ امراء کی جو فہرستیں منہاج سراج اور برنی نے دی ہیں ان میں صرف 25 ملکوں کا ذکر ہے۔ 'خان' لفظ اصل میں منگولوں سے لیا ہوا تھا کیونکہ ان میں قاآن (خان) 10000 سپاہیوں کا کمانڈر ہوتا تھا۔ دہلی سلطنت میں خان کا لفظ ایک مخصوص اور اعلیٰ حیثیت دینے کے لیے استعمال ہوتا تھا کیونکہ بلبن کو الغ خان کہا جاتا تھا۔ امراء کو کچھ اور خطابات دے کر ان کی حیثیت میں امتیاز پیدا کیا جاتا تھا، جیسے 'خواجہ جہاں'، 'عماد الملک' نظام الملک وغیرہ۔ انہیں کچھ اور مراعات یا حقوق (مراتب) بھی دیے جاتے تھے جیسے مختلف قسم کی خلعتیں، تلوار و خنجر، نشان (جھنڈا)، نوبت وغیرہ۔ ان کی ہمیشہ بڑی قدر و منزلت ہوتی تھی چونکہ ان سے حیثیت یا اقتدار اور بادشاہ کی قربت کا احساس ہوتا تھا۔ گھوڑے اور ہاتھی مع مرصع ساز و سامان بھی ان امراء کو مختلف موقعوں پر عطا کیے جاتے تھے۔

کسی خاص وقت میں کسی دربار میں امراء کی تعداد کا صحیح علم نہیں ہے۔ منہاج سراج نے التتمش کے عہد میں 32 ملکوں کی فہرست دی ہے جن میں 8 وسطی ایشیا سے برطرف شدہ حکمراں بھی تھے۔ شاید 'ترکانِ چہل گانی' (چالیس ترک) کی اصطلاح برنی نے صرف چوٹی کے امراء کے اظہار کے لیے استعمال کی ہے۔ بلبن کے عہد میں اس نے قاضیوں کے علاوہ 36 ملکوں کی فہرست دی ہے۔ علاء الدین خلجی کے دور میں امراء کی تعداد 48 تک پہنچ گئی جن میں 7 افراد رشتے دار تھے جن میں سلطان کے بیٹے بھی تھے۔ اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اس وقت جب علاء الدین خلجی کی موت کے بعد سلطنت میں ایک دم توسیع نہیں ہوئی ملک میں چوٹی کے امراء یا ملکوں کی تعداد کافی کم تھی اور جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں امراء کے اس چھوٹے سے زمرے میں بھی آپسی کشمکش اور جھگڑے کافی سخت رہے تھے۔ اس کشمکش میں آپسی تعلقات یا نسلی قربت یا فرق بھی اہم کردار ادا کرتے تھے۔ ترک خود کو تمام دوسری نسلوں سے متعلق لوگوں جیسے تاجکوں، خلجیوں، افغانوں، ہندوستانیوں وغیرہ سے افضل اور اعلیٰ سمجھتے تھے۔ التتمش کی موت کے بعد تاجکوں کو خارج کر دیا گیا اور اعلیٰ عہدوں پر لگ بھگ ترکوں کی گرفت قائم ہو گئی۔ خلجیوں کے عروج سے یہ گرفت ٹوٹی۔ پھر خلجیوں اور تغلق کے دور میں ہندوستانی مسلمان آگے بڑھے، مگر محض اپنی ذاتی صلاحیت اور مستعدی کے بل پر۔ پھر بھی غیر ملکی خون یا کسی مشہور و اعلیٰ خاندان کا وراثتی تعلق کافی حد تک سماجی قدر و منزلت کا پیمانہ رہا جس کی مراکش کے سیاح ابن بطوطہ نے بھی تصدیق کی ہے۔

بلند مرتبہ امراء کے سماجی پس منظر کے بارے میں ہمارے پاس کوئی خاص معلومات موجود نہیں ہیں۔ شروع کے دور میں حرکت یا سماجی طور پر منتقلی کی کیفیت کسی حد تک موجود تھی۔ اور ایک وسیع سماجی پس منظر رکھنے والے وہ افراد جو فوجی سلسلے میں اپنے ساتھ ایک تابعدار جمعیت پیدا کر لینے کی صلاحیت اور طاقت بھی رکھتے تھے، یا جو سلطان کی نظر التفات حاصل کر لیتے تھے اور اگر اُن کی قسمت ان کا ساتھ دیتی تھی تو وہ 'ملک' کے عہدے پر پہنچ سکتے تھے۔ بہت سے امراء نے حقیقت میں اپنی زندگی کی ابتدا غلام کی حیثیت میں کی تھی اور سماجی زینے کے اونچے درجوں پر آہستہ آہستہ چڑھے تھے۔ امراء کے زمرے میں یہ فراخی تیرھویں صدی تک شاہی خاندانوں کے تیز عروج و زوال کی وجہ سے رہی جس کے نتیجے میں پچھلی سلطنت کے دور کے زیادہ تر امراء تبدیلی کی نظر ہو جاتے تھے۔ اسی لیے تیرھویں صدی کے درمیان ہمیں ایسے خاندان مشکل سے نظر آتے ہیں جن کے افراد ایک نسل سے زیادہ کسی مرتبہ امارت پر باقی رہے ہوں۔

چودھویں صدی میں خلجیوں کے عروج اور پھر تغلق خاندان کے عروج کے ساتھ ساتھ، جنہوں نے لگ بھگ سو سال حکومت کی، امرا اور زمرے کی سماجی بنیاد پھیلی بھی اور زیادہ مضبوط اور مستحکم بھی ہوئی۔ اعلیٰ عہدوں پر ترک امراء کے اجارے کے کے ساتھ طبقہ امراء میں داخل ہونے کے لیے بھرتی کا میدان بھی وسیع ہوا۔ بہت سے خلجی، افغانی اور ہندوستانی زمرہ امراء میں شامل ہوئے۔ ترکوں کو نکال باہر کرنے کی کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی گئی۔ بہرحال، جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا تھا اگر کبھی امیر اپنے اقتدار اور عہدے سے ہٹایا بھی جاتا تھا تو اس کی سماجی حیثیت اور سابقہ اقتدار اس کے ورثاء میں پہنچ جاتا تھا اور ان ورثاء کو یہ یقین ہوتا تھا کہ کھوئی ہوئی طاقت یا اقتدار کی واپسی صرف کسی مناسب وقت اور موقع کی منتظر ہے۔

مذہبی افراد کے ساتھ یہ زمرے وہ حلقہ بناتے تھے جسے عرف عام میں 'اشراف' کا نام دیا جاتا تھا اور انہیں محترم اور قابلِ تعظیم مانا جاتا تھا۔ اُس دور کے اندازِ فکر کے مطابق حکومت پر اس حلقے کے سلسلے میں ایک مخصوص ذمے داری عائد ہوتی تھی، جو صرف ان کی ملازمت سے ہی تعلق نہیں رکھتی تھی بلکہ ان کی بیواؤں کو پنشن دینے اور ان کی غیر شادی شدہ لڑکیوں کی شادی کے لیے بھی ذمہ دار تھی۔

عام طور پر 'اہل سیف' (جنگجو) اور اہلِ قلم (پڑھنے لکھنے والے لوگوں کے درمیان) ایک تقسیم بھی خاصی واضح تھی۔ موخر الذکر کو عدالتی اور تحریری کاموں سے متعلق عہدوں کے لیے چنا جاتا تھا۔ علما بھی اسی زمرے میں آتے تھے۔ جب تک منحرف یا ضدی قسم کے سرداروں، مقدسوں اور کسانوں سے محصول وصول کرنے کے سلسلے میں انتظامیہ کا کام فوجی خدمات کے مترادف یا متوازی تھا، پڑھے لکھے زمرہ کو انتظامیہ سے عام طور پر الگ رکھا جاتا تھا، لیکن اس کے باوجود زور اسی بات پر دیا جاتا تھا کہ وزیر کو علم والے زمرے سے چنا جانا چاہیے۔ عام طور پر امراء علم والے طبقے کو کچھ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انہیں انتظامی اور سیاسی معاملات کے لیے ناموزوں تصور کرتے تھے۔ چنانچہ علاؤالدین خلجی نے قاضی مغیث کے اس مشورے کو کہ منگولوں سے کسی قسم کے معاہدے کی کوشش کی جائے نہ صرف مسترد کیا بلکہ یک نویسندہ ابن نویسندہ (یہ کلرک کا بیٹا کلرک) ہوتے ہوئے فوجی اور سیاسی امور میں مشورہ دینے کے لیے اس کا تحقیر آمیز مذاق بھی اڑایا۔

'اشراف' سے اس حلقے یا جماعت سے جس سے امراء کا انتخاب ہوتا تھا، اس کے اثر سے امراء کو ایک استحکام تو ضرور نصیب ہوا مگر اس سے مسلم سوسائٹی میں بھی ایک طرح کی درجہ بندی یا طبقہ واریت پیدا ہو گئی۔ 'اشراف' کے مقابلے میں 'اذلاف' یا 'کم اصل' (نچلے درجے) کے لوگوں کا طبقہ ہوتا تھا۔ اس نچلے درجے میں عام شہری اور پیشہ ور لوگ، جیسے جُلاہے، کسان، مزدور وغیرہ ہوتے تھے۔ اشراف اور اذلاف کے طبقوں کے درمیان صرف شادی بیاہ ہی ناممکنات میں سے نہیں تھا بلکہ ان میں سماجی تعلقات بھی بہت مشکل سے قائم ہوتے تھے۔ اس قسم کی سماجی درجہ بندی گو کہ مغربی اور وسط ایشیا کے مسلمانوں میں کسی قدر پہلے بھی موجود تھی، یہ ہندوستان پہنچ کر۔ جہاں دیرینہ روایت کے تحت ذات پات ورثے میں ملتی تھی۔ اور زیادہ سخت ہو گئی۔

اس گہری سماجی تقسیم سے ہی یہ تصور پیدا اور راسخ ہوا تھا کہ حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر پہنچنے کا حق صرف 'باعزت' طبقے کے افراد کو حاصل ہے۔ اس لیے جب محمد بن تغلق نے اعلیٰ عہدوں پر، صرف مستعدی اور کارکردگی کی بنیاد پر، 'نچلے' درجے یا 'ذات' سے تعلق رکھنے

والے مسلمان یا ہندوؤں۔ جیسے شراب کشید کرنے والے، نائی، باورچی، مالی، دکاندار (بازاری) وغیرہ کا تقرر کیا تو اعلیٰ طبقے کے لوگوں میں کافی وسیع پیمانے پر مزاحمتی انداز نظر آیا۔ کچھ مختلف وجوہات کے نتیجے میں اس کا یہ تجربہ ناکام ہوا۔ دوسری طرف فیروز تغلق نے جب اپنے امراء میں صرف 'باعزت' طبقے سے ایسے لوگوں کو مقرر کیا جن کے آباواجداد بادشاہ کی خدمات انجام دے چکے تھے تو اس کی بہت تعریف و توصیف کی گئی اور اعلیٰ طبقے نے اسے بہت پسند کیا۔ فی الحقیقت یہ تعصب صرف 'ہندوستانیوں' کے خلاف نہیں بلکہ پورے نچلے طبقے کے خلاف تھا، خواہ وہ ہندوستانی مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ اس کیفیت کا ثبوت اس بات سے مل جاتا ہے کہ فیروز کا وزیر خانِ جہاں جو ایک برہمن نو مسلم تھا اُسے مسلمانوں کے ہر طبقے نے خوشی سے قبول کر لیا تھا۔ اس کے بالکل برعکس 'بارادوئی' اور 'پرواری' جنہیں غلطی سے نچلے درجے کے نو مسلم تصور کر لیا گیا تھا اور جو علاءالدین خلجی کے انتقال کے بعد کچھ عرصے کے لیے چوٹی پر پہنچ گئے تھے، ان پر برنی نے بڑی سخت تنقید کی تھی۔ برنی کہتا ہے کہ بلبن کے عہد میں جب امراء کے پاس بظاہر بہت زیادہ نقد روپیہ موجود نہیں تھا، یہ لوگ جب کوئی مجلس یا عیش و عشرت کی محفل سجانا چاہتے تھے تو ان کے کارندے روپے قرض لینے، ساہاؤں، اور ملتانیوں، کے پاس دوڑے چلے جاتے تھے، جس کے نتیجے میں ان کے اقطاع سے حاصل ہوئی ساری آمدنی ان لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جاتی تھی اور سونا چاندی صرف تاجروں کے گھروں میں پایا جاتا تھا۔ علاءالدین خلجی کے برسر اقتدار آنے اور اس کے تحت محصول کے ایک نئے مرکزی نظام کے اُبھرنے سے اس صورت حال میں کسی حد تک تبدیلی پیدا ہوئی۔ یہ نظام خلجی حکمرانوں تک باقی رہا۔ اس نئے محصولی نظام میں ترجیح اس بات کو دی جاتی تھی کہ محصول نقد رقم میں ادا کیا جائے۔ اور یہ طریقہ صرف خالصہ علاقوں۔ جن کی آمدنی براہ راست مرکزی خزانے میں جاتی تھی۔ پر ہی عائد نہیں ہوتا تھا بلکہ اُن علاقوں کے لیے بھی تھا جو 'اقطاع' کے طور پر دیے گئے تھے۔ اس طرح جب ابنِ بطوطہ کو منصف مقرر کیا گیا اور اس کی تنخواہ 5,000 مقرر کی گئی تو اسے ایسے ڈھائی گاؤں دے کر اس کی ادائیگی کی گئی جن کی سالانہ آمدنی اس رقم کے برابر ہوتی تھی۔ اب ہمیں بڑی بڑی تنخواہیں پانے والے امراء کا بھی علم ہے۔ چنانچہ ملک کو 50,000 سے 60,000 ٹنکہ تک تنخواہ ملتی تھی۔ امیر کو 30,000 سے 40,000 ٹنکہ کے درمیان اور سپہ سالار کو 20,000 ٹنکہ ملتے تھے۔ فیروز تغلق کے عہد میں تنخواہیں اور زیادہ تھیں۔ چنانچہ خانِ جہاں مقبول کو 13 لاکھ ٹنکے ملتے تھے اور ان کے علاوہ اس کی فوج اور ملازمین کے اخراجات اور اس کے بیٹوں اور دامادوں کے بھتے (الاؤنس) الگ تھے، دوسرے امراء کو چار سے آٹھ ٹنکے سالانہ تنخواہ ملتی تھی۔ مجموعی طور پر اس کا مطلب یہ تھا کہ دیہی علاقوں سے ہونے والی زائد یا اضافی آمد مرکز میں کچھ اعلیٰ طبقے کے ہاتھوں میں مرکوز ہو رہی تھی۔ بڑی بڑی تنخواہوں کا مطلب صرف یہی نہیں تھا کہ فضول خرچی بڑھ رہی تھی، اس سے دولت کی ذخیرہ اندوزی کے امکانات بھی بڑھ رہے تھے۔ ملک شاہین جو فیروز کا نائب امیر مجلس تھا، اس نے اپنے بعد ہیرے جواہرات، زیورات اور بیش قیمت خلعتوں کے علاوہ 50 ٹنکے چھوڑے۔ عماد الملک بشیر سلطانی نے جو بادشاہ کا غلام رہ چکا تھا، 13 کروڑ ٹنکے اپنی موت کے بعد چھوڑے جن میں سے 9 کروڑ سلطان نے ضبط کر لیے۔ بہر حال ان مثالوں کو معمول نہیں مستثنیات سمجھنا چاہیے۔ بعد کے غیر یقینی حالات میں ایک تحفظ یا سہارا بن جانے کے علاوہ ایسے خزانوں کی تعداد میں اضافہ اس بات کا بھی اظہار کرتا ہے جس سے ملک میں نقد زر پر مبنی معیشت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی تھی۔ بہر طور نقد زر پر مبنی معاشیات کے ابھرنے اور مستحکم ہونے سے تجارت اور تاجروں کے حق میں اندازِ فکر میں بھی تبدیلی پیدا ہونے لگی تھی۔ ابن بطوطہ نے دہلی کے سلطان کی ملکیت میں پانی کے جہازوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ ایک موقع پر سلطان محمد بن تغلق نے شہاب الدین قزرونی کو،

جو اس کا دوست تھا اور سمندری تجارت کا ماہر اور 'شاہ تجار' کہلاتا تھا، اسے تین جہاز سونپ دیے۔ غالباً پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ تاجروں نے انتظامیہ میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔ اسی وجہ سے محمد بن تغلق نے کھمبایت شہر کا انچارج شہاب الدین کو مقرر کر دیا تھا۔ اگر ابن بطوطہ کے بیان کو صحیح مان لیا جائے تو سلطان نے اُسے وزیر مقرر کرنے کا بھی وعدہ کیا تھا مگر دہلی کی طرف آتے ہوئے اسے وزیر خانِ جہاں نے قتل کروا دیا۔

ایسی اطلاعات بھی موجود ہیں کہ عراق کا ابوالحسن عبادی، جو دہلی میں قیام رکھتا تھا، وہ سلطان محمد بن تغلق کے پیسے سے تجارت کرتا تھا اور اس کے لیے عراق اور خراسان سے ہتھیار اور دوسری اشیاء خریدتا تھا۔ ممکن ہے دوسرے امراء نے بھی سلطان کی مثال پر عمل کیا ہو مگر اس کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے۔ دوسری طرف اس کا اظہار زیادہ ہوتا ہے کہ امراء کی سرمایہ کاری زیادہ تر تجارت کی بجائے باغات پر ہوتی تھی جن کی تعداد فیروز کے عہد میں امراء کی خوشحالی میں اضافے کے ساتھ بہت تیزی سے بڑھی۔ بہر طور، امراء کی طرف سے پیداواری سرمایہ کاری کے اُبھرنے میں ابھی کچھ وقت اور درکار تھا اور اِسے اکبر کے عہد کی نو مرکزیت کا انتظار تھا۔ ترک امراء کی تعلیم اور ثقافتی (کلچرل) طرزِ فکر کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں۔ ظاہری طور پر وہ ناخواندہ تو نہیں تھے۔ یہاں تک کہ سمرقند و بخارا کے غلاموں کو بازاروں میں دوبارہ بیچنے سے پہلے پڑھنا لکھنا سکھایا جاتا تھا۔ حالانکہ غلاموں میں بہت سے غلام تازہ نو مسلم ہوتے تھے مگر یہ وسطِ ایشیا اور خراسان وغیرہ میں اس وقت کے اسلامی ثقافتی اور مذہبی معمولات سے بخوبی واقف ہوتے تھے۔ بہر حال یہ ایک دیرینہ اور مستحکم امراء طبقے جیسی ثقافتی شان و شوکت مشکل سے ہی اپنا سکتے تھے۔ نہ ان امراء سے ایسی کسی بات کی توقع کی جا سکتی تھی کہ یہ باشعور انداز میں ثقافت کے مربی یا سرپرست رہے ہوں گے، گو کہ شعراء اور ادیبوں کی سرپرستی امارت اور عظمت کی علامت سمجھی جاتی تھی اور کبھی بھی انہیں غیر معمولی انعام و اکرام سے بھی نوازا جاتا تھا۔ اس صورت حال میں امیر خسرو اور ان کے ساتھی امیر حسن سجزی کے منظر عام پر آنے سے تبدیلی پیدا ہونا شروع ہوئی۔ تیرھویں صدی کے آخر میں یہ صورتِ حال پیدا ہوئی اور پھر رفتہ رفتہ ایک نیا ہند و مسلم 'ثقافت اُبھرنا شروع ہوا جس کی نشو و نما میں بہت سے امراء اور صوفیاء نے قابل قدر انداز میں حصہ لیا۔ اس طرح ضیاء نخشبی (فوت 1350) نے بہت سے موضوعات پر لکھا جن میں شعر و سخن بھی شامل تھا اور انہوں نے بہت سی سنسکرت تحریروں کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ اس طرح صدی قسم کے جنگجو کی حیثیت سے امراء رفتہ رفتہ ثقافت کے مربی اور سرپرست بھی ہوتے چلے گئے۔

17.2.2 زمیندار طبقہ

حالانکہ راجپوت لگ بھگ پورے شمالی ہندوستان میں حکمرانی کا اقتدار کھو چکے تھے اور اب صرف راجستھان اور اُس کے آس پاس کے علاقوں اور دور افتادہ ہمالیہ کے پہاڑی علاقوں، بندیل کھنڈ وغیرہ میں ہی ان کا کچھ اقتدار باقی تھا لیکن راجپوت راجا مرکز کے زیر انتظام پنجاب، دوآب، بہار، گجرات وغیرہ کے بڑے بڑے علاقوں پر اب بھی خاصی مضبوط گرفت رکھتے تھے۔ یہ لوگ 'رائے'، 'رانا'، راوت وغیرہ کے ناموں سے جانے جاتے تھے۔ ان کے اپنے مسلح فوجی دستے ہوتے تھے اور یہ لوگ عام طور پر دیہی علاقوں میں اپنے چھوٹے قلعوں یا گڑھیوں میں رہتے تھے۔ ان کی تعداد یا ان کی فوجی طاقت کا اندازہ بہت کم موجود ہے، بہر حال یہ دیہی علاقوں کی معاشی اور سماجی زندگی اور وہاں کی سیاسی صورت حال میں اہم حیثیت کے حامل تھے۔ حالانکہ اس وقت کے ماخذ انہیں پوری طرح دشمن کے روپ میں پیش کرتے ہیں۔

جن سے مستقل جہاد صرف جائز ہی نہیں لازمی تھا لیکن ایک مستقل دشمنی کا ماحول نہ ترکی سلطانوں کے لیے کوئی پر سکون صورت حال تھی نہ خود ان راجاؤں کے لیے۔ ترکی سلطانوں کے حق میں یہی صورت حال مناسب تھی کہ یہ اپنے اپنے علاقوں میں اس وقت تک حکومت کرتے رہیں جب تک یہ خراج کے طور پر ایک مقررہ رقم پابندی سے ادا کرتے رہیں اور عام طور پر وفاداری اور تابعداری کا اظہار کرتے رہیں۔

ترک حکمرانوں اور ہندو سرداروں کے درمیان بڑھتے ہوئے سیاسی تعلق کے سلسلے میں شہادتیں بھی موجود ہیں۔ چنانچہ بتایا جاتا ہے یہ ہندو رائے سو سو کوس کی دوری سے بلبن کے دربار کی شان و شوکت دیکھنے آیا کرتے تھے۔ بنگال میں بلبن کی طغرل پر فتح کے بعد اودھ میں بہت سے لوگ اُسے خوش آمدید کہنے آئے جن میں اس علاقے کے رائے بھی تھے۔ کچھ بعد میں جب فیروز تغلق نے بنگال پر حملہ کیا تو مشرقی اتر پردیش کے رائے اس کے ساتھ جن میں سب سے اہم شخصیت گورکھپور اور چمپارن کے رائے اودے سنگھ کی تھی، اس نے خراج کے بیس لاکھ بھی ادا کیے جو اس پر ادھار تھے۔

ایک اور موقع پر جب بلبن کے ایک بھتیجے ملک چھجو نے جو کڑا کا گورنر تھا، جلال الدین خلجی کے خلاف بغاوت کی تو وہاں کے مقامی رائے، راوت اور پایک اس کے ساتھ شامل ہو گئے اور ''چیونٹیوں اور ٹڈیوں کی طرح اس کے ارد گرد منڈلانے لگے۔'' جلال الدین خلجی سے مقابلے میں وہ اس کے ساتھ جمے رہے۔ ملک چھجو کو تو شکست ہوئی مگر اس واقعے کے بعد سے ہندو سردار دربار میں سلطان کے سامنے حاضر رہنے لگے۔ اُس طرح یہ بھی سنا جاتا ہے کہ فیروز تغلق کے عہد میں 'انی رتھو' جو ''دو شاہی چھتروں کا مالک'' تھا، رائے مدار (یابلار) دیو، رائے سمیر، راوت ادھی رام وغیرہ کو دربار میں صرف حاضر ہونے کی ہی اجازت نہیں تھی بلکہ دربار میں بیٹھنے کی بھی اجازت تھی۔

سلطنت عہد میں ان بڑھتے ہوئے سیاسی رشتوں کے باوجود سرداروں کی حیثیت بہت حد تک غیر یقینی ہی تھی۔ دہلی کے سلطانوں کی پالیسی میں ایک حصہ یہ بھی تھا کہ جب بھی ممکن ہو ہندو سرداروں کو بے دخل کر دیا جائے یا مستقل طور پر یہ کوشش جاری رکھی جائے کہ ان سرداروں کے مقبوضہ علاقوں میں شاہی محصول انتظامیہ کو عائد کر کے ان کی طاقت اور حقوق اور سہولتوں کو متواتر گھٹایا جائے۔ حالانکہ اس طرز عمل سے غالباً کسانوں پر پڑنے والے مجموعی بار میں تو تخفیف نہیں ہوئی ہو گی مگر اس سے سرداروں اور دوسرے بچولیوں کے حقوق اور بالائی آمدنی میں غالباً کچھ کمی ضرور آئی ہو گی۔

چودھویں صدی کی ابتدا تک ہمیں 'زمینداروں' کا ذکر بھی بار بار ملنے لگتا ہے۔ یہ اصطلاح جو ہندوستان سے باہر کہیں استعمال نہیں ہوئی، ایسے ایسے بچولیوں کے لیے متواتر استعمال کی جانے لگی جو موروثی حقوق رکھنے والے تھے۔ امیر خسرو نے اسے سب سے پہلے استعمال کیا۔ کچھ سے بعد رفتہ رفتہ یہ اصطلاح خوطوں، مقدموں اور چودھریوں بلکہ ان سابقہ سرداروں کے لیے بھی استعمال ہونے لگی جنہیں اس بات کے لیے مجبور کر دیا گیا تھا کہ وہ ایک متعینہ مجموعی رقم ادا کرنے کے بجائے محصول کے تخمینے کی بنیاد پر مقرر کی جانے والی رقم ادا کریں۔ مغلوں کے عہد میں لفظ 'زمیندار' ان تمام لوگوں کے لیے جو زمین کی موروثی ملکیت رکھتے تھے یا محصول میں موروثی حصہ رکھتے تھے، استعمال ہونے لگا۔ سردار تک بھی اسی زمرے میں شمار کیے جانے گئے۔ ان حقوق یافتہ دیہی لوگوں کے طرز زندگی کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں۔

بہر حال ان کے تمول یا دولتمندی کا باقی لوگوں کی غربت سے مقابلہ کیا جاتا ہے۔

17.2.3 انتظامی افسران اور علماء

حکمراں طبقہ، خصوصاً امراء نچلے درجے کے کارکنوں کی مدد حاصل کیے بغیر کام کر ہی نہیں سکتے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے بہت سے ملازمین، غلام اور دوسرے مصاحبین وغیرہ بھی ہوتے تھے۔ ان کارکنوں کو مجموعی طور پر دو اقسام میں بانٹا جاسکتا ہے۔ عدالتی اور مذہبی کارکن اور دوسرے محصول اور انتظامیہ سے متعلق کارکن۔ اول الذکر میں قاضی اور مفتی ہوتے تھے جو اُن تمام شہروں میں مقرر کیے جاتے تھے جہاں مسلمانوں کی قابل ذکر آبادی ہوتی تھی۔ یہ لوگ مسلمانوں کے معاملات میں دیوانی مقدمات فیصل کرتے تھے اور ہندوؤں کے معاملات کو اُن کے روایتی قوانین اور دھرم شاستر کے مطابق فیصلوں کے لیے چھوڑ دیتے تھے۔ یہ فوجداری مقدموں کا بھی فیصلہ کرتے تھے۔ ان کا افسر اعلیٰ قاضی القضاۃ یا سب سے بڑا قاضی ہوتا تھا۔ پایہ تخت اور شاید دوسرے شہروں میں ایک 'داد بک' ہوتا تھا جو بے حساب عاید کیے ہوئے محصولوں کی وقتاً فوقتاً جانچ پڑتال کرتا تھا، اور ان امیروں پر نگرانی اور گرفت رکھنے کے لیے ذمے دار ہوتا تھا جو محصول کی وصولی کی غرض سے مسلمانوں کی املاک کا سروے کر کے ان کا حساب رکھتے تھے۔ ان کے علاوہ محتسب بھی ہوتا تھا جو کوتوال کے ماتحت کام کرتا تھا اور اس پر نگاہ رکھنے کا ذمہ دار ہوتا تھا کہ سلطان اعلانیہ شریعت کے خلاف کام نہ کریں یا روزہ نماز جیسے فرائض کی پابندی سے منہ نہ موڑیں۔ وزن اور ناپ تول کی نگرانی بھی اس کی ذمے ہوتی تھی۔

یہ سب تنخواہ دار عہدے ہوتے تھے اور جیسے جیسے مسلمان آبادی بڑھی ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا رہا۔ پھر امام اور موذن وغیرہ بھی ہوتے تھے جن کا تقرر مسجدوں میں کیا جاتا تھا۔ مقبروں وغیرہ پر قرآن شریف کی تلاوت کے لیے قاری رکھے جاتے تھے۔ انہیں دوسری تقریبات کے موقعوں پر بھی بلایا جاتا تھا۔ ان کے علاوہ مذہبی قابل احترام لوگوں کو مختلف اسکولوں (مکتبوں) اور کالجوں (مدرسوں) میں مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ سب لوگ دینی یا مذہبی طبقے میں شمار ہوتے تھے اور علماء کہے جاتے تھے۔ علماء کا بہت احترام کیا جاتا تھا۔ عام اصول کے مطابق یہ لوگ مسلم قوانین (شریعت)، منطق اور دینیات وغیرہ میں باقاعدہ تربیت یافتہ ہوتے تھے اور عربی زبان کی بھی کچھ واقفیت رکھتے تھے۔ ان سرکاری طبقوں کے علاوہ بھی مسلم علماء اور دیندار لوگوں کا ایک طبقہ تھا جنہیں حکومت کی طرف سے وظائف اور محصول معاف زمینیں اور دوسرے عطیات دیے جاتے تھے۔

اس وسیع اور غیر منظم قسم کے زمرے کی سماجی بنیاد کے بارے میں معلومات بہت کم موجود ہیں۔ مجموعی طور پر اس زمرے کو وہ طبقہ کیا جاسکتا ہے جسے جدید اصطلاح میں نچلا درمیانی یا درمیانی طبقہ کہا جاتا ہے۔ گو کہ انہیں میں سے کچھ علماء قاضی القضاۃ کے درجے پر بھی پہنچے اور بڑی حد تک ان کا شمار حکمراں طبقے میں ہونے لگا۔ اکثر اوقات شعراء، علماء، مورخ، طبیب اور حکومت کے نچلے درجے کے کارکن۔ عامل (محصول وصولی کارکن) محرر (اکاؤنٹنٹ) وغیرہ بھی اسی سماجی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اسے ہم 'خواندہ' طبقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں اس ملک میں جہاں کی آبادی کا بڑا حصہ ناخواندہ ہو وہاں تعلیم یافتہ لوگ خاص طور پر جو مذہبی معلومات کا بھی دعویٰ رکھتے ہوں

انہیں بڑا اعزاز واحترام حاصل ہو جاتا ہے۔ پھر بھی علماء بحثیت ایک طبقہ، بالا ثر اور سمجھدار قسم کے حلقوں میں کسی خاص اہمیت کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے تھے۔ بلبن کے بیٹے بغرا خان نے بعد کے دور کے دینی افراد کے متعلق اپنے بیٹے کیقباد کو ''لالچی اور چالباز لوگ جنہیں اس دنیا کے علاوہ آخرت کی کوئی فکر نہیں'' کے الفاظ کے ساتھ متنبہ کیا تھا۔ امیر خسرو نے حکومت میں قاضیوں کے طبقے کو بے ایمان (بدعنوانیاں کرنے والے)، جاہل اور حکومت میں کسی قسم کی ذمہ دار حیثیت کے لیے نااہل افراد کہا تھا۔ یہ لوگ عام طور پر گستاخ، مغرور، بے حقیقت اور ابن الوقت قسم کے لوگ کہے جاتے تھے جو کسی وقت بھی اپنے اصول و عقائد کو بااقتدار لوگوں کو خوش رکھنے کی خاطر قربان کر سکتے تھے۔ عام طور پر سلطان سیاسی معاملات میں انہیں کسی قسم کا مشورہ دینے کی بھی اجازت نہیں دیتے تھے اور انہیں صرف عدالتی معاملات کو فیصل کرنے، مذہبی امور اور تعلیم کے سلسلے تک محدود رکھتے تھے۔ اس کے باوجود علماء نے عام مسلمانوں اور حکمران طبقے کے درمیان ایک عبوری سلسلے یا پل کا کردار ادا کیا اور مسلمانوں میں ایک اتحاد کا احساس پیدا کیے رہنے میں مدد کی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ بہت سے علماء غیر ملکی تھے جنہوں نے یا تو منگولوں کے دباؤ سے بچنے کے لیے ہندوستان میں پناہ لی تھی یا ہندوستان کی خوشحالی نے انہیں یہاں کھینچ بلایا تھا۔ انہیں ہندوستان کے بارے میں بہت کم واقفیت تھی اور انہوں نے ہندوستانی دینی حلقے کے ایک طبقے کے ساتھ مل کر مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تناؤ بنائے رہنے کا کام کیا اور عوام میں جو ایک سماجی بھائی چارہ یا عام ہم آہنگی پیدا ہو گئی تھی اسے نظر انداز کیا۔ مرکز میں انتظامیہ کے متواتر اُبھرتے ہوئے آلہ کار کے لیے اور علاء الدین خلجی کے شروع کیے ہوئے نئے محصولی نظام کو مختلف صوبوں اور شہروں میں عائد کرنے کے لیے بہت بڑی تعداد میں کلرکوں اور دوسرے دفتری کارکنوں کی بھی ضرورت تھی۔ افسروں کے اس زمرے کی سرکاری طاقت، بدعنوانیوں کے امکانات اور ان کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں، اور پھر ان کی اصلاح کے لیے علاء الدین خلجی کے اٹھائے ہوئے متعدد اقدامات وغیرہ کو برنی نے بڑی وضاحت اور مثالوں کے ساتھ بیان کیا ہے۔ سرکاری خدمات میں بھرتی ہونے والے اس گروپ کے سماجی پس منظر کی معلومات موجود نہیں ہیں۔ ان میں سے بہت سے افراد ہندوستانی نومسلم یا علماء طبقے سے تعلق رکھتے ہوں گے۔ اگر ہم مقدموں اور پٹواریوں کو اس طبقے سے مستثنا کر دیں جو ہندو تھے، اور جو گاؤوں میں رہتے تھے تو ان نچلے درجے کے افسروں میں زیادہ تر مسلمان ہوں گے۔ بہر حال لگتا ہے کہ محمد بن تغلق کے عہد تک ہندو بھی اس حلقے میں داخل ہونے لگے تھے کیونکہ یہی وہ حلقہ تھا جس سے اس نے اعلیٰ حیثیتوں کے لیے کچھ تھوڑی سی تعداد میں افراد کا انتخاب کیا تھا۔ اس طرح اس وقت تک فارسی داں ہندوؤں کا بھی ایک طبقہ اُبھر آیا تھا۔

17.2.4 تاجر اور سرمایہ کار طبقے

ہندوستان میں تجارت کی بڑی پرانی روایت موجود تھی اور یہاں تاجروں اور سرمایہ کاروں کا ایک طبقہ قدیم زمانے سے موجود تھا۔ چنانچہ دھرم شاستروں میں ٹھیکے یا معاہدے، قرض کے لین دین اور خرید و فروخت سب کے لیے قوانین اور ضابطے متعین تھے۔ ویش ذات کے ایک باقاعدہ تاجر طبقے کی شکل میں ابھرنے اور ان کے دوج (دوبار پیدا ہوئے یا حقوق یافتہ) طبقے میں شمار کیے جانے سے ملک کی سماجی اور معاشی زندگی میں ان کی اعلیٰ حیثیت کا اظہار بخوبی ہوتا ہے۔ بہر حال بڑے بڑے تاجروں (نگر اسٹریشٹن) اور معمولی دکانداروں (بنک) اور معمولی بنجاروں کے درمیان واضح طور پر امتیاز کر لینا بہت ضروری ہے۔ پانچویں صدی میں تصنیف ہوئی کہانیوں (پنچ تنتر) کے مطابق اوّل

الذکر زمرہ سماجی اعتبار سے حکمرانوں سے قریب سمجھا جاتا تھا اور شاہی خاندان کے ساتھ یہ لوگ آزادانہ طور پر گھلے ملے رہتے تھے۔ یہ بڑے تاجر صرف بڑے پانے یا تھوک کے بیوپار یا دور دراز علاقوں سے تجارت میں ہی حصہ نہیں لیتے تھے، جس میں غیر ملکوں سے تجارت بھی شامل تھی بلکہ یہ لوگ سرمایہ کاری اور روپے پیسے کی تبدیلی یا لین دین کا کاروبار بھی کرتے تھے۔ یہ تاجر دور دراز کی تجارت کے لیے سرمایہ فراہم کرتے تھے، خطرات اور خدشات کے لیے تحفظ (بیمہ) دیتے تھے اور ہنڈی نظام کے تحت ایک جگہ سے دوسری جگہ نقد رقمیں منتقل کرتے تھے۔

شمالی ہندوستان میں ایک مضبوط اور مستحکم مرکزیت پر مبنی حکومت، بنیادی طور پر چاندی کے ٹنکے پر مبنی کرنسی کا نظام و سڑکوں پر بہتر تحفظ اور امن، شہروں کی نشو و نما اور اسلامی دنیا سے ہندوستان کا متعارف ہونا، یہ تمام امور مغربی اور وسطی ایشیا سے ہندوستان کی بری اور بحری تجارت کے لیے ذمہ دار تھے۔ بحری تجارت زیادہ تر گجرات کے راستے ہوتی تھی۔ اس کی تصدیق ان متعدد بیانات سے ہوتی ہے جن میں تاجروں اور سرمایہ کاروں کو ملتانی کہا گیا ہے۔ عام طور پر یہ مانا جاتا ہے کہ پورے عہد وسطیٰ میں ملتان بہت اہم تجارتی مرکز تھا، چونکہ درّہِ بولان کو پار کرکے یہ براہ راست ہرات اور بخارا سے جڑا ہوا تھا جو ''ریشمی سڑک'' کا ایسا چوراہا تھا جو مشرق کی طرف سے وسط ایشیا اور چین سے اور مغرب کی طرف سے ایران اور قسطنطنیہ اور لبنان سے جڑا ہوا تھا۔ دریائے سندھ کے ذریعے ملتان مغربی بندرگاہوں سے بھی تعلق رکھتا تھا، ظاہر ہے کہ ملتانیوں کا بڑا حصہ ہندوؤں پر ہی مشتمل تھا۔

ہم برنی کے اس بیان کا ذکر کر چکے ہیں جس میں اس نے اظہار کیا تھا کہ ملتانی اور دہلی کے ساہا امراء کو روپیہ ادھار دینے کے سلسلے میں اتنے رئیس ہو چکے تھے کہ سونا چاندی صرف انہیں کے گھروں میں دیکھا جا سکتا تھا۔ برنی نے ملتانیوں اور ساہاؤں کی خوشحالی کو دوسرے انداز سے بھی بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جلال الدین خلجی نے ہندوؤں کے خلاف کوئی اقدام کرنے سے بالکل صاف انکار کر دیا جو دارالسلطنت دہلی میں بھی پوری مذہبی آزادی رکھتے تھے اور اُن میں سے خوشحال لوگ ظاہر ہے ملتانی، بڑے سکون اور عیش کی زندگی گزار رہے تھے اور انہیں اپنے جان و مال کے تحفظ کی کوئی فکر نہیں تھی۔

بیوپاریوں کے ایک اور زمرے کا بھی برنی نے حوالہ دیا ہے۔ یہ تھے دلال۔ یہ دلال اصل میں کمیشن ایجنٹ تھے جو خریداروں اور بیچنے والوں کو ایک دوسرے سے قریب لا کر اس کی فیس لیتے تھے۔ ان کا وجود دہلی میں تجارت میں اضافے کو ظاہر کرتا ہے۔ بتایا جاتا ہے کہ مختلف چیزوں کے خریدار، خصوصاً کپڑے کے خریدار، بازاروں پر علاءالدین کی گرفت کے بعد دہلی کی طرف دوڑے چلے آتے تھے۔ برنی ان دلالوں کا ذکر خاص طور پر گھوڑوں کی فروخت پر علاءالدین کی گرفت کے سلسلے میں کرتا ہے۔ اُس نے ان دلالوں کے لیے بڑے سخت لفظ استعمال کیے ہیں، جن میں سے خاصی بڑی تعداد خصوصاً گھوڑوں کے تاجر، مسلمانوں کی ہی تھی۔ انہوں نے خود اپنا ایک مضبوط حلقہ بنا لیا تھا جو بہت پیسے والا تھا جو بعض موقعوں پر سلطان تک کی حکم عدولی کر لیتا تھا اور اس کے احکام کو نظرانداز کر دیتا تھا۔

دہلی میں مسلمان تاجر عام طور پر غیر ملکی عراقی، ایرانی، خراسانی وغیرہ تھے لیکن ان کے ساتھ کچھ مسلمان ملتانیوں کا ذکر بھی مل جاتا

ہے۔ چنانچہ حسام الدین اور اس کا باپ اور دادا، جنہیں علاء الدین نے قاضی مقرر کیا تھا وہ ملتان کے ہی بیوپاری تھے۔ ابن بطوطہ کے قول کے مطابق ہندوستان میں تمام غیر ملکی تاجر خراسانی کہلاتے تھے۔ مسلمان تاجروں کا ایک حلقہ افغانیوں کا تھا۔ ان کی خصوصیت کاروان تجارت اور گھوڑوں کی تجارت تھی۔

ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں تاجر فرقوں کی معلومات بہت کم ہیں۔ گجرات میں تجارت کی روایت بہت پختہ اور جمی ہوئی تھی جس میں مقامی اور غیر ملکی تاجر، دونوں فرقے موجود تھے۔ ہم ایک مصری، شہاب الدین قزرونی کا ذکر کر چکے ہیں جو کئی جہازوں کا مالک تھا اور کھمبایت میں رہتا تھا۔ جین، مارواڑی، گجراتی بنیے اور بوہرے بھی تجارتی کام میں مصروف تھے جن کا ذکر روایتی اور مقامی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ انہی تاجروں میں سے علاء الدین کے لیے ملک کافور کو حاصل کیا گیا تھا۔

17.2.5 معیار زندگی

اس دور کے مورخوں نے سلطان کے مسرفانہ طرز زندگی کو بیان کرنے میں بڑی فراخدلی سے کام لیا ہے۔ ان کے محلات، ان کے ساز و سامان، ان کے حرموں میں بہت بڑی تعداد میں عورتوں اور اعزاء کی فضول خرچیاں، اُن کے قیمتی کپڑے اور زیورات، شاہی اصطبل پر زبردست اخراجات اور امراء، شعراء، علماء اور صوفیاء کو دیے جانے والے قیمتی تحفے تحائف کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ طرز زندگی ایک مستقل انداز بن گیا تھا اور یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ درباریوں اور رعایا کے ذہنوں پر اس کا اثر پڑتا تھا۔

ہمیں سلطانوں کی انفرادی زندگی کے اس انداز پر اس سے زیادہ توجہ دینے کی ضرورت نہیں ہے جتنی آج کے لااُبالی اور شوقین قسم کے نوجوانوں پر توجہ دی جاسکتی ہے لیکن سلطان بہر طور سرپرستی کا مرکز ہوتا تھا اور سماج میں سب سے اعلیٰ یا سرپرست (لیڈر) کی حیثیت رکھتا تھا اور سماج کے اعلیٰ طبقے کے طرزِ زندگی اور انداز فکر پر بڑا گہرا اثر رکھتا تھا۔

ہم تغلق کے دور سے امراء کی بڑھتی ہوئی خوشحالی اور فضول خرچی کو پہلے دیکھ چکے ہیں۔ بہر حال بلبن کے عہد میں، جیسا کہ ذکر ملتا ہے، اس کے رشتے کے بھائی ملک کشلی خان نے ایک موقعے پر اپنے تمام گھوڑے اور 10,000 ٹنکے اپنے شاعروں اور بھانڈوں کو دے دیے تھے۔ بلبن کا ماتحت کوتوال فخر الدین 12,000 قرآن پڑھنے والوں کو مالی امداد دیا کرتا تھا اور ایک ہزار لڑکیوں کو ہر سال جہیز دیتا تھا۔ اس نے نہ کبھی ایک لباس کو دوبارہ پہنا نہ ایک بستر پر دوبارہ سویا۔ بلبن کا دیوان عرض عماد الملک اپنے دستر خوان (کھانوں) کے لیے مشہور تھا جو پچاس سے ساٹھ قابوں (ڈشوں) پر مشتمل ہوتا تھا جنہیں اس کے کارکنوں اور کلرکوں میں ہر روز تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ میر مقبول 'محمد بن تغلق کا ایک امیر' اپنے ذاتی اخراجات کیلیے ساڑھے تین لاکھ ٹنکے خرچ کیا کرتا تھا۔ فیروز کے وزیر خان جہاں کے حرم میں 20,000 عورتیں تھیں۔ امراء کے اسراف کی ان مثالوں کو اکادکا نہیں تصور کیا جاسکتا، انہیں پھیلایا جاسکتا ہے۔

امراء کے اس طرز زندگی کی مانگوں کو پورا کرنے کے نتیجے میں کچھ مخصوص قسم کی صنعتوں کے ابھرنے کے مواقع پیدا ہوئے۔ ایسی صنعتوں میں کتنے لوگ برسرروزگار تھے یا کتنے لوگ اس سلسلے میں دوسری خدمات انجام دیتے تھے اس کا اندازہ محصول امشکل ہے لیکن یہ

تعداد خاصی بڑی ہو گی چونکہ زیادہ تر امراء اپنی دولت کو جمع کر کے نہیں رکھتے تھے۔ نہ یہ امراء اپنے پیسے کو کسی پیداواری عمل میں سرمایے کے طور پر لگاتے تھے۔ جو کچھ بھی سرمایہ کاری تھی وہ محمد بن تغلق اور اس سے بھی زیادہ فیروز تغلق کے عہد میں باغات محصولے کی تھی۔ کمتر درجے کے سرکاری کارکنوں، عدالتی کارکنوں، مذہبی کارکنوں اور حکیموں، شاعروں، موسیقاروں اور دوسرے پیشہ وروں کے معیار زندگی کے بارے میں بھی واقفیت زیادہ موجود نہیں ہے۔ کچھ بہت مشہور حکیم بہت متمول اور رئیس ہوتے تھے۔ شعر کا انحصار اس پر تھا کہ انہیں کیسا مربی یا سرپرست نصیب ہوا ہے۔ چنانچہ امیر خسرو کے والد کو، جس وقت وہ امیر تھے، بلبن کے دربار میں 1,200 ٹنکے سالانہ کا وظیفہ ملتا تھا۔ بلبن کے عارض نے شاہی موسیقاروں کو ایک بار اپنے گھر پر گانے کے لیے 10,000 ٹنکے، 100 گھوڑے اور 320 لباس دیے تھے۔ عام طور پر یہ طبقے نسبتاً آرام کی زندگی گزارتے تھے مگر فضول خرچی یا اسراف کی زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔

جہاں تک شہر کی عام آبادی کا سوال ہے اُن کے معیار زندگی کا انحصار عام طور پر قیمتوں اور ان کی تنخواہوں پر ہی تھا۔ علاء الدین خلجی سے پہلے قیمتوں کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ بازاروں پر گرفت کے ذریعے علاء الدین نے کھانے کے سستے سامان کی فراہمی کو یقینی بنادیا۔ چنانچہ برنی بتلاتا ہے کہ گیہوں ساڑھے سات جیتل فی من، جو 4 جیتل فی من، اور اچھے قسم کا پاول 5 جیتل فی من کے حساب سے بکتا تھا۔ بہر حال اگر ضروریات زندگی کی قیمتیں کم تھیں تو تنخواہیں بھی کم تھیں۔ علاء الدین کے عہد میں کاریگر کی تنخواہ 2 یا 3 جیتل یومیہ تھی جس کا مطلب ہے صرف ڈیڑھ یا 2 ٹنکے (1) مہینہ۔ برنی لکھتا ہے کہ 6 جیتل کی روٹی اور دم پخت گوشت، یعنی صرف زندگی گزارنے برابر غذا، سات آٹھ لوگوں کے لیے کافی ہوتی تھی۔ ذاتی ملازموں کی تنخواہ 10 سے 12 ٹنکے سالانہ ہوتی تھی۔ ایک گھوڑ سوار سپاہی کی تنخواہ جو علاوالدین نے 234 کے سالانہ یا لگ بھگ 20 ٹنکے مہینہ مقرر کی تھی، اتنی تھی کہ اُس میں ایک سپاہی اور اس کا گھوڑا ڈھنگ سے زندگی گزار سکتے تھے۔ بتایا جاتا ہے کہ علاء الدین کی موت کے بعد، قیمتوں پر کنٹرول کا نظام بگڑ کر ختم ہو گیا اور قیمتیں بہت تیزی سے بڑھیں اور ان کے ساتھ ساتھ تنخواہیں چار گنا بڑھ گئیں۔ بہر حال ان اعداد کا بالکل صحیح صحیح حساب نہیں لگایا جاسکتا۔ ابن بطوطہ کی دی ہوئی قیمتوں کا تجزیہ کرنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قیمتیں ڈیڑھ گنی سے زیادہ بڑھیں۔ تنخواہیں بھی اسی تناسب سے بڑھی ہوں گی۔ فیروز کے عہد کے شروع میں قیمتیں اور تنخواہیں اور زیادہ تھیں۔ عفیف کے بیان کے مطابق، سلطان کی کسی قسم کی کوشش کے بغیر قیمتیں خود بخود علاء الدین دور کی حد تک نیچے آ گئیں۔ بہر حال تنخواہیں پھر بھی اونچی رہیں۔ خوردنی اشیاء کی قیمتوں میں اتار چڑھاؤ بہتر فصل کی وجہ سے تھا یا زراعت میں توسیع کی وجہ سے، یا بین الاقوامی سطح پر چاندی کی قلت کی وجہ سے۔ یہ مسئلہ اب بھی مورخوں کے درمیان زیر بحث ہے۔

17.2.6 شہری زندگی

ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ دسویں صدی سے شمالی ہندوستان میں شہروں میں نو آبادکاری شروع ہو گئی تھی۔ ترکی مرکزیت کے تحت اس رجحان میں تیرھویں صدی سے اور تیزی آئی اور اس کے ساتھ ہی شہری بنیاد رکھنے والا ایک حکمراں طبقہ بھی ابھرا جس کا معیار زندگی اونچا تھا۔ دہلی کے علاوہ جسے ابن بطوطہ نے اسلامی دنیا کے مشرقی حصے کا سب سے بڑا شہر کہا ہے، ہمارے پاس ایسی روایتیں بھی ہیں کہ دولت آباد (یوگیری) بھی دہلی جتنا بڑا شہر تھا۔ اس دور میں جو دوسرے شہر ہندوستان میں مشہور تھے وہ ملتان، اہور، کڑا (آج کے الہ آباد کے نزدیک)

لکھنوتی اور کھمبایت تھے۔

کسی شہر کی معاشی زندگی پر وہاں کے امراءاُن کے ملازمین و مصاحبین، تاجروں اور دکان داروں کا سب سے زیادہ اثر ہوتا تھا۔ شہر کی آبادی کا سب سے بڑا حصہ ملازمین، غلاموں، سپاہیوں، کاریگروں اور کچھ دوسرے گروپوں جیسے پھیری والے، موسیقار، نٹ خود اپنے کاروبار یا روزگار والے لوگ اور فقیروں وغیرہ پر مشتمل ہوتا تھا۔ ان مختلف ہے گروپوں کی ساخت کی معلومات لگ بھگ نہ ہونے کے برابر ہے یعنی ان کے طرز زندگی، سماجی پس منظر کے متعلق کچھ کہنا مشکل ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شہر ہی وہ جگہ تھے جہاں مختلف پس منظر اور نسلی اعتبار سے الگ الگ طرح کے لوگ، غلام، دستکار اور فنکار، وغیرہ ایک جگہ ساتھ ساتھ رہتے تھے اور سماجی لین دین کے مواقع حاصل کرتے تھے۔ شہر میں داخلہ کی مکمل دیکھ بھال کوتوال کرتا تھا جو صرف شہر میں امن وامان اور تحفظ کا ہی ذمے دار نہیں تھا بلکہ بازاروں پر پوری گرفت، بدنام قسم کے اڈوں (جواخانے اور طوائفوں کے کوٹھے وغیرہ) پر کڑی نگاہ رکھنا بھی اس کی ذمے داری ہوتی تھی۔ پچھلی روایت کے مطابق ہم پیشہ لوگ عام طور پر ایک ہی علاقہ (محلے) میں رہتے تھے جسے حفاظت کے خیال سے رات کو مقفل کر دیا جاتا تھا۔ شہروں کا جغرافیائی روپ لگ بھگ ایک طے شدہ انداز پر ہوتا تھا جس میں ایک علیحدہ حصہ بادشاہ اور امراء کی رہائش کا ہوتا تھا دوسری طرف مہتر، چمڑے کا کام کرنے والوں اور فقیروں کی رہائش شہر کے باہری حصے میں رکھی جاتی تھی لیکن یہ ہوتی شہر کی فصیل کے اندر ہی تھی۔ دہلی میں فقیروں کی آبادی بھی بہت کافی تھی ہوامراءاور رؤسا کے یہاں خیرات کے لیے چکر لگاتے رہتے تھے۔ ان کا دوسرا ٹھکانا مزارا، اور صوفی سنتوں کی خانقاہیں، مٹھ اور تکیے وغیرہ ہوتے تھے۔ عام لوگوں کی طرح یہ بھی ہتھیار باندھتے تھے اور کبھی کبھی امن وامان کے لیے بھی خطرہ کھڑا کر دیتے تھے۔

شہر دستکاریوں اور حرفوں کا بھی مرکز ہوتے تھے۔ بنائی، رنگائی، چھپائی، کڑھائی وغیرہ وغیرہ۔ شاہی کارخانوں میں بھی بڑی تعداد میں کاریگر ملازم ہونے تھے جو سونے چاندی کے کارچوبی کام اور ریشمی کڑھائی کے کاموں میں لگے ہوتے تھے لیکن زیادہ تر کاریگر اور دستکار اپنے گھر پر ہی کام کرتے تھے اور ذات کی بنیاد پر گلڈ کے نظام میں منظم ہوتے تھے۔ پھر بھی سارے مخصوص حرفے اور دستکاریاں شہروں میں محدود نہیں تھے۔ جنوبی ہندوستان اور گجرات میں بہت سے گاؤں اور قصبوں میں کچھ خاص قسم کے سوتی کپڑے کی تیاری کا کام ہوتا تھا۔ اس طرح عہد وسطیٰ کے یوروپ کے برخلاف ہم حرفوں اور دستکاریوں کو ہندوستان میں شہروں اور دیہات کے درمیان کسی سخت قسم کی تقسیم میں مقید نہیں کر سکتے۔ شہروں اور دیہی علاقوں کے درمیان حرنے اور دستکاری کا یہ رشتہ کاریگروں کے دیہی علاقوں سے شہروں کی طرف حرکت یا آنے جانے کا سلسلہ بھی جاری رکھتا تھا۔

17.2.7 دیہی معاشرہ

اس دور کے تمام مآخذ دیہی سماج کے موضوع پر لگ بھگ خاموش ہیں مگر اس کی کو کسی حد تک سنسکرت، اپ بھرنش اور کچھ جنوبی ہند کی زبانوں میں موجود حوالوں سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ حالانکہ دیہی زندگی کے بارے میں ان مآخذوں سے نویں۔ دسویں صدی اور اس کے بعد کی معلومات فراہم ہوتی ہیں لیکن ان سے وہ پس منظر مل جاتا ہے جن سے ہم سلطنت دور میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں اور دیہی زندگی میں

جاری رہنے والی چیزوں کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔

بارھویں صدی کے جین مصنف ہیم چندر کی تحریروں کی بنیاد پر ہم گاؤں کے باشندوں کو چار درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:۔(1) پیداوار میں شریک یا بٹائی، والے کسان جن کے لیے کر شک یا ار دھک کے الفاظ (جو فصل کا نصف وصول کرتے تھے استعمال کیے گئے ہیں: (2) ہل میں شریک اور کھیت مزدور جن کے لیے کچھ مختلف الفاظ ہلواک، کناس، اور کبھی کبھی کر شک بھی استعمال ہوئے ہیں۔ یہ دو درجے سب سے نچلے یا انحصار رکھنے والے کسانوں کے تھے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کر شک جس کے لفظی معنی زمین جوتنے والے کے ہیں، یہ لفظ کسان کے لیے ایک نسلی قسم کی پہچان دیتا تھا جو دیہی سماج کا سب سے بڑا زمرہ تھا۔ان کے بعد (3) زمرے کے کسان آتے تھے، جنہیں کچھ نئے لکھنے والوں نے آزاد کسان بھی کہا ہے مگر ان کے لیے مالک (پروپرائٹر) کا لفظ شاید زیادہ مناسب ہوگا۔ بعد میں ان لوگوں کو زمین مالک یا خود کاشت کہا جانے لگا۔ انہیں اپنی موروثی زمینوں پر میراث کا حق حاصل تھا۔ یہ اپنی جھونپڑیوں یا مکانوں کے بھی مالک تھے اور شاملات (اجتماعی ملکیت زمینوں) کے بھی مالک تھے۔ عام طور پر یہ ذات برادری کی بنیاد پر منظم ہوتے تھے۔ آخری (اور (4)) زمرہ دیہی کامگاروں کا تھا۔ موچی، رسی بننے والے، چوکیدار وغیرہ۔ان میں سے کچھ کامگار جیسے موچی اور کھیت مزدور، سوا پاچ، اچھوت ذاتوں سے بھی تعلق رکھتے تھے۔ نیچ اور ادھام جیسے لفظ انہیں سے متعلق تھے۔ محنت کش کسان کی دل سوز غربت اور پریشان حال زندگی کے سلسلے میں دھرم شاستروں کے مفسر اور دوسرے لکھنے والے سب یک زبان ہیں۔ پرم پران میں کر شک کی مصیبت زدہ زندگی کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ اپنے وقت کے حکمرانوں کے ظلم سے اتنے کچلے ہوئے تھے کہ یہ اپنے گھر والوں تک کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے تھے۔ کسانوں کی غربت کا زمینداروں، ساہوکاروں اور سامنتوں کی عیش و آرام کی زندگی سے مقابلہ کیا گیا ہے۔

اس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ دیہی سماج میں بہت زیادہ نابرابری یا فرق تھا۔ سلطنت دور میں نقدلین دین کی ترقی اور تیز ہوئی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ یہ فرق اور بڑھ گیا۔ حالانکہ سلاطین کی زرعی پالیسیاں اس خیال کے مدِ نظر وضع کی جاتی تھیں کہ حکمرانوں اور ان افسروں کی آمدنی متواتر جاری رہے جو اس سلطنت کے منتظم تھے مگر ان کا اثر بہر حال دیہی سماج اور معاشیات پر بھی پڑتا تھا۔ فی الحقیقت یہ نتیجہ ہمیں خود اخذ کرنا پڑے گا کیونکہ اس دور کے تاریخ نویس اس قسم کے مسئلوں سے مشکل سے ہی تعلق رکھتے تھے۔

17.2.8 غلامی

شہری آبادی میں ایک بڑا حصہ غلاموں یا گھریلو ملازمین کا بھی ہوتا تھا۔ غلامی کا سلسلہ ہندوستان، مغربی ایشیا اور یوروپ میں طویل عرصے سے چلا آ رہا تھا۔ مختلف قسم کے غلاموں۔ وہ غلام جو کسی کے اپنے گھر میں پیدا ہوا ہو، خریدا ہوا ہو، کسی اور طرح یا ورثے میں حاصل ہوا ہو، ان تمام مختلف حیثیتوں کو ہندو شاستروں میں بھی بیان کیا گیا ہے۔ غلامی کو عربوں اور پھر ترکوں نے بھی اپنا لیا۔ غلام حاصل کرنے کا سب سے عام طریقہ جنگوں میں قید کرنے کا تھا۔ مہابھارت تک میں جنگی قیدی کو غلام بنا لینا معمولی یا عام طریقہ مانا گیا ہے۔ ترک اپنی جنگوں میں ہندوستان اور اس سے باہر اس طریقے پر بڑے پیمانے پر عمل کرتے تھے۔ غلاموں کی خرید فروخت کے بازار مغربی ایشیا اور ہندوستان دونوں

جگہ موجود تھے۔ ترک، کاکیشیائی، یونانی اور ہندوستانی غلاموں کی قدر زیادہ تھی اور اسی لیے اُن کی مانگ بھی زیادہ تھی۔ کچھ کم تعداد میں غلام افریقہ، خاص طور پر حبش سے بھی درآمد کیے جاتے تھے۔ غلام زیادہ تر گھریلو کام، مصاحبی یا ساتھ رکھے جانے کے لیے یا اُن کی کسی خاص تربیت یا صلاحیت کی وجہ سے خریدے جاتے تھے۔ تربیت یافتہ غلام یا خوبصورت لڑکے اور خوبصورت لڑکیاں کبھی کبھی بہت زیادہ قیمت میں بکتے تھے۔ تربیت یافتہ غلاموں کی بہت قدر کی جاتی تھی اور بعض بعض موقعوں پر یہ ترقی کر کے بڑی بڑی اعلیٰ حیثیتوں تک پہنچ گئے، جیسے قطب الدین ایبک پہلے ایک غلام تھے۔

غلام پکڑنے کا کام مغربی اور وسط ایشیا میں بڑے پیمانے پر ہوتا تھا۔ غلام حاصل کر کے ان کی تربیت کرنا وسط ایشیا میں خاص طور پر امیروں کے سپرد ہوتا تھا۔ شروع کے ترک بادشاہوں، جیسے قطب الدین ایبک نے اس سلسلے کو ہندوستان میں بھی جاری رکھا۔ چنانچہ جب 1195 میں گجرات پر حملہ کیا تو اُس نے 20,000 قیدیوں کو غلام بنالیا اور اگلے سال 50,000 کو کالنجر کے حملے میں غلام بنایا گیا۔ حالانکہ ایسی وسیع پیمانے کی کسی غلام سازی کی مہم کا ذکر بلبن اور علاء الدین خلجی کے حملوں میں نہیں ملتا۔ پھر بھی مالِ غنیمت میں غلام بھی ایک مال مانے جاتے تھے۔ زیادہ تر جنگ میں پکڑے ہوئے قیدیوں کو قتل کر دیا جاتا تھا صرف کچھ چنے ہوئے لوگوں کو غلام بنا کر لے آیا جاتا تھا۔ دیہی علاقوں میں چلائی گئی بغاوت کو دبانے کی مہموں میں بڑی تعداد میں مرد، عورت اور بچے غلام بنائے گئے تھے اور انہیں دہلی کے غلام بازاروں میں بیچا گیا تھا۔ غلاموں کی خرید فروخت کچھ ایسا معمولی قسم کا عمل تھا کہ برنی نے کنیزوں اور خوبصورت لڑکوں کی قیمت کا مویشیوں کی قیمت کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ بہر حال وسط ایشیا کے دستور کے برخلاف جہاں گرفتار شدہ ترکی غلام فوجی استعمال میں آتے تھے دہلی میں بیچے جانے والے غلام عام طور پر گھریلو خدمات میں استعمال کیے جاتے تھے۔ یہ چیز اتنی عام تھی کہ کوئی کلرک اگر غلام رکھتا تھا تو یہ بات کوئی غیر معمولی یا حیرت ناک نہیں مانی جاتی تھی۔ عام طور پر غلاموں کو دستکاری کی تربیت نہیں دی جاتی تھی اور انھیں اس کام میں استعمال نہیں کیا جاتا تھا لیکن کنیزوں کو سوت کاتنے کے کام میں ضرور لگایا جاتا تھا۔ یہ ذکر بھی موجود ہے کہ صوفی سنت تک غلاموں کی کمائی پر زندگی گزارتے تھے۔

فیروز تغلق کے یہاں اس عمل سے کچھ انحراف ملتا ہے۔ اس نے اپنے بڑے امراء کو حکم دیا تھا کہ وہ صرف جنگ میں غلام بنائیں اور اُن میں سے جو بہترین ہوں انہیں سلطان کی خدمت کے لیے بھیجیں۔ ماتحت سرداروں کو بھی ان احکام کی پابندی ضروری تھی۔ اس طرح سے 1,80,000 غلام جمع کیے گئے تھے۔ ان میں سے کچھ کو نڈہبی مطالعے کے لیے چنا گیا تھا، ان میں سے 12,000 کو دستکاری کی تربیت دی گئی تھی اور مختلف پرگنوں میں پھیلا دیا گیا تھا۔ اس سے تربیت یافتہ کاریگروں اور دستکاروں کی زبردست کمی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ غلاموں سے ایک مسلم محافظ دستہ، بھی منظم کرنے کی کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ غلاموں کے دستے نے فیروز کے انتقال کے بعد بادشاہ گر بننے کی کوشش کی مگر انہیں شکست دے کر منتشر کر دیا گیا۔

حالانکہ گھریلو غلامی مغلوں کے دور میں بھی جاری رہی لیکن غلاموں نے صنعتی پیداوار یا فوج میں کوئی اہم کردار ادا نہیں کیا۔ بہر حال اس میں شک نہیں کہ غلامی کا طریقہ غیر انسانی عمل تو تھا ہی اس سے آزاد مزدور کی حیثیت میں بھی کمی آتی تھی اور تنخواہیں بھی گرتی تھیں۔

17.2.9 عورتوں کی حیثیت اور رسم و رواج

اس دور میں ہندوستانی سماج کی ساخت میں مشکل سے ہی کوئی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ اس دور کے سمرتی لکھنے والے بھی برہمنوں کو وہی اعلیٰ حیثیت دیتے تھے لیکن ساتھ ہی اس طبقے کے نااہل افراد کی اتنی ہی سختی سے مذمت بھی کرتے تھے۔ ایک طرز فکر کے مطابق برہمنوں کو صرف غیر معمولی حالات میں ہی زراعتی کاموں میں شریک ہونے کی اجازت نہیں تھی بلکہ عام زمانے میں بھی اس کی اجازت تھی کیونکہ 'کالی یگ' میں ہون، پوجا وغیرہ کے کاموں سے انہیں زندگی گزارنے کے برابر پیسہ نہیں مل پاتا تھا۔

سمرتی لکھنے والے اب بھی اس بات پر مصر تھے کہ بروں کو سزا دینا اور اچھوں کو جزا دینا چھتریوں کا ہی فرض ہے اور اسی طرح لوگوں کے تحفظ کے لیے ہتھیار اٹھانے کا کام بھی انہیں کا ہے۔ شودروں کے فرائض، پیشے اور ممنوعات بھی لگ بھگ پہلے ہی کی طرح دُہرائے گئے تھے۔ یوں تو شودروں کا سب سے پہلا فرض دوسری ذاتوں کی خدمت کرنا ہی تھا مگر انہیں تمام پیشے اختیار کرنے کی اجازت ہو گئی تھی۔ یہ لوگ صرف شراب اور گوشت کا کاروبار نہیں کر سکتے تھے۔ ویدوں کے مطالعے یا انہیں دہرانے کی ممانعت کو اب بھی دوہرایا گیا تھا مگر پرانوں کو سننے پر پابندی نہیں تھی۔ کچھ لکھنے والے اس حد تک آگے بڑھے ہوئے تھے کہ ان کے مطابق صرف شودر کے ہاتھ کے کھانے کا ہی پرہیز نہیں بلکہ ایک گھر میں اس کے ساتھ رہنا، ایک چارپائی پر بیٹھنا یہاں تک کہ کسی قابل شودر سے مذہبی تعلیم حاصل کرنے سے بھی بچنا ضروری ہے۔ بہر حال یہ ایک آخری حد کا تصور مانا جانا چاہیے لیکن ذات باہر کے لوگوں اور چنڈالوں سے میل جول رکھنے پر سب سے سخت پابندی تھی۔

ہندو سماج میں عورتوں کی حیثیت میں بھی بہت کم تبدیلی آئی تھی۔ لڑکیوں کی کم عمری میں شادی، اور شوہر کی خدمت اور اس کی پوری تابعداری بیوی کا سب سے اہم فریض مانا جانا اور ایسے تمام قواعد و ضوابط بدستور موجود تھے۔ شادی کی منسوخی (طلاق) کی اجازت بالکل آخری حد پر تھی جیسے چھوڑ کر چلا جانا، گھناؤنی بیماری وغیرہ۔ مگر تمام لکھنے والے اس سے متفق نہیں تھے۔

کالی یگ میں بیوہ کی شادی کا شمار بھی ممنوعات میں سے تھا بظاہر یہ اوپر کی تین ذاتوں پر عائد ہوتا تھا۔ جہاں تک ستی کا سوال ہے کچھ لکھنے والے اسے پورے شد و مد سے منظور کرتے ہیں لیکن کچھ دوسرے صرف بعض حالات میں اس کی اجازت دیتے ہیں۔ سیاحوں کی خاصی بڑی تعداد نے ملک کے مختلف حصوں میں اس کی موجودگی کا ذکر بھی کیا ہے۔ ابن بطوطہ نے بڑے بھیانک سے انداز میں ڈھول کی کان پھاڑ دینے والی آواز کے ساتھ ایک عورت کے اپنے شوہر کی چتا پر جلنے کا منظر بیان کیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ستی کے لیے سلطان سے اجازت لینی پڑتی تھی۔

ملکیت میں مفسرین نے ایسے شوہر کی ملکیت میں بیوہ کے حق کو تسلیم کیا ہے جس کے کوئی اولاد نرینہ نہ ہو، بشرطیکہ ملکیت مشترکہ نہ ہو، یعنی پہلے تقسیم ہو چکی ہو۔ بیوہ اس ملکیت کی صرف نگہبان یا متولی ہی نہیں ہوتی تھی بلکہ اس کو فروخت کر دینے کا حق بھی رکھتی تھی۔ اس سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ عورتوں کے ملکیت کے حقوق میں کچھ بہتری پیدا ہوئی تھی۔

اس دور میں عورتوں کو الگ رکھنے اور غیر لوگوں کے سامنے گھونگھٹ کر لینے کی مانگ، یعنی پردہ کا رواج اونچی ذات کے لوگوں میں

عام ہوتا چلا گیا۔ عورتوں کو مردوں کی نگاہ بازیوں سے دور رکھنے کے لیے انہیں علیحدہ رکھنے کا دستور اونچی ذات کے ہندوؤں میں موجود تھا اور قدیم ایران اور یونان وغیرہ میں بھی یہ طریقہ رائج تھا۔ عربوں اور ترکوں نے بھی اسے اپنا لیا تھا اور وہ اسے اپنے ساتھ ہندوستان لائے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی یہ پورے ہندوستان، خصوصاً شمالی ہندوستان میں پھیل گیا۔ پردے کے رواج کو اس خوف سے بھی منسوب کیا گیا ہے کہ ہندو عورتوں کو حملہ آور نہ پکڑ لیں۔ جارحیت کے کسی دور میں عورتوں کو جنگ میں فتح کے انعام کے طور پر حاصل کر لینے کا تصور ہمیشہ موجود رہا ہے۔ پردے کے رواج کے پھیلنے میں شاید سب سے اہم حصہ سماجی حیثیت کا ہی ہے۔ یہ سماج میں اونچی ذات کے اظہار کی ایک علامت بن گیا اور وہ تمام لوگ جو خود کو باعزت ظاہر کرنا چاہتے تھے وہ اسے اپنا لیتے تھے۔ اس کے لیے مذہبی جواز بھی تلاش کر لیے گئے۔ جو بھی وجہیں رہی ہوں اس رواج نے عورتوں پر خراب اثر ہی مرتب کیا اور اس سے مردوں پر ان کا انحصار اور بڑھ گیا۔

سلطنت دور میں مسلم معاشرہ نسلی اور علاقائی اعتبار سے بھی بٹا ہوا رہا۔ ہم اس میں کافی گہری معاشی نابرابری بھی دیکھ چکے ہیں۔ ترک ایرانی، افغانی اور ہندوستانی مسلمان مشکل سے ہی ایک دوسرے کے یہاں شادی کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان طبقوں میں بھی ہندوؤں جیسی کچھ ذات پات جیسی علیحدگی پیدا ہو گئی تھی۔ نچلی ذاتوں سے آنے والے نو مسلموں سے بھی فرق یا تعصب برتا جاتا تھا۔

ہندو اور مسلم اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی ایک دوسرے سے زیادہ تعلقات نہیں رکھتے تھے اس کی کچھ وجہ تو موخرالذکر (مسلمانوں) میں ایک احساس برتری کی موجودگی تھی اور کسی حد تک آپسی شادیوں اور ساتھ مل کر کھانے پینے پر مذہبی پابندیاں تھیں۔ اعلیٰ ذات کے لوگ مسلمانوں کے سلسلے میں بھی وہی پابندیاں عائد کرتے تھے جو شودروں سے متعلق تھیں۔ مگر یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ ذات پات کی پابندیوں نے مسلمانوں اور اعلیٰ ذات کے ہندوؤں اور شودروں کے درمیان سماجی قسم کے لین دین کو بالکل ہی بند نہیں کیا تھا۔ اکثر اوقات مسلمان فوجوں میں ہندو سپاہی بھرتی کیے جاتے تھے۔ زیادہ تر امراء اپنے ذاتی امور کے منتظموں کی حیثیت سے ہندو افراد کا تقرر کرتے تھے۔ علاقائی انتظامیہ کا پورا آلہ کار لگ بھگ پورا کا پورا ہندوؤں کے ہاتھوں میں ہی رہا۔ اس طرح ان حلقوں میں آپسی تعلق یا لین دین کے بہت سے مواقع موجود تھے۔ یہ تصور کہ یہ دونوں مذہبی فرقے بالکل اپنے اندر محدود اور بند تھے اور ایک دوسرے کے معاملات سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے تھے نہ حقیقت پر مبنی ہے نہ یہ قابل عمل ہے۔ اور پھر اس وقت جو مواد موجود ہے اس سے اس قسم کے تصور کی تصدیق بھی نہیں ہوتی ہے۔ مفادات کے ٹکراؤ، سماجی اور ثقافتی تصورات کے اختلاف اور رسم و رواج اور عقائد کے فرق سے تناؤ ضرور پیدا ہوتے تھے جس کی وجہ سے ایک دوسرے کو سمجھنے اور ثقافتی اشتراک کی رفتار سست ہو جاتی تھی۔

17.3 معاشی زندگی

17.3.1 زراعت

سلطنت دور میں دیہی، معاشیات میں کسی قسم کی تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ابن بطوطہ، جس نے پورے ہندوستان کا دورہ کیا تھا، اس نے ہندوستان میں پیدا ہونے والے غلوں اور دوسری فصلوں، پھلوں، پھولوں وغیرہ کی بہت تفصیلی فہرست درج کی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر

فصلوں سے ہم آج واقف ہیں۔ چاول اور گنا مشرق میں اور جنوب میں اور گیہوں اور سرسوں وغیرہ شمال میں۔ کپاس بہت بڑے علاقے میں بوئی جاتی تھی۔ جو، تل اور کچھ نچلے درجے کی دوسری فصلیں بھی عام طور پر آگائی جاتی تھیں۔ ابن بطوطہ کا کہنا ہے کہ زمین اتنی زرخیز تھی کہ اس سے سال میں دو فصلیں ملتی تھیں۔ ربیع سرما کی فصل، اور خریف (برسات) کی فصل۔ چاول کی فصل سال میں تین بار بوئی جاتی تھی۔ کچھ فصلیں دیہی صنعتوں کے لیے بنیاد فراہم کرتی تھیں۔ جیسے تیل نکالنا، گڑ بنانا، نیل تیار کرنا، سوت کتائی اور بنائی وغیرہ۔ آلو، مکئی، لال مرچ، تمباکو، جو سولھویں صدی میں ہندوستان پہنچے، وہ ابن بطوطہ کی فہرست میں بھی نہیں ہیں۔ محمد بن تغلق اور فیروز تغلق کے دور یعنی چودھویں صدی میں باغات میں خاص ترقی نکالیں۔ مگران سے (آج کے ہریانہ میں) حصار کے علاقے کو فائدہ پہنچتا تھا۔ سندھ اور پنجاب کے علاقوں میں بھی کچھ چوٹی علاقوں میں بھی کچھ چھوٹی نہروں کا ذکر ملتا ہے۔

17.3.2 محاصل کا نظام

شمالی ہندوستان میں ترکوں کی آمد سے پہلے زری پالیسیوں اور عملی صورت حال کی معلومات ہمارے پاس بہت کم ہیں۔ فصلیں اگانے والوں کو بہت سے محصول یا چنگیاں جیسے 'بھاگ' بھوگ (محصول) اور 'کر' (غیر معمولی محصول) ادا کرنے ہوتے تھے لیکن فصل کا کتنا حصہ اس طرح نکل جاتا تھا۔ انفرادی یا اجتماعی طور پر نہ اس کا کوئی تخمینہ لگایا جاسکتا ہے نہ یہ کہ اس کا کتنا حصہ حکمراں کو پہنچتا تھا اور کتنا اس کے ماتحت کارندوں اور زمیندار رؤسا کو۔ دھرم شاستروں کے مطابق پیداوار میں سے روایتی طور پر صرف چھٹا حصہ (6/1) دینا ہوتا تھا لیکن جنوبی ہندوستان میں ایسے حکمرانوں کا ذکر بھی موجود ہے جو پیداوار کا تیسرا حصہ (3/1) یا دو تہائی (3/2) تک طلب کرتے تھے۔ چول خاندان کے ایک ایسے بادشاہ کا ذکر بھی ملتا ہے جس نے اپنے جاگیرداروں کو پیداوار کا آدھا حصہ جمع کر لینے کی اجازت دے دی تھی۔ بہر حال، عملی صورت یہ تھی کہ محصول کی مانگ اس بات پر منحصر تھی کہ کسان کو کتنا ادا کرنے پر مجبور کیا جاسکتا تھا۔

تیرھویں صدی میں بھی دیہی سماج کے ڈھانچے میں مشکل سے ہی کوئی تبدیلی رونما ہوئی تھی اور چونکہ شروع دور کے ترک سلاطین محصول وصولی کے لیے ہندو سرداروں پر ہی منحصر تھے اس لیے انہوں نے اس کی وصولی کا کام اس وقت کے موجودہ طریقوں کے مطابق انہیں پر چھوڑ دیا تھا لیکن اس سے بھی اس محصول کی شرح کا اندازہ نہیں ہو سکتا جو حقیقت میں اس وقت کسانوں سے طلب کیا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ترکی حکمراں طبقے کی عام طرز فکر کو برنی نے لگ بھگ سو سال کے بعد بیان کیا تھا۔ اس کے مطابق بلبن نے بغرا خاں کو اتنا زیادہ محصول (خراج) وصول نہ کرنے کا مشورہ دیا تھا کہ جو کسان کو مفلسی کی حد تک پہنچا دے اور اتنا کم بھی نہ وصول کرنا چاہیے کہ ان کے پاس ضرورت سے زیادہ پیسہ ہو جائے اور وہ باغی ہو جائیں۔ اسے کس طرح عاید کیا گیا تھا یا یہ کس طرح عمل میں آتا تھا اس کا کوئی علم نہیں ہے۔ عام طور پر اس کو اس نقطہ نظر سے عاید کیا جاتا تھا کہ اس سے اس وقت کے موجود دیہی ڈھانچے میں مداخلت نہ ہو۔

جیسا کہ ہم اس سے پہلے ابواب میں دیکھ چکے ہیں چودھویں صدی میں کئی نئی چیزیں ابھریں۔ علاؤالدین خلجی نے محصول کی مانگ اوپری دوآب کے علاقوں میں علی گڑھ تک اور راجستھان اور مالوا میں پیداوار کے نصف کی حد تک بڑھا دی۔ اسی علاقے کو 'خالصہ' قرار دے دیا

گیا تھا جس کا مطلب تھا کہ اس کا محصول براہِ راست شاہی خزانے میں پہنچتا تھا۔ محصول کی مانگ ہر کسان کی مزروعہ زمین کے رقبہ کی بنیاد پر مقرر کی جاسکتی تھی۔ اس کے علاوہ ایک بات یہ بھی تھی کہ دہلی کو چھوڑ کر، باقی علاقوں کے کسانوں کو نقد محصول دینے کی ترغیب دی جاتی تھی۔ علاؤالدین نے بھی اس بات کو یقین بنانے کی کوشش کی کہ کسان اپنی کھڑی فصلوں کو ہی بنجاروں کو بیچ میں اور انہیں اپنے کھیتوں یا گوداموں میں نہ لے جائیں تاکہ ان کی زیادہ بہتر قیمت حاصل کرنے کی امید میں ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے۔ بہر حال، عمل میں اس طریقہ کار میں ترمیم کرنی ضروری ہوگئی کیونکہ یہ ذکر بھی ملتا ہے کہ بہت سے کسان خود اپنا غلہ بیچنے کے لیے مقامی منڈیوں میں لے آتے تھے مگر ظاہر ہے یہ دولت مند کاشتکار ہوں گے۔

علاؤالدین کے اپنائے ہوئے زرعی طریقہ کار دیہی معاملات میں زبردست مداخلت کے مترادف تھے۔ ان طریقوں سے وہ دیہات کے ترجیح یافتہ طبقے 'خوط، مقدم اور چودھریوں' اور کچھ حد تک ان دولت مند کسانوں کے حقوق کے خلاف عمل کرنے کی کوشش کر رہا تھا، جن کے پاس ان کی اپنی ضرورت سے زیادہ غلہ بازار میں بیچنے کے لیے موجود تھا۔

'خوط' اور مقدموں کے سلسلے میں یہ شبہ تھا کہ وہ اپنے اوپر عائد ہونے والے محصولوں کا بوجھ کمزور طبقے پر منتقل کر دیتے تھے اور گھر ہی اور چرائی محصول ادا نہیں کرتے تھے۔ برنی کے دلفریب بیان کے مطابق خوط اور مقدم اتنے غریب ہوگئے تھے کہ وہ نہ قیمتی لباس پہن سکتے تھے نہ عربی اور عراقی گھوڑوں پر سوار ہو سکتے تھے اور ان کی عورتوں کو مسلمانوں کے گھروں میں کام کرنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔ برنی بہر حال مبالغے سے کام لیتا ہے لیکن خوطوں اور مقدموں کے یا زمین مالک اعلیٰ طبقے کے تمام حقوق اور آسانیاں جو انھیں باپ دادا سے ملتی چلی آرہی تھیں انہیں یکسر سلب کر لینے کی کوشش اور عالموں کی ایک پوری فوج مقرر کر رہے۔ جن میں زیادہ تر رشوت خور اور بے ایمان ثابت ہوئے۔ بہر طور ان تمام کوششوں کو ناکام ہی ہونا تھا۔

بتایا جاتا ہے کہ علاوالدین کے عاید کردہ محصول کے سلسلے کے تمام اقدام اس کی موت کے ساتھ ہی خود بخود ختم ہوگئے۔ مگر یہ معلومات موجود نہیں کہ اس سے پیائش کا پورا نظام یادوآب کے علاقوں میں خالصہ کی نصف پیداوار محصول میں لے لینے کا طریقہ بھی ختم ہو گیا۔ خوط اور مقدموں کے حقوق اور آسانیوں کی بحالی کا مطلب تھا کہ حکومت اب مزروعہ زمین کی بنیاد۔ یعنی ہر کسان کے زیر کاشت علاقے کی پیائش پر محصول مقرر نہیں کرتی تھی، بلکہ اب یہ پورے علاقے سے ایک بالمقطی (کل ملی جلی) رقم وصول کرتی تھی اور انفرادی محصول کا تخمینہ محصولے کا کام مقدموں اور خوطوں کا ہی تھا۔ اس طرح یہ دیہی علاقوں میں مقدموں اور خوطوں کے معاشی اور سماجی اقتدار کی تصدیق بھی تھی۔

غیاث الدین تغلق نے پیائش کے نظام کو بدل کر خالصہ علاقوں کی پیداوار میں شرکت کا مکمل اقدام کیا۔ اسے کسانوں کی بہتری کا اقدام مانا گیا کیونکہ پیائش کے طریقے میں فصل اگانے میں آخر تک جو خدشات رہتے ہیں ان کا زیادہ بڑا حصہ کسان کو ہی برداشت کرنا ہوتا تھا لیکن حصہ داری یا بٹائی میں فائدہ اور نقصان، دونوں میں کاشتکار اور حکومت دونوں شریک ہوتے تھے۔ غیاث الدین نے ایک اور اہم اقدام

بھی کیا۔ ان علاقوں میں جہاں اقطاع رکھنے والے لوگ تھے، یعنی خالصہ کے علاوہ علاقے، اس نے ان کے متعلق حکم جاری کیا کہ ان پر محصول محض تخمینے یا یکمشت حساب کر کے نہ بڑھا دیا جائے، ''بلکہ بتدریج اور آہستہ آہستہ بڑھایا جائے کیونکہ یکمشت اضافے سے دیہات تباہ ہو جائیں گے اور خوشحالی میں رکاوٹ پیدا ہو گی''۔ برنی نے ان معتدل انداز کے اضافوں کی پالیسی کو اس طرح بیان کیا ہے کہ اقطاع والے علاقوں سے محصول کی مانگ ''دس یا گیارہ میں ایک'' کی شرح سے نہیں بڑھائی جانی چاہیے۔ اس جملے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اضافہ ایک بٹا دس (10/1) یا ایک بٹا گیارہ (11/1) ہو سکتا ہے۔ نہ اس کا یہ مطلب ہے کہ محصول دسواں حصہ ہو، یا جیسا کہ کچھ نئے مورخوں نے فرض کر لیا ہے، (اسلامی) بنیادی تصور کے مطابق کم سے کم پانچواں حصہ ہو۔ برنی نے محصول کے پیمانے یا شرح کا کہیں ذکر نہیں کیا نہ دوآب کے خالصہ علاقوں کے سلسلے میں نہ اقطاع کے بارے میں۔ شاید خالصہ سے باہر کے علاقوں میں محصول کی مانگ وہی سابقہ یعنی ایک تہائی رہی تھی۔

محمد بن تغلق نے علاء الدین کے نظام کو پھر عاید کرنے کی کوشش کی اور اسے اپنی پوری سلطنت میں پھیلانا چاہا، لیکن اس کے اقدامات نے دوآب کے علاقے میں ایک زبردست قسم کی کسان شورش کھڑی کر دی۔ اس کی وجہ شاید یہ رہی ہو کہ انفرادی طور پر محصول کا تخمینہ محصولے میں، پیمائش کے وقت حقیقی پیداوار کی بجائے پہلے سے طے شدہ (غیر حقیقی) پیداوار کو اپنایا گیا۔ مزید براں پیداوار کو نقد رقم میں تبدیل کرتے وقت بھی حقیقی قیمتوں کی بجائے سرکار کی طرف سے طے کردہ قیمت اپنائی گئی۔ مویشیوں اور گھروں پر محصول محصولے کے سلسلے میں بھی سختی برتی گئی۔ اس طرح حقیقی محصول یا محصول کی مانگ کافی بڑھ گئی یعنی نصف یا اس سے بھی زیادہ۔

علاء الدین خلجی کی زرعی اصلاحات کی طرح محمد بن تغلق کے اقدامات کو اس مقصد کے پیش نظر تیار کیا گیا تھا کہ دیہی علاقوں میں متمول طبقے، خاص طور پر خوط اور مقدم کو ملے حقوق و سہولیات میں کچھ تخفیف کی جا سکے۔ مگر اس کے اقدامات سے اوسط کسان کو بھی پریشانی ہوئی۔ فی الحقیقت دوآب کے علاقے میں اس کے خلاف کافی سخت بغاوت کی یہی وجہ تھی۔

محمد بن تغلق نے اس کے بعد بالکل مختلف یا مخالف سمت میں اقدامات کرنے کی کوشش کی۔ دوآب جو براہ راست حکومت کے زیر انتظام (خالصہ) علاقہ تھا، یہاں اس نے فصلوں کے پرانے طریقے کو بدل کر انہیں بہتر کرنے کی کوشش کی اور نچلے درجے کی فصلوں کے بدلے اعلیٰ درجے کی فصلیں اگانے کی ترغیب دی۔ اس سلسلے میں جو سب سے اہم ترغیب دی گئی وہ کنوؤں وغیرہ کے لیے قرض دیا جانا تھا۔ یہ پالیسی صرف متمول اور رئیس قسم کے کسانوں اور خوطوں اور مقدموں کے تعاون سے ہی کامیاب ہو سکتی تھی کیونکہ انہیں کے پاس سب سے بڑے زمین کے قطعے اور دوسرے ذرائع موجود تھے۔ مگر یہ قدم بھی ناکام ہوا کیونکہ اس کام کے لیے جو افسر مقرر کیے گئے وہ ان علاقائی کیفیات سے ناواقف تھے اور وہ صرف خود پروری اور زیادہ سے زیادہ خود کمانے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ فیروز کو ہریانہ میں کسانوں کو نہروں کا نظام فراہم کر کے، اس پر دس فیصدی کا غیر معمولی محصول بڑھا کر اور فصلوں کا چناؤ خود کاشتکار پر چھوڑ کر زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔

مجموعی طور پر اندازہ یہی ہوتا ہے سلطانوں کے عہد، خصوصا چودھویں صدی میں محصول خاصہ زیادہ تھا اور نصف کے آس پاس رہتا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ پرانے بلیوں۔ رائے، رادت، خوط اور مقدم وغیرہ کے حقوق و سہولیات کو متواتر گھٹاتے رہنے کی کوشش بھی اس

میں واضح طور پر موجود تھی۔ پہلی بار اتنی بڑی مقدار میں محصول کا تخمینہ لگایا گیا تھا اور میں اتنے وسیع اور زرخیز علاقے سے کئی عشروں تک جمع کیا جاتا رہا تھا۔ اس کے لیے جو انتظامی طریقے اپنائے گئے ان سے اور اتنی بڑی آمدنی کے ذرائع کو ایک مرکزیت مل جانے اور اس کے حکمراں طبقے کے ہاتھوں میں آجانے سے جو اثرات پیدا ہوئے ان کے نتائج دیہی زندگی اور شہری صناعوں، کاریگروں، تجارت اور کاروبار، سب پر بہت اہم تھے۔

فیروز تغلق کے زمانے کو عام طور پر دیہی خوشحالی کا دور مانا جاتا ہے۔ برنی اور عفیف کا کہنا ہے کہ سلطان کے احکامات کے نتیجے میں صوبوں میں زراعت بڑھی اور جتائی ہوائی کو اتنا فروغ ہوا کہ دوآب میں کوئی گاؤں غیر مزروعہ نہیں رہا۔ ہریانہ میں نہری نظام سے جتائی بڑھی۔ عفیف کے مطابق ''رعیت (کسانوں کے گھروں میں اتنا غلہ، دولت، گھوڑے، اور ساز و سامان جمع ہو گیا کہ اسے بیان نہیں کیا جا سکتا۔''اس نے یہاں تک بیان کیا ہے کہ کوئی کسان عورت ایسی نہیں تھی جس کے پاس زیور نہ ہو اور ''ہر کاشتکار کے گھر میں بہت اچھی چارپائیاں اور ان پر صاف دھلی چادریں، بہت سا ساز و سامان اور دولت''موجود تھی۔

ظاہر ہے یہ صورتِ حال عام طور پر زیادہ بڑے اور رئیس قسم کے کسانوں اور دیہات کے اونچے طبقے۔ خوط مقدم وغیرہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس طرح دیہی سماج میں غیر مساوات اور فرق متواتر باقی رہا اور دیہات کی زائد پیداوار شاہی پالیسی کے تحت دیہات سے باہر نکلتی رہی۔ بہر حال، دیہات کی معاشی کیفیت میں بہتری پیدا کرنے کی کوششوں میں کسی حد تک کامیابی بھی حاصل ہوئی تھی لیکن اس کے زیادہ بڑے حصے سے عام طور پر دیہات کے اوپری طبقے اور حقوق یافتہ افراد ہی مستفید ہوئے تھے۔

17.3.3 غیر زرعی پیداوار

سلطنت دور میں ملک کے معاشی ذرائع کا کوئی تفصیلی ذکر موجود نہیں ہے اور جو کچھ ہے اس میں ابوالفضل کی آئین اکبری میں دیے ہوئے بیانات بھی شامل کرنے ضروری ہیں، جو سولہویں صدی کے آخری حصے میں تحریر میں آئے تھے۔ مختصراً مصنوعات میں سب سے اہم کپڑا، دھات کی مصنوعات، عمارتی کام اور کچھ اور ضمنی کام، جیسے چمڑے کا کام، کاغذ سازی، کھلونے بنانا وغیرہ شامل تھے۔

17.3.4 کپڑے کی صنعت

کپڑے کی صنعت ہندوستان کی سب سے بڑی صنعت رہی ہے اور پرانے وقتوں سے چلی آرہی ہے۔ اس میں سوتی کپڑا، اونی اور ریشم ہر طرح کا کپڑا شامل تھا۔ سوتی کپڑے کو بھی دو قسم کے کپڑوں میں بانٹا جا سکتا ہے، موٹا (کمین) اور عمدہ قسم کا (مہین)۔ موٹا یا گھٹیا قسم کا کپڑا 'پاٹ' کہلاتا تھا اور اسے غریب لوگ اور فقراء پہنتے تھے۔ ظاہر ہے یہ دیہات میں گھروں میں ہی بنا جاتا تھا لیکن کچھ علاقوں میں باقاعدہ طور پر بھی تیار کیا جاتا تھا جیسے اودھ میں، اور وہاں سے دہلی لایا جاتا تھا۔ کچھ بہتر قسم کا سوتی کپڑا، سادا کپڑا (کرپاس) کہلاتا تھا اور یہی عام طور پر استعمال میں آتا تھا۔ عمدہ قسم کا کپڑا ململ یا تن زیب ہوتا تھا جو بنگال میں سلہٹ اور ڈھاکہ میں اور دکن میں دیوگیری میں بنتا تھا۔ یہ اتنا باریک، ایسا نفیس اور اتنا قیمتی ہوتا تھا کہ اسے صرف رؤسا اور دربار کے امراء ہی پہنتے تھے۔ گجرات میں بھی کئی طرح کا نفیس سوتی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ باربوسا نے لکھا ہے

کہ کیمبے (کھم بایت) ہر قسم کے گھٹیا اور نفیس سوتی کپڑے کی پیداوار کا مرکز تھا اور اس کے علاوہ کچھ سستی قسم کی مخمل، ساٹن، ٹافٹا (ریشمی کپڑا)اور دبیر دری بھی تیار ہوتے تھے۔

مختلف قسم کے کپڑوں کی رنگائی اور چھپائی ہوتی تھی اور چھپائی میں لکڑی کے بوٹے استعمال کیے جاتے تھے۔ اس لیے چودھویں صدی کے صوفی ہندی شاعر ملا داؤد نے چھپے (کھنڈ چاپ) کپڑے کا ذکر کیا ہے۔ کپڑے کی تیاری کے علاوہ دوسری مختلف مصنوعات، جیسے دری، جانمازیں، غلاف، دریاں، نواڑ وغیرہ بھی گجرات کے دوسرے حصوں میں تیار کی جاتی تھیں۔

اس دور میں کپڑے کی صنعت میں چرخے کی آمد سے بھی بہتری ہوئی تھی۔ جدید دور کے ایک مورخ، عرفان حبیب کے مطابق چرنے کی موجودگی کی تصدیق ایران کے بارہویں صدی کے متعدد معروف شعراء کے کلام سے ہو جاتی ہے۔ ہندوستان میں اس کا سب سے پہلا حوالہ چودھویں صدی کے وسط میں ملتا ہے۔ اس طرح یہ ترکوں کے ساتھ ہندوستان آیا ہوگا اور چودھویں صدی کے وسط تک عام استعمال میں آنے لگا ہوگا۔ بتایا جاتا ہے کہ سب سے سیدھے سادے چوٹے سے کاتنے والے کی پیداواری صلاحیت ہاتھ کی تکلی سے سوت کاتنے والے کے مقابلے میں چھ گنا بڑھ گئی۔ ایک اور اوزار جس کا اس عرصے میں استعمال شروع ہوا وہ دھنیے کی کمان یا دھنگی تھی جس سے بنولوں سے روئی کو چھڑانے کا کام کافی تیزی سے ہونے لگا۔

ریشم بنگال سے درآمد کیا جاتا تھا جہاں ریشم کے کیڑے پالے جاتے تھے۔ بہر طور ریشم کے دھاگے کی زیادہ مقدار میں سپلائی، جس میں کچا ریشم بھی شامل تھا ایران اور افغانستان سے ہوتی تھی۔ ریشمی، اور سوت اور ریشم کے ملے جلے کپڑے کی مانگ دہلی اور اس کے قرب و جوار میں بہت تھی۔ کھمبایت کا ریشم کپڑے کی اُن قیمتی قسموں میں تھا جن پر علاء الدین خلجی نے کنٹرول کیا تھا۔ گجرات کے طرح طرح کے ڈیزائن والے 'پٹولا' کی بہت قدر تھی۔ گجرات سونے چاندی سے کڑھائی کے کام کے لیے بھی مشہور تھا جو عام طور پر ریشم پر ہوتی تھی۔

گو کہ بھیڑیں میدانی علاقوں میں بھی پالی جاتی تھیں مگر اون پہاڑی علاقوں سے حاصل کیا جاتا تھا۔ بہترین قسم کا اونی کپڑا اور سمور زیادہ تر باہر سے درآمد کیا جاتا تھا اور اسے لگ بھگ صرف دربار کے امراء ہی پہنتے تھے۔ بہر حال کشمیر کی شال کی صنعت کافی جمی ہوئی تھی۔ محمد بن تغلق نے چین کے شہنشاہ کو کشمیری شالیں تحفے میں بھیجی تھیں۔ سلطانوں کی سرپرستی میں قالین بننے کے کام نے بھی ترقی کی اور ان میں بہت سے ایرانی اور وسط ایشیائی ڈیزائن اپنائے گئے۔

رنگائی کی صنعت کا ذکر بھی ضروری ہے۔ نیل (انڈیگو) اور دوسری سبزیاں وہ رنگ فراہم کرتی تھیں جن رنگے ہوئے چمکتے رنگین کپڑے اور عورتیں اور مرد دونوں بڑے شوق سے پہنتے تھے۔ رنگائی کی صنعت اور چھینٹ کی چھپائی میں بھی گہرا تعلق ہے 'ٹائی اینڈ ڈائی' (بندھن) رنگائی کی کاری گری راجستھان کی پرانی صنعت ہے۔ بہر حال اس بات کا علم نہیں ہے کہ لکڑی کے بوٹوں (بلاک) کے ذریعے چھپائی کا کام کب شروع ہوا۔

کپڑے کی صنعت جو بڑی تعداد میں روزگار فراہم کرتی تھی اس کی تنظیم کیسی تھی اس کی معلومات موجود نہیں ہیں۔اور پھر جیسا کہ بعد میں نظر آتا ہے، کاتنا عورتوں کا کام تصور کیا جاتا تھا اور عام طور پر گھروں میں ہوتا تھا۔اس کام کے لیے کنیزوں سے بھی کام لیا جاتا تھا۔بنائی بھی ایک گھریلو صنعت تھی جو عام طور پر قصبوں اور شہروں میں چلتی تھی اور گاؤں میں بھی کہیں کہیں کپڑا بنا جاتا تھا۔بنائی کا مال (دھاگا وغیرہ) جلاہے کو خود خرید نا ہوتا تھا یا بیوپاری اُسے جلاہوں کو پہنچاتے تھے۔ نفیس قسم کے یا عیش و آرام والے کپڑے سرکاری کارگاہوں یا 'کارخانوں' میں تقسیم ہوتے تھے۔اس طرح ہمیں پتہ چلتا ہے کہ محمد بن تغلق کے کارخانوں میں 4000 کاریگر تھے جو مختلف قسم کی چادریں اور کپڑے تیار کرتے تھے۔فیروز تغلق نے اپنے کارخانوں اور پرگنوں میں کام کرنے کے لیے بہت سے غلاموں کو بھرتی کرکے ان کی تربیت کی تھی۔

17.3.5 دھات کا کام

ہندوستان میں دھات کے کام کی روایت بھی قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے۔اس کی تصدیق مہرولی (دہلی) میں موجود لاٹ سے ہوتی ہے جو صدیوں سے موسم کے گرم و سرد کی زیادتی جھیلتی چلی آرہی ہے۔ہندوستان کے دھات کے دستکاروں کی کاریگری اور چابک دستی کی تصدیق تانبے اور ملی جلی دھاتوں کی ان گنت مورتیوں سے بھی ہوتی ہے۔دھات میں دوسری دھاتوں کے نقش و نگار یا پچی کاری والی تلواریں، خنجر وغیرہ پوری دنیا میں مشہور تھے۔کانسے اور تانبے کے منقش اور پچی کاری والے برتن جو دکن میں تیار کیے جاتے تھے ان کی مغربی ایشیا میں متواتر مانگ رہتی تھی۔ سلطنت دور کے اعلیٰ معیار بھی ہندوستان میں دھات کے کام کی نفاست اور بہترین کاری گری کا ثبوت ہیں۔چاندی۔ سونے کا کام کرنے والے سنار اپنے نازک زیورات کی وجہ سے چاروں طرف جانے جاتے تھے اور زیورات کی مانگ مرد عورتوں دونوں طرف سے برابر بنی رہتی تھی۔

17.3.6 عمارتی صنعت

عمارتی صنعت یعنی تعمیر کا کام بھی لوگوں کے لیے روزگار کا اہم ذریعہ تھا۔دسویں صدی سے شمالی ہندوستان میں مندروں کی تعمیر کا سلسلہ کافی تیزی سے چل رہا تھا جیسا کہ بندیلکھنڈ میں کھجوراہو، راجستھان میں دلواڑا اور اڑیسہ اور گجرات میں بنے دوسرے مندروں سے ظاہر ہوتا ہے۔ترکی سلطان بھی عمارتیں بنوانے کے زبردست شوقین تھے۔انہوں نے محراب کے نئے طرز، گنبد اور محرابی یا قوسی چھتیں بنوانی شروع کیں اور ایک نئے مسالے سے روشناس کرایا۔یہ پلاسٹر میں استعمال کیا جانے والا چونے کا مسالہ تھا۔انہوں نے شہر، قلعے، مسجدیں، محلات، تعمیر کرائے جن میں سے کچھ کے باقیات یا کھنڈر اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس زمانے میں اینٹیں بنانے کے کام میں زبردست تیزی آئی اور زیادہ سے زیادہ لوگوں نے اینٹوں اور پتھر سے بنے پکے مکانوں میں رہنا شروع کردیا لیکن غریب لوگ بہر حال کچے ، چھپر والے مکانوں میں ہی زندگی بسر کرتے رہے۔سنگ تراشی میں ہندوستان کے کاریگروں کا یوں بھی کوئی مقابلہ نہیں تھا۔امیر خسرو کا دعوی تھا کہ دہلی کے سنگ تراش اور راج پوری مسلم دنیا میں سب سے اچھے کاریگر ہوتے تھے۔تاریخی اعتبار سے یہ بات بھی پوری طرح مانی جاتی ہے کہ تیمور اپنے ساتھ اپنے پایۂ تخت سمرقند کی تعمیر کے لیے دہلی سے سنگتراش اور راج لے گیا تھا۔اس بات کا بہر حال کوئی اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ عمارت کی صنعت میں کتنے لوگ لگے ہوئے تھے۔ برنی کا بیان ہے کہ علاءالدین خلجی نے 70,000 کاریگروں کو اپنی عمارات کی تعمیر میں

لگایا تھا۔ محمد بن تغلق اور فیروز دونوں بہت بڑے معمار سلطان تھے۔ فیروز نے صرف کچھ نئے شہر ہی نہیں بسائے بلکہ بہت سی پرانی عمارتوں اور مقبروں وغیرہ کی مرمت کا کام بھی کروایا۔ اسی دور میں چینی کاری کے ٹائلوں کا رواج بھی شروع ہوا۔ ہندو راجاؤں اور سرداروں نے بھی تعمیری کام کی سرپرستی کی اور بہت سے نئے شہر۔ جیسے راجستھان میں جودھپور، اس زمانے میں تعمیر ہوئے۔ بہترین قسم کا لکڑی کا کام بھی پورے ملک میں ہوتا تھا اور دروازے نشستیں (کرسیاں)، مسہریاں اور گھریلو استعمال کی بہت سی چیزیں تیار ہوتی تھیں۔

17.3.7 دوسرے حرفے اور کاغذ سازی کی صنعت

ایک اور حرفہ جو ہندوستان میں کافی وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا وہ کپڑے کا کام تھا جس کی بنیاد ملک میں موجود مویشیوں کی بہت بڑی تعداد کی موجودگی تھی۔ یہ کام ذات کی بنیاد پر منظم تھا۔ اصطبلوں میں بہت بڑی تعداد میں گھوڑے موجود تھے جن کے لیے اعلیٰ درجے کی زینیں بنتی تھیں جو امراء کو تحفے میں بھی دی جاتی تھیں۔ گجرات میں بہت نفیس چمڑے کی لال۔ نیلی چٹائیاں یا فرش بنتے تھے جنہیں چڑیوں یا جنگلی جانوروں کی تصویروں سے یا میناکاری وغیرہ سے سجایا جاتا تھا۔

اس دور میں جو ایک نئی صنعت اُبھری وہ کاغذ سازی کی تھی۔ حالانکہ چین میں اس کی واقفیت پہلی صدی عیسوی میں ہی پیدا ہو چکی تھی لیکن سمرقند اور بغداد میں یہ جانکاری آٹھویں صدی تک پہنچی۔ عربوں نے اس میں شہتوت اور کچھ دوسرے پیڑوں کی چھال کی بجائے کپڑے کی دھجیوں اور رسی استعمال کر کے اسے ایک نئی ٹکنالوجی بخشی۔ بہر حال ہندوستان میں تیرھویں صدی سے پہلے اس کے استعمال کی کوئی شہادت موجود نہیں ہے اور کاغذ پر لکھا پہلا مخطوطہ اس وقت 1223-24 کا گجرات کا موجود ہے۔ کاغذ کی صنعت نے کتابوں کی موجودگی میں یقیناً بہت اضافہ کیا ہوگا۔

ان کے علاوہ کچھ صنعتیں نمک سازی، سنگِ مرمر اور دوسرے پتھروں کی کھدائی اور لوہے اور تانبے کی کان کنی سے متعلق تھیں۔ پنا اور جنوبی ہندوستان میں ہیرے کی کھدائی اور سمندر میں موتیوں کے لیے غوطے کے کام بھی ہوتا تھا۔ ہاتھی دانت کا کام ایک اہم دستکاری تھی۔

17.3.8 اندرونی تجارت

سلطنت عہد میں، جیسا کہ پہلے بھی تھا، ہندوستان پورے ایشیائی علاقے اور مشرقی افریقہ کے قریبی علاقوں کے لیے ایک صنعتی کارگاہ (درکشاپ) کی حیثیت رکھتا تھا جہاں بہت تیز اور پوری طرح جمی ہوئی گھریلو تجارت بھی ہوتی تھی۔ ہندوستان کو یہ حیثیت اس کی بے حد اچھی پیداوار دینے والی زراعت، تربیت یافتہ دستکاروں اور حرفہ نگاروں اور بہت اعلیٰ درجے کے تربیت یافتہ اور تجربہ کار تاجروں اور سرمایہ کاروں سے حاصل ہوئی تھی۔ ترک سلطنت نے جو مرکزیت پیدا کی تھی اور جس سے ایک اچھا خبر رسانی کا ذریعہ (کمیونیکیشن)، چاندی کے ٹنکے اور تانبے کے درہم کی بنیاد پر ایک مضبوط اور مستحکم کرنسی کا نظام اور ہندوستانی تجارت کی نئی تنظیم اور تحریک پیدا ہوئی تھی ان سب کی وجہ سے شمالی ہندوستان میں نئے شہروں کی آبادکاری اور زر (روپے پیسے) کی بنیاد پر کاروبار میں اضافے کو ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں۔

داخلی یا ملک کے اندر تجارت کو دو حصوں میں بانٹا جا سکتا ہے۔ پہلے دیہاتوں کے درمیان آپسی، اور ضلعوں میں شہروں کی منڈیوں سے تجارت اور دوسرے بڑے بڑے ملی جلی آبادی والے (میٹروپالیٹن) شہروں اور علاقوں کے درمیان جو تجارت ہوتی تھی وہ ان دونوں کے درمیان رکھی جا سکتی ہے۔ علاقائی تجارت یا چھوٹے علاقہ کی تجارت محصول کی ادائیگی کے لیے اور ان شہروں کی غذائی ضرورتیں پورا کرنے کے لیے ہوتی تھی جو علاقے کی وسعت اور تعداد، دونوں طرح متواتر پھیل رہی تھی۔ فصلوں کی بیچنے کی بنیادی ذمے داری گاؤں کے لیے کی ہوتی تھی اور یہی کسانوں کی ضرورت کا سامان نمک مصالے اور گاؤوں کے لوہار کے لیے کچا لوہا بھی بیچتا تھا۔ کبھی کبھی رئیس اور بڑے کسان خود اپنی زائد پیداوار کو منڈی میں بیچنے لے جاتے تھے جس کی علاء الدین خلجی نے گاؤوں میں ذخیرہ اندوزی روکنے کی غرض سے ترغیب بھی دی تھی۔ منڈیوں کے کام میں علاقائی میلے بھی مدد پہنچاتے تھے جن میں جانوروں کی خرید فروخت بھی ہوتی تھی۔ جانوروں کی ضرورت زراعت کے کاموں، اندرونی آمد و رفت اور دودھ وغیرہ کی ضرورتیں پوری کرنے میں بہت اہم تھی۔ بہر حال، اس علاقائی تجارت کی مقدار کا اندازہ کرنے کا کوئی ذریعہ ہمارے پاس موجود نہیں ہے لیکن یہ تجارت ملک کی معاشی زندگی میں بہت بنیادی کردار ادا کرتی تھی لیکن اس علاقائی تجارت میں مصروف بیوپاریوں کے لیے اس سے اتنی وافر آمدنی نہیں ہو پاتی تھی کہ یہ کوئی آسان یا افراط کی زندگی گزار سکیں جس کا مطلب یہ ہے کہ بدنام زمانہ بنیا غالباً ایک رئیس کسان سے بہتر یا علی معیار زندگی نہیں رکھ پاتا تھا۔

اس منظر کے دوسرے سرے پر دولت مند تاجر اور سرمایہ کار۔ 'ساہا'، 'مودی' اور صراف ہوتے تھے۔ تجارت سے متعلق ان کے کام ملک کے اندر بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل و حمل سے بھی تعلق رکھتے تھے اور بڑے شہروں میں رہنے والے امراء اور رؤسا کے لیے آرام و آسائش کا سامان پہنچانے سے بھی۔ بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل و حمل (آمد و رفت) میں غلہ تیل، گھی، مسالے وغیرہ شامل تھے۔ چنانچہ چاول اور شکر جو بنگال اور بہار میں ضرورت سے زیادہ ہوتے تھے وہ پانی کے جہازوں سے مالا بار اور گجرات لے جائے جاتے تھے۔ گیہوں، جو آج کی اصطلاح میں مشرقی اتر پردیش، اودھ کڑا ل (یعنی الہ آباد) میں فاضل ہوتا تھا وہاں سے دہلی کے علاقے میں لایا جاتا تھا لیکن زمین پر بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل و حمل کافی مشکل کام تھا اور اسی لیے وہ زیادہ تر بنجارے ہی انجام دیتے تھے جو اپنے خاندانوں سمیت ہزاروں بیلوں کے ساتھ ملتے تھے۔ غالباً بنجاروں کے کام میں بڑے یا رئیس تاجر۔ 'ساہا' اور 'مودی' سرمایہ لگاتے تھے، بہر حال اس سلسلے میں کافی معلومات موجود نہیں ہیں۔ قیمتی لیکن بھاری اور بڑی اشیاء جیسے نفیس کپڑا، گھوڑوں یا بیل گاڑیوں پر لے جایا جاتا تھا۔ ان اشیاء کی نقل و حمل کاروانوں یا ٹانڈاؤں کے ساتھ ہوتی تھی جن کی حفاظت سپاہی کرتے تھے کیونکہ سڑکیں جنگلی جانوروں اور ڈاکوؤں دونوں قسم کے خطروں سے غیر محفوظ تھیں۔

دہلی سے دیوگیر تک محمد بن تغلق کی بنوائی سڑک سے اندازہ ہوتا ہے کہ سڑکوں سے آمد و رفت میں بہتری پیدا کرنے کی کتنی ضرورت تھی۔ سڑک کے دونوں طرف پیڑ لگائے گئے اور ہر دو میل (کروہ) پر سرائیں تعمیر کرائی گئیں جن میں کھانے پینے کا سامان موجود رہتا تھا، بنگال میں ایک پشتہ (کنارہ) تیار کیا گیا تا کہ لکھنوتی جانے والی سڑک کا جو حصہ برسات میں زیر آب رہتا تھا اس پر سفر آسان ہو جائے۔

دور دراز کے علاقوں کی تجارت میں بڑی مقدار میں اشیاء کی نقل و حمل میں کپڑا سب سے اہم شے ہوتی تھی۔ ہم بنگال اور دیوگیر سے

آنے والی ململ یا تنزیب اور گجرات سے آنے والے نفیس کپڑے کا ذکر پہلے ہی کر چکے ہیں۔ گھوڑے۔ غیر ملکی اور ملکی۔ دونوں، در آمد والی اشیاء میں کافی اہمیت کے حامل تھے۔ نیل (انڈیگو)، مسالے، مرہم، دوائیں، چمڑے کی مصنوعات دوسری اہم اشیاء تھیں۔ کشمیر کی شالوں اور قالین کی مانگ دہلی میں تھی۔ اسی طرح خشک میوے بھی آتے تھے۔ شراب دوسرے ملکوں سے در آمد ہوتی تھی اور دوآب کے علاقے میرٹھ اور علی گڑھ میں بھی تیار ہوتی تھی۔

جہاں تک دور دراز کی تجارت میں سرمایہ کاری کا سوال ہے ہنڈی کا طریقہ کار ہی جاری رہا ہوگا۔ مودی اور صراف ہی ہنڈی طریقہ کار میں بنیادی طور پر سرمایہ محصول رے والے ذرائع تھے چونکہ آج جیسا بینک کاری نظام موجود نہیں تھا۔ گاؤں کے درجے پر بنیے اور ملکی یا قومی پیمانے پر مودی اور صراف زرعی کاموں اور اس کی تجارت میں سرمایہ کاری کے ذرائع تھے۔ موجودہ دور کے ایک ممتاز مورخ، کے۔ایم۔ اشرف کے مطابق بڑے قرضوں کے لیے 10 فی صد اور چھوٹے قرضوں یا معمولی رقموں کے لیے 20 فی صد سالانہ سود لیا جاتا تھا۔

17.3.9 غیر ملکی تجارت

غیر ملکی تجارت کے سلسلے میں مغربی اشیا کے علاقے سے، جو بحر روم کی ساحلی دنیا تک پھیلا ہوا تھا اور وسطی ایشیا اور جنوب مشرقی ایشیا اور چین سے زمینی اور بحری راستوں سے تجارت کی روایت قدیم زمانے سے چلی آرہی تھی، زمینی راستہ درّۂ بولان سے گزر کر ہرات اور درّۂ خیبر سے گزر کر سمرقند اور بخارا تک اور کشمیر کے راستے یارقند اور خوطان ہوتا ہوا آگے چین تک پہنچ جاتا تھا۔ یہ تجارتی سلسلے وسط ایشیا کے خانہ بدوش گروہوں۔ جیسے چھٹی اور ساتویں صدی میں ہن گروہوں کے یلغار، اور تیرھویں صدی میں منگول لہر، وغیرہ کی وجہ سے کبھی کبھی درہم برہم بھی ہو جاتے تھے۔ شاہی خاندانوں کے عروج وزوال سے بھی ان تجارتی راستوں کی حفاظت پر اثر پڑتا تھا۔ بہر حال، تاجر طبقہ بھی ان رکاوٹوں کا عادی ہو کر ان سے کامیابی سے نپٹنے کے لیے پختہ کار ہو گیا تھا۔ دوسری طرف خانہ بدوش گروہوں نے بھی اس تجارت کو جاری رکھنے کی قدر کو سمجھتے ہوئے اس سے محصول حاصل کرنے کو زیادہ سود مند سمجھا۔ اس طرح منگولوں نے صرف تجارت کو ہی کھلا نہ رکھا بلکہ جنگ نہ ہونے کی صورت میں اونٹ، گھوڑے، ہتھیار، باز (شاہین)، سمور اور مشک وغیرہ کی تجارت میں شامل ہونا شروع کر دیا۔ حالانکہ بلبن کو وسط ایشیا سے گھوڑے حاصل کرنے میں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن یہ رکاوٹ عارضی یا وقتی ہی ہو گی کیونکہ علاءالدین خلجی کو ایسی کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ منگولوں کی اپنی حکومتیں قایم ہو جانے، اور راستوں کے محفوظ ہو جانے کے بعد چین اور مغربی ایشیا سے تجارت اتنی آسان ہو گئی جیسی اس سے پہلے کبھی نہیں تھی۔ اس لیے منگولوں کے ہاتھوں سمرقند و بخارہ جیسے خوشحال شہروں کی بربادی کے اثرات کو بہت زیادہ اہمیت نہیں دی جانی چاہیئے۔ منگولوں کے بتدریج اسلام قبول کر لینے اور اس سے قریب ہو جانے کی وجہ سے چودھویں صدی میں تجارت کے مواقع اور بہتر ہو گئے۔ بہر حال زمینی تجارت عام طور پر انہی چیزوں تک محدود رہی جو قیمت میں زیادہ اور وزن یا حجم میں کم ہوتی تھیں جس کی وجہ نقل و حمل پر آنے والی لاگت تھی۔ زمینی تجارت میں گھوڑوں کی در آمد سب سے اہم تھی۔ ہندوستان میں فوج کے لیے عربی، عراقی اور وسط ایشیائی گھوڑوں کی متواتر مانگ موجود تھی کیونکہ سوار فوج جنگ میں بنیادی ہتھیار تھی۔ گھوڑے نام و نمود اور اعلیٰ معیار زندگی کا بھی اظہار کرتے تھے اس لیے ان کی قدر کی جاتی تھی۔ اس طرح گھوڑوں کی خرید و فروخت کا باقاعدہ انتظام حکومت کا ایک اہم یا ترجیحی کام تھا۔ جن دوسری اشیاء کی ہندوستان

میں درآمد ہوتی تھی ان میں اونٹ، سمور، گورے غلام، مخمل، خشک میوے اور شراب شامل تھیں۔ چائے اور ریشم چین سے درآمد کیے جاتے تھے، جبکہ ریشم ایران سے بھی درآمد کیا جاتا تھا کیونکہ شہتوت اور ریشم کے کیڑے وہاں منگولوں نے تیرھویں اور چودھویں صدی میں پہنچادیے تھے۔ ہندوستان سے برآمد کی جانے والی اشیاء میں سوتی کپڑا، غذائی سامان، جیسے چاول، شکر اور مسالے شامل تھے۔ ہندوستان سے غلاموں کی برآمد بھی ایک متواتر سلسلہ تھی جن کی مانگ اسلامی ملکوں میں کافی زیادہ تھی۔

ہندوستان سے زمینی تجارت کا مرکز ملتان تھا۔ 1241 میں منگولوں کے ہاتھوں لاہور ایسا تباہ ہوا تھا کہ اُسے محمد بن تغلق کے عہد تک دوبارہ مضبوطی حاصل نہیں ہوئی۔ ملتان تمام غیر ملکیوں کی آمد کا بھی مرکز تھا جن میں وہ تاجر بھی شامل تھے جنھیں خراسانی کہا جاتا تھا۔ ان 'خراسانیوں' کی تعداد کا اندازہ کرنا تو مشکل ہے مگر یہ لوگ دولت کے معاملے میں ملتانیوں سے بہر حال کم تھے۔ غیر ملکی تاجر، خصوصاً عرب سمندری تجارت میں گجرات اور مالا بار میں زیادہ متحرک نظر آتے تھے۔ ہندوستانی تاجر جن میں ہندو (اگروال، اور مہیشوری) اور جین اور بوہرے شامل تھے، یہ بھی سمندری تجارت میں کافی مشغول تھے اور یہ مغربی اور جنوبی ایشیا میں ہندوستانی تاجروں کی کالونیوں سے تجارت کرتے تھے۔ بنگال، چین اور جنوب مشرقی ملکوں سے تجارت کرتا تھا، جس میں کپڑے کی برآمد اور ریشم اور مسالوں کی درآمد شامل تھیں۔ ماہون نے، جو پندرھویں صدی کی ابتدا میں بنگال آیا تھا، لکھا کہ "ایسے دولت مند افراد کافی بڑی تعداد میں موجود تھے جو جہاز بناتے تھے اور تجارت کرنے دوسرے ملک جاتے تھے۔"

17.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ دہلی سلطنت میں ہونے والی سماجی اور اقتصادی تبدیلیوں سے واقف ہوئے۔ سماج میں مختلف طبقات اور ان کی حیثیت بطور خاص عورتوں اور غلاموں کی حالت کے بارے میں آپ کو معلومات حاصل ہوئیں۔ عوام کا معیار اور طرز زندگی اور ساتھ ہی دیہی اور شہری سماج کے درمیان فرق سے بھی آپ واقف ہو چکے ہیں۔ معاشی میدان میں آپ زراعت، محاصل، غیر زرعی پیداوار اور مختلف صنعتوں کے ارتقا کو جان چکے ہیں۔ ساتھ ہی اندرونی اور بیرونی تجارت میں ہونے والی افزائش کو بھی نشان زد کر سکتے ہیں۔

دہلی سلطنت میں سلطانوں نے نئے امراء طبقے اور سماجی نظام کو تشکیل دیا جو جاگیردارانہ سماج سے یکسر مختلف تھا۔ جہاں پہلے حکمراں طبقہ یا سامنت گاؤں دیہات میں اپنی زمینوں کے ساتھ رہتے تھے وہیں اب نیا طبقہ امرا خالصتاً شہری تھا۔ اسی طرح سلطنت کے قائم ہونے سے نئے پیشے اور سرگرمیاں وجود میں آئیں اور تجارت میں بطور خاص بیرونی تجارت میں اضافہ ہوا۔

17.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

فیوڈل	جاگیردارانہ
سر جاندار	بادشاہ کی ذاتی فوج کے کمانڈر

ساقی خاص	پانی اور دوسرے مشروبات کے منتظم
تاجک	اہل ایران اور خراسان
توران	ترکوں کا ملک جسے عام طور پر ماورا نہر بھی کہا جاتا تھا۔
ابن بطوطہ	مراکش کا ایک سیاح جس نے چودھویں صدی میں ہندوستان کی سیاحت کی تھی۔
خلجی	افغانستان میں خلج نامی ایک مقام کے لوگ جنہیں ترک لوگ، ترک تسلیم نہیں کرتے تھے۔
اہل سیف	جنگجو افراد یا طبقہ امرا
اہل قلم	انتظامیہ کے ماہرین اور تمام پڑھنے لکھنے والے لوگ
نویسندہ	کلرک

17.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

17.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. حکومت میں سب سے اہم درجے کس کے تھے؟
2. برنی نے کتنے امیروں کی فہرست دی ہے؟
3. اشراف اور اذلاف کون تھے؟
4. فیروز شاہ کا وزیر کون تھا؟
5. ایک ملک کو کتنی تنخواہ ہوتی تھی؟
6. عماد الملک بشیر سلطانی نے کتنی جائداد چھوڑی؟
7. محمد بن تغلق نے شہاب الدین قزرونی کو کتنے جہاز دیے؟
8. رائے رانا اور راوت کے نام سے کون جانے جاتے تھے؟
9. عامل اور محرر کون ہوتے تھے؟
10. امیر خسرو نے حکومت میں کس طبقے کو بے ایمان بتایا؟

17.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت میں عورتوں کی حیثیت پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. دہلی سلطنت میں غلامی کے ادارے کا مختصر جائزہ لیجیے۔
3. دہلی سلطنت میں کپڑے کی صنعت پر ایک نوٹ لکھیے۔

4. دہلی سلطنت میں تاجر اور سرمایہ کار طبقے کا مختصر تجزیہ کیجیے۔
5. دہلی سلطنت میں غیر ملکی تجارت پر روشنی ڈالیے۔

17.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت میں حکمراں طبقے پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. دہلی سلطنت میں انتظامی افسران اور علماء پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
3. دہلی سلطنت میں حاصل کے نظام کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

17.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. Asher, C. B.; Talbot, C. (1 January 2008). *India Before Europe* (1st ed.). Cambridge University Press.
2. Eaton, Richard M. (2020) [1st pub. 2019]. *India in the Persianate Age*. London: Penguin Books.
3. Green, Nile, ed. (2019). *The Persianate World*: The Frontiers of a Eurasian Lingua Franca. University of California Press.
4. Khan, Mohd. Adul Wali (1974). *Gold and Silver Coins of Sultans of Delhi*. Government of Andhra Pradesh.
5. Kumar, Sunil. (2007). *The Emergence of the Delhi Sultanate*. Delhi: Permanent Black.
6. Jackson, Peter (2003). *The Delhi Sultanate: A Political and Military History*. Cambridge University Press.
7. Satish Chandra (2007). *History of Medieval India: 800-1700*. Orient Longman.
8. محمد حبیب اور خلیق احمد نظامی، جامع تاریخ ہند، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۱ء
9. ستیش چندرا، عہدِ وسطیٰ کا ہندوستان (سلطنت سے مغل عہد تک) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۱۱ء

اکائی 18۔ ثقافت

(Culture)

اکائی کے اجزا

18.0 تمہید

18.1 مقاصد

18.2 ادب

18.2.1 سنسکرت ادب

18.2.2 عربی فارسی ادب

18.2.3 علاقائی زبانیں

18.3 فنون لطیفہ

18.3.1 طرز تعمیر

18.3.1 موسیقی

18.4 اکتسابی نتائج

18.5 کلیدی الفاظ

18.6 نمونہ امتحانی سوالات

18.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

18.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

18.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

18.7 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

18.0 تمہید (Introduction)

ہندوستان میں ترکوں کی آمد اور تیرھویں صدی میں دہلی سلطنت کے قیام کا زمانہ ہلچل اور ترقی دونوں کا دور تھا۔ جیسا ہم دیکھ چکے ہیں اس کا ابتدائی دور بڑے پیمانے پر قتل وغارت گری اور تباہی و بربادی کا دور تھا جس میں بہت سے خوبصورت مندر، محلات اور شہر تباہ و برباد کیے گئے۔ سلطنت میں توسیع کے ساتھ ساتھ یہ صورتِ حال کچھ وقفوں کے ساتھ جاری رہی لیکن جب کوئی علاقہ یا سلطنت فتح ہو جاتی تھی یا مطیع ہو جاتی تھی تو امن و سکون اور ترقی کا دور شروع ہو جاتا تھا۔ یہ انداز شمالی ہندوستان میں آہستہ آہستہ شروع ہوا جہاں بڑے بڑے علاقے دو سو سال تک براہِ راست سلطنت کے تحت رہے۔

ترک حکمرانوں کو کسی صورت میں بھی اکھڑ یا بربریت پسند تصور نہیں کیا جا سکتا۔ یہ لوگ آٹھویں صدی میں وسطی ایشیا میں ابھرے تھے اور رفتہ رفتہ انہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا۔ اس طرح انہیں اسلامی تہذیب اور ثقافت ورثے میں ملی تھی جو ترقی کی کافی اعلیٰ منزل پر پہنچ چکی تھی۔ حالانکہ عباسی خلافت، جس کا اسلامی دنیا پر ڈیڑھ صدی سے زیادہ غلبہ رہا تھا، اب اُس کے زوال کا دور چل رہا تھا، اور بہت سی ریاستیں اور سلطنتیں اس کے مقابل کھڑی ہو چکی تھیں، مگر یہ سلطنتیں بھی عباسیوں کے قائم کردہ انتظامیہ کے پیمانوں اور ثقافت کو تھوڑی بہت تبدیلی یا کمی بیشی کے ساتھ اپنائے ہوئے تھیں۔ جو ترک ہندوستان آئے تھے وہ خود کو صرف اسلام کا نمائندہ یا چیمپین ہی تصور نہیں کرتے تھے بلکہ اس کی اعلیٰ روایات اور اقدار کا ورثہ دار ہونے پر بھی فخر کرتے تھے۔ خواہ وہ طرز تعمیر کی روایات ہوں، علم و ادب ہو، حکومت کی ساخت یا سائنس اور ٹکنالوجی کچھ بھی ہو۔ انہوں نے وہی زبان، فارسی اپنائی تھی جو دسویں صدی تک وسط ایشیا، خراسان اور ایران کی حکومت اور ثقافت کی زبان بن کر ابھری تھی۔

دوسری طرف ہندو بھی ایک مذہب اور ثقافت کے ورثے دار تھے جو ہزاروں سال میں اس حد پر پہنچا تھا۔ شمالی ہندوستان میں چوتھی اور پانچویں صدی کا زمانہ سائنسی اور ثقافتی اعتبار سے انتہائی عروج کا دور مانا جاتا ہے۔ اس کے بعد گو کہ ہندوستان سائنسی میدان میں پچھڑ گیا تھا، اور تخلیقی فکر کے دھارے بھی رفتہ رفتہ خشک ہوتے چلے گئے تھے لیکن ثقافتی روایات اور اقدار ابھی باقی تھیں۔ جدید تحقیقات نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ آٹھویں سے بارھویں صدی تک کے دور کو بھی کسی طرح ثقافتی تنزل کا دور نہیں کہا جا سکتا۔ یہی وہ دور تھا جس میں تعمیری کام کافی حد تک جاری رہا خاص طور پر مندروں کے طرز تعمیر میں کافی نکھار آیا۔ اس طرح بندیل کھنڈ میں کھجوراہو، اڑیسہ اور متھرا، کاشی اور دلواڑہ وغیرہ میں بہت سی جگہ مندر رہے۔ ان مندروں میں طرز تعمیر اور بت تراشی، دونوں میں صلاحیت اور مہارت کا احساس ہوتا ہے۔ اس زمانے میں مذہب اور فلسفے میں بھی کافی اہم تصورات ابھرے۔ چنانچہ شنکر اچاریہ نے ویدوں کے فلسفے پر ایک آخری مہر ثبت کر دی اور ہندوؤں میں کسی ایک ذاتی دیوتا کی پرستش اور اس سے محبت کرنے والا ایک مسلک جنوبی ہندوستان میں اُبھرا۔

ہندومت، بدھ مذہب اور اسلام کے درمیان تعلق ہندوستان میں اسلام پہنچنے سے پہلے ہی شروع ہو چکا تھا۔ آپسی لین دین کے اس عمل میں اسلام کے ہندوستان پہنچنے کے بعد اور تیزی آئی۔ بہر طور، اس عمل کے سیاسی رُخ اور مذہبی فلسفیانہ رخ، دونوں میں امتیاز یا فرق سمجھ

لینا بہت ضروری ہے، گو کہ یہ دونوں رُخ ایک دوسرے پر اثرانداز ضرور ہوتے تھے۔ کچھ کٹر قسم کے علماء جیسے التمش کے دربار کے نورالدین مبارک غزنوی ہندوؤں سے مخالفت میں شدت پسندی کی وکالت کرتے تھے، خاص طور پر برہمنوں کے یہ شدید مخالف تھے چونکہ اُن کے خیال میں سچے دین کے یہی سب سے بڑے دشمن تھے۔ ہم پہلے یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس پالیسی کو حکمرانوں نے اپنے دور کے حالات کے اعتبار سے نامناسب اور ناقابل عمل پایا۔ خود ہندوؤں میں بھی ایک طبقے میں مسلمانوں سے کچھ دوری اور نفرت کا انداز موجود تھا، چنانچہ انہوں نے مسلمانوں سے کم سے کم تعلق رکھنے کی پالیسی اپنائی۔ بہر حال، ان رکاوٹوں اور اسلام اور ہندو، دونوں مذہبوں میں ظاہری طور پر ایک ناقابل عبور دوری کے باوجود جس میں اسلام اللہ کے علاوہ تمام دوسرے خداؤں کو سختی سے منسوخ کرتا ہے اور اس کا آخری پیغمبر (محمد) کو مانتا ہے اور ہندو مذہب تنوع یا کثیر الجہتی میں یکجہتی کا عنصر رکھتے ہوئے بہت سے دیوی دیوتاؤں کا تصور رکھتا ہے اور بتوں کی پوجا کا طریقہ اپناتا ہے جسے مسلمان مسترد کرتے ہیں۔ اپنی قربت، مصالحت اور ایک دوسرے کو سمجھنے کا عمل رفتہ رفتہ شروع ہو ہی گیا۔ اس طرز عمل کو سب سے پہلے طرز تعمیر، ادب، موسیقی وغیرہ میں دیکھا گیا۔ مذہبی رخ میں بھی یہ عمل اس وقت سے پیدا ہوا جب سے ملک میں صوفیت داخل ہوئی اور شمالی ہندوستان میں مقبول عام بھکتی تحریک کی نشو ونما ہوئی۔

یہ عمل پندرھویں صدی میں رفتہ رفتہ آگے بڑھتا رہا اور مغلوں کے دور میں سولہویں اور سترھویں صدی میں اس میں توانائی اور تیزی پیدا ہوئی۔ مگر یہ تصور کرلینا بھی صحیح نہیں ہوگا کہ اختلاف یا ٹکراؤ کے عنصر بالکل ختم ہوگئے۔ ہوا یہ کہ قربت و مصالحت اور اختلاف یا ٹکراؤ کے عمل دونوں بیک وقت جاری رہے۔ ان میں بعض حکمرانوں اور بعض علاقوں میں کچھ سستی یا رکاوٹ پیدا ہو جاتی تھی اور کچھ دوسرے حکمرانوں کے دور میں تیزی اور ترقی نظر آتی تھی۔ مناسب ہوگا کہ ٹکراؤ اور قربت، ان دونوں عناصر کا اس دور کے تناظر میں تجزیہ کیا جائے۔

18.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت کے دوران علم وادب کے ارتقا کو جان سکیں گے۔
- عربی اور فارسی ادب میں لکھی گئیں تصنیفات سے واقف ہوسکیں گے۔
- علاقائی زبانوں میں موجود ادبی سرمایہ کا تجزیہ کرسکیں گے۔
- دہلی سلطنت میں فنون لطیفہ کے عروج وارتقا کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے۔
- فن تعمیر اور سلطنت عہد کی مختلف عمارتوں کا تنقیدی تجزیہ کرسکیں گے۔
- موسیقی کے میدان میں پیش رفت کو سمجھ سکیں گے۔

18.2 ادب (Litrature)

18.2.1 سنسکرت ادب (Sanskrit Litrature)

زیر نظر عرصے کے دوران سنسکرت ہی اعلیٰ خیالات کے اظہار اور ادبِ عالیہ کی تخلیق کا وسیلہ رہی تھی۔ فی الحقیقت ادب کی مختلف شاخوں میں سنسکرت ادب کی تخلیق کا کام زبردست مقدار میں اور شاید اس سے پہلے دور سے زیادہ ہی عمل میں آیا۔ عظیم شنکر اچاریہ کے بعد 'ادویتا' فلسفے کے میدان میں رامانج، مادھو، ولبھ وغیرہ نے جو تحریری کام کیے وہ متواتر سنسکرت میں ہی ہوئے۔ ان لوگوں کے خیالات جس تیز رفتار سے ملک کے مختلف حصوں میں پھیلے اور ان پر بحثیں ہوئیں اس سے اس بات کا بخوبی اظہار ہو جاتا ہے کہ سنسکرت اس دور میں کتنا اہم کردار ادا کر رہی تھی۔ ملک کے مختلف حصوں میں، جن میں مسلم اقتدار والے علاقے بھی شامل تھے، کچھ مخصوص قسم کے اسکولوں اور علمی اداروں کا ایک جال سا پھیلا ہوا تھا۔ ان اداروں کے کام میں کسی قسم کی مداخلت یا رکاوٹ پیدا نہیں کی جاتی تھی اور یہ متواتر پھلتے پھولتے رہے۔ ان میں سے بہت سے اداروں نے کاغذ کے آنے سے بھی فائدہ اٹھانا شروع کیا اور اسے قدیم تحریروں کو دوبارہ لکھ کر مختلف جگہوں تک پہنچانے میں استعمال کیا۔ اس طرح رامائن اور مہابھارت کے کچھ قدیم ترین نسخے، جو آج موجود ہیں، وہ گیارہویں، بارہویں اور اس کے بعد کے عرصے سے ہی تعلق رکھتے ہیں۔

فلسفے کے علاوہ کاویہ (شاعرانہ بیان) ڈرامہ، فکشن، علم ادویہ (میڈیسن)، علم فلکیات (آسٹرونومی) موسیقی وغیرہ میں بھی تحریری کام جاری رہا۔ ہندو قوانین (دھرم شاستر) پر بہت سی تفسیریں اور تلخیصیں (ڈائجسٹ) بارہویں سے سولہویں صدی کے درمیان تیار کی گئیں۔ وجنانیشور کی عظیم 'متاکشر' جو ہندو قوانین کے دو بنیادی مکاتیبِ فکر میں سے ایک کی تشکیل کرتی ہے، اس کی تیاری کو بھی بارہویں صدی سے پہلے نہیں مانا جاسکتا۔ دھرم شاستروں کا ایک اور مشہور و معروف مفسر بہار کا 'چندیشور' چودہویں صدی کا تھا۔ زیادہ تر تحریری کاموں کی تخلیق ہندو حکمرانوں کے تحت جنوبی ہندوستان، اس کے بعد بنگال، پھر متھیلا اور مغربی ہندوستان میں ہوئی۔ سنسکرت کی نشو و نما میں جینیوں کا حصہ رہا۔ ان میں سب سے مشہور نام ہیم چندر سواری کا آتا ہے۔ یہ بات خاصی جیب لگتی ہے کہ انہوں نے عام طور پر ملک میں مسلمانوں کی موجودگی کو نظرانداز کیا ہے۔ اسلامی ادب یا فارسی ادب کو سنسکرت میں ترجمہ کرنے کی کوئی خاص کوشش نہیں کی گئی۔ شاید ایک واحد استثناء جامی کی تحریر کردہ یوسف وزلیخا کی کہانی کے ترجمے کی تھی۔ اسے ہندوؤں کی طرزِ فکر کی تنگ نظری یا گھرے پن کی ایک اور مثال سمجھا جاسکتا ہے جس کا ذکر البیرونی پہلے ہی کر چکا تھا۔ اس دور کی موجود حقیقتوں کو نظرانداز کرنا یا ان سے منہ موڑ لینا شاید اس حقیقت کے لیے ذمے دار مانا جائے گا کہ اس دور کے ادب میں زیادہ تر مواد دوہرایا گیا ہے اور اس میں تازگی بصیرت، تخلیقی جدت کی کمی ہے۔

18.2.2 عربی فارسی ادب (Arabic & Persian Literature)

حالانکہ مسلمانوں کا تخلیق کردہ ادب زیادہ تر عربی میں تھا جو ان کے پیغمبر کی زبان تھی اور ادب اور فلسفے کی زبان کی حیثیت میں اسپین سے بغداد تک استعمال ہوتی تھی مگر جب ترک ہندوستان آئے تو ان پر فارسی کا بڑا گہرا اثر تھا کیونکہ دسویں صدی کے بعد سے یہی زبان وسط ایشیا

اور ایران میں ادب اور حکومت کے انتظامیہ کی زبان ہو گئی تھی۔ ہندوستان میں عربی کا استعمال عام طور پر علماء اور فلاسفہ کے ایک محدود حلقے میں باقی رہا۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسلامی قوانین کی تلخیصیں اور ترجمے فارسی میں بھی تیار ہوتے رہے جنہیں خود ہندوستان کے علماء نے ہی تیار کیا تھا۔ ان میں سب سے مشہور فقہہ فیروز شاہی، ہے جسے فیروز تغلق کے عہد میں تیار کیا گیا تھا۔ بہر حال، عربی تلخیصیں تیار کرنے کا کام بھی جاری رہا، چنانچہ ان میں سب سے مشہور فتاوائے عالمگیری ہے جو اورنگ زیب کے دور میں فقیہوں کے ایک حلقے کے تیار کیے ہوئے اسلامی قوانین کا مجموعہ ہے۔

دسویں صدی میں ترکوں کی آمد سے ملک میں ایک نئی زبان 'فارسی' بھی پہنچی۔ اسی زمانے میں ایران اور وسطِ ایشیا میں بھی فارسی میں ایک نئی زندگی اور توانائی آئی اور فارسی زبان کے کچھ عظیم ترین شعراء فردوسی اور سعدی اور عشقِ حقیقی اور صوفیانہ شاعری کے عظیم شعراء، ثنائی، عراقی، جامی، حافظ وغیرہ ہوئے اور دسویں سے چودھویں صدی کے درمیان ان کا زبردست کلام منظر عام پر آیا۔ ترکوں نے بالکل ابتداء ہی ادب اور انتظامیہ کے لیے فارسی زبان کو اپنا لیا تھا۔ اس طرح اس زبان کی نشوونما کے لیے ہندوستان میں سب سے پہلا مرکز لاہور بنا حالانکہ اس ابتدائی دور کے فارسی لکھنے والوں میں سے بہت کم لوگوں کا کام اب باقی ہے لیکن ان میں سے کچھ لکھنے والوں جیسے مسعود سعد سلمان کی تحریروں میں لاہور سے ایک گہرے لگاؤ اور محبت کا احساس ہوتا ہے۔ بہر حال اس دور کے سب سے قابل ذکر مصنف امیر خسرو تھے۔ 1252 میں پٹیالی (مغربی اتر پردیش میں بدایوں کے پاس ایک مقام) میں پیدا ہوئے اور انہیں اپنے ہندوستانی ہونے پر بڑا ناز تھا۔ وہ کہتے ہیں، ''میں نے ہندوستان کی تعریف و توصیف دو وجہوں سے کی ہے، چونکہ ہندوستان میری جائے پیدائش اور میرا ملک ہے، اور اپنے ملک سے محبت ایک اہم فرض ہے۔ ہندوستان جنت جیسا ہے۔ اس کی آب و ہوا خراسان سے بہتر ہے۔ یہ پورے سال ہرا بھرا اور ہمیشہ پھولوں سے بھرا رہتا ہے۔ یہاں کے برہمن اتنے ہی لائق و فاضل ہیں جیسے ارسطو اور یہاں بہت سے علموں کے بہت بڑے بڑے عالم موجود ہیں''

ہندوستان سے خسرو کی اس والہانہ محبت سے اظہار ہوتا ہے کہ ترک خود کو اب ایک غیر ملکی حکمراں طبقے کی شکل میں دیکھنے کے لیے تیار نہیں تھے اور اب ان کے اور ہندوستانیوں کے درمیان ایک طرح کی ثقافتی مصالحت اور قربت کے لیے میدان ہموار ہو گیا تھا۔ امیر خسرو نے بہت بڑا شاعرانہ ذخیرہ تیار کیا جس میں تاریخی رومانی کہانیاں بھی شامل تھیں۔ انہوں نے شاعری کی ہر صنف میں لکھا اور فارسی کا ایک نیا طرز ایجاد کیا جسے سبقِ ہندی، یا ہندوستانی طرز کے نام سے جانا جاتا ہے۔

خسرو نے ہندوستان کی زبانوں کی تعریف کی ہے جس میں ہندی (جسے انہوں نے 'ہندوی' لکھا ہے) بھی شامل تھی۔ اُن کے کچھ متفرق ہندی اشعار بھی اُن کی تحریروں میں نظر آجاتے ہیں، لیکن خالق باری، جس کی تالیف کو اُن سے منسوب کیا جاتا ہے، اس کے متعلق اغلب خیال یہی ہے کہ وہ کسی بعد کے اِسی نام کے شاعر کی تیار کی ہوئی ہے۔ وہ ایک باکمال موسیقار بھی تھے اور مشہور صوفی نظام الدین اولیا کی 'سماع' کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ جس دن خسرو نے اپنے پیر نظام الدین کے انتقال (1325) کی خبر سنی، اُسی دن ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ انہیں بھی نظام الدین اولیا کے مقبرے کے احاطے میں ہی دفن کیا گیا۔

شاعری کے علاوہ اس دور میں فارسی میں تاریخ نویسی کی بھی ایک مضبوط روایت اُبھری۔ اس دور کے سب سے مشہور تاریخ نویس منہاج سراج، ضیاءالدین برنی، عفیف اور عصامی تھے۔

فارسی زبان کے توسط سے ہی ہندوستان کے وسط ایشیا اور ایران سے گہرے ثقافتی تعلقات قائم ہوئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ فارسی صرف انتظامیہ اور سیاسی امور کی زبان ہی نہیں رہی، بلکہ سماج کے اعلیٰ طبقے اور اُن سے ملحق اور منحصر حلقے کی زبان بھی ہو گئی۔ یہ صورتِ حال شمالی ہندوستان سے شروع ہوئی اور بعد میں دہلی سلطنت کی جنوب میں توسیع اور ملک کے مختلف حصوں میں مسلم ریاستوں یا بادشاہتوں کے قائم ہونے سے لگ بھگ پورے ملک میں پھیل گئی۔

ملک میں سنسکرت اور فارسی نے خاص طور پر سیاست، مذہب اور فلسفے کے میدانوں میں رشتے یا ذریعے کی زبان کا کام انجام دیا اور ادبی تخلیقات کی بھی یہی زبانیں رہیں۔ شروع شروع میں ان دونوں زبانوں میں بہت کم لین دین تھا۔ ضیاء نقشبندی (فوت 1350) نے سب سے پہلے سنسکرت سے فارسی میں وہ کہانیاں ترجمہ کیں جو ایک طوطے نے اس عورت کو سنائی تھیں جس کا شوہر سفر پر گیا ہوا تھا۔ 'طوطی نامہ' کتاب جو محمد بن تغلق کے زمانے میں تیار ہوئی تھی بے حد مقبول ہوئی اور فارسی سے ترکی اور بعد میں بہت سی یوروپی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا۔ اس نے ہندوستان کی قدیم جنسی کتاب کوک شاستر کا بھی فارسی میں ترجمہ کیا۔ بعد میں فیروز شاہ کے زمانے میں علم طب اور موسیقی کی کتابیں بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کی گئیں۔ کشمیر کے سلطان زین العابدین نے مشہور و معروف تاریخ کی کتاب 'راج ترنگنی' اور 'مہا بھارت' کا فارسی میں ترجمہ کروایا۔ اسی کی فرمائش پر علم طب اور موسیقی کی کتابیں بھی سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔

18.2.3 علاقائی ادب (Regional Litrature)

اس زمانے میں بہت سی علاقائی زبانوں میں بھی اعلیٰ درجے کا ادب تخلیق ہوا۔ کچھ علاقائی زبانوں ہندی بنگالی، مراٹھی وغیرہ کی ابتدا بھی آٹھویں صدی میں ہی تلاش کی گئی ہے۔ کچھ دوسری زبانیں جیسے تامل بہت پرانی زبانیں ہیں۔ بودھ، جین اور ناتھ پنتھی 'سادھوؤں' نے کچھ ''ملی جلی یا بگڑی ہوئی زبانوں'' (اپ بھرنش) اور علاقائی زبانوں کو سنسکرت کے استعمال پر ترجیح دی۔ چودھویں صدی کے شروع میں امیر خسرو نے علاقائی زبانوں کی موجودگی کا ذکر کیا ہے اور لکھا ہے: ''اس زمانے میں ملک کے ہر صوبے میں اس کی ایک مخصوص زبان ہے، جو کسی دوسرے سے مستعار نہیں لی گئی ہے۔ سندھی، لاہوری، کشمیری کباری (جموں کے علاقے کی ڈوگری)، دُھر سمندری (کرناٹک کی کنڑ)، تیلنگی (تلگو)، گوجر (گجراتی)، معبری (تامل)، گوری (شمالی بنگال) بنگالی، اودھ اور دہلی اور اس کے آس پاس بولی جانے والی (ہندوی)'' انہوں نے آگے بیان کیا ''یہ زبانیں زمانہ قدیم سے ہی زندگی کے عام کاروبار میں ہر طرح استعمال ہوتی رہی ہیں۔''

کچھ جدید علاقائی زبانیں، جیسے آسامی، اُڑیا، ملیالم وغیرہ کا ذکر نہیں ملتا۔ بہرحال خسرو نے اس اہم صورت حال، یعنی جدید علاقائی ہندوستانی زبانوں کی نشو نما کی طرف صحیح نشاندہی کی ہے۔ ان میں سے بہت سی زبانوں کا پختگی کی سطح تک پہنچ جانا اور ان کا ادبی تخلیقات میں استعمال ہونا عہد وسطی کی بڑی ممتاز اور قابل ذکر خصوصیت مانی جائے گی۔ اس کی وجوہات متعدد اور مختلف تھیں۔ ممکن ہے برہمنوں کی

بالادستی اور حیثیت میں کمی آنے سے سنسکرت کی حیثیت میں بھی کسی قدر کمی آئی ہو۔ بھکتی سنتوں کی طرف سے علاقائی اور عام زبان کا استعمال بھی ان زبانوں کی ترقی کی ایک یقینی وجہ تھی۔ فی الحقیقت، ملک کے بہت سے علاقوں میں سنتوں سادھوؤں نے ہی ان زبانوں کو ادب کے سانچے میں ڈھالنا شروع کیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ترکوں کی آمد سے پہلے بہت سی علاقائی حکومتوں میں سنسکرت کے ساتھ تامل، کنڑ، مراٹھی وغیرہ بھی استعمال ہوتی تھیں۔ ترک حکومت کے دوران بھی یہ طریقہ جاری رہا ہو گا کیوں کہ ہمیں دہلی سلطنت میں ہندی جاننے والے محاسیوں (اکاؤنٹنٹس) کے تقرر کا ذکر ملتا ہے۔ بعد میں جب دہلی سلطنت منتشر ہو گئی، تب بھی انتظامی امور میں بہت سی علاقائی حکومتوں میں فارسی کے ساتھ علاقائی زبانوں کا استعمال جاری رہا۔ چنانچہ جنوبی ہندوستان میں وجے نگر کے حکمرانوں کی سرپرستی میں تلگو ادب کی نشو و نما ہوئی۔ مراٹھی بہمنی سلطنت کی انتظامیہ کی زبانوں میں سے ایک تھی اور اس کے بعد بیجاپور کے دربار میں بھی یہ صورت برقرار رہی۔ وقت کے ساتھ ساتھ جب یہ زبانیں ترقی کر کے ایک خاص درجے پر پہنچ گئیں تو کچھ مسلم حکمرانوں نے ان کے ادبی استعمال کے سلسلے میں بھی سرپرستی کی۔ مثال کے طور پر بنگال کے حکمراں نصرت شاہ نے رامائن اور مہابھارت کا بنگالی میں ترجمہ کروایا۔ اسی کی سرپرستی میں مالادھر باسو نے 'بھگوت' کا ترجمہ کیا۔ بنگالی شعراء کو اس کی جو سرپرستی ملی اس کا ذکر پہلے بھی کیا جا چکا ہے۔

صوفیوں کی موسیقی کی محفلوں میں بھکتی سنتوں کی ہندی نظموں اور گیتوں کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ مشرقی اترپردیش میں 'چنداین' کے مصنف ملاداؤد اور پدماوت کے مصنف ملک محمد جائسی وغیرہ نے ہندی میں ہی لکھا اور صوفیانہ تصورات اور خیالات کو اس انداز میں بیان کیا کہ انہیں عام آدمی سمجھ سکے۔ انہوں نے شاعری کی کچھ صنفوں جیسے مثنوی کو بھی عام کیا۔

18.3 فنون لطیفہ (Fine Arts)

18.3.1 فن تعمیر (Architecture)

نئے حکمرانوں کی سب سے پہلے ضرورت رہنے کے لیے مکان اور اپنے ہم مذہبوں کے لیے عبادت گاہیں بنانے کی تھی۔ عبادت گاہوں کے لیے شروع میں انہوں نے مندروں اور دوسری عمارتوں کو مسجدوں میں تبدیل کرنا شروع کیا۔ ان کی مثالیں، دہلی میں قطب مینار سے ملحق مسجد قوت الاسلام اور اجمیر میں وہ عمارت ہے جسے، اڑھائی دن کا جھونپڑا کہا جاتا ہے۔ اوّل الذکر پہلے ایک جین مندر تھا جو بعد میں ایک ایسے مندر میں تبدیل کر دیا گیا تھا جو وشنو کے نام پر تھا اور موخر الذکر ایک بودھ خانقاہ تھی۔ دہلی میں جو واحد تعمیری کام تھا وہ منہدم کیے ہوئے دیوی استھان (گربھ گرہ) کے سامنے دو محرابیں تھیں جنہیں بڑی خوبصورتی سے نقاشی سے سجایا گیا تھا۔ ان کے سامنے چھت دار راستوں سے گھرا ایک صحن تھا جس میں اس علاقے کے ستائیس مندروں سے لوٹے ہوئے صرف ستون کھڑے کر دیے گئے تھے۔ ان محرابوں کو جس انداز سے سجایا گیا ہے وہ بہت دلچسپ ہے۔ چونکہ اسلام میں انسان یا کسی جانور کی شکل بنانا منع ہے اس لیے ان پر بھی کوئی ایسی شکل نہیں بنائی گئی تھی۔ اس کے بدلے انہوں نے پھولدار بیلوں اور قرآن کی آیتوں کا استعمال کیا تھا جو ایک دوسرے میں بڑی فن کاری اور خوبصورتی سے گوندھی گئی تھیں۔ پھر جلدی ہی ترکوں نے اپنی عمارتیں بھی بنانی شروع کر دیں۔ اس کے لیے انہوں نے زیادہ تر یہیں کے کاریگروں

سے کام لیا جیسے سنگ تراش، راج مستری وغیرہ۔ کچھ بعد میں کچھ فنکار معمار مغربی ایشیا سے ہندوستان آئے۔ اپنی عمارتوں میں ترکوں نے محرابوں اور گنبدوں کا استعمال بہت زیادہ کیا۔ بہر حال نہ تو محراب ترکی یا مسلمان ایجاد تھی نہ گنبد۔ عربوں نے انہیں بازنطینی سلطنت سے اپنایا تھا اور پھر ان میں اختراعیں کر کے انہیں بہتر کیا اور پھر بالکل اپنا بنالیا۔

محراب اور گنبد کے استعمال کے کچھ فائدے تھے۔ گنبد عمارت کو ایک خوشگوار خط فلکی یا افقی پس منظر فراہم کرتا تھا اور معماروں میں جیسے جیسے تجربہ اور اس سے اعتماد بڑھا گنبد اوپر اٹھتا چلا گیا۔ ایک چوکور عمارت پر گول گنبد تعمیر کرنے اور گنبد اونچے سے اونچا اٹھانے کے سلسلے میں بھی بہت سے تجربے کیے گئے۔ اس طرح بہت سی عالیشان اور اونچی اونچی عمارتیں وجود میں آئیں۔ محرابوں اور گنبدوں کا فائدہ ایک یہ تھا کہ ان کی وجہ سے اُن بہت سے ستونوں سے چھٹکارا پانا ممکن ہو گیا جن پر چھت رکھی جاتی تھی۔ اس طرح سے بڑے بڑے ہال بنائے جا سکے جن میں کسی قسم کی رکاوٹ بغیر دیکھا جا سکتا تھا۔ ایسی جگہیں مسجدوں اور محلوں میں لوگوں کے جمع ہونے میں آسانی پیدا کرتی تھیں۔ بہر حال ایسی محرابوں کو بہت مضبوط مسالوں (سیمنٹ) کی ضرورت ہوتی تھی جن کے بغیر پتھروں کو نہیں جمایا جا سکتا تھا۔ ترک اپنی عمارتوں میں بہت عمدہ قسم کا چونے کا مسالہ (گچ) استعمال کرتے تھے۔ اس طرح انواع و اقسام کی بہت سی عمارتیں اور بہتر قسم کے مسالوں کا استعمال پورے ہندوستان میں ترکوں کی آمد سے رائج ہوتا چلا گیا۔

محراب اور گنبد سے ہندوستانی پہلے سے واقف تھے مگر ان کا استعمال اتنے وسیع پیمانے پر نہیں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ محراب کی تعمیر کا صحیح اور سائنٹفک طریقہ مشکل سے ہی کہیں استعمال ہوتا تھا۔ ہندوستان کی عمارتوں میں جو طریقہ عام طور پر استعمال ہوتا تھا اس میں پتھر پر پتھر رکھ کر فاصلے کو کم کرتے چلے جاتے تھے یہاں تک یہ فاصلہ اتنا کم ہو جاتا تھا کہ اُسے ایک پتھر سے بند کیا جا سکتا تھا یا اُن پتھروں پر ایک سل رکھ کر اُسے ڈھکا جا سکتا تھا۔ ترکی حکمرانوں نے اپنی عمارتوں میں گنبد اور محراب کا طریقہ اور شہتیروں اور پتھر کی سل دونوں طریقوں کا استعمال کیا۔

سجاوٹ کے سلسلے میں ترک بھی اپنی عمارتوں میں انسانی یا حیوانی شکلیں بنانے سے گریز کرتے تھے۔ ان کے بدلے میں وہ جیومیٹری اور پھولوں اور بیلوں کا استعمال کرتے تھے اور ان میں قرآن کی آیتوں کی پٹیاں اور پینل بھی شامل کرتے تھے۔ اس طرح عربی خط بھی ایک قسم کا آرٹ یا فن بن گیا۔ آرائش کے ان مختلف طریقوں کے مجموعے کو طغرائی گل کاری (Arabesque) کہا جانے لگا۔ انہوں نے ہند وامتیازی خصوصیات جیسے بل، گھنٹی، سواستک (swastika) کنول وغیرہ کو بھی آسانی سے اپنالیا۔ ہندوستانیوں کی طرح ترک بھی اپنی عمارتوں کی سجاوٹ کے بڑے شوقین تھے۔ ترکوں نے اپنی عمارتوں میں سنگ سرخ کو استعمال کر کے ان میں رنگ کی خوبصورتی اور بڑھادی۔ پہلے پھر یا سنگ مرمر کو سجاوٹ یا سنگ سرخ کے اثر کو ابھارنے کے لیے استعمال کیا جاتا تھا۔

تیرھویں صدی میں ترکوں کی بنوائی ہوئی سب سے عالیشان اور سب سے مشہور عمارت مسجد قوت السلام سے ملحق مینار ہے۔ یہ موذن کے اذان دینے کی جگہ 'ماذانہ' کہلاتا تھا۔ 'قطب مینار' تو اسے بہت بعد میں کہا جانے لگا۔ شاید اس لیے کہ اس کی تعمیر قطب الدین ایبک

نے شروع کروائی تھی، یا ممکن ہے اس لیے کہ جب التمش نے اسے مکمل کروایا تو مشہور صوفی قطب الدین بختیار کاکی دہلی میں رہتے تھے اور اسے ان کی روحانیت کی دین یا علامت سمجھا جانے لگا تھا۔ اس خیال کی کوئی بنیاد یا وجہ موجود نہیں ہے کہ یہ کسی پہلے بنے ہوئے راجپوت مینار کی بنیادوں پر دوبارہ بنایا گیا ہے یہ خیال اس لیے پیدا ہوا کہ مینار کی بنیاد یا نچلے حصے میں کچھ ایسے پتھر لگے ہوئے ہیں جو اس علاقے کے منہدم شدہ مندروں کے تھے۔ مینار میں نصب ایک کتبے میں فضل بن ابوالعالی کا نام بھی کندہ ہے، مگر اس بوسیدہ اور مٹے ہوئے سے کتبے سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ نام اس کے معمار کا ہے یا صرف کام کی نگرانی کرنے والے کا۔

گو کہ میناروں کی تعمیر کی روایت ہندوستان، مغربی ایشیا اور دوسری جگہوں پر موجود تھی لیکن قطب مینار کئی وجوہات کی بناء پر منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی زبردست اونچائی۔ 71.4 میٹر (238) فٹ، اس کی مخروطی یا گاؤدم ساخت کی وجہ سے اور باا ثر ہوگئی ہے۔ شروع میں یہ صرف چار منزل اونچا تھا لیکن اس کی اوپری منزل پر بجلی گر گئی تھی تو فیروز تغلق نے اس کی مرمت کروائی اور ایک منزل اور بڑھادی۔ اس مینار کی خاص خوبصورتی اصل میں اس کے چھجوں (بالکنوں) سے ہے، جو اس میں سے اُبھرے ہوئے یا باہر نکلے ہوئے ہیں اور ''گوشے دار شہد کے چھتوں''، جیسے شش پہل پتھروں سے جڑے ہوئے ہیں۔ مینار کے باہری حصے پر تکون (کمرخی) اور گولائی لی ہوئی متناسب پٹیوں کو جس مہارت سے ابھارا گیا ہے اُس نے اور سنگ سرخ اور سفید سنگِ مرمر کی اوپر لگی پٹیوں نے اس کی خوبصورتی کو بہت بڑھادیا ہے۔

التمش کے عہد میں دہلی سلطنت کے استحکام کے بعد سے ترکوں کے بڑھتے ہوئے عمارتی کام کو اس دور کی بہت سی عمارتوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔ اس طرح اتر پردیش میں بدایوں کی مسجد اور بہت سی دوسری عمارتوں، ناگور، ہانسی اور ہریانہ میں پلول کے مقام پر عالی شان دروازے اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ اب ترکوں نے خود اپنی عمارتیں بنوانے کا عزم کر لیا تھا۔ التمش کا اپنا مقبرہ، جو خود اُسی کے آخری دنوں میں بنا تھا اس سے تعمیر میں ہندو اور مسلم روایات کے آپسی امتزاج کے نشانات بھی ملنے شروع ہو جاتے ہیں۔ یہ مقبرہ ایک مربع شکل کی عمارت تھا لیکن اس کے کونوں پر چوتھائی گنبد کے قبے اور سہارے کی ڈاٹیں بنا کر اور اُسے ہشت پہل شکل دے کر اس پر گنبد تعمیر کیا گیا تھا۔ بعد میں مربع شکل کی بہت سی عمارتوں میں یہی طریقہ استعمال کیا گیا۔ اس سے بھی زیادہ متاثر کن اندرونی دیواروں کی نقاشی تھی جس میں خطاطی میں ہندوستانی گل کاری شامل کر کے اسے اور خوبصورت کیا گیا تھا۔

تیرھویں صدی میں مغربی ایشیا میں منگولوں کی تباہ کاریوں کے نتیجے میں بہت سے عالم وفاضل لوگ ہندوستان آئے جن میں ریاضی داں اور ماہرین تعمیرات (آرکیٹیکٹ) بھی شامل تھے۔ اس کے اثر سے ہمیں بلبن کے سیدھے سادے مقبرے میں صحیح محراب نظر آجاتی ہے۔ یہ محراب دونوں طرف اُبھرے چھجے یا منڈیر جیسے پتھروں پر براہ راست ابھاری جاتی ہے، اور اس طرح نہیں بنائی جاتی کہ پتھر پر پتھر رکھ کر فاصلے کو کم کرتے چلے گئے اور پھر اوپر ایک پتھر کی سل سے اسے ڈھک دیا۔

خلجی دور میں بھی بہت تعمیری کام ہوا۔ علاءالدین نے سیری میں اپنا پایہ تخت تعمیر کروایا جو قطب سے کچھ کلو میٹر دور تھا۔ بدقسمتی سے اب اس شہر کی مشکل سے ہی کوئی چیز بچی ہے۔ علاءالدین نے قطب مینار سے دوگنا اونچا ایک مینار اور بنوانے کا منصوبہ بنایا تھا مگر وہ اپنی

موت کی وجہ سے اسے پورا نہ کرواسکا۔ بہر حال اس نے قوت الاسلام مسجد میں داخلے کا ایک دروازہ ضرور بنوایا۔ یہ دروازہ، جسے علائی دروازہ کہتے ہیں اس کی کچھ ممتاز خصوصیات ہیں۔ اس پر با گنبد اس اصول پر نہیں بنایا گیا کہ مسالے کے ردّے ایک کے اوپر ایک اس طرح چڑھائے جائیں کہ جیسے جیسے یہ اوپر اٹھتا جائے اس کی جسامت یا سائز رفتہ رفتہ کم سے کم ہوتا چلا جائے بلکہ اسے آگے بڑھتی ہوئی گگروں (radiating voussors) کے اصول پر بنایا گیا تھا اور یہ اپنے طرز کی ہندوستان میں پہلی عمارت تھی۔ گھوڑے کے فعل کی شکل کی محراب، جس کو پہلی مرتبہ کسی عمارت میں استعمال کیا گیا تھا، یہ بھی دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتی ہے۔ زینت کے لیے استعمال کیے گئے طریقے محراب کے اندرونی حصے میں چھوٹی ہوئی جگہ (merlons) ،دو محرابوں کے ملنے کی جگہ (Spandrel) پر کنول کا استعمال سفید سنگ مرمر کی جعفریاں (جالیاں) اور لال پتھر کی یکسانیت کو کم کرنے کے لیے سنگ مرمر کی سفید پٹیاں عمارت میں مضبوطی اور شان و شوکت پیدا کرتی ہیں جو ہندوستانی طرز تعمیر کی روایات میں ایک امتیازی خصوصیت ہے۔ اس دور میں مسجد کے طرز تعمیر میں بھی ترقی اور پختگی پیدا ہوئی جیسا کہ صوفی نظام الدین اولیا کے مزار کے پاس تعمیر جماعت خانہ مسجد میں محسوس ہوتا ہے۔

تغلق دور میں بھی جو سلطنت عہد کے انتہائی عروج اور ساتھ ہی ساتھ اس کے زوال کے ابتدا کا بھی وقت ہے، عمارتی کام میں بہت ترقی ہوئی۔ غیاث الدین اور محمد بن تغلق نے قلعہ - محل کی ملی جلی بہت بڑی تعمیر کروائی جسے تغلق آباد کہا جاتا ہے۔ جمنا کے دھارے کو روک کر اس کے چاروں طرف ایک بہت بڑی مصنوعی جھیل بھی تیار کی گئی۔ غیاث الدین کا مقبرہ طرز تعمیر میں ایک نئے رجحان کی نشاندہی کرتا ہے۔ ایک متاثر کن اور خوبصورت خط فلکی (افقی پس منظر) پیدا کرنے کے لیے عمارت کو ایک اونچے چبوترے پر اٹھایا گیا۔ اس کی خوبصورتی اس کے سنگِ مرمر کے گنبد سے اور دوبالا ہو گئی۔

تغلق دور کی عمارتوں کی ایک اور امتیازی خصوصیت اس کی ڈھلواں دیواریں ہیں۔ یہ گاؤدم دیوار میں (batter) کہلاتی ہیں اور ان سے عمارت کی مضبوطی اور پختگی کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔ بہر طور، فیروز تغلق کی عمارتوں میں گاؤدم کا استعمال شاذ و نادر ہی ہے۔ تغلق دور کی عمارتوں کی ایک اور امتیازی خصوصیت ان میں محراب کے اصول اور چوکھٹ اور شہتیر (لنٹل اور بیم) دونوں کا عمداً امتزاج ہے۔ حوض خاص میں فیروز تغلق کی بنوائی ہوئی عمارتوں میں جو تفریحی مقام کے طور پر بنوائی گئی تھیں اور جن کے چاروں طرف ایک بہت بڑی مصنوعی جھیل بھی تھی، یکے بعد دیگرے ایک منزل میں محراب اور دوسری میں چوکھٹ اور شہتیر کا انداز ملتا ہے۔ ایسا ہی فیروز شاہ کے نئے قلعے میں بھی دیکھا جا سکتا ہے جسے فیروز شاہ کوٹلہ کہا جاتا ہے۔ تغلق حکمرانوں نے اپنی عمارتوں میں قیمتی سنگ سرخ استعمال نہیں کیا بلکہ سستا اور آسانی سے ملنے والا بھورا پتھر ہی لگایا ہے۔ فیروز شاہ کی عمارتوں میں پتھروں پر گچ یا چونے کے مسالے کی بھی ایک موٹی سی تہہ چڑھائی جاتی تھی جس پر سفید پتائی کی جاتی تھی اور یہ طریقہ ابھی تک بھی رائج ہے۔ چونکہ اس قسم کے پتھروں اور مسالے پر نقاشی یا کھدائی کا کام آسان نہیں تھا اس لیے تغلق دور کی عمارتوں میں زینت یا آرائش بہت کم نظر آتی ہے لیکن فیروز کی تمام عمارتوں میں سجاوٹ میں کنول ضرور نظر آتا ہے۔ ایک اور طریقہ جو فیروز تغلق کے مقبرے میں نظر آتا ہے وہ سامنے کے رخ پر پتھر کا جنگلا ہے جو خالص ہندو انداز ہے۔

اس زمانے میں بہت سی مسجدیں بھی تعمیر ہوئیں جیسے کلاں مسجد، کھڑکی مسجد۔ یہ کھردرے یا بے پالش پتھر کی تھیں اور ان پر گچ مسالے کا پلاسٹر بھی نہیں ہوا تھا اس لیے یہ اتنی پر شکوہ نہیں تھیں۔ ان کی ستون بھاری اور موٹے تھے۔ ابھی ہندوستان کے معمار میں اتنی خود اعتمادی بھی پیدا نہیں ہوئی تھی کہ وہ گنبد کو زیادہ اونچا اٹھا سکے۔ اس لیے یہ عمارتیں کچھ دبی دبی سی لگتی ہیں۔ لودیوں نے بھی اپنی عمارتوں میں آڑے ترچھے اور بے گڑھے پتھروں کے استعمال اور گچ کے پلاسٹر کی روایت کو جاری رکھا۔ مگر اس وقت تک ہندوستانی معمار اور راج مستری نے طرز کی عمارتوں کی تعمیر کے سلسلے میں پورا اعتماد حاصل کر چکے تھے۔ اس لیے اب اُن کے گنبد آسمان میں اونچے اٹھنے لگے تھے۔ ایک نیا طریقہ جو ہندوستان میں ہی پہلی بار نظر آیا دہ دوہرا گنبد بنانے کا تھا۔ شروع میں اس کو تجربے کے طور پر بنایا گیا مگر سکندر لودی کے مقبرے میں یہ پوری طرح مکمل شکل میں سامنے آیا۔ جیسے جیسے گنبدوں کی اونچائی بڑھتی گئی یہ طریقہ ضروری ہوتا چلا گیا۔ گنبد کا ایک پرت اندر کی طرف رکھنے سے گنبد کی اونچائی اندر کے حصے میں متناسب دکھائی دیتی تھی۔ بعد میں یہی طریقہ تمام عمارتوں میں استعمال ہونے لگا۔ ایک اور تعمیراتی طریقہ جو سب سے پہلے فیروز کے وزیر خان جہاں تلنگانی کے مقبرے میں استعمال ہوا وہ ہشت پہل عمارت بنانے کا تھا۔ اس میں اور بھی اختراعات شامل کی گئیں۔ اس کے چاروں طرف ایک برآمدہ بنایا گیا۔ بارش اور دھوپ سے بچانے کے لیے اس پر ایک چھجہ بھی ڈالا گیا، چھت کے تمام کونوں پر چھتریاں یا اولتیاں بنوائی گئیں۔ ان کی عمارتوں میں بھی محراب اور شہتیر اور پتھر کی سل والے دونوں طریقے استعمال کیے گئے۔

لودیوں نے اپنی عمارتوں، خصوصاً مقبروں کی تعمیر میں ایک طریقہ یہ بھی اپنایا کہ انہیں اونچے چبوتروں پر اُٹھایا جس سے یہ عمارتیں جسامت میں بھی اور خط فلکی (افقی پس منظر) کے اعتبار سے بھی عالیشان لگیں۔ کچھ مقبروں کو باغات میں تعمیر کروایا گیا۔ دہلی کا لودی گارڈن اس کی بہترین مثال ہے۔ بعد میں مغلوں نے بھی ان میں سے بہت سی خصوصیات کو اپنایا اور ان کا نقطہ عروج شاہ جہاں کے بنوائے ہوئے تاج گل میں نظر آیا۔

دہلی سلطنت کے انتشار تک ہندوستان کے مختلف علاقوں کی ریاستوں میں اُن کا اپنا انفرادی طرز تعمیر بھی اُبھر چکا تھا۔ ان میں سے زیادہ طرزوں پر وہاں کے مقامی طرز تعمیر کی بڑی گہری چھاپ تھی۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں یہ بات بنگال گجرات، مالوہ اور دکن وغیرہ کی عمارتوں میں خاص طور پر موجود تھی۔

اس زمانے میں تعمیراتی کاموں میں ہمیں صرف زبردست اضافہ نظر نہیں آتا بلکہ ہندو مسلمان روایات اور طرز تعمیر کے ایک دوسرے سے قریب تر آنے کا رجحان بھی نظر آتا ہے۔ پندرھویں صدی میں جو بہت سی بادشاہتیں قائم ہوئیں وہاں دہلی میں ابھرتے ہوئے طرزِ تعمیر کو اپنے علاقے کی تعمیراتی روایت میں ضم کر کے ایک ملا جلا انداز پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔

18.3.2 موسیقی (Music)

ایک دوسرے کو سمجھنے، قربت اور میل جول کے رجحانات صرف مذہبی اعتقادات اور رسوم، طرزِ تعمیر اور ادب میں ہی نظر نہیں

آتے بلکہ یہ فنون لطیفہ، خاص طور پر موسیقی کے میدان میں بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ ترک جس وقت ہندوستان آئے تھے تو انہیں موسیقی کی بھرپور روایت عربوں سے ورثے میں مل چکی تھی جس کی ایران اور وسط ایشیا میں مزید نشو و نما ہوئی تھی۔ وہ اپنے ساتھ کچھ نئے ساز بھی لائے تھے، جیسے رباب اور سارنگی اور کچھ نئے طرز اور اصول بھی اُن کے پاس تھے۔ بغداد کے خلفاء کے دربار میں ہندوستانی موسیقی اور موسیقاروں نے شاید وہاں موسیقی کی نشو و نما پر بھی اثر ڈالا تھا۔ بہر حال، ان دونوں کے درمیان باقاعدہ تعلق سلطنت دور میں ہی عمل میں آیا۔ امیر خسرو کا ذکر پہلے بھی آچکا ہے۔ خسرو جنہیں 'نایک' یعنی موسیقی کے اصول اور ریاض دونوں کے استاد کا خطاب دیا گیا تھا، انہوں نے بہت سے فارس۔ عرب راگ شروع کیے۔ جیسے ایمن، گورا (غارا) سنم وغیرہ۔ قوالی کی ابتدا بھی انہیں سے منسوب کی جاتی ہے۔ ستار کی ایجاد کا سہرا بھی انہیں کے سر رکھا جاتا ہے لیکن اس کا کوئی ثبوت ہمارے پاس موجود نہیں ہے۔ طبلے کو بھی اُن سے منسوب کیا جاتا ہے مگر اس کی نشو و نما غالباً سترھویں صدی کے آخری حصے میں یا اٹھارویں صدی کے شروع میں ہوئی تھی۔

موسیقی میں قربت اور تکمیل کا عمل فیروز کے عہد میں جاری رہا۔ اس کے عہد میں ہندوستانی کلاسیکی تحریر 'راگ درپن' کا ترجمہ فارسی میں ہوا۔ موسیقی کی محفلیں صوفیوں کی خانقاہوں اور بسیروں سے باہر نکل کر امراء کے محلوں تک پہنچ گئیں۔ جونپور کا حکمراں سلطان حسین شرقی موسیقی کا بڑا مربی اور سرپرست تھا۔ اس دور کے سب سے بڑے موسیقار کے بعد صوفی پیر بودھن کو ہی اگلے نمبر پر مانا جاتا ہے۔ ایک اور علاقہ جہاں موسیقی کی زبردست آبیاری اور نشو و نما ہوئی وہ گوالیار کی ریاست تھی۔ گوالیار کا راجا مان سنگھ موسیقی کا زبردست دلدادہ تھا۔ 'مان کوتوہال' نام کی کتاب، جس میں مسلمانوں کی اختراع کی ہوئی تمام طرزوں کو جمع کیا گیا ہے، وہ اسی کی سرپرستی اور نگرانی میں تیار کی گئی تھی۔ یہ نہیں معلوم کہ شمال ہندوستان کی موسیقی کی طرز جنوبی ہندوستان کی طرز سے کب الگ ہوئی۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ طرز میں یہ فرق زیادہ تر شمالی ہندوستان میں فارس۔ عرب راگوں اور تالوں کی وجہ سے ہی پیدا ہوا۔ سلطنت کشمیر میں ایک بالکل الگ یا ممتاز طرز ابھرا جس پر ایرانی موسیقی کا زیادہ اثر تھا۔ جون پور کو فتح کرنے کے بعد سکندر لودی نے وہاں کی پرانی روایت، موسیقی کی سرپرستی کو بڑے شاہانہ انداز میں برقرار رکھا۔ بعد میں اسے افغان حکمرانوں نے بھی اپنایا اور اس روایت کو اور آگے بڑھایا۔ چنانچہ شیر شاہ کا جانشین عدالی خود موسیقی کا بڑا استاد تھا۔ بہر حال موسیقی کا نقطہ عروج مغل دور میں پہنچا۔

18.4 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی میں ہم نے دہلی سلطنت کے دوران تہذیب و ثقافت کے میدان میں ہونے والی پیش رفت کا جائزہ لیا۔ سلطنت عہد میں سلطانوں نے علوم و فنون کے ارتقا میں بھرپور حصہ لیا اور عالموں، دانشوروں اور فن کاروں کی قدر دانی کی۔ دہلی سلطنت کے کئی حکمراں بذات خود بڑے عالم اور دانشور تھے جیسے کہ محمد بن تغلق اور فیروز شاہ تغلق۔ ان حکمرانوں کے وزیر بھی اکثر قابل اور جید عالم ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر شمس الدین التمش کے وزیر نظام الملک جنیدی ایک عظیم دانشور اور ماہر مدبر تھے۔ وسطی ایشیا میں منگولوں کی لوٹ مار اور قتل و غارت گری سے بھاگ کر متعدد علما و فضلا نے دہلی کے سلطانوں کے دربار میں پناہ حاصل کی۔ اس ماحول میں دہلی سلطنت میں علم و ادب کی

ترقی میں اضافہ ہوا۔ عربی اور فارسی ادب میں مختلف علوم وفنون پر متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ان کے علاوہ علاقائی زبانوں میں بھی کافی سرمایہ تصنیف کیا گیا اور ان زبانوں کو بھی فروغ حاصل ہو جیسے ،اپبھرنش، گجراتی، بنگالی اور اڑیا وغیرہ۔ جنوب میں بھی اس دور میں تمل، تلگو اور کنڑ زبانوں کو عروج حاصل ہوا۔ وجے نگر ریاست میں کنڑ اور تلگو کی بھرپور سرپرستی کی گئی۔

علم وادب کے علاوہ فنون لطیفہ کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ فن تعمیر کے میدان میں نئے حکمرانوں نے متعدد تعمیرات کا آغاز کیا۔ دہلی میں قطب مینار کی تعمیر سے لے کر باقاعدہ شہروں کی تعمیر تک یہ دور اپنی عمارتی سرگرمیوں کے لیے مشہور ہے۔ فیروز شاہ تغلق کے دور میں یہ فن اپنے عروج پر پہنچ گیا اور فیروزاباد، جون پور، حصار فیروزہ جیسے نئے شہر تعمیر کیے گئے۔ دہلی میں قطب مینار، علائی دروازہ، قوت الاسلام مسجد، کوٹلہ فیروز شاہ، غیاث الدین کا تغلق کا مقبرہ، تغلق آباد، اجمیر میں ڈھائی دن کا جھونپڑا وغیرہ اسی دور میں تعمیر کیے گئے۔

فن موسیقی کو بھی فروغ حاصل ہوا۔ حالانکہ اسے شاہی سرپرستی تو کم ہی حاصل رہی مگر صوفیوں کی خانقاہوں اور سماع کی محفلوں میں اسے بہت اہمیت حاصل ہوی۔ سماع میں موسیقی کے استعمال کو لے کر درباری علما اور صوفیوں میں اختلافات بھی چلتے رہے۔ امیر خسرو ستار کے ماہر تھے اور نظام الدین اولیا کے سامنے اسے بجایا کرتے تھے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ یہ دور تہذیبی ارتقا اور تمدنی نشوونما کا دور تھا۔ شاہی اور عوامی سرپرستی سے مختلف علوم وفنون کو پھلنے پھولنے کے بھرپور مواقع میسر آئے۔

18.5 کلیدی الفاظ (Keywords)

سماع	:	صوفیوں کی ذکر الٰہی کی محفل جہاں قوال گا کر اہل محفل کو محظوظ کرتے تھے۔
خط فلکی	:	افقی پس منظر
مینار یا ماذنہ	:	موذن کے اذان دینے کی جگہ
شنکراچاریہ	:	ساتویں صدی میں ادویت فلسفے کے بنیاد گذار

18.6 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

18.6.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ادویت فلسفہ کس سے منسوب ہے؟
2. جب ترک ہندوستان میں آئے تو ان پر کس زبان کا گہرا اثر تھا؟
3. فارسی زبان کے دو عظیم شعرا کا نام بتایئے۔
4. سبق ہندی کس نے ایجاد کیا؟
5. فارسی میں لکھنے والے دو مورخین کے نام بتایئے۔

6. طوطی نامہ کے مصنف کا نام بتائیے؟
7. کشمیر کے سلطان زین العابدین نے کن اہم کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کروایا؟
8. اپ بھرنش کا لفظی معنیٰ کیا ہے؟
9. چنداین کے مصنف کون تھے؟
10. اڑھائی دن کا جھونپڑا کہاں واقع ہے؟

18.6.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت میں عربی فارسی ادب پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. اس دور میں سنسکرت ادب کا مختصر جائزہ لیجیے۔
3. دہلی سلطنت میں موسیقی پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. دہلی سلطنت میں علاقائی ادب کا مختصر تجزیہ کیجیے۔
5. ہندوستان کے تعلق سے امیر خسرو کے نظریات پر روشنی ڈالیے۔

18.6.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت میں فن تعمیر پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. دہلی سلطنت میں علم وادب کے ارتقا پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
3. دہلی سلطنت میں ثقافتی ارتقا کا تفصیلی جائزہ لیجیے۔

18.7 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for further Reading)

1. Asher, C. B.; Talbot, C. (1 January 2008). India Before Europe (1st ed.). Cambridge University Press.
2. Blair, Sheila; Bloom, Jonathan M. (1995). The Art and Architecture of Islam, 1250-1800. Yale University Press Pelican History of Art.
3. Harle, J.C. (1994). The Art and Architecture of the Indian Subcontinent (2nd ed.). Yale University Press Pelican History of Art.
4. Kumar, Sunil. (2007). The Emergence of the Delhi Sultanate. Delhi: Permanent Black.

اکائی 19۔ بھکتی تحریک

(Bhakti Movement)

اکائی کے اجزا

19.0 تمہید

19.1 مقاصد

19.2 بھکتی کے تصور کا پس منظر

19.3 نجات حاصل کرنے کے تین ذرائع

19.4 تمل خطے میں بھکتی تحریک

19.5 آدی شنکراچاریہ

19.6 اصلاحی تحریک کے طور پر بھکتی کے ابھرنے کے ذمہ دار عوامل

19.6.1 ہندو مذہب میں ذات پات کے نظام کی سختی

19.6.2 بھکتی تحریک پر اسلام کے اثرات

19.7 اصل حقیقت سے فرار کے طور پر بھکتی تحریک

19.8 بھکتی مصلحین کی اہم تعلیمات

19.9 ممتاز بھکتی مصلحین

19.9.1 رامانج

19.9.2 نمبکارا

19.9.3 مادھواچاریہ

19.9.4 رامانند

19.9.5 کبیر

19.9.6 گرونانک

19.9.7 ولبھ چاریہ
19.9.8 میرابائی
19.9.9 چیتنیہ مہاپربھو
19.10 مہاراشٹر کے بھکتی سنت
19.10.1 نام دیو
19.10.2 تکارام
19.10.3 سوامی رام داس
19.11 بھکتی تحریک کا اثر
19.12 اکتسابی نتائج
19.13 کلیدی الفاظ
19.14 نمونہ امتحانی سوالات
19.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
19.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
19.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
19.15 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

19.0 تمہید (Introduction)

بھکتی تحریک ایک اہم ترین سماجی، مذہبی اور ثقافتی تحریک تھی جس نے عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج میں مثبت تبدیلیوں کی راہ ہموار کی جس کے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ بھکتی تحریک کے ضمن میں کئی بھکتی مصلحین ابھرے جنھوں نے اس بات کا پرچار کیا کہ "خدا ایک ہے، تمام انسان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔" انہوں نے بت پرستی کو رد کیا اور ذات پات کے غیر انسانی نظام اور اچھوت ہونے کے تصور کی مذمت کی۔ رفتہ رفتہ بھکتی تحریک پورے ہندوستان میں پھیل گئی اور میرابائی جیسی خواتین بھی اس تحریک میں شامل ہوگئی تھیں۔ اس تحریک نے سماجی اور روحانی جمہوریت کے لیے مہم چلائی اور اعلان کیا کہ خدا کو مذہبی پیشواؤں اور پجاریوں کے طبقے کے چنگل سے آزاد کر کے عام لوگوں کے قریب لایا جانا چاہیے۔ اس تحریک نے یہ بھی ثابت کیا کہ ہندوستانی سماج کسی بیرونی اثر و رسوخ کے بغیر خود کو اندر سے بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

19.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کو پڑھنے کے بعد آپ

- بھکتی کے تصور اور بھکتی تحریک کے ابھرنے کے اسباب کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- بھکتی مصلحین کی مختلف تعلیمات سے اپنے آپ کو واقف کر سکیں گے۔
- سماج میں بھکتی مصلحین کے کام اور پیغام کا جائزہ لے سکیں گے۔
- ہندوستانی ثقافت میں بھکتی مصلحین کے تعاون کو جان سکیں گے۔
- ہندوستانی سماج اور ثقافت پر بھکتی تحریک کے اثرات کا جائزہ لے سکیں گے۔
- اس بات کو ثابت کر سکیں گے کہ ہندوستانی سماج کسی بیرونی محرک کے بغیر اپنے اندر سے سماجی تبدیلی کی اہلیت رکھتا ہے۔

19.2 بھکتی کے تصور کا پس منظر

موکش یا نجات حاصل کرنے کے حتمی مقصد کے ساتھ وقف ہو کر خدا کی عبادت کو بھکتی کہا جاتا ہے۔ بھکتی کا تصور اتنا ہی پرانا ہے جتنا کہ ہندوستانی مذہبی روایت جو کہ وادی سندھ کی تہذیب سے جا کر ملتی ہے۔ وادی سندھ کی تہذیب میں، ہمیں پشوپتی شیو کی پوجا کے ابتدائی شواہد ملتے ہیں جو جانوروں سے گھرے مراقبے میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہمیں ویدوں، اپنشدوں، رزمیہ داستانوں اور پرانوں میں بھکتی کا ذکر واضح طور پر ملتا ہے۔ ویدانت یا ویدک مذہبی فلسفہ بنیادی طور پر اپنشدوں پر مبنی ہے، جو رسمی اور سطحی شکلوں سے اوپر اٹھ کر ہند آریائیوں کے مذہبی عقائد و اعمال کے فلسفیانہ پہلو سے بحث کرتا ہے۔ یہ تخلیق کے اسرار کو حل کرنے اور انسانی زندگی کے معنی اور مقصد کو مابعد الطبیعاتی اندازوں کے ذریعے تلاش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ویدانت کے فلسفے کا اصل محور خالق اور مخلوق، خدا (برہمن یا پرماتما) اور روح (آتما) کا تصور ہے۔ یہ دو بنیادی اصولوں کے گرد گھومتا ہے-۱۔ روح کی دوبارہ پیدائش یا منتقلی کا نظریہ۔ ۲۔ کرم کا نظریہ یا "مکافات عمل کا قانون"۔ روح اور خدا کے درمیان تعلق ایسا ہی ہے جیسے کامل اور جزو کے درمیان تعلق؛ پانی کے قطرے اور سمندر کے درمیان تعلق۔ انسان فانی ہے لیکن روح لافانی ہے۔ خدا کا ایک حصہ اور جز ہونے کے ناطے، اس کا حتمی مقصد خدا کے ساتھ دوبارہ ملاپ کی تلاش اور خدا کے ساتھ ایک ہو جانا ہے۔ یہی نجات (جسے مکتی، موکش یا نروان بھی کہا جاتا ہے) یا پنر جنم کے چکر سے آزادی ہے۔

19.3 نجات حاصل کرنے کے تین ذرائع

ویدانت، نجات کے حصول کے لیے تین طریقے بتاتا ہے۔ وہ ہیں گیان مارگ، کرم مارگ اور بھکتی مارگ۔ گیان مارگ، نجات کے حصول کے لیے حقیقی علم کی تحصیل یا عرفان پر زور دیتا ہے۔ کپل کا سانکھیہ درشن اس طریقے کی سفارش کرتا ہے۔ کرم مارگ، نجات کے حصول کے لیے خالص عمل پر زور دیتا ہے۔ بھگوت گیتا میں کرشن نے اپنے شاگرد ارجن کو اسی کی تعلیم دی۔

بھکتی مارگ، خدا کی دل لگا کر عبادت، بندے کی خدا کے سامنے مکمل سپردگی اور پاک نیت، اچھے الفاظ اور عمل کے ساتھ خدا سے لو محصول ے پر زور دیتا ہے۔ یہ خدا اور بندے کے درمیان ذاتی تعلق قائم کرتا ہے، ایک ایسا تعلق جو آقا اور غلام، شوہر اور بیوی یا محبوب اور عاشق کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس قسم کی عقیدت کے ذریعے مکتی حاصل کی جاسکتی ہے۔

گیان مارگ کو اپنانا سب سے مشکل ہے۔ غیر معمولی خدائی اوصاف کے حامل بہت کم سادھو اور مادی دنیا کی خواہشات سے عاری، پاک ذہن و قلب کے حامل سنیاسی، حقیقی علم یا عرفان کے حصول میں کامیاب ہوئے ہیں۔

19.4 تمل خطے میں بھکتی تحریک

بدھ مذہب اور جین مذہب کے بڑھتے ہوئے اثر ور سوخ کے خلاف رد عمل کے طور پر چھٹی صدی کے آس پاس تامل خطے میں بھکتی کے فرقے نے ایک تحریک کی شکل میں جنم لیا۔ یہ جنوبی ہندوستان میں تقریباً تین صدیوں تک شیومت اور وشنومت کے ذریعے پروان چڑھا۔ شیو کی پوجا کرنے والوں کو نینار کہا جاتا تھا اور وشنو کی پوجا کرنے والوں کو الوار کہا جاتا تھا۔

19.5 آدی شنکراچاریہ (820-788 عیسوی)

شنکراچاریہ مالابار، کیرالہ سے تعلق رکھنے والے نمبودری برہمن تھے۔ وہ بنیادی طور پر شیو کے بھکت تھے۔ انہوں نے قدیم ہندوستانی صحیفوں بالخصوص اپنشدوں کی از سر نو تشریح کے ذریعے ایک ٹھوس فلسفیانہ بنیاد فراہم کر کے ہندو احیا کی تحریک کو بالکل نیا موڑ دیا۔ انہوں نے ویدک مذہبی اور روحانی فکر کے پورے سلسلے کی ایک شاندار تشریح کرتے ہوئے ادویت (Advaita) کے فلسفے یعنی 'ویدانت کی توحید' کی وکالت کی۔ انہوں نے بچپن ہی میں اپنے والد کو کھو دیا تھا۔ نوعمری میں وہ سنیاسی بن گئے اور حقیقی علم اور حکمت کی تلاش میں نکل گئے۔ وہ پیدائشی طور پر ایک اولوالعزم فرد تھے اور اپنے رہن سہن اور سماجی حیثیت کے لحاظ سے کٹر مذہبی تھے۔ انہوں نے کاشی میں مذہبی صحیفوں اور فلسفیانہ خیالات کی تعلیم حاصل کی۔ ان کے ایک استاد گووندا یوگی بتائے جاتے ہیں۔

شنکراچاریہ نے ہندومت کے احیا کے لیے ایک بھرپور مہم شروع کی۔ بدھ مذہب اور جین مذہب کا مقابلہ کرنے کے لیے، انہوں نے بدھ سنگھ کی طرز پر، ہندو سنیاسیوں کو ان کی پرہیزگاری کے لحاظ سے نئے سرے سے منظم کیا اور ہندو مذہب کی تبلیغ اور قبولیت کے لیے ایک زبردست مہم چلائی۔ انہوں نے ہندوستان کی ثقافتی وحدت کو اجاگر کرنے کے لیے ملک کے مختلف حصوں میں متعدد مٹھوں کی بنیاد رکھی۔ مشرق میں جگناتھ پوری، جنوب میں سری نگری، مغرب میں دوارکا اور شمال میں بدری ناتھ میں مٹھ قائم کیے گئے۔

شنکراچاریہ کا انتقال 32 سال کی عمر میں کیدار ناتھ میں ہوا لیکن، اس سے پہلے ان کا نام پورے ملک میں بہت مشہور ہو گیا تھا۔ ان کی جانب سے شروع کی گئی بھرپور اور منظم مہم کے نتیجے میں، ہندو مذہب کو چھوڑنے والے لاکھوں لوگ واپس ہندو مذہب کی طرف لوٹ گئے۔ شنکراچاریہ کو بجا طور پر جدید ہندو مذہب کا نجات دہندہ کہا جاتا ہے اور وہ بھکتی تحریک کے پیشرو بھی تھے۔ تاہم انہوں نے نجات کے حصول کے

لیے ایک ذریعے کے طور پر گیان یعنی حقیقی علم پر زور دیا۔ یہ مثالی طور پر تو مناسب تھا لیکن عام آدمی کے لیے اس پر عمل کرنا مشکل تھا۔ لہذا، ویدانت فلسفے کے بعد آنے والے مبلغین نے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور ہندو مذہب کو ایک متحرک قوت بنانے کے لیے بھکتی مارگ یا بھکتی کے راستے کی وکالت کی۔

19.6 اصلاحی تحریک کے طور پر بھکتی کے ابھرنے کے ذمہ دار عوامل

19.6.1 ہندو مذہب میں ذات پات کے نظام کی سختی

بھکتی نے عہد وسطیٰ کے دور میں اس وقت ایک اصلاحی تحریک کی شکل اختیار کی جب متعدد سادھو اور سنتوں نے ملک کے مختلف حصوں میں لوگوں کے درمیان سماجی اور مذہبی اصلاحات کا کام شروع کیا۔ بھکتی تحریک کے تیزی سے پھیلنے کی مختلف وجوہات ہیں۔ ہندو مذہب اور سماجی ڈھانچہ کا زوال اس کی بنیادی وجوہات تھیں۔ شنکراچاریہ اور دیگر کی کوششوں سے بدھ مذہب اور جین مذہب کو دھکہ پہنچا اور برہمنی عقیدے کی بالادستی بحال ہوئی۔ اس کا مطلب ہندوؤں کی پورے مذہبی نظم پر برہمن پجاری طبقے کا غلبہ تھا۔ چونکہ مذہب نے ان کی زندگی کے تمام شعبوں میں ایک اہم کردار ادا کیا، سماجی، ثقافتی، سیاسی اور یہاں تک کہ معاشی زندگی میں بھی مکمل طور پر برہمنوں کی بالادستی تھی۔ راجپوت دور میں ہندو سماج پر ان کی گرفت مزید مضبوط ہوئی۔ بہت سے راجپوت سرداروں کو برہمن پجاریوں نے شتریہ کا درجہ دیا تھا۔ نویں اور دسویں صدی میں، برہمن بڑے پیمانے پر ذات پات میں تقسیم کرنے والوں کے طور پر آگے آئے جب انہوں نے ہندوستان میں آنے والے غیر ملکی سرداروں کو اعلیٰ ذات کا درجہ دینا شروع کیا۔ اس سے سماجی و ثقافتی رہنماؤں کے طور پر لوگوں پر ان کی گرفت مزید مضبوط ہوئی۔ بعدازاں، ترکوں کے ہاتھوں راجپوتوں کی شکست اور بارہویں اور تیرہویں صدی میں ان کی طاقت کے زوال نے برہمنوں کو ہندو مذہب کا واحد نجات دہندہ بنا دیا۔ انہوں نے اس سلسلے میں ہندو مذہب کی بڑی خدمت کی، لیکن ساتھ ہی ساتھ دیگر دو اعلیٰ ذاتوں شتریہ اور ویشیوں کے ساتھ کافی برا سلوک کیا۔ البیرونی بتاتے ہیں کہ گیارہویں صدی کے شروع میں ویشیوں کے ساتھ شودروں جیسا سلوک کیا جاتا تھا۔ آرسی دت کے مطابق جب تک ہندوستان ایک آزاد ملک تھا شتریوں نے اپنا قبضہ برقرار رکھا، لیکن بارہویں صدی کے بعد وہ اپنی شان اور آزادی کھو بیٹھے۔ اس من گھڑت تصور کو بھی پھیلایا گیا کہ ویشیوں کی طرح، شتریوں کا بھی ایک ذات کے طور پر وجود ختم ہو گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ برہمنوں نے جان بوجھ کر ہندو عوام کو خوفزدہ کرنے کے لیے اس طرح کی خرافات پھیلائیں تا کہ وہ ان سے جتنی زیادہ ہو سکے اپنی خدمت کروا سکیں۔ ذات پات کے نظام کو مزید سخت بنا دیا گیا اور انتقامی انداز میں ذات پات کی تفریق پر عمل ہونے لگا۔ شودر سماج کا ایک بڑا حصہ تھے۔ البیرونی نے شودروں کے نیچے آٹھ نچلی ذاتوں کا ذکر کیا ہے جو کہ یہ تھیں: جولاہا، چمار، کرتب باز، ٹوکری بننے والا، ملاح، مچھیرا، شکاری اور لوہار۔ وہ تمام لوگ جو مندرجہ بالا ذاتوں میں سے کسی میں بھی نہیں آتے تھے ان کو صرف ذات باہر یا چنڈال قرار دے دیا گیا۔ اونچی ذات کے لوگوں نے نچلی ذاتوں کا استحصال کیا اور ان پر طرح طرح کی توہین کا انبار لگا دیا۔ یہاں تک کہ ریاستوں نے بھی ذات پات کی بنیاد پر اپنی رعایا کے درمیان امتیاز برتا۔ البیرونی نے بتایا کہ ایک برہمن کی سزا جس نے کسی دوسری ذات کے آدمی کو قتل کیا ہو، کفارہ دینا ہے، اور یہ کفارہ روزہ، عبادت اور صدقہ دینے پر مشتمل تھا۔ اگر اس نے کسی اور برہمن کو قتل کیا تو اس کی سزا ملک بدری اور جائیداد کی ضبطی تھی۔ کسی بھی صورت میں برہمن

مجرم کو موت کی سزا نہیں دی جاسکتی تھی جو کہ چوری جیسے چھوٹے معاملات میں بھی شودروں اور چنڈالوں پر عام طور پر دی جاتی تھی۔ جرائم کی سزا کی طرح محصول کے معاملات میں بھی برہمنوں کو مراعات حاصل تھیں۔ وہ تمام محصول ادا کرنے سے آزاد تھے۔

مذکورہ بالا مراعات کے بدلے برہمن پجاریوں کی جانب سے دی جانے والی خدمات زیادہ تر منفی نوعیت کی تھیں۔ البیرونی کو جس نے ہندو مذہبی فلسفے اور اداروں کا بغور مطالعہ کیا تھا، ہندو تثلیث کے تین دیوتاؤں اور اس کے پیچھے موجود اپنشدوں کے حقیقی توحیدی فلسفے کو سمجھنے میں کوئی دشواری محسوس نہیں ہوئی۔ البتہ البیرونی یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ 'یہ عظیم عقیدہ' چند 'تعلیم یافتہ لوگوں کی خصوصی ملکیت' بن کر رہ گیا ہے اور 'عام عوام' کو بتوں اور مندروں، بے معنی رسومات اور غیر ضروری پابندیوں میں مشغول کردیا گیا ہے۔ مایوسی کے عالم میں انہوں نے سوال اٹھایا کہ ''ایسی سرزمین پر لوگوں کو زہر کیوں پلایا جارہا ہے جہاں ایک قدیم اور حیات بخش مذہب کا امرت دھارا بہتا ہے؟'' کسی وقت سادہ اور راست گو رہنے والے ویدک مذہب نے دقیانوسی عقائد، پیچیدہ رواج و رسومات، توہمات اور دھوکہ دہی کو جگہ دے دی جس کی بنیادی وجہ شدید غفلت اور برہمن پجاریوں کی خود غرضی تھی۔ انہوں نے زوال پذیر مذہبی رسومات کا خاموشی سے مطالعہ کیا اور جان بوجھ کر پرانے مذہبی صحیفوں کی تحریف یا غلط تشریح کی جس کا مقصد عقیدت مندوں کو اس سے دور کرنا اور غریب اور معصوم لوگوں کو بے وقوف بنانا تھا۔ ایک مشاہدے کے مطابق، پندرہویں صدی کے آغاز تک ''بے معنی رسومات، توہمات، پجاریوں کی خود غرضی اور لوگوں کی بے حسی کے جھاڑ جھنکاڑ نے مذہب کی بہار کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ ظاہر داری نے حقیقت کی جگہ لے لی تھی، اور ہندو مذہب کا اعلیٰ روحانی کردار فرقوں کے ظاہری اسباب کے نیچے دب گیا تھا۔' ہندوستانی معاشرہ مجموعی طور پر بیمار تھا۔ سماجی ماحول اتنا بیمار تھا کہ اس نے سب سے ذہین اور اچھے گھر والوں کو بھی افسردہ اور مایوس کردیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے پورا سماج خود غرض اور جنونی پجاریوں کے ہاتھوں اغوا ہو چکا تھا۔ اس طرح کی افسوسناک حالت زیادہ دیر تک غیر چیلنج شدہ نہیں رہ سکتی۔ آہستہ آہستہ، نچلی ذاتوں میں اعلیٰ ذاتوں کے استحصالی رجحانات کے خلاف عدم اطمینان کے آثار دکھائی دینے لگے۔ اس نے سماج کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے تعلیم یافتہ افراد، مذہبی سادھوؤں اور ناقدین کی آنکھیں کھول دیں اور سب میدان میں کود پڑے تاکہ مزید تاخیر سے قبل اس سڑاند کو ختم کیا جاسکے۔ ان میں سے زیادہ تر یا تو بغیر کسی دنیاوی لالچ کے سنیاسی تھے یا پھر انہیں سماجی و مذہبی اصلاحات لانے کے لیے کچھ عرصہ کے لیے راہب بننا پڑا تھا۔ انہوں نے ہندو مذہب کے نام پر پھیلے ہوئے جھوٹ کے خلاف احتجاج کی آواز بلند کی، ذات پات کے نظام کی مذمت کی، اور برہمن پجاریوں کو موردِ الزام ٹھہرایا جو بنیادی طور پر اس تمام گڑبڑ کے ذمہ دار تھے۔ جیسا کہ تمام سماجی اور مذہبی برائیوں کی جڑیں، مذہبی نظام میں پیوست ہوتی ہیں، اس لیے اصلاحات کا کام بھی مذہبی سطح پر ہی موثر طریقے سے کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ ان تمام دانشمند افراد، جو ہندو سماج کی بحالی کے خواہشمند تھے، کو اپنے مشن کی کامیابی کے لیے مذہبی مبلغین اور سنیاسیوں کا روپ اپنانا پڑا۔ انہوں نے سرعام سماج میں اصلاحات کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی اپنے اعلیٰ اخلاقی کردار کے ذریعہ ایک مثال قائم کی تاکہ ان کے پیروکاران کی تقلید کرسکیں۔ ان سنیاسی اور علمی سنتوں نے اپنی زندگی اپنے ساتھ والوں کی خدمت کے لیے وقف کردی، اور ہر ایک کی اپنے مشن میں کامیابی براہ راست اس احترام کے تناسب سے تھی جو ان کے پیروکار بطور گروان کے تئیں رکھتے تھے۔ ان کی انتھک کوششوں سے، بھکتی فرقہ ایک زبردست تحریک میں تبدیل ہوگیا جس نے پورے ملک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔

19.6.2 اسلام کا اثر

دوسرا بڑا عنصر جس نے بھکتی تحریک کو مہمیز دی وہ اسلام کی آمد اور ہندوستان میں ترک حکومت کا قیام تھا۔ اسلام کے مساوات کے عقیدہ نے ذات پات کے شکار ہندوازم کے لیے ایک سنگین چیلنج کھڑا کر دیا۔ اسلام اپنے مذہبی فلسفے اور سماجی تنظیم کے حوالے سے اپنے بنیادی اصولوں کی وجہ سے پہلے ہی دنیا بھر میں شہرت حاصل کر چکا تھا۔ ایک خدا کا تصور، بت پرستی کی مخالفت اور سب کی برابری کی بنا پر مظلوم اور پسے ہوئے ہندو عوام کو اس کی جانب راغب ہونا ہی تھا۔ لہذا، بھکتی مصلحین کے مقاصد میں سے ایک یہ تھا کہ وہ خود اپنے گھر کو درست کر کے لوگوں کو اسلام قبول کرنے سے روکیں۔ اس طرح، انہوں نے بھکتی تحریک کو اسلام کی بڑھتی ہوئی لہر کے خلاف ایک دفاعی ہتھیار کے طور پر استعمال کیا۔

19.7 اصل حقیقت سے فرار کے طور پر بھکتی

کچھ ناقدین کے مطابق، بھکتی تحریک زندگی کی تلخ حقیقتوں سے فرار کے رویے پر مبنی تھی۔ ان کا خیال ہے کہ نام نہاد مسلم حکمرانی کے قیام کے ساتھ ہی ہندو نہ صرف اپنی سیاسی آزادی کھو بیٹھے بلکہ متعدد سیاسی، مذہبی اور معاشی بے اختیاری کا شکار بھی ہوئے۔ انہیں ذمی قرار دیا گیا اور ریاست کی مکمل شہریت سے محروم کر دیا گیا۔ چونکہ وہ عہد وسطیٰ کے سلطانوں کی گھٹن اور عدم برداشت پر مبنی اجنبی حکمرانی کے تحت مادی، سیاسی اور ثقافتی ترقی کو آگے نہیں بڑھا سکتے تھے، اس لیے انہوں نے بھکتی میں پناہ تلاش کی۔ 'جس چیز کا علاج نہیں کیا جا سکتا اسے برداشت کرنا چاہیے' اصول پر عمل کرتے ہوئے انہیں ان کے پیشواؤں نے مشورہ دیا کہ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ اس پر قانع ہو جائیں۔ تاہم ناقدین کے ایسے دلائل ٹھوس تاریخی اعداد و شمار پر مبنی نہیں ہیں۔ وہ عہد وسطیٰ کی تاریخی سماجی حقیقت کے خلاف ہیں۔

19.8 بھکتی مصلحین کی اہم تعلیمات

بھکتی مصلحین میں سے ہر ایک نے اپنے تبلیغی (مشنری) کام کو اپنے اصلی یا انفرادی انداز میں جاری رکھا۔ اکثر ان کا میدانِ عمل یا عقیدت مندوں کا حلقہ بھی ملک کے مخصوص علاقوں یا کچھ حصوں تک محدود رہتا۔ لہذا، یہ امر کوئی تعجب خیز نہیں کہ بھکتی مصلحین کی تعلیمات میں بعض اوقات سماجی و مذہبی برائیوں کے خاتمے کے لیے اختیار کردہ مواد اور طریقہ کار میں فرق نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود ان کی عمومی تعلیمات کی کوئی جامع فہرست تیار کرنا مشکل نہیں ہے۔ وہ قادر مطلق، ہر وقت اور ہر جگہ موجود اور ہر چیز کا علم رکھنے والے واحد خدا پر اٹل یقین رکھتے تھے۔ انہوں نے نجات کے حصول کے لیے خدا کی خالص عبادت کی۔ تمام بھکتی مصلحین نے ایسے 'گرو' یا روحانی رہنما کی اہمیت پر زور دیا جو عقیدت مندوں کو ان کے اہداف کے حصول میں مدد دے سکے۔ صرف ایک سچا استاد جو ذاتی برائیوں اور دنیاوی لالچوں سے پرے ہو اور جس نے بھکتی مارگ کی راہ میں آسمانی علم (علم الٰہی) کا مزہ چکھا ہو وہی اپنے پیروکاروں کو روحانی تعلیم دے سکتا ہے اور انہیں اندھیرے سے روشنی کی طرف لے جا سکتا ہے۔ چنانچہ گوشت و خون سے بنے ایک جاندار گرو کو اختیار کرنا، نجات کے حصول کا ایک ناگزیر ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ بہت سے ممتاز مبلغین نے خود گرو کا کردار اختیار کیا اور ان کے عقیدت مندوں نے انہیں اپنا گرو تسلیم کیا۔ اخلاقی تعلیم

بھکتی مصلحین کی تعلیمات کا ایک لازمی حصہ تھی۔ جو لوگ گرو سے بپتسمہ لینا چاہتے تھے ان کے لیے اعلیٰ اخلاقی کردار اور نیک زندگی گزارنا شرط تھی۔ خدا کے آگے مکمل خود سپردگی یا خدا کے لیے خود کو مکمل طور پر وقف کر دینا روحانی علم اور خدائی نعمتوں کے حصول کے لیے ناگزیر سمجھا جاتا تھا۔ ہر عقیدت مند سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنی انا، ذاتی خواہشات، نفسانی لذتوں اور دیگر دنیاوی لالچوں کو دبا کر فکر، قول اور عمل کے لحاظ سے خود کو خدا کی عبادت کے لیے وقف کر دے۔ بھکتی مصلحین تمام انسانوں کی برابری پر یقین رکھتے تھے اور انہوں نے لوگوں میں دیگر انسانوں کو آگے بڑھانے کے جذبات کو فروغ دینے کی وکالت کی۔ مثلاً تمام انسان ایک ہی خدا کی اولاد ہیں، اس لیے تمام انسانوں کو کسی دوسرے شخص کی ذات، رنگ اور نسل سے قطع نظر ایک دوسرے سے محبت کرنی چاہیے۔ بنی نوع انسان سے محبت خدا سے حقیقی عقیدت تھی۔

انقلابی مصلح ہونے کے ناطے، زیادہ تر بھکتی سنتوں نے جڑ پکڑی ہوئی سماجی اور مذہبی برائیوں کے خلاف بھرپور مہم چلائی۔ انہوں نے برہمن پجاریوں کی بالادستی کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جو اپنے آپ کو تمام مذہبی علم اور اداروں کے ٹھیکیدار سمجھتے تھے اور جو بنیادی طور پر ہندو سماج کے زوال اور انحطاط کے ذمہ دار تھے۔ کچھ بھکتی سنتوں نے ہندو صحیفوں اور سنسکرت زبان کے تقدس کو چیلنج کیا جو عوام کے لیے ناقابل فہم ہو چکی تھی۔ ان سب نے لوگوں کی مقامی بولیوں میں پرچار کیا جسے وہ آسانی سے سمجھ سکتے تھے۔ اس سے ملک کے طول و عرض میں بھکتی تحریک کے تیزی سے پھیلنے میں مدد ملی۔ بھکتی مصلحین نے بت پرستی، توہم پرستانہ عقائد اور رسومات اور یگنوں کے انعقاد اور مقدس مقامات کی زیارت سمیت بے معنی رسومات کی مذمت کی۔ انہوں نے خود غرض اور مکار پجاریوں جانب سے غریب اور ناواقف عوام کے ساتھ کی جانے والی تانترک رسومات اور دھوکہ دہی پر ایک زوردار حملہ کیا۔ بھکتی مصلحین نے نہ تو مابعد الطبیعاتی تصورات پر اختلاف کیا اور نہ ہی فلسفیانہ معاملات کی گہرائی کے چکر میں جانے کی کوشش کی۔ اس کے بجائے، وہ اپنے خیالات اور نقطہ نظر میں بنیادی طور پر چندہ اور وسیع النظر تھے۔ وہ تمام انسانوں کی برابری پر یقین رکھتے تھے اور 'اچھوتوں' کے تئیں اپنائیت کے جذبات کو فروغ دیتے تھے۔ بھکتی مصلحین میں سے بہت سے خود نچلی ذات سے تعلق رکھتے تھے اور ان کی تعلیمات اونچی ذات اور نچلے، امیر اور غریب، تعلیم یافتہ اور ان پڑھ دونوں کے لیے تھیں۔ ان کے پیغام میں ایک مقبول اپیل تھی۔

19.9 ممتاز بھکتی مصلحین

19.9.1 رامانج (1017-1137)

شنکراچاریہ کے بعد بھکتی تحریک کے عظیم شارح رامانج چاریہ تھے۔ ان کا تعلق جدید آندھرا پردیش سے تھا۔ چند دانشوروں نے انہیں بھکتی تحریک کے بانیوں میں سے ایک کے طور پر پہلے درجہ پر رکھا ہے کیونکہ صحیح کہا جائے تو وہی تھے جنہوں نے حصول نجات کے اصل ذریعہ کے طور پر بھکتی کو گیان پر ترجیح دی۔ عقیدہ کے لحاظ سے وہ ایک وشنو تھے۔ انہوں نے ویدانت کی تربیت اپنے استاد کانچی پورم کے پرکاش یادو سے حاصل کی جو شنکراچاریہ مکتبہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ رامانج نے شنکر کے نظریہ کے کچھ فلسفیانہ پہلوؤں جیسے کائنات محض ایک

نظروں کا دھوکا (مایا) ہے اور مطلق توحید وغیرہ سے اختلاف کیا۔ رامانج نے ایک ذاتی خدا م جو اعلیٰ ترین حقیقت کی تشکیل کرتا ہے، کی عبادت پر زیادہ زور دے کر ویدانت کے فلسفے کی نئی تعریف کی۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ خدا کائنات کا سب سے بڑا خالق، فنا کرنے والا اور محافظ ہے اور روح اگرچہ اسی ربانی قوت کا ایک حصہ ہے، پھر بھی اس سے الگ ہے۔ رامانج نے کہا کہ ویدانت کے توحیدی فلسفے کے اندر شنویت موجود ہے۔ ایک عظیم اسکالر اور بڑے پیمانے پر سفر کرنے والے رامانج نے بھکتی فرقے پر متعدد کتابیں اور مقالے تصنیف کیں، جن میں بھگوت گیتا بھی شامل ہے۔ شنکر اچاریہ کے برعکس، رامانج اپنے سماجی نقطہ نظر میں بہت آزاد خیال تھے اور انہوں نے اپنی تعلیمات میں ذات پات کی رکاوٹوں کو توڑ دیا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں بھکتی مصلح کے طور پر قومی شہرت حاصل کی اور 120 سال کی عمر میں اپنی موت سے قبل اپنے ذاتی روابط کی بنیاد پر ان کے 10,000 سے زیادہ عقیدت مند موجود تھے۔

19.9.2 نمبکار

جنوبی ہند سے تعلق رکھنے والے رامانج کے ایک نوجوان ہمعصر، نمبکار نے متھرا کے قریب بَرجا میں اپنا آشرم قائم کیا، اور کرشن اور رادھا کی شکل اختیار کر کے خدا کے خود سپردگی کا پرچار کیا۔ ان کا فرقہ وادی گنگا میں عام لوگوں میں بہت مقبول ثابت ہوا۔

19.9.3 مادھواچاریہ

مادھواچاریہ، تیرہویں صدی میں پروان چڑھنے والے وشنومت کے ماننے والے تھے جن کا تعلق جنوبی ہندوستان سے تھا۔ انہوں نے وشنومت سینتیس کتابیں تصنیف کیں، جن میں بالخصوص شنکر اچاریہ کی جانب سے توحیدی فلسفے سے ہٹ کر شنویت کے فلسفہ کو اپنانے پر بحث کی گئی۔ مادھواچاریہ کے مطابق، کائنات کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ سوا تنتر یعنی 'آزاد' اور اسوا تنتر معنی 'منحصر'۔ سوا تنتر میں قادر مطلق، ہر وقت اور ہر جگہ موجود اور ہر چیز کا علم رکھنے والے واحد خدا شامل ہے۔ جبکہ اسوا تنتر، مادے اور روحوں پر مشتمل ہے۔ تاہم، فلسفیانہ قیاس آرائیوں کے یہ گنجلک معاملات ان کے ماننے والوں کی فکر کا محور نہیں تھے جو ان کی سرپرستی میں خدا کی گہری عبادت کے ذریعے نجات حاصل کرنے کی خواہش رکھتے تھے۔

19.9.4 رامانند

بھکتی تحریک کے پہلے ممتاز مبلغ، جن کی پیدائش اور پرورش شمالی ہند میں ہوئی، رامانند تھے۔ ان کی آمد کے ساتھ ہی بھکتی تحریک جنوب سے وادی گنگا میں منتقل ہو گئی۔ پریاگ کے کنیاکبج برہمن والدین کی اولاد، رامانند نے بنارس میں ہندو مذہبی فلسفے میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور رامانج مکتب فکر کے مبلغ بن گئے۔ اس کے فوراً بعد، انہوں نے رام اور سیتا کی عقیدت مندی کے نظریے کی بنیاد پر ایک آزاد فرقہ قائم کیا۔ انہوں نے ہندو مذہب کے واحد ٹھیکیدار کی حیثیت سے، برہمنوں کی بالادستی کی سختی سے مخالفت کی اور شودروں اور نچلی ذاتوں میں سے اپنے عقیدت مند بنائے حالانکہ وہ ذات پات کے تعصبات کو یکسر ختم نہیں کر سکے۔ یہ رامانند ہی تھے جنہوں نے درج ذیل مشہور قول تصنیف کیا:

''ذات پات پوچھے ناہی کوئی، ہری کو بھجے سو ہری کا ہووے''

ترجمہ۔ کوئی آدمی کسی سے اس کی ذات نہ پوچھے۔ اگر وہ خدا کی پرستش کرتا ہے تو وہ خدا کی ملکیت ہے اور خدا اس کے ساتھ ایک ہو جاتا ہے۔

راما نند نے بھکتی تحریک کے پرچار کے لیے ہندی کو اپنایا، جو اس وقت وادیٔ گنگا میں عام لوگوں کے بولی جانے والی زبان تھی، اور اس طرح اس زبان کے فروغ کے لیے ایک عظیم الشان خدمت انجام دی۔ وہ پہلے بھکتی مصلح تھا جنہوں نے خواتین کے لیے خدا کی عبادت کے دروازے کھولے اور خواتین مرید بنائے۔ ان کے مرنے کے بعد اس کے بارہ مرید مشہور ہوئے اور جنہوں نے ان کا پیغام گھر گھر پہنچایا۔ ان میں، دیگر کے علاوہ، دھنا (ایک جاٹ)، سینا (ایک حجام)، رائے داس (ایک موچی) اور پدماوتی اور سورساری نامی دو خواتین شامل تھیں۔

19.9.5 کبیر (1440-1510 عیسوی)

کبیر راما نند کے تمام مریدوں میں سب سے زیادہ مقبول تھے۔ وہ ہندوستان میں بھکتی تحریک کی تاریخ میں ایک قابل فخر مقام رکھتے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ وہ ایک ہندو بیوہ کے بیٹے تھے جنہوں نے شرمندگی سے بچنے کے لیے انہیں پیدائش کے بعد بنارس میں پانی کے حوض کے پاس چھوڑ دیا۔ انہیں نیرو نامی ایک مسلمان جلاہے نے اٹھا کر اپنے بیٹے کی طرح پالا۔ کبیر نے شادی کی اور اپنے سرپرست باپ کے پیشے کو اپنایا لیکن ایک کم گو اور سنجیدہ مزاج آدمی ہونے کی وجہ سے انہوں نے اپنا زیادہ تر وقت تنہائی اور مراقبہ میں گزارا۔ راما نند نے انہیں بھکتی فرقے میں لانے کی کوشش شروع کی۔

بھکتی تحریک کے دائرے میں کبیر کا داخلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان صلح کل کروانے میں سب سے زیادہ کارآمد ثابت ہوا۔ کبیر دونوں مذہبی برادریوں کے ساتھ اپنی مکمل وابستگی کے ساتھ، دونوں میں سے کسی ایک کے خلاف مذہبی تعصب سے پاک تھے۔ اس نے بھکتی مصلحین کے ساتھ ساتھ صوفی سنتوں کے ساتھ بھی کندھا ملایا۔ اگرچہ وہ اپنے نقطہ نظر میں شدید مذہبی تھے لیکن وہ ہندو مذہب یا اسلام ،ان میں سے کسی ایک کے پیروکار نہیں تھے۔ وہ بالکل آزاد خیال فرد تھے اور انہوں نے دونوں مذاہب کی برائیوں پر برملا کھلی تنقید کی۔ کبیر نے ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل مخلوط اجتماعات سے خطاب کیا اور دونوں فرقوں سے اپنے مرید بنائے۔ انہوں نے برہمنوں اور ملاؤں کی یکساں طور پر ان کے مذہبی احکامات کے واحد ٹھیکیدار ہونے کی مذمت کی اور ان کو ان کے راسخ العقیدہ اور استحصالی رویہ کے لیے آڑے ہاتھوں لیا۔ انہوں نے ویدوں کے ساتھ ساتھ قرآن کو نازل شدہ صحیفے ماننے سے انکار کر دیا۔

کبیر خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتے تھے، قطع نظر اس کے کہ اسے کس ناموں سے پکارا جاتا ہے۔ کبیر نے ہندوؤں میں موجود بت پرستی، ذات پات کے نظام اور اچھوت پرستی کی شدید مخالفت کی اور ساتھ ہی مسلمانوں کی دقیانوسی اور بے معنی رسومات کی مذمت کی۔ انہوں نے پاکیزگی قلب اور خلوصِ خدا کے بغیر مسجد میں پانچ نمازیں ادا کرنے کو فضول قرار دیا۔ کبیر نے مذہبی رواداری پر زور دیا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کو بھائی چارے کا سبق سکھایا۔ وہ ان نمایاں بھکتی اصلاح کاروں میں سے ایک تھے جنہوں نے زندگی کے تمام شعبوں میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے کی پوری کوشش کی۔ کبیر نے ستی اور بچپن کی شادی کے رواج کے خلاف آواز اٹھائی، یہ دو برائیاں مکمل طور پر سماجی تھیں۔ کبیر دنیا کو ترک کرنے اور حقیقی علم یا نجات کی تلاش میں جنگلوں یا پہاڑیوں پر جانے کے حق میں نہیں تھے۔ اس کے

بجائے، انہوں نے اپنے پیروکاروں کو نصیحت کی کہ وہ محنت کر کے اپنی روزی کمائیں اور ایک دیانتدار، شریف اور وقف زندگی گزارتے ہوئے گھر کے تمام فرائض انجام دیں۔ کبیر کی تعلیمات وقت کے سماجی اور مذہبی تقاضوں سے کامل ہم آہنگ تھیں۔ انہوں نے خود کو ایک مربوط ہندوستانی سماج کے تصور سے پوری طرح ہم آہنگ کیا اور لاکھوں لوگوں کے دل جیت لیے۔ ان کے دوہا اور مشہور انقلابی اقوال بڑے پیمانے پر مشہور ہیں اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستانی ثقافتی ورثے کا ایک اٹوٹ حصہ بن چکے ہیں۔ ان کی موت کے بعد، ان کے ہندو اور مسلمان دونوں پیروکار، کبیر پنتھی کے نام سے مشہور ہوئے۔ کبیر پنتھ کے عقیدت مند اور پجاری کا عہدہ آج تک اپنی الگ شناخت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

19.9.6 گرونانک (1469-1538 عیسوی)

گرونانکِ کبیر کے ہمعصر نوجوان تھے۔ انہوں نے پنجاب میں سماجی اور مذہبی اصلاحات کا بیڑا اٹھایا اور قرونِ وسطیٰ کے ہندوستان کے تمام بھکتی اصلاح کاروں میں سب سے زیادہ مقبول ثابت ہوئے۔ ان کی تعلیمات کبیر کی تعلیمات سے ملتی جلتی تھیں حالانکہ نانک اپنے نقطہ نظر کے لحاظ سے کبیر سے زیادہ انقلابی تھے، اور طویل مدتی لحاظ سے ان کی کوششیں تمام بھکتی مصلحین کی بہ نسبت بہت زیادہ نتیجہ خیز ثابت ہوئیں۔ نانک 1469 میں تلونڈی، جدید ننکانہ صاحب میں (موجودہ پاکستان میں) پیدا ہوئے۔ ان کے والدین کالورام اور ترپتا دیوی کا تعلق مہتا کھتری ذات سے تھا۔ نانک تمام دنیاوی لالچوں اور اپنی عمر کی عام برائیوں سے پاک، ایک غور و فکر کرنے والے انسان کے طور پر پلے بڑھے۔ ان کی شادی سُلا کھانی سے ہوئی اور ان کے دو بیٹے تھے۔ انہیں عرفان 1594ء میں اس وقت حاصل ہوا جب وہ سلطان پور لودھی میں سرکاری گودام میں ملازم تھے۔ نانک ایک سنیاسی بن گئے، گو کہ یہ عارضی طور تھا، اور انہوں نے شمال مغربی ہندوستان میں بھکتی تحریک شروع کی۔ سفر کے پانچ دوروں میں، جسے اداسی کہا جاتا ہے، اور جو تیس سال سے زائد عرصے پر محیط ہے، گرونانک نے سیلون اور مکہ اور مدینہ کی مسلمانوں کی زیارت گاہوں کے علاوہ ملک کے ہر کونے تک ربانی عبادت کا پیغام پہنچایا۔ ان کی تعلیمات بھکتی تحریک کے تمام مذکورہ بالا اصولوں کے مطابق تھیں، اس میں کبیر کی طرح صرف اضافہ یہ تھا کہ انہوں نے بھی اپنے پیروؤں کے لیے گھریلو زندگی گزارنے کی وکالت کی۔ اس انقلابی تصور کو انہوں نے اس وقت منطقی انجام تک پہنچایا جب انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ خدا کے بندوں کے لیے نجات کے حصول کے راستے پر، ایک ایماندار روٹی کمانے والے اور گھر والے کی زندگی اسی طرح گزارنا ممکن ہے جس طرح کنول کا پھول گدلے پانی کے درمیان بے داغ کردار کے ساتھ زندہ رہتا ہے۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں نانک نے راوی کے کنارے کرتار پور میں (ہندو مٹھوں یا صوفی سنتوں کی خانقاہوں کی طرح) اپنا ڈیرہ قائم کیا اور اپنے خاندان کو اپنے ساتھ دوبارہ شامل ہونے کی اجازت دی۔ انہوں نے ایک آئیڈیل گھریلو فرد کی مثال قائم کرنے کے لیے ہل چلانا شروع کیا۔ گرونانک نے 'عالمگیر بھائی چارہ' کو اپنا نعرہ بنایا، جو کہ صوفی سنتوں کا ایک تصور ہے، اور ہندو مسلم اتحاد کی حمایت کی۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں میں سے ذات پات کے امتیاز اور ذات پات کی تفریق کی برائیوں کو ختم کرنے کے لیے ایک عملی قدم کے طور پر اپنے ڈیرہ میں اجتماعی بعام (لنگر) متعارف کروایا۔ گرونانک کے مشن کی ایک عظیم کامیابی گرو کے ادارہ کا قیام تھا جو انہوں نے اپنی تعلیمات کے مسلسل پرچار کے لیے قائم کیا۔ اپنی زندگی کے دوران، انہوں نے روحانی قابلیت کی بنیاد پر، اپنے بیٹوں کے مقابلے اپنے ایک مرید 'بھائی لہنا' (انگد) کو

فوقیت دی اور انہیں اپنا جانشین مقرر کیا۔ 1538ء سے 1708ء عیسوی تک نو گروؤں نے گرو نانک کے روحانی تخت کو سجایا۔ اس انقلابی قدم نے سکھ مت کو ایک الگ مذہب کے طور پر جنم دیا۔

19.9.7 ولبھ چاریہ

پندرہویں اور سولہویں صدی میں بھکتی تحریک اپنے پورے آب و تاب پر رہی اور اس کی بازگشت سترھویں صدی کے وسط تک سنی گئی۔ دیگر بھکتی مصلحین میں ولبھچاریہ کا تذکرہ ضروری ہے۔ وہ 1479ء میں جنوبی ہندوستان کے ایک تلگو برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے بنارس میں اپنا آشرم قائم کیا اور وادی گنگا کرشنا فرقہ کو پھیلایا۔

19.9.8 میرا بائی (1498-1546)

میرا بائی خواتین میں سے تمام بھکتی مصلحین میں سب سے مشہور تھیں۔ وہ ایک راجپوت شہزادی تھیں۔ ان کی شادی رانا سانگا کے سب سے بڑے بیٹے اور مجوزہ تخت کے وارث، شہزادہ بھوج راج سے 1516ء میں ہوئی۔ بھوج راج اپنے والد کی زندگی ہی میں قبل از وقت انتقال کر گئے اور میرا بائی بیوہ ہو گئیں۔ ان کے غم میں اس وقت مزید اضافہ ہوا جب ان کے والد 1527ء میں خانوا کی تاریخی جنگ میں رانا کی طرف سے لڑتے ہوئے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور اس کے فوری بعد ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ رانا سانگا نے بھی اپنی زندگی کی آخری سانس لی۔ میرا بائی اس تکلیف دہ دنیاوی زندگی کے دباؤ کو برداشت نہ کر سکیں، اور وہ ایک سنیاسی بن گئیں اور انہوں نے بھکتی فرقہ کو اپنایا۔ انہوں نے کرشنا کے نام پر خدا کی عبادت کا پرچار کیا۔ وہ ہندی اور سنسکرت کی عالم تھیں اور پیدائشی طور پر ایک شاعرہ تھیں جن کے بھکتی گیت اور نغمے سولہویں صدی کے ہندوستان کا ایک بھرپور ثقافتی ورثہ ہیں۔ ان کی زندگی کے آخری سال دوار کا میں گزرے۔ بھکتی تحریک میں ان کے داخلے نے تقریباً ہر ہندو گھرانے تک خدا کی عبادت کا پیغام پہنچایا۔

19.9.9 چیتنیہ مہاپربھو (1486-1533)

چیتنیہ مہاپربھو، نادیہ کے ایک برہمن گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ بنگال کے سب سے مشہور بھکتی مصلح تھے۔ پچیس سال کی عمر میں وہ سنیاسی بن گئے اور انہوں کرشنا فرقے کو اپنایا۔ وہ متھرا اور ورنداون میں کئی سالوں تک رہے اور لاکھوں بھکتوں کو اپنی جانب متوجہ کیا۔ وہ ذات پات کے نظام اور بھید بھاؤ کے سخت مخالف تھے۔ وہ محبت کی وہ تصویر بن گئے جس کا دل غریبوں اور پسے ہوئے لوگوں کے دکھوں کو دیکھ کر ترس سے پگھل جاتا ہے۔ وہ بنگال میں اتنے زیادہ مقبول تھے کہ ان کے عقیدت مندوں نے انہیں وشنو یا خود کرشنا کا اوتار قرار دیا۔

19.10 مہاراشٹر کے بھکتی سنت

19.10.1 نام دیو (1270-1350)

مہاراشٹر میں سماجی اور مذہبی انقلاب لانے کا سہرا بھکتی تحریک کو جاتا ہے جس کی قیادت نام دیو، تکارام اور رام داس کر رہے تھے۔

نام دیو جو پیشے کے لحاظ سے ایک درزی تھے، مہاراشٹر کے پہلا ممتاز بھکتی مصلح بن گئے۔انہوں نے ہندو مذہب پر برہمن پجاریوں کی بالادستی کو دلیری سے چیلنج کیا، بت پرستی اور ذات پات کے نظام کی مخالفت کی اور مراٹھوں کے درمیان باہمی محبت اور ہمدردی کا ماحول پیدا کیا۔ نام دیو نے تمام ذاتوں اور طبقات سے اپنے پیرو بنائے۔ان کی تعلیمات، مذکورہ بالا بھکتی تحریک کی تعلیمات کے مطابق تھیں۔انہوں نے ہری کے نام سے خدا کے آگے سپردگی کا پرچار کیا۔

19.10.2 تکارام (1649-1601)

تکارام، سترھویں صدی کے پہلے نصف میں مہاراشٹر میں پروان چڑھے۔ وہ پیدائشی طور پر شودر تھے۔انہوں نے نو عمری میں ہی رہبانیت اختیار کی اور خدا ترسی کی زندگی گزاری اور لوگوں کی خدمت کی۔انہوں نے ذات پات کے ڈھانچہ کو شدید دھکا پہنچایا اور مہاراشٹر میں ایک مساویانہ سماج کی تعمیر میں لوگوں کی مدد کی۔ تکارام نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے بھی کام کیا اور مراٹھا حکمران شیواجی سے داد و تحسین حاصل کی۔

19.10.3 سوامی رام داس (1681-1608)

یہ شیواجی کے ایک معزز استاد تھے، جنہوں نے سترھویں صدی میں مرہٹوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کو اخلاقی اور روحانی پس منظر فراہم کیا۔ شیواجی اور ان کی ماں جیجا بائی دونوں ہی پرمارتھ طبقہ سے تعلق رکھنے والے رام داس کے مرید تھے اور جن زندگی کے عمومی فلسفہ کا ذکر ان کی یادگار تصنیف داسابودھا میں ملتا ہے۔

19.11 بھکتی تحریک کا اثر

بھکتی فرقے نے چودھویں صدی کے اختتام پر ایک وسیع پیمانے پر عوامی تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ یہ بنیادی طور پر ایک مقامی تحریک تھی جس میں ہندوؤں کے تمام طبقات اور ذاتیں شامل تھیں۔اس کی بنیادیں یا مقبولیت اسلام کی مرہون منت نہیں تھی حالانکہ یہ کسی حد تک صوفیوں کے تصوف کے فلسفے سے متاثر تھی۔ بھکتی تحریک نے اپنے معلنہ مقاصد کو کافی حد تک حاصل کر لیا۔اس نے سماج میں برہمن پجاریوں کے غلبہ پر شدید ضرب لگا کر ہندو مت کا احیا کیا۔اس نے عوام کا ان کے مذہبی اور سماجی ثقافتی ورثے پر اعتماد بحال کیا اور بڑے پیمانے پر جاری قبولیت اسلام کی لہر پر پابندی لگائی۔ ذات پات کے قلعے کو توڑا نہیں جا سکا تاہم اس کے برے اثرات کو اونچی ذات اور نچلی ذات کے ہندوؤں کے درمیان ہم آہنگی کے رشتوں اور آزادانہ سماجی میل جول کے ماحول کو فروغ دیتے ہوئے کم سے کم کیا گیا۔ہندوؤں کو جن بے شمار سماجی برائیوں کا سامنا تھا ان کا مکمل خاتمہ نہیں کیا جا سکا۔ تاہم، جب ان برائیوں کو پوری طرح سے بے نقاب کیا گیا اور ان پر لعن طعن شروع ہوئی، تب ان برائیوں میں کمی آئی اور لوگوں کے شعور سے نکلنا شروع ہوئیں۔ بھکتی تحریک نے زندگی کی عمدہ اقدار پر زور دیا اور اس طرح مجموعی طور پر سماج کے عمومی اخلاقی رویہ کو بہتر بنایا۔ بھکتی مصلحین اور صوفی سنتوں نے انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان بھائی چارے اور ہم آہنگی کی فضا پیدا کرنے میں مدد دی۔ بھکتی تحریک نے نام نہاد ہندو اور مسلم ثقافتوں یا مقامی اور غیر ملکی ثقافتی

روایات کے درمیان قومی یکجہتی واتحاد کی قوتوں کو ایک مہمیز دی۔

بھکتی تحریک کے کچھ ضمنی یامابعد اثرات بھی قابل ذکر ہیں۔ تمل، تلگو، ہندی، پنجابی، بنگالی اور مراٹھی سمیت مقامی زبانوں کی ترقی کا زیادہ تر سہرا بھکتی مصلحین کو جاتا ہے جنہوں نے لوگوں کی مقامی بولیوں اور زبانوں میں اپنی مہم کو آگے بڑھایا۔ بھکتی کے موضوع نے ان زبانوں کے ادبی ذخیرے کو بھی تقویت بخشی کیونکہ اس نے ان ہندوستانی علما کو فکر اور اظہار کا ایک نیا زاویہ فراہم کیا جو بصورت دیگر مبلغین کے طور پر تحریک میں شامل نہیں تھے۔ مثال کے طور پر، دو قابل ذکر اسکالر سنتوں، سور داس اور تلسی داس نے سولہویں صدی کے دوسرے نصف اور سترہویں صدی کی پہلی سہ ماہی میں ہندی ادب کو ثروت مند بنانے میں گراں قدر تعاون کیا۔ اور بعدازاں، پنجاب میں سکھ مت کی پیدائش، اس بھکتی تحریک کا براہ راست نتیجہ تھا جو پنجاب میں گرونانک نے 1594 عیسوی میں شروع کی تھی، اس طرح، بھکتی تحریک نے عہد وسطیٰ کی ہندوستانی تاریخ، معاشرہ اور ثقافت میں کثیر جہتی تعاون کیا۔

19.12 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعہ کے بعد، آپ نے بھکتی کے تصور اور عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں بھکتی تحریک کے ابھرنے کے اسباب کو سمجھا۔ آپ بھکتی مصلحین کی مختلف تعلیمات سے بھی واقف ہوئے۔ آپ نے سمجھ لیا کہ بھکتی مصلحین نے ذات پات کے نظام، چھوا چھوت اور بت پرستی کی مذمت کی اور تمام انسانوں کے بھائی چارے کی وکالت کی۔ آپ نے ان بہت سے بھکتی سنتوں کے بارے میں بھی پڑھا جنہوں نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنا کام انجام دیا۔ آپ نے عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج، تاریخ اور ثقافت پر بھکتی تحریک کے اثرات کو بھی جانا۔ آپ پر یہ بات بالکل واضح ہو گئی کہ بھکتی سنتوں نے سماجی اور روحانی جمہوریت (مساوات) کی وکالت کی اور ایک استحصال سے پاک مساوات پر مبنی سماج کا تصور کیا۔ وہ خدا اور مذہب کے توسط سے عام لوگوں پر ظلم و ستم کا خاتمہ چاہتے تھے۔ آپ پر یہ بات بھی بالکل واضح ہو گئی ہے کہ ہندوستانی معاشرہ کسی بیرونی عامل کی ضرورت کے بغیر خود کو اندر سے بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

19.13 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

19.13.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ویدانت کے مطابق، نجات حاصل کرنے کے تین طریقے کیا ہیں؟
2. 'نیانار' کسے کہتے ہیں؟
3. شنکراچاریہ نے مٹھ کہاں قائم کیے؟
4. "ذات پات نہ کوئی، ہری کو بھجے سو ہری کا ہووے"، کس نے کہا؟
5. رامانند کی دو خواتین مرید کون ہیں؟

6. گرونانک کہاں پیدا ہوئے تھے؟
7. میرابائی کس کی پوجا کرتی تھی؟
8. داسابودھا، کس نے تصنیف کی؟
9. مہاراشٹر کے بھکتی سنتوں میں سے کسی ایک کا نام بتائیں۔
10. بنگال کے ایک بھکتی سنت کا نام بتائیں۔

19.13.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بھکتی تحریک میں کبیر کے تعاون وخدمات پر نوٹ لکھیے۔
2. بھکتی تحریک پر اسلام کے اثرات پر نوٹ لکھیے۔
3. شنکر اچاریہ پر ایک نوٹ لکھیے۔
4. مہاراشٹر کے بھکتی مصلحین پر نوٹ لکھیے۔
5. میرابائی پر نوٹ لکھیے۔

19.13.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں بھکتی تحریک کے ابھرنے کے ذمہ دار عوامل پر بحث کریں۔
2. عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج اور ثقافت پر بھکتی تحریک کے اثرات کا تجزیہ کریں۔
3. 'بھکتی تحریک ثابت کرتی ہے کہ ہندوستانی سماج بیرونی عوامل کے بغیر خود کو اندر سے بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔' بحث کریں۔

19.14 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Sugggested Books for Further Reading)

1. Historiography, Religion and State in Medieval India, Har-Anand Publications Pvt. Ltd., New Delhi, 2013.
2. Chandra, Satish, Religion in Indian History, Tulika Books, New Delhi, 2007.
3. Habib, Irfan ed., Religious Movements in South Asia, 600-1800, Oxford University Press, New Delhi, 2008.

اکائی 20۔ صوفی تحریک

(Sufi Movement)

اکائی کے اجزا

20.0 تمہید

20.1 مقاصد

20.2 تصوف کی تعریف

20.3 ہندوستان میں تصوف

20.4 صوفیا کی اہم تعلیمات

20.5 ہندوستانی صوفیوں پر بھکتی تحریک کا اثر

20.6 ہندوستان کے مشہور صوفیاء

20.7 چشتی سلسلہ

20.7.1 خواجہ معین الدین چشتی

20.7.2 قطب الدین بختیار کاکی

20.7.3 شیخ فرید گنج شکر

20.7.4 شیخ نظام الدین اولیاء

20.7.5 شیخ نصیر الدین محمود

20.7.6 بنگال میں چشتی سلسلہ

20.7.7 دکن میں چشتی سلسلہ

20.8 چشتی صابری سلسلہ

20.9 شیخ سلیم چشتی

20.10 سہروردی سلسلہ

20.11 قادری سلسلہ

20.12 نقشبندی سلسلہ

20.13 شطاری سلسلہ

20.14 تصوف کے اثرات

20.15 اکتسابی نتائج

20.16 کلیدی الفاظ

20.17 نمونہ امتحانی سوالات

20.17.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

20.17.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

20.17.3 طویل جوابات کے حامل سوالات

20.18 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

20.0 تمہید (Introduction)

تصوف دنیا کے ہر مذہب کا ایک ناگزیر حصہ ہے۔ اسلامی تصوف، جسے تصوف یا صوفی مت کے نام سے جانا جاتا ہے، اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود اسلام۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اسلام کے بطن سے پیدا ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں کچھ نیک طینت اور شرمیلے لوگ تھے جنھوں نے اسلام کو بخوشی قبول کیا لیکن اس پر عمل پیرا ہونے میں سستی کا مظاہرہ کیا۔ ایسے آزاد منش بندگانِ خدا قرآنی تعلیمات اور حیات نبویؐ سے متاثر ہوئے۔ انہوں نے دیرپا روحانی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنے باطن کی تطہیر پر زیادہ زور دیا۔ اسلام میں قادرِ مطلق، اللہ تعالیٰ جیسی اعلیٰ ترین ہستی کے وجود کے بارے میں شعور ہی نیک لوگوں کے ذہنوں کو مسحور کرنے کے لیے کافی تھا کہ وہ خود سپردگی، مراقبہ اور خدمت خلق کے ذریعہ معرفتِ خداوندی حاصل کر سکیں۔ تصوف کا اسلام کے علاوہ کوئی علاحدہ مقصد یا عقیدہ نہیں تھا اور ایک طویل عرصے تک اس کی کوئی تنظیم یا خانقاہی نظام نہیں تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس نے نویں صدی میں اسلام کی سخت گیر رسمیت (شعائر) کے خلاف ردعمل کے طور پر ایران میں ایک باقاعدہ تحریک کی شکل اختیار کی۔ بغداد کے عباسی خلفا کے زمانے میں اسے ایک نظریاتی بنیاد حاصل ہوئی اور صوفی بزرگوں نے عیسائیت، ہندومت، بدھ مذہب اور جین مذہب سمیت دیگر مذاہب اور لوگوں سے تصوف کے نظریات کو فراخ دلانہ طور پر اخذ کرنا شروع کیا۔ تاراچند نے تصوف کو ایک پیچیدہ رجحان کے طور پر بیان کیا ہے، جس کا موازنہ ایک دریا سے کیا جا سکتا ہے جو کئی سرزمینوں سے آنے والی معاون دریاؤں کے پانی کو اکٹھا کر کے اپنی جسامت بڑھاتا ہے۔ تصوف کو مسلم قدامت پرستوں، سنی اور شیعہ دونوں نے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ اس کے نتیجے میں بعض اوقات صوفیوں کو ستایا گیا اور ان میں سے بعض کا اسلام سے ارتداد کے

الزام میں در حقیقت سر قلم کر دیا گیا۔ قدامت پسندوں یا سخت گیر اسلام اور تصوف کے درمیان مفاہمت کا سہرا الغزالی (1112-1057 عیسوی) کے سر جاتا ہے، جو ایک عرب فلسفی تھے۔ انھوں نے تصوف کو اسلامی الہیات کے ایک اٹوٹ جز کے طور پر ایک مابعد الطبیعیاتی بنیاد فراہم کی۔

20.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- تصوف کے تصور کو سمجھ سکیں گے۔
- تصوف کی ابتدا اور ہندوستان میں اس کی آمد کو جان سکیں گے۔
- ہندوستان میں پروان چڑھنے والے مختلف صوفی سلسلوں سے واقف ہو سکیں گے۔
- ہندوستان میں تصوف کے فروغ اور صوفیا کی تعلیمات کا تجزیہ کر سکیں گے۔
- عہد وسطیٰ کے ہندوستانی سماج اور ثقافت پر تصوف کے اثرات کا مطالعہ کر سکیں گے۔
- فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے فروغ میں صوفیائے کرام کے کردار کا اندازہ لگا سکیں گے۔

20.2 تصوف کی تعریف

اصطلاح ''صوفی'' کی تعریف متعین کرنے کی مختلف کاوشیں کی گئی ہیں۔ یہ اصطلاح نویں صدی کے آس پاس خدا ترس اور زاہد مسلمانوں کے لیے استعمال کی گئی تھی جنھوں نے مادہ پرست دنیا کی رسم و رواج اور سماجی ممنوعات سے بے پرواہ ہو کر سب سے بڑھ کر خدا کو پسند کیا اور جو خدا کے عشق میں اس درجہ ڈوبے ہوئے تھے کہ قادرِ مطلق کے خیال سے ایک لمحہ کی دوری یا انحراف بھی انہیں گوارا نہ تھا۔ بعض کے نزدیک صوفی کی اصطلاح ان کے دلوں کی پاکیزگی، ان کے خیالات کی پاکیزگی اور ان کے اعمال کی شرافت کی بنا پر لفظ 'صفا' (پاکی) سے نکلی ہے۔ دیگر افراد یہ اصطلاح صف (لائن، قطار) سے اخذ کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انہیں صوفیا اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنی خواہشات کو خدا کی راہ میں قربان کرنے اور خدا کے آگے سر جھکانے والوں کی صف میں سب سے آگے تھے۔ تیسری تعریف کے مطابق، صوفی کی اصطلاح لفظ 'صُفہ' سے ماخوذ ہے کیونکہ ان اولیا کی صفات اصحاب صفہ یا ''چبوترے پر بیٹھنے والوں'' کے مشابہ تھیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے وابستہ تھے جنہیں صحابی کہا جاتا ہے اور جنھوں نے خالص پاکیزہ زندگی گزاری۔ صوفی کی اصطلاح لفظ صوف یا موٹے اون سے بھی مشابہت رکھتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ صوفیا کو اونی کمبل یا کپڑے کی ڈھیلی چادر پہننے کی عادت کی وجہ سے ایسا کہا گیا ہوگا۔ ان تمام مشتقات کو شیخ الاسلام، زکریا انصاری نے ایک تعریف میں خوبصورتی سے اس طرح جمع کیا ہے:

''تصوف سکھاتا ہے کہ کس طرح اپنے نفس کو پاک کیا جائے، اخلاق کو بہتر بنایا جائے اور دائمی خوشی حاصل کرنے کے لیے اپنی باطنی و ظاہری زندگی کی تعمیر کی جائے۔ اس کا موضوع روح کی تطہیر ہے اور اس کا انجام یا مقصد ابدی سعادت اور برکت کا حصول ہے۔''

اب عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ صوفیا اپنے آغاز سے ہی مسلم سماج کا ایک اہم حصہ بن گئے۔ وہ دیندار مسلمان تھے جو شرع کی حدود میں رہتے تھے اور اسے نجات کا حقیقی راستہ مانتے تھے۔ ایک مشاہدے کے مطابق راسخ العقیدہ مسلمان ظاہری طرز عمل پر انحصار کرتے ہیں جبکہ صوفی باطنی پاکیزگی کے خواہاں ہیں۔ راسخ العقیدہ مسلمان، مذہبی رسومات کی اندھی اطاعت یا ان کی پابندی پر یقین رکھتے ہیں جبکہ صوفیوں کے خیال میں خدا تک پہنچنے کا واحد ذریعہ محبت ہے۔

صوفی اسلام کے پرامن سفیر تھے۔ انہوں نے اپنی زندگیاں انسانیت کی خدمت اور اسلام کے پھیلاؤ کے لیے وقف کر دیں۔ اسلام کی تبلیغ ان کے نزدیک، لوگوں کی سب سے بڑی خدمت تھی جس کے ذریعہ وہ ان کی اندھیروں سے روشنی کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ صوفیا نے دور دراز ممالک میں ہجرت کی اور غیر مسلموں کے درمیان رہ کر پرامن ذرائع سے اپنا کام جاری رکھا۔

20.3 ہندوستان میں تصوف

صوفیا کی ہندوستان میں آمد ہندوستان میں اسلام کی آمد کے ساتھ ہی شروع ہو گئی۔ ابتدائی عرب تاجروں کے ہمراہ متعدد تارک الدنیا لوگ ہندوستان میں مالابار، کیرل اور سندھ میں وارد ہوئے۔ سندھ میں شیخ عثمان علی ہجویری جو داتا گنج بخش کے نام سے مشہور ہیں، ابتدائی دور میں ہندوستان آنے والے اہم صوفیوں میں سے ایک ہیں۔ شمالی ہندوستان میں ترک حکومت کے قیام کے بعد وسطی ایشیا سے صوفیوں نے بڑی تعداد میں ہندوستان کی جانب ہجرت شروع کی۔ وہ ہندوستانی سادھوؤں کے لباس اور انداز میں گھومتے پھرتے تھے اور انہوں نے کئی جگہوں پر اپنے آستانے قائم کر لیے۔ انہوں نے ہندوستانی قصبوں کے آس پاس نچلی ذاتوں کے بستیوں یا گھروں کے قریب اپنا ٹھکانہ بنا لیا۔ ان کا پہلا مقصد اپنے اطراف بسنے والے ان افراد کی محبت اور اعتماد حاصل کرنا تھا۔ صوفیا نے اپنے آپ کو پورے ملک میں پھیلایا اور اسلام کی پرامن تبلیغ کی۔

20.4 صوفیا کی اہم تعلیمات

تصوف کی بنیاد توحیدی فلسفے پر تھی جو اسلام کا پہلا بنیادی اصول ہے۔ تاہم اس کے باوجود، صوفیا نے، بھکتی فرقے کے شارحین کی طرح، مطلق حقیقت یا خالق اعلیٰ کو جاننے اور خدا اور اس کے عقیدت مندوں کے درمیان تعلق کے معلوم کرنے کے لیے اپنی فکر اور فلسفیانہ قیاس آرائیوں کو بنیاد بنایا۔ اس سلسلے میں، انہوں نے بعض اوقات مسلم علما کے ساتھ کافی اختلاف کیا۔ بھکتی مصلحین کی طرح صوفیا بھی اپنے طریقہ تدریس کے حوالے سے کئی معاملات میں ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تصوف اپنے فروغ کے آخری مرحلے میں کئی سلسلوں میں منقسم ہو گیا، جن میں سے ہر ایک کے بانی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے کوئی نہ کوئی خاص تعاون کیا ہے یا صوفیانہ فلسفے یا اپنے شاگردوں کی تنظیمی ترتیب کو انفرادیت بخشی ہے۔ بے شک، ہندوستانی صوفیا کی بنیادی تعلیمات کے خصوصی حوالے سے تصوف کے نمایاں اصولوں کو تفصیلی طور پر بیان کرنا قابل قدر ہو گا۔

توحیدی فلسفہ نظریہ وحدت الوجود پر مبنی تھا۔ اس کے مطابق خالق (حق) اور مخلوق (خلق) مشابہ تھے۔ بالالفاظ دیگر، خدا تمام کثرت

کے پیچھے وحدت اور تمام غیر معمولی ظہور کے پیچھے حقیقت تھا۔ اس نظریہ کے خالق، شیخ محی الدین ابن العربی (1248-1165 عیسوی) اس کی وضاحت اس طرح کرتے ہیں:

''خدا کے سوا کچھ نہیں، اس کے علاوہ کسی چیز کا وجود نہیں ہے۔ کوئی ایک 'کوئی اور' بھی نہیں ہے؛ جہاں تمام چیزوں کا جوہر ایک ہے۔''

یہ نظریہ مطلق توحید کے ویدانت فلسفے کے مطابق تھا جس کے مطابق خالق اور مخلوق (انسان) یا خدا اور روح ایک مطلق حقیقت ہیں۔ صوفی خدا اور روح کے درمیان ہم آہنگی کے رشتے کے قیام کے لیے کھڑے تھے، اس لیے ان کی خدا کے ساتھ براہ راست رابطہ کی آرزو تھی جو اس فانی زندگی (خاکی جامہ) میں حاکم مطلق کے لیے شدید محبت اور اس کے روبرو مکمل خود سپردگی اور اخلاص کے ذریعے ہی حاصل کی جاسکتی ہے۔ صوفی سنتوں نے اپنی حیثیت میں پیروں، موجود اساتذہ یا روحانی رہنماوں (جیسے بھکتی فرقے کے گرو) کو راستہ دکھایا اور اپنے پیروکاروں کو، جنہیں مرید کہا جاتا ہے، اس دائمی خوشی کے حصول کے لیے اسباب تجویز کیے، جس کو انہوں نے معرفت یا وصل کا نام دیا۔ راسخ العقیدہ مسلمان، وحدت الوجود یا معرفت کے عقائد کے مخالف تھے۔ ان کے نزدیک، خدا بطور حاکم مطلق اپنے ابدی وجود میں ناقابل تقسیم اور بے مثال ہے، اور یہ کہ خدا اور انسان کے درمیان تعلق وہی ہے جو خالق اور مخلوق یا آقا اور بندے کے درمیان ہے۔ دوسری طرف صوفیا نے اس رشتے کا موازنہ اس رشتہ سے کیا جو عاشق اور معشوق یا شوہر اور بیوی کے درمیان ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک خدا کی موجودگی ہر وہ شخص محسوس کر سکتا ہے جو اس کی پکار پر محبت بھرے دل سے حاضر ہوتا ہے۔ صوفیا کا خیال ہے کہ خدا ایک غیر مرئی مطلق حقیقت اور ایک ابدی حسن ہے جسے انہوں نے جمال کا نام دیا ہے اور یہ کائنات محض ایک سراب نہیں ہے۔ یہ خدا کا ظاہری یا خارجی مظہر ہے، اور اسے حسن (قابل محبت خوبصورتی) کا نام دیا گیا ہے۔ انہوں نے استدلال کیا کہ خود نمائی اور محبت کیے جانے کی خواہش ابدی خوبصورتی کی ایک لازمی صفت ہے۔ لہذا، صوفی فلسفہ، محبت کے اصول پر مبنی تھا جو تمام مذاہب کا خلاصہ اور تمام مخلوقات کا سبب تھا۔

صوفیا نے سادگی کو اپنایا اور رضائے الٰہی کے سامنے مکمل خود سپردگی پر زور دیا۔ انہوں نے تزکیہ نفس اور اپنے محبوب خدا کی ذات میں مکمل جذب ہونے کا تصور پیش کیا جس کا حصول ذاتی جدوجہد سے ممکن نہیں ہے۔ ان کا احساس تھا کہ دل کی پاکیزگی، رسوم وروایات سے کہیں زیادہ عظیم ہے اور یہ واحد راستہ ہے جس سے سچائی کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ ایک قول کے مطابق، ایک صوفی کو قرب الٰہی کے حصول سے پہلے خدا کے روبرو خود سپردگی کے دس مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ وہ یہ تھے: توبہ، ورع (پرہیز)، زہد (تقوی)، فقر (فاقہ)، صبر (تحمل)، شکر، خوف (خشیت)، رجا (امید)، توکل (قناعت) اور رضا (رضائے الہی کے سامنے سر تسلیم خم کرنا)۔

بھکتی مصلحین کی طرح، زیادہ تر صوفیاء نے دنیاداری کو یا چھوڑ دیا اور انہیں تارک دنیا کہا جاتا تھا۔ اس کی وضاحت خلیق احمد نظامی نے اس طرح کی ہے: ''عام تاثر یہ ہے کہ ترک دنیا کا مطلب زندگی سے قطع تعلق کرلینا اور تمام دنیاوی رشتوں سے منقطع ہو جانا ہے، حالانکہ عصری صوفیانہ مآخذ سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ درحقیقت صوفیاء نے جسے رد کیا وہ یہ دنیا نہیں تھی بلکہ زندگی اور اس کے مسائل کے بارے میں مادیت پسندانہ روش تھی جس سے وہ نفرت کرتے اور حقیر سمجھتے تھے۔ انسان جتنا زیادہ مادیت پسندی میں مشغول ہوتا جاتا ہے، اتنا ہی وہ

اپنے روحانی مقاصد سے دور ہوتا جاتا ہے۔‘‘

کچھ صوفیاء نے تجرد اختیار کیا جبکہ بعض نے شادی کی اور عام گھریلو افراد کی طرح زندگی گزاری۔ ان کا زیادہ تر انحصار ’فتوح‘ (تحائف اور ہدایا) پر تھا حالانکہ ان میں سے بعض نے اپنے ذریعہ معاش کے لیے بنجر زمین کی کھیتی باڑی کو اپنا لیا۔ سماج میں طفیلیوں کا طبقہ پیدا کرنا ان کا ہر گز ارادہ نہیں تھا۔ صوفی خانقاہوں یا جماعت خانہ یعنی جائے مجلس میں رہتے تھے۔ عام طور پر صوفیوں نے سرکاری ملازمت کے ساتھ ساتھ ریاستی سرپرستی سے بھی گریز کیا حالانکہ ان میں سے چند نے اراضی اور رقم کی شکل میں سرکاری عطایا قبول کیے اور خوشحال زندگی گزاری۔

20.5 ہندوستانی صوفیاء پر بھکتی تحریک کے اثرات

اب یہ عالمی سطح پر تسلیم شدہ ہے کہ بھکتی تحریک کے پھیلاؤ نے ہندوستانی تصوف پر گہرا اثر ڈالا اور اس کے برعکس یہی معاملہ رہا۔ صوفی عقائد ویدانت کے ساتھ زبردست مماثلت رکھتے ہیں لیکن یہ عہد وسطیٰ کے زمانے میں صوفیا پر ہندوستانی فکر کے فوری اثرات کی وجہ سے نہیں تھا۔ صوفی فلسفہ فارسی سرزمین پر پروان چڑھا جہاں اسلام کے ظہور سے بہت پہلے بدھ مذہب اور ویدک فلسفے کا نفوذ ہو چکا تھا۔ اس طرح یہ صوفی مت کا دور دراز کا ہندوستانی ثقافتی ورثہ تھا جس نے اسے بدھ مذہب اور ویدانت کی طرح مذہبی جوش اور اظہار کے طریقے فراہم کیے تھے۔ بہر حال، ہندوستانی صوفیا نے خود ایک طبقہ تشکیل دیا جو دوسرے مسلم ممالک میں اپنے ہم منصبوں سے بالکل الگ تھا۔ ہندوستانی سرزمین پر تصوف کی یہ بعد کی ترقی ہندوستانی فکر اور سماجی ماحول کی مرہون منت ہے۔ تنگ نظری اور تعصبات سے آزاد، صوفیا نے اس کہاوت کی پیروی کی، ’کبوتر با کبوتر باز با باز‘۔ انہوں نے ہندوستانی سنیاسیوں کی صحبت میں گھر کا ماحول محسوس کیا اور ان جیسا نظر آنے کی کوشش کی۔ انہوں نے ان جیسا لباس، طرز عمل اور ظاہری روش اختیار کی تاکہ ہندوؤں کے نچلے طبقات کو شکوک و شبہات سے دور رکھا جا سکے جن کے درمیان وہ اسلام کی تبلیغ کے لیے کام کرتے تھے۔ انہوں نے ہندوستانی سادھوں اور سنتوں کے سنیاسی طریقوں ’بالخصوص اپنے جسموں کو اذیت رسانی اور عوام الناس کی تفریح طبع کے لیے کرتب بازی، کی کھل کر نقل کی۔ ان کے خانقاہوں کو بدھ خانقاہوں اور ہندو مٹھوں کے انداز میں بنایا گیا تھا جہاں ہندوستانی رسم و رواج کو فراخدلانہ اختیار کیا جاتا تھا۔ ہندو سنیاسیوں کی طرح، صوفیوں نے بھی نئے آنے والوں کے سر منڈوائے اور بعض رسومات کی پابندی کی جو دوسرے مسلم ممالک میں ان کے ہم منصبوں کے لیے بالکل اجنبی تھے۔ انہوں نے اپنے مقامی رسم و رواج کے مطابق مقامی زائرین، ان کے متوقع پیروکاروں سے سلامی وصول کی اور ان طریقوں کو اپنے تنظیمی ڈھانچے کا لازمی حصہ بنایا۔ اس طرح تصوف کو پوری طرح سے ہندوستانی بنایا گیا تھا اور صوفی سنتوں کو لوگوں میں، ہندوؤں اور مسلمانوں میں یکساں طور پر بہت احترام حاصل تھا۔

20.6 ہندوستان کے مشہور صوفیاء

صوفیاء کئی طبقات میں تقسیم تھے جنہیں سلسلہ کہا جاتا تھا۔ ایک اندازے کے مطابق عالم اسلام میں اس طرح کے زائد از 175 سلسلے وجود میں آئے۔ ابوالفضل نے صوفیاء کے 14 سلسلوں کا تذکرہ کیا ہے جو ہندوستان میں نفوذ پذیر پائے گئے اگرچہ کہ ان میں سے صرف دو ہی

سلسلوں کی جڑیں ہندوستانی سرزمین میں گہری ہوئیں جو چشتی اور سہروردی ہیں۔ سہروردی سلسلہ کا مشاہدہ بالعموم سندھ اور شمال مغربی ہندوستان میں جب کہ چشتی سلسلہ تمام ہی ملک میں بہت زیادہ غالب ہوا۔

20.7 چشتی سلسلہ

شہرت اور روحانی دبدبے کے اعتبار سے چشتی صوفیوں کا ہندوستان میں کوئی مقابل نہیں تھا۔ ہندوستان میں فروکش ہونے والے پہلے صوفی سلطان سخی سرور تھے۔ انہوں نے طویل عمر نہیں پائی کہ اپنے پیچھے نقوش چھوڑ سکیں۔ اسے زیادہ منظم انداز میں قائم کرنے کا سہرا، چشتی سلسلے کے ایک اور مہاجر صوفی خواجہ معین الدین چشتی کے سر رہا۔

20.7.1 خواجہ معین الدین چشتی

سیار العارفین کا متن جو معین الدین چشتی کی وفات کے تقریباً تین سو سال بعد مرتب کیا گیا تھا، معین الدین کے سلسلہ نسب کی تفصیلات فراہم کرتا ہے۔ اس کے مطابق، سمجھا جاتا ہے کہ وہ وسطی ایشیا میں سجستان کے متوطن تھے۔ نوجوانی میں ہی اُن کی ملاقات ایک صوفی ابراہیم قندوزی سے ہوئی جن کا ان کی زندگی پر گہرا اثر مرتب ہوا۔ اپنی آبائی جائیداد کی فروخت سے غریبوں اور ضرورت مندوں میں خیرات تقسیم کر کے سخاوت کے جذبے کا مظاہرہ کرتے ہوئے معین الدین نے علم کی تلاش میں بخارا اور سمرقند کا سفر کیا۔ فارس کے سفر کے دوران جب معین الدین کا رابطہ شیخ عثمان ہروانی سے ہوا تو انہیں چشتی سلسلے میں شامل کر لیا گیا۔ ان کی عمر تقریباً 52 سال تھی جب ان کے روحانی مربی نے اپنے خلیفہ جانشین کے طور پر ان کا انتخاب کیا تھا۔ ہندوستان آنے سے پہلے انہوں نے فارس اور وسطی ایشیا کا دورہ کیا، جہاں کہا جاتا ہے کہ وہ اجمیر میں مقیم ہو گئے۔ معین الدین کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انہوں نے ایک صوفی کی سادہ زندگی گزاری، اپنے پیروکاروں کو اچھا انسان بنانے کی کوششوں اور لوگوں کی اخلاقی بہتری کے لیے کام کرنے پر توجہ مرکوز کیا۔ معین الدین چشتی کا انتقال 1236 عیسوی میں 95 سال کی عمر میں اجمیر میں ہوا۔

معین الدین کے افکار کے بارے میں ہمیں عہد وسطیٰ کے ہندوستانی تذکرہ نگاروں کی تحریروں سے واضح تصور ملتا ہے۔ انہوں نے اپنے پیروکاروں کو مذہبی رسوم و رواج کی پابندی کرنے اور حرام سے سختی سے گریز کرنے کی ہدایت دی۔ وہ نماز اور دل کی سخاوت کو ایک مسلمان کے لیے بنیادی اہمیت کا حامل سمجھتے تھے۔ انہوں نے بلند نظریات کی زندگی بسر کی اور انسانیت کی خیر خواہی کے پابند عہد رہے۔

20.7.2 خواجہ قطب الدین بختیار کاکی

معین الدین کے سرکردہ پیروکار قطب الدین بختیار کاکی تھے۔ وہ فرغانہ کے آش علاقہ میں پیدا ہوئے تھے۔ معین الدین نے جب آش کا دورہ کیا تب قطب الدین ان کے صوفی حلقے میں شامل ہو گئے۔ قطب الدین کی 1221 عیسوی میں دہلی آمد ہوئی جہاں ان کا گرمجوشانہ استقبال کیا گیا اور انہیں اُس وقت کے حکمران سلطان التمش نے سرپرستی حاصل ہوئی۔ قطب الدین نے دہلی میں ایک سادہ گھریلو زندگی

گزاری۔ ان کی وفات پر ان کے فرزندان کے سجادہ نشین یعنی روحانی جانشین بنے۔ قطب الدین نے تقویٰ و پرہیزگاری کی زندگی بسر کی اور سلطنت دہلی کے سیاسی معاملات میں حصہ لینے میں کبھی دلچسپی نہیں دکھائی۔ کہا جاتا ہے کہ التمش نے جب انہیں شیخ الاسلام (مشیر برائے مذہبی امور) بنانا چاہا تو انہوں نے سلطان کی اس پیشکش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ کاکی (روٹی کا آدمی) کی عرفیت سے اس لیے مشہور ہوئے کیونکہ وہ اور ان کا خاندان غربت کی زندگی بسر کرتے تھے حتیٰ کہ ان کے پاس پیٹ بھرنے کے وسائل بھی نہیں تھے لیکن خدا پر ان کا توکل کچھ ایسا تھا کہ ان کے گھر والوں کو جب بھی ضرورت درپیش ہوتی، کرشماتی طور پر روٹی میسر ہو جاتی تھی۔ قطب الدین کی وفات 1235 عیسوی میں ہوئی اور مہرولی میں اس جگہ تدفین عمل میں آئی جو انہوں نے خود منتخب کی تھی اور خرید رکھی تھی۔ ان کے فرزند شیخ احمد، ان کی درگاہ کے متولی بنے لیکن قطب الدین بختیار کاکی کے روحانی جانشین بننے کا اعزاز پنجاب سے تعلق رکھنے والے ان کے پیروکار فرید الدین مسعود کو حاصل ہوا۔

20.7.3 شیخ فرید الدین گنج شکر

بابا فرید گنج شکر (مٹھائیوں کا شیدائی) کی عرفیت سے مشہور فرید الدین مسعود پنجاب میں ملتان کے ایک گاؤں کھٹوال کے رہنے والے تھے۔ ملتان میں تعلیم کے دوران ان کی ملاقات قطب الدین سے ہوئی اور وہ ان سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کے پیروکار بن گئے۔ اپنے مرشد کی خواہش کے مطابق فرید الدین نے پانچ سال کے عرصے میں رسمی تعلیم مکمل کی اور پھر دہلی میں قطب الدین کے حلقے میں شامل ہو گئے۔ فرید الدین ریاضت کی زندگی گزارتے تھے اور اپنی للّٰہیت کی وجہ سے بہت جلد مشہور ہو گئے۔ اس کے نتیجے میں، پیروکاروں کی بڑی تعداد ان سے فیض حاصل کرنے کے لیے ان کے قریب ہو گئی۔ ان کی شہرت غیر ضروری پریشانی کا باعث بن گئی کیونکہ زائرین کی بہ کثرت اور مسلسل آمد کے سبب ان کے چین و سکون میں خلل پڑنے لگا۔ نتیجہ میں انہوں نے ہریانہ کے مقام ہانسی منتقل ہونے کا فیصلہ کیا لیکن اپنے مرشد سے ملاقات کے لیے وقتاً فوقتاً دہلی آتے رہے۔ قطب الدین کی وفات پر انہیں چشتی سلسلے کی باگ ڈور سنبھالنے کے لیے مجبور کیا گیا لیکن وہ دوبارہ ہانسی منتقل ہو گئے اور وہاں کھٹوال گئے اور بالآخر پنجاب کے چھوٹے سے قصبے اجودھن میں مستقل سکونت اختیار کی۔ اجودھن میں انہوں نے شہر کی جامع مسجد کے قریب ایک خانقاہ قائم کی۔

بابا فرید نے اپنی ذات کے لیے نفس کشی کے معیارات مقرر کیے تھے، سادہ لباس پہنتے، لکڑی کی عام چارپائی پر سوتے، اور بقاء کے لیے بیری اور باجرے کی روٹی کھاتے تھے۔ انہیں ہدیے کے طور پر اراضی کے وسیع پٹوں کی پیشکش کی گئی لیکن انہیں مادی فوائد میں کوئی دلچسپی نہیں تھی اور اپنے پیروکاروں کو بھی بادشاہوں اور ان کے درباروں سے دور رہنے کا مشورہ دیا کرتے تھے۔ ان کی خانقاہ تمام طبقات کے عام لوگوں کی آماجگاہ بن گئی تھی جہاں مستشرقین، راہبوں، یوگیوں اور صوفیوں سبھی کی آؤ بھگت کی جاتی تھی۔ انہوں نے ان زائرین کی زندگیوں میں شخصی دلچسپی لی اور ہمیشہ مدد کے خواہاں رہتے تھے۔ بابا فرید کا جب 1271 عیسوی میں انتقال ہوا تو ان کی خانقاہ میں ہی ان کی تدفین عمل میں آئی۔

20.7.4 شیخ نظام الدین اولیاء

بابا فرید کے جانشین دہلی سے تعلق رکھنے والے ایک نوجوان پیروکار بنے۔ وہ شیخ نظام الدین تھے جن کے خاندان کا اصل تعلق بخارا

سے تھے، لیکن تیرھویں صدی کے اوائل میں بدایوں میں سکونت اختیار کی۔ نظام الدین 1264 عیسوی میں اپنے خاندان کے ساتھ دہلی منتقل ہو گئے۔ نظام الدین کو بابا فرید سے ملاقات کا بڑا اشتیاق تھا چنانچہ انہوں نے اس صوفی سے ملاقات کے لیے اجودھن کا سفر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ پہلی ہی ملاقات میں وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ اسی دن وہ چشتی سلسلے میں شامل ہو گئے۔

خانقاہ میں بہت کم مدت میں تمام پیروکاروں نے نظام الدین کو روحانی مربی کی حیثیت سے قبول کر لیا۔ اس سلسلے کے سربراہ بننے کے بعد انہوں نے دہلی میں ان کی اپنی خانقاہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔ صرف ہدایا پر اپنی اور اپنے ساتھیوں کی گزر بسر کی وجہ سے زندگی عسرت میں گزرتی تھی اور کئی مرتبہ بھوکے پیٹ ہی دن گزر جاتا۔ تکالیف کے کئی سال گزرنے کے بعد، خلجی حکمران جلال الدین خلجی نے انہیں باضابطہ طور پر تسلیم کیا اور ان کی خانقاہ کے اخراجات کی تکمیل کے لیے ایک مخصوص گاہوں کی خاطر خواہ آمدنی کی پیشکش کی۔ خانقاہ میں رہنے والوں کی شدید خواہش تھی کہ شیخ اس پیشکش کو قبول کر لیں لیکن انہوں نے کوئی التفات نہیں کیا اور فقر و زہد کی زندگی برقرار رکھی۔

نظام الدین کی خانقاہ کی ایک خصوصیت سماع کی محافل کا مسلسل انعقاد تھا۔ سمجھا جاتا ہے کہ اس طرح کی چھ سماع محافل میں شیخ نے خود شرکت کی۔ سماع کے بارے میں نظام الدین کا تصور سادہ سا تھا جبکہ وہ اسے شریعت کے خلاف نہیں سمجھتے تھے اور اپنے خیالات کی تائید میں احادیث کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے ان محافل کے انعقاد کا خاص طریقہ مقرر کیا تھا، جہاں قوال کا عاقل و بالغ مرد ہونا اور اس کی قوالیوں پر موسیقی کی دھن کا شہوت انگیز نہ ہونا لازم تھا۔ سامعین کا بھی خدا سے خالص تعلق ضروری تھا جب کہ موسیقی کے آلات ستار، بربط اور سارنگی (وایلن) ہوا کرتے تھے۔

نظام الدین کی باوصف خصوصیات میں سے ایک کسی بندھے ٹکے اصول کا پابند رہنے کے بجائے وقت اور موقع کی مناسب سے بہتر عالمانہ فیصلے کرنے کی صلاحیت تھی۔ ان کے بنیادی فلسفے کی اساس خدا کی وحدانیت پر یقین تھا جس کی وجہ سے تمام شعبہ ہائے زندگی کے افراد ان کی خانقاہ میں جمع ہوتے تھے۔ وہ تمام مذاہب کی رسوم و رواج کا بہت احترام کرتے تھے اور جبری قبولیت اسلام پر یقین نہیں رکھتے تھے۔ درحقیقت، مکمل صوفی تصنیف 'فوائد الفواد' میں صرف ایک جگہ تبدیلی مذہب کا حوالہ ملتا ہے۔ نظام الدین کی وفات 1325 میں ہوئی، اور ان کے بھتیجے کے فرزند خواجہ رفیع الدین ہارون سجادہ نشین کی حیثیت سے ان کے جانشین بنے۔

20.7.5 شیخ نصیر الدین محمود

شیخ نظام الدین کے روحانی جانشین شیخ نصیر الدین محمد تھے جو چراغ دہلوی کی حیثیت سے مشہور ہوئے۔ ان کی پیدائش اودھ میں ہوئی اور 25 سال کی عمر میں نصیر الدین عملاً صوفی بن گئے۔ دہلی میں چشتی سلسلے کے نظام کو سنبھالنے کے باوجود انہوں نے اپنے مرشد کی طرح کفایت شعاری کی زندگی کو اپنایا اور انہیں حصول روزی کی جدوجہد کرنی پڑتی تھی۔ اس کے باوجود نصیر الدین اپنے مرشد سے بعض امور میں اختلاف کیا۔ نظام الدین نے پیر یا روحانی مربی کی سختی سے تابعداری کی تعلیم دی تھی لیکن نصیر الدین کا ماننا تھا کہ کسی کو اپنے سے برتر کی آنکھ بند کر کے پیروی نہیں کرنی چاہئے، حتیٰ کہ وہ اپنے پیروکاروں کو ایسے افعال کے بارے میں سوال کی ترغیب دیتے جو شریعت کے خلاف ہوں۔

مثال کے طور پر، اسلام میں سجدہ صرف خدا کے آگے جائز ہے، لیکن قبل ازیں صوفی سنتوں نے کچھ تامل کے ساتھ ہی سہی اپنے پیروکاروں کو اپنے آگے ماتھا ٹیکنے کی اجازت دی تھی۔ نصیر الدین نے اس عمل کی اجازت نہیں دی۔ انھوں نے اپنے مریدوں کو ذریعہ معاش کی خاطر سرکاری نوکری کرنے پر بھی اعتراض نہیں کیا۔ 1356 عیسوی میں ان کی وفات کے بعد، نصیف الدین کی ان کی خواہش کے مطابق ان کے اپنے گھر میں تدفین کی گئی۔ یہ علاقہ 'چراغ دہلی' کی حیثیت سے مشہور ہوا۔ کئی برسوں بعد، فیروز تغلق نے ان کے مزار پر گنبد تعمیر کی اور اس کے انتظامات صوفی کے بھتیجے مولانا زین الدین علی کو سونپے گئے۔

20.7.6 بنگال میں چشتی سلسلہ

بنگال میں چشتی سلسلہ کا آغاز سراج الدین اخی سراج نے کیا جو گوڑ میں رہتے تھے اور 1357 عیسوی میں ان کی وفات ہوئی۔ ان کے جانشین نور قطب عالم نے پنڈوا میں اپنی خانقاہ قائم کی۔

20.7.7 دکن میں چشتی سلسلہ

سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز

نصیر الدین نے اپنے روحانی جانشینوں کی حیثیت سے چند مریدوں کا انتخاب کیا تھا جس کا معیار علم تھا۔ سید محمد گیسو دراز دہلی میں 1321 عیسوی میں ایک صوفی خاندان میں پیدا ہوئے۔ وہ شیخ نصیر الدین کے مرید کامل تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم دولت آباد میں ہوئی، کیونکہ سلطان محمد بن تغلق نے اپنا دارالحکومت تبدیل کیا اور مکمل شہر دہلی کا تخلیہ کرتے ہوئے اسے وہاں منتقل کرنے کا حکم صادر کیا تھا۔ گیسو دراز کا خاندان بھی ان میں شامل تھا جو وہاں منتقل ہو گئے۔ دارالحکومت جب دہلی کو واپس منتقل ہوا تو گیسو دراز شمالی ہند کو واپس لوٹے۔ بہت جلد، انھوں نے نصیر الدین کے چشتی سلسلے میں شمولیت اختیار کی اور 20 سال بعد نصیر الدین نے انھیں اپنا روحانی جانشین بنانے کا اعلان کیا۔ تیمور نے جب 1398 عیسوی میں دہلی پر حملہ کیا تو گیسو دراز نے کئی دیگر لوگوں کی طرح ایک بار پھر دکن کو ہجرت کی۔ مالوا اور گجرات کے راستے سفر کرتے ہوئے وہ 1399 عیسوی میں بہمنی دارالحکومت گلبرگہ پہنچے۔

گیسو دراز (1422-1321 عیسوی) کی گلبرگہ آمد نے دکنی زبان و ادب کو فروغ دیا۔ بعد میں دکنی اردو کی حیثیت سے مشہور اس لہجے نے ایک آزاد اور اہم بولی جانے والی زبان کی شکل اختیار کی۔ یہ شمالی ہند کی ہندی، فارسی، گجراتی اور مراٹھی کا امتزاج تھی، وہ زبانیں جو مختلف علاقوں سے آئے ہوئے سپاہی اور گھومتے پھرنے والے درویش اور صوفی فقیر بولا کرتے تھے۔ گیسو درازا گرچہ فارسی پر دسترس رکھتے تھے اور اس زبان میں لکھ بھی سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنی تعلیم کا ذریعہ دکنی کو اختیار کیا۔ ان کی بیشتر ابتدائی تصانیف دکنی زبان میں ہیں۔ فارسی اگرچہ کہ بہمنی سلطنت کی درباری زبان برقرار تھی، تاہم گیسو دراز عوام الناس تک جن میں خاطر خواہ تعداد غیر مسلم پیروکاروں کی تھی، صرف دکنی کے ذریعہ ہی پہنچ سکتے تھے۔ گلبرگہ میں ان کی درگاہ پر منعقد ہونے والی سالانہ تقریب یا عرس میں آج بھی تمام مذاہب کے لوگ شرکت کرتے ہیں۔

فیروز شاہ بہمنی کے دور میں شیخ گیسو دراز کا سلطان کے ساتھ کچھ اختلاف ہو گیا جس کی وجہ سے سلطان نے انہیں محل چھوڑنے اور شہر بدر ہونے کا حکم دیا۔ فیروز کے شیخ کے ساتھ کبھی بھی اچھے تعلقات نہیں رہے اور نہ ہی اس نے اپنے بھائی احمد شاہ سے اتفاق کیا جو شیخ کی تائید کرتے تھے۔ فیروز کے بیٹے حسن خان کو جب شہزادہ ولی عہد مقرر کیا گیا تو یہ اختلافات اور گہرے ہو گئے۔ شیخ نے ولی عہد کے ساتھ نیک تمنائیں وابستہ کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ ان کا ماننا تھا کہ خدا تعالیٰ نے پہلے ہی احمد شاہ کو فیروز کا جانشین مقرر کر دیا ہے چنانچہ اب حسن خان کے لیے کسی دعا کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس نے فیروز کو بہت زیادہ برہم کر دیا اور اس نے شیخ کو یہ پیام بھیجا کہ چونکہ ان کی خانقاہ محل کے قریب واقع ہے اور وہاں روزانہ بڑی تعداد میں زائرین آتے ہیں جس سے سلطان کے ذہنی سکون میں خلل پڑ رہا ہے اس لیے وہ اپنی خانقاہ فصیل شہر کے باہر منتقل کر دیں۔ اس شاہی فرمان کے سننے کے بعد شیخ نئے مقام پر منتقل ہو گئے اور 1422 میں سلطان کی وفات تک وہیں مقیم رہے۔

لیکن فیروز کی وفات کے بعد اس کے بھائی احمد شاہ بہمنی (1422-36) نے دکن کے عوام پر گیسو دراز کے روحانی اور اخلاقی دبدبے کا اعتراف کیا اور اپنے فائدے کے لیے اسے استعمال کیا۔ صوفی کے قریبی ساتھیوں اور پیروکاروں پر عنایت کے علاوہ اکثر و بیشتر وہ صوفی کی خانقاہ پر حاضری دیا کرتا تھا۔ سلطان نے صوفی کے وارثین کو فراخدلی سے زمینیں عطیہ کیں جسے غالباً انہوں نے قبول کر لیا۔

گلبرگہ میں گیسو دراز کی موجودگی کے سبب دکن میں چشتی سلسلے کی جڑیں گہری ہو گئیں۔ ان کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ان کے پوتے اور روحانی جانشین سید یداللہ اور مرید شیخ پیارا ہنوز گلبرگہ میں مقیم رہے۔ ان کے مرید جمال الدین مغربی اور ان کے جانشین کمال الدین بیابانی کے ذریعہ علاقہ میں چشتی سلسلے کا اثر و نفوذ جاری رہا۔ کمال الدین کے مرید میران جی شمس العشاق نے بیجاپور میں بھی اس سلسلے کو مقبول بنایا۔ فصیح الدین بابا اور سنج الخاکسر اور برہان الدین جانم اس سلسلے کے دیگر صوفی ہیں جنہوں نے دکن میں اس سلسلے کو فروغ بخشا۔

چشتی سلسلے کے صوفیا کو شمالی ہند میں علمائے آخرت اور دکن میں علمائے دنیا کہا جاتا تھا۔ چودھویں صدی کے اختتام پر شمالی ہند میں چشتی سلسلے کا زوال دیکھا گیا جس کی بنیادی وجہ گیسو دراز کی دکن کو ہجرت کے بعد دہلی میں اس کی قیادت کرنے والے کوئی قابل مریدوں کا نہ ہونا تھا۔ مالوا، گجرات، بنگال اور دکن چشتی سلسلے کے نئے مراکز کے طور پر ابھرے اور اس دور میں دہلی سے توجہ ہٹ گئی۔ علاوہ ازیں، شمالی ہند میں تغلقوں کے زوال کے ساتھ ساتھ شمالی ہند کا سیاسی عدم استحکام، درباری سازشوں اور دہلی کے طبقہ اشراف کے درمیان جھگڑوں نے روحانیت کو زوال سے دوچار کیا۔

20.8 صابری سلسلہ

سولہویں صدی میں شمالی ہند میں چشتی سلسلے کو اس وقت کسی حد تک راحت ملی جب بابا فرید کے قریبی رشتے دار مخدوم علاء الدین علی احمد صابر نے اس سلسلے میں کچھ حد تک جان پھونکی۔ اسے صابری شاخ کی حیثیت سے شہرت ملی اور ان کے بارے میں معلومات اقتباس الانوار میں مل سکتی ہیں جو سترھویں صدی کی ایک چشتی تصنیف ہے۔ اس تصنیف میں صابر کے حق میں بابا فرید کی عزت و تکریم کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس سلسلے کے بہت ہی مشہور صوفیوں میں سے ایک عبدالقدوس گنگوہی تھے، جنہوں نے دیگر صوفیوں کے ساتھ شمال میں ماضی کی چشتی عظمت کو

بحال کیا۔ عبدالقدوس نے صوفی مت پر کافی تحریر کیا اور ان کی 18 تصانیف کے منجملہ صرف 10 باقی رہ گئیں۔ اس صوفی کو یوگا میں خاص دلچسپی تھی اور بتایا جاتا ہے کہ اپنے مرید سلیمان مانڈوی کو انہوں نے تجوید قرآن کے اسباق کے عوض اسے سکھایا تھا۔ رشد نامہ میں بھی یوگا کے فلسفے کے تئیں ان کے خاص لگاؤ کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔

اس سلسلے کے ایک اور عظیم صوفی شیخ محب اللہ الہ آبادی کو باطنی علوم میں ان کے علم و مہارت کے سبب 'شیخ کبیر' (عظیم شیخ) کا لقب ملا۔ انہوں نے وحدت الوجود کے تصور کی وکالت کی اور عربی و فارسی میں اس پر تشریحات لکھے۔ ان کے فلسفے کو دیکھتے ہوئے کئی علماء نے ان پر بدعت کا الزام لگایا اور ان کی سزائے موت کا فتویٰ جاری کیا جسے بڑی کوششوں سے منسوخ کیا گیا۔

20.9 شیخ سلیم چشتی

ایسا نام جس سے دور حاضر کے اکثر عوام روشناس ہیں وہ سلیم چشتی کا ہے جو اکبر بادشاہ کے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ وہ سیکری میں پروان چڑھے، جہاں ان کے خاندان نے پنجاب سے ہجرت کی تھی۔ وہ بابا فرید کی اولاد میں سے تھے۔ وہ پاک پٹن درگاہ کے صوفی حلقے میں شامل ہوئے اور مشرق وسطیٰ کا کئی مرتبہ سفر کیا اور متعدد بار حج کی سعادت حاصل کی۔ 1538 عیسوی میں وہ سیکری واپس لوٹے اور وہاں خانقاہ بنائی۔ انہیں 'سور' خاندان کے حکمرانوں کی سرپرستی حاصل تھی اور ان کے زوال کے بعد، سلیم ایک بار پھر بیرون ملک مذہبی سفر کے لیے نکل پڑے۔

جیسا کہ تاریخی حوالوں میں کہا گیا ہے کہ مغل شہزادہ سلیم کی پیدائش، جو بعد میں جہانگیر کے نام سے مشہور ہوا، اکبر بادشاہ کو اس صوفی کی خصوصی دعا کا نتیجہ تھی۔ شکرانے کے طور پر اکبر نے سیکری میں شاندار شہر بسایا اور اپنے دارالحکومت کو وہاں منتقل کیا۔ نئے شہر کو عظیم خانقاہ اور ایک مسجد سے آراستہ کرتے ہوئے اکبر نے شیخ کے باوقار مقام تک بلند کیا۔ شیخ کی وفات پر، مسجد کے ایک گوشے میں ان کی تدفین کی گئی جس پر ایک گنبد بنایا گیا۔

20.10 سہروردی سلسلہ

فارس کے مقام سہرورد کے رہنے والے شیخ ابو نجیب سہروردی اس سلسلے کے بانی تھے۔ ہندوستان میں ان کے بھتیجے اور جانشین شیخ شہاب الدین سہروردی کے خلفاء نے اس سلسلے کو متعارف کیا۔ تاہم ہندوستان میں تبلیغ کرنے والے سہروردی سلسلے کے پہلے صوفی بہاء الدین زکریا تھے جو ملتان کے رہنے والے تھے۔ سہروردی صوفیاء نے اپنی تحریکی سرگرمیوں کے مرکز کے طور پر شمال مغربی صوبوں کا انتخاب کیا کیونکہ وہ منگول حملوں کی وجہ سے بکھرے ہوئے تھے۔ چنانچہ ملتان اور سندھ، اس سلسلے کی سرگرمیوں کے اہم مراکز بنے۔

شیخ نے سیاسی امور میں گہری دلچسپی لی اور ان کی خانقاہ آنے والے ہر شخص کی پذیرائی نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کے پاس آنے والے اشراف سے زیادہ تعلق خاطر کا اظہار کرتے تھے۔ ان کی وفات 1262 میں 81 سال کی عمر میں ہوئی اور ملتان میں تدفین کی گئی جہاں ان کے

مزار پر ایک گنبد تعمیر کیا گیا۔ ان کے فرزند صدر الدین عارف کی جانب سے جو اپنے والد سے بہت زیادہ مختلف تھے، بہاء الدین کو جانشین بنایا گیا۔ ایک سچے صوفی کی طرح، انہوں نے دولت کی آرزو نہیں کی اور اپنا سب کچھ خیرات کر دیا۔ صدر الدین کے مشہور مرید احمد معشوق طویل وقفے تک حالت وجد میں رہنے کی صلاحیت سے معروف تھے۔ صدر الدین کے جانشین ان کے فرزند رکن الدین ملتانی بنے جنہوں نے اپنے دادا کے نقش قدم کی پیروی کی، اور خانقاہ کو ایک بار پھر سیاسی اشراف سے جوڑ دیا۔ انہوں نے حکمران سلطانوں سے ملنے کے لیے کئی مرتبہ دہلی کے دورے کیے ساتھ ہی شیخ نظام الدین چشتی سے بھی ملاقات کی۔

رکن الدین کے مریدوں کی کوششوں سے یہ سلسلہ بتدریج ہندوستان میں کئی دیگر مقامات میں پھیل گیا۔ رکن الدین کے مشہور مریدوں میں سے ایک حسینی سادات تھے، جن کی صوفی علم باطن پر نظموں میں دوسروں کے تئیں تحمل اور رواداری کی روح کو ظاہر کیا گیا۔ رکن الدین کے ایک اور مرید صدر الدین ظفر آبادی جو حاجی چراغ ہند سے زیادہ شہرت رکھتے تھے، جون پور میں یہ سلسلہ قائم کیا۔ رکن الدین کی وفات کے بعد ملتان میں سہر وردی سلسلے کے جوش و خروش میں کمی آگئی۔ سہر وردی سلسلے کے ایک اور صوفی شیخ جلال الدین تبریزی نے لکھنوتی میں ایک خانقاہ اور ایک لنگر قائم کیا جس کا اعادہ بنگال کے دیوتلا میں کیا گیا۔

سید جلال الدین جہانیان جہانگشت نے موجودہ سندھ میں اوچ کے مقام پر اس سلسلے میں نئی روح پھونکی، جہاں سہر وردی خانقاہ قائم کی تھی۔ اس صوفی نے کافی سفر کیے اور مملکت کے ساتھ بہتر تعلقات میں کوئی قباحت محسوس نہیں کی۔ محمد بن تغلق نے انہیں شیخ اسلام مقرر کیا اور سہوان میں 40 مواضعات کی جاگیر عطا کی۔ فیروز تغلق کی نگاہوں میں بھی شیخ کی کافی قدر و منزلت تھی۔ کہا جاتا ہے کہ صوفی کی سفارش پر سلطان نے اسلام کے ذریعہ عائد کردہ کئی محاصل منسوخ کر دیے۔ صوفی ادب میں ان کا تعاون بھی گراں قدر ہے جب کہ انہوں نے متعدد صوفی متون پر تشریحات لکھیں اور قطب الدین دمشقی کی تصنیف الرسالۃ المکیہ کا فارسی میں ترجمہ کیا۔

سہر وردی سلسلے کے ایک اور اہم صوفی شیخ حامد بن فضل اللہ عرف جمالی کنبوہ گزرے ہیں۔ کئی اسلامی ممالک کے لیے ان کے متعدد اسفار سے انہیں وسیع تجربہ حاصل ہوا۔ پندرھویں صدی کی آخری دہائی میں ہندوستان واپسی کے بعد انہوں نے اپنی تحریکی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ جمالی نے سکندر لودھی، بابر اور ہمایوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات قائم کیے۔ انہوں نے بابر کی مدح میں ایک قصیدہ لکھا اور گجرات مہم پر ہمایوں کے ساتھ گئے جہاں ان کا انتقال ہو گیا۔ جمالی کی شاعرانہ ذکاوت کا اظہار ان کی مثنوی مہر و ماہ میں ہوتا ہے لیکن ان کی ادبی مہارت کا نچوڑ سیر العارفین ہے جو 13 چشتی و سہر وردی صوفیوں کی سوانح حیات پر مشتمل ہے۔ جمالی کے فرزند اکبر شیخ گدائی نے اکبر کے دور میں مؤثر کردار ادا کیا اور اس کے محکمہ مذہبی امور میں 'صدر' کے اہم مقام پر فائز ہوا۔

اُچ کے سہر وردی صوفیا کو بڑی حد تک گجرات کے سلاطین کی سرپرستی حاصل تھی۔ مرأۃ سکندری میں گجرات کی مسلم مملکت کے بانی ظفر خان کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں، جو مخدوم جہانیاں جہاں گشت کی دعاؤں سے تخت نشین ہوا تھا۔ سلطان احمد، مخدوم کے پوتے شیخ نور قطب عالم کے صوفی حلقے میں شامل ہوا۔ شیخ کے روحانی جانشین شاہ مانجھاں تھے۔ کئی سہر وردی صوفیاء کی طرح انہوں نے اپنے دور کے

سیاسی امور میں گہری دلچسپی لی اور مالوہ کے خلاف مقابلے میں گجراتی سلاطین کی مدد کی۔ان کا مزار احمد آباد میں واقع ہے جو آج بھی مرجع خلائق بنا ہوا ہے۔

سولہویں صدی تک، سہروردی سلسلے کا زوال ہو گیا اور وہ کشمیر اور پنجاب تک محدود رہ گیا۔اُس دور میں ہندوستان کے واحد سہروردی صوفی حاجی عبدالوہاب بخاری تھے جو سکندر لودھی کے دور حکمرانی میں دہلی میں مقیم تھے۔

سہروردی سلسلے کو کشمیر میں مخدوم حمزہ کشمیری نے قبولیت عام دی۔وہ کشمیر میں شیعہ غلبہ کے حق میں نہیں تھے چنانچہ انہوں نے اسے کمزور کرنے کی مسلسل کوششیں کیں۔ان کی وفات کے بعد،ان کے مریدوں نے ان کے نقش قدم کی پیروی جاری رکھی۔ حمزہ کے نہایت اہم مریدوں میں باباداؤد خاکی سہروردی تھے۔شاعری میں مخدوم حمزہ کی سوانح حیات پر مشہور تصنیف 'وردالموارد ین' مرتب کرنے کا سہرا حاصل کرنے والے داؤد بھی اپنے مرشد کی طرح کشمیر میں شیعہ غلبے کے مخالف تھے اور اکثر و بیشتر سنیوں کی ایذار سانی پر اظہار خیال کرتے تھے۔ان کے جانشین میر نازک تھے جنہوں نے سماع کے تصور کی مخالفت کی اور اس میں شرکت سے صوفیوں کو باز رہنے کی تلقین کی۔

سہروردی سلسلے کے ایک اور مشہور صوفی، شیخ حسن تھے، جو سولہویں - سترھویں صدی میں پنجاب کے لاہور میں مقیم تھے۔ سہروردی سلسلے سے نسبت قائم کرنے سے قبل وہ مشہور یوگی گورکھ ناتھ کی صحبت میں رہے۔ عبدالرحیم خان خاناں اور نواب مرتضیٰ خان جیسے مشہور نواب ان کے مریدوں میں شامل تھے۔ان کی مزار لاہور میں واقع ہے اور اب ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے۔

سہروردی شاخ سے نکلنے والے فردوسی صوفی بہار تک محدود تھے۔اس سلسلے کو نظام الدین فردوسی کے ایک مرید شیخ حرف الدین یحیٰ نے مقبول بنایا، جنہوں نے شریعت اور وحدت الوجود کے تصور کے مابین اعتدال لانے کی کوشش کی۔انہوں نے انسانیت کی خدمت پر بہت زیادہ زور دیا جو ان کے فلسفے کا اہم جزو تھا۔

20.11 قادری سلسلہ

پندرھویں صدی کے وسط میں شیخ عبدالقادر جیلانی کی جانب سے قائم کردہ سلسلہ ہے۔ابتدائی قادری صوفیاء نے بہمنی سلطان احمد شاہ کی سرپرستی میں، جو فارسی اور عربی ثقافتی روایات کا بڑا سرپرست تھا، دکن میں خانقاہیں قائم کیں۔اس پالیسی کے حصہ کے بطور، احمد شاہ نے فارس کے کئی صوفیاء کو دکن میں اپنے نئے دارالحکومت بیدر آنے کی دعوت دی۔ کہا جاتا ہے کہ سلطان چاہتا تھا کہ دکن، عالم اسلام کے دیگر حصوں کی روحانی معلومات سے سیراب ہو۔ فرشتہ میں لکھا ہے کہ سلطان نے فارس کے مشہور قادری صوفی شاہ نعمت اللہ ولی کو ان کے پوتے شاہ نوراللہ کو اس کے دربار میں بھیجنے کی ترغیب دی۔احمد شاہ نے نہ صرف اپنی دختر کا نوراللہ سے نکاح کیا بلکہ صوفی کے دادا کے اعزاز میں نعمت آباد کے نام سے ایک نیا شہر بسایا۔ بعدازاں، نوراللہ کے مکمل قریبی خاندان نے بیدر کو ہجرت کی۔ان کے بھائیوں حبیب الہ اور محب اللہ نے بیدر میں قادری خانقاہ قائم کی، جو وقت کے گزرتے ہندوستان میں ایک اہم قادری مرکز کے طور پر ابھری۔ بیدر کے دیگر مشہور قادری شیخ

ابراہیم ملتانی اوران کے فرزند اور جانشین ابراہیم مخدوم جی تھے۔

قادریوں کی ایک اور شاخ پندرھویں صدی کے وسط میں پنجاب میں قائم کی گئی۔اسے شیخ عبدالقادر جیلانی کی اولاد میں سے ایک سید محمد حلبی اوچی نے قائم کیا۔ سید نے اُس وقت ہندوستان کا دورہ کیا جب وہ کم عمر تھے۔انہوں نے اپنے آبائی مقام حلب (شام کا شہر) واپسی سے قبل لاہور اور ناگور میں کچھ عرصہ قیام کیا۔1428 عیسوی میں جب وہ دوبارہ ہندوستان آئے تو اوچ میں رہائش اختیار کی، جہاں سلطان حسین مرزا ان کے حلقہ مریدی میں شامل ہوئے۔سید محمد کے فرزند عبدالقادر دوم ان کے جانشین بنے۔ابتداء میں عبدالقادر نے سماع کی حمایت کی اور مادّی مسرتوں کے خواہاں تھے جو پُرآسائش زندگی کی ضامن ہو لیکن اُچ میں قادری خانقاہ کی قیادت سنبھالنے کے بعد ان میں نمایاں تبدیلی آئی۔وہ صوفی بن گئے، خانقاہ سے جڑے تمام عطائے نوازشات کے ساتھ سرکاری عہدے سے دست کشی اختیار کی۔صوفی کے تقویٰ و روحانی کارناموں کو عبدالحق محدث دہلوی نے ان کے متعدد کرشموں کی شکل میں پیش کیا ہے۔سولہویں صدی میں آگرہ اور دہلی میں بھی قادریوں کی سرگرم تحریکی سرگرمیاں دیکھی گئیں۔مکہ کے متوطن ابوالفتح بن جمال الدین مکی نے سکندر لودھی کی دعوت پر آگرہ میں قادری سلسلے کو متعارف کیا۔ بتایا جاتا ہے کہ پانی پت کے میدان میں ابراہیم لودھی کے ساتھ صوفی بھی ہم رکاب تھے جہاں ابراہیم لودھی کی بابر کے ساتھ تاریخی جنگ ہوئی۔دہلی کے دیگر نمایاں قادری صوفیاء میں امان اللہ پانی پتی اور میر سید عبدالعلیٰ تھے۔مؤخرالذکر زبردست عالم تھے جنہوں نے ابن عربی کی فتوحات مکیہ کی شرح لکھی۔

سولہویں صدی میں سری نگر قادریوں کا ایک اور مرکز تھا۔ شیخ احمد قادری کو جب بابا داؤد خاکی کی جانب سے کشمیر مدعو کیا گیا، تو وہ وہیں مقیم ہوگئے، جہاں کشمیر کے سلطان ان کے مرید بن گئے۔انہوں نے اپنے دوست داؤد خاکی کے بشمول بے شمار مسلمانوں کو سلسلے میں شامل کیا۔داؤد کے جانشین میر نازک بنے اوران کے پوتے میر محمد علی نے سری نگر میں قادری روایات کو مقبول عام بنایا۔مشرق وسطیٰ کے کئی مہاجر صوفیاء نے دکن میں بھی قادری سلسلے کی تبلیغ کی۔سید عبدالقادر یوسف، بدرالدین حبیب اللہ اور شاہ عبدالحسن قادری بیدر اور بیجاپور کے چند قابل ذکر قادری صوفیوں میں سے تھے۔شاہ عبدالحسن قادری کو بیجاپور کے سلطان ابراہیم عادل شاہ دوم کی قربت حاصل تھی جسے انہوں نے صوفی مت کی پیچیدگیوں سے واقف کروایا۔وہ ایسے صوفیوں کے حق میں نہیں تھے جو حالت نشہ میں ہوں۔انہوں نے 'سکھ انجام' لکھی جو دکنی زبان کی مشہور تصنیف ہے۔شہرت پانے والے ایک اور دکنی صوفی شاہ عبداللطیف لاا وبالی ہیں' جو بغداد سے ہجرت کر کے دکن میں آئے اور کرنول کے قریب ایک گاؤں میں رہائش اختیار کی۔

قادری سلسلہ کا سب سے زیادہ اثر صرف پنجاب اور دکن ہی میں دیکھا گیا۔چشتی صوفیوں کے برخلاف قادریوں نے مریدی اور وابستگی کی بنیاد پر پیروکاروں کا جال پورے برصغیر میں نہیں پھیلایا۔

20.12 نقشبندی سلسلہ

نقشبندی سلسلے کی بنیاد درحقیقت بہاء الدین نقشبندی نے وسطی ایشیاء میں ڈالی۔ہندوستان میں سولہویں صدی میں یہ سلسلہ مقبول

ہوا۔ اگرچہ یہ سلسلہ پندرھویں صدی میں کشمیر میں قائم ہو چکا تھا، لیکن اکبر کے دور میں ہی اس کی سرگرمیوں نے زور پکڑا۔ نقشبندیوں کو مغل خاندان کی بڑی حد تک سرپرستی حاصل تھی۔ بابر کے والد عمر شیخ مرزا نقشبندی صوفی خواجہ نشیر الدین عبیداللہ احرار کے مرید تھے۔ بابر خود بھی صوفی کے فرزندوں سے کافی قریب تھا۔ بعد میں، اکبر کے دور میں جب صوفی کی اولاد ہندوستان آئی، بادشاہ نے ان کے اخراجات کی تکمیل کے لیے لاہور کے سرکار باری دوب میں پرگنہ جماری یا چمیاری عطا کی۔ سمرقند واپسی سے قبل 16 سال اپنے قیام کے دوران انہوں نے بڑی تعداد کو اپنا تابع کیا۔

کابل کے متوطن خواجہ باقی باللہ تھے جنہوں نے ہندوستان میں نقشبندی سلسلے کو شہرت دی۔ اپنے پیر خواجگی امکنگی کی ہدایت پر یہ صوفی ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی اور مختصر لیکن روحانی سرگرم زندگی گزاری۔ خواجہ پوری طرح وحدت الوجود کے نظریے کے قائل تھے اور انہوں نے اس نظریے کی مدح سرائی میں کافی شاعری کی۔ ان کا خیال تھا کہ صوفیاء سماع کے ذریعہ روحانی سکون حاصل کر سکتے ہیں اور مغل زیر تسلط علاقوں میں اسلامی تعلیمات کی تشہیر کرتے اور مغل نوابوں کو اپنی روزمرہ زندگی میں تقویٰ کی روش اختیار کرنے کے لیے مسلسل مکتوبات روانہ کرتے تھے۔

خواجہ باقی باللہ کے جانشین شیخ احمد سرہندی بنے۔ خلیفہ کی حیثیت سے مقرر کیے جانے کے بعد شیخ کو سرہند واپس جانے کی اجازت ملی، جہاں سے انہوں نے اپنے مریدوں کو برصغیر کے تمام حصوں میں روانہ کیا۔ نتیجتاً ہندوستان کے تمام علاقوں میں پیروکاروں کی بڑی تعداد بنانے میں مدد ملی۔ وہ اسلام میں مذہبی اختراعات یا بدعات کے خلاف تھے اور ہندوستانی اسلام میں اصلاحات کی سنجیدہ کوششیں کیں۔ اس سعی و جہد کے اعتراف میں وہ مجدد الف ثانی کے لقب سے پہچانے جانے لگے۔ وہ وحدت الوجود کے نظریے کے حامی نہیں تھے، جو ان کے خیال میں بہت زیادہ مشکل اور پیچیدہ تھا۔ مجموعی طور پر، شیخ نے راسخ العقیدہ اسلام کی بحالی کا بیڑا اٹھایا اور مذہبی عقاد اور ہندوؤں کے سیاسی تقررات کے اس حد تک ناقد تھے کہ جزیہ کو دوبارہ نافذ کرنا چاہتے تھے۔ وہ شیعہ عقائد پر بھی یکساں تنقید کرتے تھے اور اسلام کے پہلے تین خلفاء کی تنقیص پر شیعوں کی مذمت کرتے تھے۔ کسی حد تک شیخ کو بالخصوص پیغمبر محمد کی نیابت کے دعویٰ پر شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کے اس تنقید کے نتیجے میں بادشاہ جہانگیر نے انہیں گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا تھا۔ بعد میں انہیں رہا کیا گیا اور وہ سرہند واپس لوٹے جہاں بالآخر ان کی وفات ہو گئی۔ تاہم ان کے آدم بنوری اور شاہ عبدالرحیم جیسے مخلص مرید تھے، جنہوں نے مغل سلطنت کے مختلف حصوں میں اس سلسلے کی ترویج کے لیے جدوجہد کی۔

شیخ احمد سرہندی کے بعد ان کے فرزند محمد معصوم ان کے جانشین بنے، جو قرآن کی مضبوط تلاوت پر زور دیتے تھے اور اپنے والد کی طرح بڑی تعداد میں شاگردوں کی تربیت کی۔ اس صوفی نے امراء کی صحبت سے گریز کیا، بھلے ہی انہوں نے مغل شہنشاہ اورنگ زیب سے خط و کتابت کی، لیکن شہنشاہ کا مصاحب بننے سے انکار کر دیا۔ ان کے فرزند سیف الدین کو شہنشاہ کی روحانی تربیت کے لیے مقرر کیا گیا۔ خواجہ معصوم کے چھ فرزند تھے۔ انہوں نے اپنے پیچھے بے شمار پیروکار چھوڑے جو تمام کے تمام مایہ ناز صوفی تھے جن کے ذریعہ پورے برصغیر ہند

میں نقشبندی تعلیمات کی تبلیغ عمل میں آئی۔ حجۃ اللہ محمد نقشبندی سرہند میں واقع ان کی خانقاہ کے جانشین بنے۔

ہندوستانی نقشبندیوں میں خواجہ خواند محمد واحد ہیں جو مجددی سلسلے سے وابستہ نہیں ہوئے۔ وہ کشمیر سکونت پذیر تھے اور کہا جاتا ہے کہ مغل شہنشاہوں اکبر، جہانگیر اور شاہجہاں ساتھ ہی ساتھ مغل حرم کی خواتین بھی ان سے دعاؤں کی طالب تھیں لیکن کشمیر میں ان کی مخالف شیعہ مہم ان کے لاہور جلاوطنی کا سبب بنی، جہاں ان کی وفات ہوئی اور وہیں تدفین کی گئی۔ نقشبندی سلسلے کو بعد میں ان کے فرزندان خواند احمد اور معین الدین نے جاری رکھا۔

20.13 شطاری سلسلہ

ہندوستان میں شطاری سلسلے کا تعارف لودھی دور حکمرانی میں ہوا۔ گوالیار کے سید محمد غوث اس سلسلے کے سب سے زیادہ مشہور صوفی گزرے ہیں۔ انہوں نے دو مشہور کتابیں ''جواہر الخمسہ'' اور ''کلید مخازن'' تصنیف کی جس میں صوفی اصولوں اور افعال پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بادشاہ ہمایوں اور مشہور ہندوستانی موسیقار تان سین اس سلسلے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ شطاری صوفیوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے افکار واعمال میں کئی ایک مماثلتوں کو دریافت کرنے کی کوشش کی۔ اس سلسلے کے افراد پُرآسائش دنیاوی نعمتوں میں رہتے ہوئے، روحانی زندگی گزارتے تھے۔

20.14 صوفی تحریک کے اثرات

جیسا کہ کہا جاچکا ہے کہ ہندوستان میں آمد سے قبل تصوف کی اپنی تاریخ تھی۔ سادہ فلسفے، غیر پیچیدہ اعمال اور تحمل ورواداری کی روح کے ساتھ صوفیوں نے عوام الناس کے دل جیت لیے، جو جوق در جوق خاقاہوں کا رخ کرتے۔ صوفیوں میں بیشتر چشتی صوفیوں کو، ان کے کرشموں اور سیاسی امور سے ان کی عدم دلچسپی کے سبب زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے سرکاری عہدے قبول کرنے سے گریز کیا، حکومت میں نفع بخش عہدوں کے لیے اپنے پیروکاروں کی حوصلہ شکنی اور مملکت کے ساتھ تمام تعلقات پر سرد مہری کا رویہ اپنایا۔ اس کے برخلاف، سہروردی صوفیاء نے سیاسی تائید، نفع بخش تقررات اور مادّی آسائشیں حاصل کیں۔ وہ سیاسی مہروں کی قربت کو بھی ترجیح دیتے تھے۔

کئی چشتی صوفیوں نے مقامی زبانوں کو اپنے پیغام کی ترسیل کا ذریعہ بنایا۔ خانقاہوں میں ہزاروں لوگوں کو چین وسکون میسر ہوتا جب کہ خانقاہوں اور درگاہوں پر منعقد کیے جانے والے عرس اور دیگر تقاریب کو اس قدر پرکشش ثقافتی رنگ دیا گیا کہ غریب وامیر سبھی اس کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے۔ امن، ہم آہنگی، عالمی بھائی چارگی اور بقائے باہم کے صوفیوں کے پیام کے ساتھ ساتھ ان کے بھکتی ہم منصبوں کی کوششوں نے مذہبی، طبقاتی اور فرقہ وارانہ کشیدگی سے پاک سماج بنانے میں مدد دی۔ ذات پات میں بٹے ہندوستانی سماج کو قابل رشک ہندو مسلم افکار واعمال کو یکجا کرنے کے لیے بھکتی۔ صوفی تحریک کی ضرورت تھی۔ عہد وسطیٰ کے صوفی مت نے، خواہ وہ بھکتی شکل میں ہو یا صوفی

نظریات ہوں، ہندوستان کی سماجی۔ مذہبی سوچ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ خدائے بزرگ و برتر کی تلاش میں محبت عالم کے بارے میں اظہار خیال کے ذریعے، صوفی فلسفے نے مذہبی رواداری کے ماحول کو پروان چڑھایا، روحانیت کو فروغ دیا اور اسلام میں موجود تہذیبی اقدار کو جلا بخشی۔

20.15 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کا مطالعہ کرتے ہوئے آپ صوفی مت کی تعریف اور تصور سے واقف ہوئے۔ آپ نے اس کے تاریخی دوار اور ہندوستان میں اس کی آمد سے آگہی حاصل کی۔ ااپ کو نہ صرف صوفی افکار پر بھکتی تحریک کے اثرات کو سمجھنے میں مدد ملی بلکہ صوفی سنتوں کی اصل تعلیمات سے بھی روشناس ہوئے۔ آپ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں ابھرنے والے متعدد صوفی سلسلوں سے تفصیلی طور پر آشنا ہوئے، جس میں عوام الناس میں صوفیت کے پیغام کی تبلیغ کی گئی۔ آپ اس بات سے واقف ہوئے کہ صوفی مت نے عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں محبت واخوت کو پروان چڑھایا اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی قائم کی۔

20.16 کلیدی الفاظ (Keywords)

صفا	پاکی
صف	لائن، قطار
صفہ	چبوترہ
صوف	موٹا اون
تطہیر	پاکی حاصل کرنا
راسخ العقیدہ	کٹر، اصول پسند

20.17 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

20.17.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. ابوالفضل نے کتنے صوفی سلسلوں کا تذکرہ کیا ہے؟
2. خواجہ معین الدین چشتی کی تفصیلات کس متن میں ملتی ہیں؟
3. قطب الدین بختیار کاکی کی تدفین کہاں ہوئی؟
4. بابا فرید نے اپنی خانقاہ کہاں قائم کی تھی؟
5. چراغ دہلی' کی حیثیت سے کون معروف تھے؟

6.بنگال میں چشتی سلسلے کو کس نے روشناس کرایا؟

7. گیسودراز نے اپنے پیغام کی تبلیغ کے لیے کس زبان کو اپنایا تھا؟

8. شیخ کبیر کس کا لقب تھا؟

9.سہروردی سرگرمیوں کے اہم مراکز کون سے تھے ؟

10. سیارالعارفین کے مصنف کا کیا نام تھا؟

20.17.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. صوفیت کے تصور پر ایک نوٹ لکھیے۔

2. چشتی صوفیوں کی صابری شاخ پر نوٹ تحریر کیجیے۔

3. سلیم چشتی کے بارے میں نوٹ لکھیے۔

4. قادری صوفیوں پر نوٹ لکھیے۔

5. ہندوستان سماج پر صوفی تحریک کے اثرات قلم بند کیجیے۔

20.17.3 طویل جوابات کے حامل سوالات(Long Answer Type Questions)

1. سہروردی صوفیوں پر مضمون تحریر کیجیے۔

2. صوفی تحریک میں چشتی سلسلے کے تعاون پر مضمون لکھیے۔

3. بھکتی اور صوفی سنتوں کی تعلیمات میں مماثلتوں کا تجزیہ کیجیے۔

20.18مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

---

1. Islam, Sirajul (2004). *Sufism and Bhakti*. USA.
2. Schimmel, Annemarie (1978). *Mystical dimensions of Islam*. USA: University of North Carolina Press.
3. Alvi, Sajida Sultana (2012). *Perspectives on Mughal India: Rulers, Historians, Ulama, and Sufis*. Karachi: Oxford University Press.
4. Aquil, Raziuddin (2007). *Sufism, Culture, and Politics: Afghans and Islam in Medieval North India*. New Delhi: Oxford University Press.

5. Schimmel, Anniemarie (1975). "Sufism in Indo-Pakistan". *Mystical Dimensions of Islam*. Chapel Hill: University of North Carolina Press.
6. Schimmel, Anniemarie (1975). "Sufi Orders and Fraternities". *Mystical Dimensions of Islam*. Chapel Hill: University of North Carolina Press.
7. Saiyid Zaheer Husain Jafri and Helmut Reifeld, ed. (2006). *The Islamic Path: Sufism, Politics, and Society in India*. New Delhi: Konrad Adenauer Foundation.
8. Abidi, S.A.H. (1992). *Sufism in India*. New Delhi: Wishwa Prakashan.
9. Anjum, Tanvir (2011). *Chishti Sufis in the Sultanate of Delhi 1190-1400: From Restrained Indifference to Calculated Defiance*. Pakistan: Oxford University Press.

اکائی 21۔ نظم ونسق: مرکزی حکومت

(Administrtion: Central Government)

اکائی کے اجزا

21.0 تمہید

21.1 مقاصد

21.2 مرکزی نظم ونسق

21.3 سلطان کا مرتبہ اور اختیارات

21.4 وزرا، محکمہ جات اور ان کے فرائض

21.4.1 وزیر

21.4.2 دیوان وزارت

21.4.3 دیوان رسالت

21.4.4 دیوان عرض

21.4.5 دیوان انشا

21.4.6 دربار اور شاہی حرم کے امور

21.4.7 عدل وانصاف

21.4.8 امیر داد

21.4.9 ڈاک، پولیس اور خفیہ نظام

21.4.10 محکمہ مالیات/نظام مال گزاری

21.5 اکتسابی نتائج

21.6 کلیدی الفاظ

21.7 نمونہ امتحانی سوالات

21.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات

21.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات

21.7.2 طویل جوابات کے حامل سوالات

21.8 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

21.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کا قیام قطب الدین ایبک کے ہاتھوں 1206ء میں ہوا۔ 1206 سے 1526 کا زمانہ دہلی سلطنت کا دور کہلاتا ہے جو کہ تاریخ ہند کا اہم دور ہے۔ اس دور میں نہ صرف سیاسی و معاشی سطح پر بھی بہت سی تبدیلیاں آئیں بلکہ نظم و نسق پر توجہ دی گئی۔ یہاں ہم صرف دلی سلطنت کے مرکزی ڈھانچے اور اس کے نظم و نسق سے متعلق بات کریں گے لیکن اس سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ بھی جان لیں کہ دہلی سلطنت کی نوعیت اور ماہیت کیا تھی۔

قانوناً دہلی سلطنت خلافت کا ایک حصہ تھی، بغداد کے نام نہاد خلفا کا سلسلہ ختم ہونے پر بھی خلیفہ کی اطاعت کے مفروضے کو جاری رکھا گیا تھا، سوائے علاالدین خلجی اور اس مختصر زمانے کے جب کہ قطب الدین مبارک شاہ نے خلیفہ کا منصب خود اختیار کر لیا۔ محمد بن تغلق نے مصری عباسیوں کی بالادستی کو قبول کیا۔ پہلا سید حکمراں، خضر خان تیمور اور شاہ رخ کی سیادت تسلیم کرتا تھا۔ بعد کے سلاطین نے ایک گم نام خلیفہ کی اطاعت کے اقرار کی روایت قائم رکھی۔ عملاً سلطنت مستقل بالذات تھی اور ایک مقتدر مملکت کے تمام اختیارات رکھتی تھی۔ اس کا طرز حکومت مطلق العنان تھا۔ سلطان مملکت کا سربراہ اور اس کی افواج کا سپہ سالار اعظم ہوتا تھا۔ شاہی خانوادہ مسلم شریعت کا پابند ہوتا تھا جس کی حفاظت اور نفاذ اس کا فرض تھا۔ جو ترک ہندوستان آئے ان کے ذہنوں پر بھلے ہی ریاست یا سلطنت کے سلسلے میں اسلامی تصور یا عمل کا بڑا گہرا اثر تھا لیکن وہ اپنے قبائلی اور خاندانی رسم و رواج کو بھی پوری طرح فراموش یا مسترد نہیں کر پائے تھے۔ انہوں نے سیاسی معاملات اور ان کے حل کرنے کے سلسلے میں عملی پختگی کا بھی اظہار کیا اور ساتھ ہی ساتھ اسلامی قوانین کے نفاذ کی بھی کوشش کی۔ شریعت کے ساتھ ساتھ انہوں نے ضوابط (Secular Laws) بھی بنائے تاکہ وہ اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ بھی انصاف کر سکیں۔ برنی انہیں ضوابط کو جہانداری کا نام دیتا ہے۔

تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ضیاء الدین برنی، علاالدین خلجی کے عہد کے ایک قاضی مغیث الدین کی سلطان سے بات چیت کا ذکر کرتا ہے۔ یہ بات چیت مال غنیمت کی تقسیم کے سلسلے میں ہے۔ قاضی مغیث نے کہا کہ شریعت (اسلامی قانون) کے مطابق مال غنیمت کا زیادہ حصہ سلطان اپنے پاس نہیں رکھ سکتا۔ جواب میں سلطان نے یہ کہا کہ وہ ریاست کی ضرورتوں کے مطابق ہی کام کرے گا چاہے شریعت میں اس کی اجازت ہو یا نہ ہو۔ وہ ریاست کی فلاح و بہبود کو ترجیح دے گا۔ سلطان کے اس ایک جملے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت عملاً مذہبی ریاست نہیں تھی حالانکہ سلاطین، مذہب اسلام کے پیرو تھے پھر بھی ریاست کے اصول و ضوابط کا تعین خاص ضرورتوں اور حالات کے مد نظر ہی ہوتا تھا۔ اس طرح یہ ثابت ہوتا ہے کہ دہلی سلطنت اپنی ان کے معتد بہ حصے میں قانوناً مشرقی خلافت کا ایک حصہ رہی مگر تمام عملی

اعتبارات سے وہ ایک آزاد مملکت تھی۔

21.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- عہد سلطنت میں جاری وساری انتظامی اداروں سے واقف ہو سکیں گے۔
- دلی سلطنت کے مرکزی نظم ونسق کو سمجھ سکیں گے۔
- سلطان کے مرتبے اور اختیارات جان سکیں گے۔
- وزرا، محکمہ جات اور ان کے فرائض کی جانکاری حاصل کر سکیں گے۔
- عدالتی اور قانونی نظام کو سمجھ سکیں گے۔

21.2 مرکزی نظم ونسق

دہلی سلطنت کے مرکزی نظم نسق کے امور سلطان کی موجودگی میں مختلف وزیروں یا امیروں کی دیکھ ریکھ میں انجام پذیر ہوتے تھے۔ سلاطین ریاست کی فلاح وبہبود کو مد نظر رکھتے ہوئے ضابطے اور توانین بناتے تھے، خطبہ اور سکے اقتدار کا مظہر سمجھے جاتے تھے۔ خطبہ جو ایک مذہبی پیغام ہوا کرتا تھا اور خصوصا جمعہ کی نماز سے پہلے دیا جاتا تھا اس میں سلطان کا نام خاص طور سے لیا جاتا تھا۔ سکوں کو جاری کرنا بھی اقتدار اعلیٰ کا مظہر تھا اور سکوں پر سلطان کا نام کندہ ہوا کرتا تھا۔ پوری سلطنت میں نظم ونسق کو قائم رکھنے امن وامان بنائے رکھنے کے لیے بہت سے انتظامی شعبے قائم کیے گئے تھے۔ ان انتظامی شعبہ جات کا مطالعہ کرنے سے سلطان کا مرتبہ اور اختیارات کے بارے میں معلومات فراہم کرلیں۔

21.3 سلطان کا مرتبہ اور اختیارات

دہلی سلطنت میں انتظامیہ کی جو ساخت ابھری وہ بنیادی طور پر عباسی طرز حکومت اور اس کے بعد غزنوی اور سلجوقی نظام حکومت پر مبنی تھی۔ اس پر قدیم ہندوستانی انتظامیہ اور کسی قدر ہندوستان کے حالات اور یہاں کی روایات کا بھی اثر تھا۔ سلاطین دہلی نے سلطنت کو بحسن و خوبی چلانے کے لیے ایک مستحکم نظام حکومت قائم کیا جس کی پیروی شیر شاہ سوری اور اس کے بعد مغل حکمرانوں نے بھی کی۔ سلطان مملکت کا سربراہ اور اس کی افواج کا سپہ سالار اعظم ہوتا تھا۔ قانوناً وہ شریعت کا پابند ہوتا تھا۔ وہ نظم حکومت کا محور ہوتا تھا۔ اس کا دربار ہی سلطنت کی سیاسی اور معاشی زندگی کا مرکز ہوتا تھا۔ سلطان علوم وفنون کا سب بڑا سرپرست تھا۔ سلطان کو شریعت کے لازمی اجزا میں ردوبدل کا کوئی اختیار نہیں تھا مگر وہ قانون کی تفسیر وتشریح کا محدود حق رکھتا تھا۔

دہلی سلطنت میں سلطان کو ایک مرکزی حیثیت حاصل تھی، وہ انتظامیہ کا محور، فوج کا سپہ سالار اعظم اور تمام عدالتی معاملات میں

منصف اعلیٰ ہوتا تھا، وہ عزت و اقتدار کا منبع اور سر چشمہ تھا، ضیاالدین برنی کے مطابق "بادشاہ کا قلب خدا کا آئینہ تھا یعنی وہ اللہ کی منشا کا مظہر تھا جس کا مطلب یہ بھی تھا کہ بادشاہ کے افعال پر نکتہ چینی نہیں کی جا سکتی تھی، پورے سلطنت عہد میں سلطان ہی حکمرانی اور حکومت کا محور و مرکز ہوتا تھا، طاقتور سلاطین جیسے بلبن اور علاالدین خلجی آمرانہ انداز میں کام کرتے تھے، اس عہد میں تخت نشینی کا کوئی باضابطہ قانون نہیں تھا حصول اقتدار کے لیے بھائیوں کے مابین جنگ ہوا کرتی تھی، سلاطین کا دربار سیاسی ہوا کرتا تھا، سلطان عام طور پر مملکت کے اہم ترین امور کو اپنی مجلس (جسے مجلس خلوت بھی کہتے تھے) میں بحث کے لیے رکھتا تھا، اس مجلس میں وزرا کے علاوہ معتمد عہدہ دار بھی حاضر رہتے تھے لیکن اس مجلس کی کوئی دستوری حیثیت نہیں تھی بلکہ یہ ایک مشاورتی مجلس ہوتی تھی، اس کے فیصلے سلطان پر لاگو نہیں ہوا کرتے تھے۔

حکمرانی کے عمل میں سلطان کو بہت سے وزیر مدد دیتے تھے۔ ہر ایک وزیر کو سلطان منتخب کرتا تھا اور وہ سلطان کی مرضی تک اپنے فرائض انجام دیتا تھا۔ سلطان کا مشیر خاص وزیر ہوتا تھا اور وہی عام طور پر حکومت کے پورے تنظیم کا نگراں بھی مانا جاتا تھا۔ اس کے کاموں میں اہم ترین کام شعبہ مالیات کا انتظام ہوتا تھا۔ ہر کام بحسن و خوبی انجام پائے اس کے لیے عہدیداروں، نقیبوں اور چوبداروں کے ایک بڑے عملے کی ضرورت ہوتی تھی۔ سلطان کا حفاظتی دستہ، اس کے ذاتی خدام، محل کا محافظ دستہ، شاہی محل میں رہنے والوں کی خدمت کے لیے عملہ اور بہت سے دوسرے کارکنوں کی ایک بڑی فوج ہوتی تھی۔ مملکت کے نظم و نسق میں شاہی محل کا بھی حصہ ہوتا تھا جس میں وکیل در، امیر حاجب، نقیب وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مرکزی حکومت کو چلانے کے لیے مختلف وزارتوں کے تحت بہت سے محکمے بھی قائم تھے۔

21.4 وزرا محکمہ جات اور ان کے فرائض

وزرا اور مختلف قسم کے عہدیداران سلطان کی مدد کیا کرتے تھے، وزیروں کی تعداد متعین نہیں تھی، وہ وزرا جو سلطان کی مدد کیا کرتے تھے، ان میں وزیر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی، وزیروں کی کوئی کونسل تشکیل نہیں دی جاتی تھی، کیونکہ مشترکہ ذمہ داری کا تصور ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔

21.4.1 وزیر

وزیر کی صلاحیت، لیاقت، حکومت میں اس کے کردار اور اختیارات وغیرہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے، جو قیوں کے وزیر نظام الملک (جن کی کتاب سیاست نامہ ہے) کے مطابق وزیر کو اہل کتاب ہونا چاہیے یعنی جنگجو کے مقابلے میں صاحب علم و فضل ہونا چاہیے، اسے وسیع تجربہ کار، فہیم و ذکی اور ہوشمند ہونا چاہیے تاکہ سلطان اس سے کسی مسئلے میں مشورہ کر سکے، اسے موقع شناس بھی ہونا چاہیے، مسلم سیاسی مفکرین کے مطابق دو قسم کے وزیر ہوتے تھے:

1۔ وزیر تفویض: وہ وزیر جسے اپنا جانشین مقرر کرنے کے علاوہ ہر طرح کے لامحدود اختیارات حاصل ہوتے تھے۔

2۔ وزیر تنفیذ: وہ وزیر جو صرف حکمراں کے احکامات کی تعمیل کا ذمہ دار ہوتا تھا۔

دہلی سلطنت میں مذکورہ دونوں طرح کے وزرا ہوا کرتے تھے۔

مسلم سیاسی مفکر وزیر کو بڑی اہمیت دیتے ہیں۔ الفخری کہتا ہے کہ ''وزیر فرماں روا اور رعایا کے بیچ میں ہوتا ہے'' فخر مدبر لکھتا ہے کہ ''کوئی سلطنت وزیر کے بغیر پائیدار یا خوش حال نہیں ہو سکتی''، وزارت قانوناً سلطان یا خلیفہ کی نیابت ہے۔ اکثر وزیر مخصوص اور محدود اختیارات رکھتے تھے۔ جن وزرا کو غیر محدود اختیار حاصل تھا، وہ سلاطین کے نام سے سلطنت پر حکومت کرتے تھے۔ سلاطین دہلی کے ماتحت وزیر مہذب اور تعلیم یافتہ ہوتے تھے۔ خان جہاں مقبول جو قابل ترین وزرا میں سے تھا باوجود ناقص تعلیم کے سب سے زیادہ دانش مند تھا۔ سلطنت دہلی کی تاریخ میں وہی ایک ایسا وزیر تھا جو کم پڑھا لکھا تھا۔ سلاطین اکثر دربار عام میں وزیر کی معرفت تمام سوالات کرتے تھے۔ وزیر کے فرائض منصبی میں فوجی مہمات کی رہنمائی کرنا، ممالک کو فتح کرنا، انعامات دینا اور بزم ورزم میں آب وتاب کے ساتھ نمایاں ہونا، خزانے میں دولت جمع کرنا، عہدیداروں کا تقرر کرنا وغیرہ، غرض کہ وزیر پورے نظام حکومت کا سربراہ ہوتا تھا، مرکزی دیوان مالیات سے اس کا براہ راست تعلق ہوتا تھا، وزیر مختلف اقسام کے مصارف کی نگرانی بھی کرتا تھا، وزیر کا فرض ہوتا تھا کہ وہ فرماں روا کو بہت سے مختلف النوع مسائل پر مشورہ دیتا رہے۔

21.4.2 دیوان وزارت

وزیر کا محکمہ دیوان وزارت کہلاتا تھا، مالیات سے اس کا تعلق ہوتا تھا، اس کی مدد ایک نائب وزیر کرتا تھا، اس کے بعد مشرف ممالک ہوتا تھا جو پوری سلطنت کا محاسب اعلیٰ (اکاونٹنٹ جنرل) ہوتا تھا، مستوفی ممالک حسابات کی جانچ پڑتال کرتا تھا (یہ آڈیٹر جنرل کے مشابہ ہوتا تھا) مشرف کا فرض ہوتا تھا کہ صوبوں اور مختلف محکموں سے جو حسابات موصول ہوں انہیں درج کرلے اور مستوفی ان کی جانچ پڑتال کرتا تھا، حسابات کے گوشواروں کی الگ الگ نقلیں مشرف اور مستوفی کو بھیجی جاتی تھیں، فیروز شاہ کے زمانے میں مشرف آمدنی سے واسطہ رکھنے لگا اور مستوفی کا تعلق خرچ سے ہو گیا، مشرف کی مدد کے لیے ایک ناظر ہوتا تھا جو مال گزاری کی وصولیابی کا نگراں ہوتا تھا، وہ مقامی حسابات کی جانچ پڑتال بھی کرتا تھا، مشرف ممالک اور مستوفی ممالک دونوں وزارتی درجے کے عہدے دار ہوتے تھے اور سلطان کی خدمت میں براہ راست رسوخ رکھتے تھے، وزیر کو عموماً ''صدر عالی'' کہا جاتا تھا اور خواجہ جہاں بھی کہا جاتا تھا یہی زیادہ مستعمل تھا، اسی طرح دیوان وقوف (خرچ کے کاغذات کو تیار کرنے والا شعبہ) دیوان مستخرج (وصول کیے گئے ایڈیشنل محصول کی دیکھ بھال کرنے والا شعبہ) اور دیوان امیر کوہی (نظام مال گزاری اور زراعت کی ترقی کے لیے شعبہ) دیوان وزارت سے متعلق ہوتا تھا، اس کے علاوہ تین اور بڑی وزارتیں تھیں، جن میں دیوان رسالت، دیوان عرض یا عارض ممالک اور دیوان انشا قابل ذکر ہیں۔

21.4.3 دیوان رسالت

دیوان رسالت ان چار خاص وزارتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر ضیاء الدین برنی نے کیا ہے، دیوان رسالت کے ذریعہ مذہبی اور دینی امور انجام پاتے تھے۔ مستحق علما وصلحا کو وظائف بھی دیوان رسالت ہی سے ملتے تھے، اس کا صدر صدر الصدور کہلاتا تھا جو عموماً قاضی ممالک بھی ہوتا تھا اور اس حیثیت سے محکمہ عدل کی نگرانی بھی کرتا تھا، وظائف اور بے محصول زمینیں عطا کرنے کے علاوہ صدر کے محکمے کا ایک

کام عوامی اخلاق کے نگراں محتسبوں کا تقرر بھی کرنا تھا۔ محتسب کا کام تھا کہ لوگ شراب نوشی سے باز رہیں، نماز روزہ کے پابند ہیں اور شرع کی پابندی کریں، ساتھ ہی ناپ تول کی جانچ پڑتال بھی محتسب کے ذمہ ہوتی تھی اور یہ سب کام دیوان رسالت کے دائرۂ اختیار میں آتے تھے، فیروز شاہ تغلق نے عوام کی شکایات سننے والا ایک محکمہ بھی قائم کیا اور اسے دیوان رسالت کا نام دیا، اس کا سربراہ کوئی ممتاز امیر غالبا وکیل در ہوتا تھا، اسی طرح علاالدین خلجی نے بازاروں پر نگاہ رکھنے کے لیے شحنہ مقرر کیا اور ان کے کام کی نگرانی کے لیے ایک بڑے امیر کو مقرر کیا، می دیوان رسالت کہلاتا تھا، اس طرح دیوان رسالت کی شکل مختلف حکمرانوں کے عہد میں مختلف رہی لیکن ضرورت مندوں میں وظائف اور بے محصول زمینوں کی تقسیم کے کام غالباً تمام عرصے میں دیوان رسالت کے پاس ہی رہا۔

21.4.4 دیوان عرض

ایک وزارت جنگ کے لیے ہوتی تھی جسے دیوان عرض کہتے تھے، عارض ممالک اس کا سربراہ ہوتا تھا، یہ فوجی معاملات کے پورے نظم ونسق کا ذمہ دار ہوتا تھا، وہ فوجی بھرتی کے لیے صدر عہدے دار کی حیثیت سے کام کرتا تھا اور فوجیوں کی تنخواہ مقرر کرتا تھا، ہر چھ سال میں کم سے کم ایک مرتبہ سوار سپاہیوں کا معائنہ کرتا تھا اور ہر سوار کے ساز و سامان اور سواری کے گھوڑے کی حالت جانچتا تھا، سپاہیوں کی ترقی اور تنزل کا انحصار عارض پر ہوتا تھا، جب بھی کوئی مہم شروع کی جاتی تو اس کی تیاریاں عارض کے ذمہ ہوتیں، فوج کی تنخواہوں کی ادائیگی کا ذمہ دار بھی عارض ہوتا تھا، تمام اہم جنگوں میں عارض خود فوج کے ساتھ ہوتا تھا، رسد اور حمل و نقل کے معاملات کی نگرانی بھی عارض کرتا تھا، عارض کی مدد کے لیے محرروں کا ایک بڑا عملہ ہوتا تھا اور مرکز و صوبوں میں اس کے نائبین ہوتے تھے، عارض ممالک گھوڑوں اور آدمیوں کے حلیوں کی فہرست رکھتا تھا اور وہ خود افواج کا نگران اعلی ہوتا تھا، عارض کا عہدہ بڑی اہمیت کا حامل ہوتا تھا اور یہ وزیر کے اختیارات کو بھی کسی قدر محدود کرتا تھا۔

21.4.5 دیوانِ انشاء

دیوان انشا، یہ خط و کتابت کا شعبہ تھا، اس کا افسر دبیر خاص یا امیر منشی کہلاتا تھا، شاہی اعلانات اور فرامین کا مسودہ تیار کرنا اور انہیں متعلقہ افسران تک بھیجناری کا کام تھا، دبیر خاص کی مدد کے لیے بہت سے دبیر (منشی) ہوا کرتے تھے، دیوان انشا سے ہی سے سلطان کے فرمان جاری ہوتے تھے، دیوان انشا کے فرائض میں یہ بات شامل تھی کہ وہ پڑوسی ملک کے حالات پر متواتر نگاہ رکھے اور ان سے حکمراں کو مطلع کرتا رہے، کبھی کبھی پڑوسی حکمراں اور شہزادوں کو باقاعدہ شاہی تحریریں بھیجی جاتی تھیں جن کے ذریعہ کی نئی تخت نشینی، کسی اہم واقعے بات کی اطلاع دی جاتی تھی، اہم اقطاع داروں اور آس پاس کے راجاؤں کو بھی دبیر ہی مختلف قسم کے خطوط اور پیغامات بھیجنے کا ذمہ دار ہوتا تھا، یہ بڑی اہمیت اور ذمہ داری کا عہدہ تھا۔

21.4.6 دربار اور شاہی حرم کے امور

شاہی حرم کے امور کا سب سے اہم افسر وکیل در ہوتا تھا۔ یہ شاہی حرم کے تمام کاموں کا نگراں ہوتا تھا جس میں شاہی مطبخ اور شاہی

اصطبل شامل تھا۔ شہزادوں کی تعلیم کی ذمہ داری بھی اسی کی ہوتی تھی، یہ عہدہ بہت اعلی رتبے کے امیر کو سونپا جاتا تھا۔ ایک عہدہ امیر حاجب کا ہوتا تھا جسے باربک بھی کہتے تھے۔ یہ درباری تقریبات کا منتظم ہوتا تھا۔ سلطان کے سامنے پیش کی جانے والی تمام درخواستیں اور استغاثے اسی کے توسط سے آگے بڑھتے تھے۔ ایک شعبہ برید خاص کا تھا۔ یہ جاسوسی یا خبر رسانی شعبے کا سربراہ ہوتا تھا۔ جاسوس یا برید سلطنت کے مختلف حصوں میں مقرر کیے جاتے تھے اور سلطان کو تمام معاملات سے مطلع کرنا انہیں کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ ایک محکمہ کارخانہ یا شاہی اسٹور اور دوسرا امور عامہ (پبلکس ورکس) کا شعبہ تھا جس کا کوئی امیر نگراں ہوتا تھا۔ کارخانہ شاہی ضرورتوں اور شاہی حرم کے لیے تمام ضروری اشیا کی پیداوار اور فراہمی کا ذمہ دار تھا۔

21.4.7 عدل وانصاف

عدل وانصاف کے لیے دیوان قضا قائم تھا جس کا سربراہ قاضی ممالک ہوتا تھا۔ اسے قاضی القضاہ بھی کہا جاتا تھا اور اس کا دفتر دارالحکومت میں ہی ہوتا تھا۔ سلطنت کے تمام مقدمات اسی کی نگرانی میں فیصل ہوتے تھے۔ حالانکہ آخری اپیل سلطان کے حضور کی جاسکتی تھی جس کا فیصلہ حتمی تھا۔ اس کے علاوہ تمام شرعی اور مذہبی امور کی دیکھ بھال قاضی القضاۃ کی ذمے داری تھی۔ وہ ماتحت عدالتوں کے فیصلے کے خلاف اپیلوں کی سماعت کرتا تھا اور مقامی قاضی مقرر کرتا تھا۔ دارالحکومت کے علاوہ ہر شہر میں ایک قاضی ہوتا تھا۔

21.4.8 امیر داد

انصاف سے متعلق ایک اور عہدے دار بھی ہوتا تھا جسے امیر داد کہتے تھے۔ دارالحکومت میں امیر داد کا عہدہ اہمیت رکھتا تھا۔ سلطان کی غیر حاضری میں امیر داد ہی عدالت کا مسند نشین ہوتا تھا اور سلطان کی موجودگی میں وہ عدالت کے انتظام وانصرام اور اس کے فیصلوں پر عمل درآمد کرانے کا ذمہ دار ہوتا تھا۔ امیر داد مسجدوں اور عمارت عامہ کی دیکھ بھال کے علاوہ کوتوال، پولیس اور محتسب کا نگراں ہوتا تھا۔

21.4.9 ڈاک، پولیس اور خفیہ نظام

سلطنت کے تمام حصوں سے اطلاعات فراہم کرنے، امن وامان قائم رکھنے اور امرا پر کنٹرول بنائے رکھنے کے لیے ڈاک، پولیس اور جاسوسی کا سہارا لیا جاتا تھا۔ پولیس کے محکمے کے روزمرہ کے فرائض کوتوال انجام دیتا تھا۔ اس کا دائرہ اختیارات دیہاتی علاقوں پر بھی محیط ہوتا تھا۔ مقدمات کی تفتیش کے علاوہ امن وامان بنائے رکھنے کی ذمہ داری کوتوال کی ہوتی تھی۔ بلبن اور علاءالدین خلجی نے ایک جاسوسی کا شعبہ بھی قائم کیا تھا جہاں سے سلطان کو ہر اہم واقعہ کی خبر مل جایا کرتی تھی۔

21.4.10 محکمہ مالیات نظام مال گزاری

عہد وسطی میں دہلی سلطنت کی آمدنی کا سب سے بڑا ذریعہ زمین کا محصول تھا۔ زیر کاشت زمین دو قسموں میں منقسم تھی:

- **عشری**- عشری زمین وہ ہوتی تھی جس پر مسلمان کاشت کرتے تھے۔ عشری زمین خراجی کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔

- **خراجی۔** خراج کا لفظ آرامی زبان میں پیغمبر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے موجود تھا۔ وہ تمام زمینیں جو طاقت کے زور پر فتح کرنے کے بعد مسلم سپاہیوں میں نہ تقسیم کر کے غیر مسلم حکمرانوں یا غیر مسلم کسانوں کو دے دی گئی ہوں، خراجی زمینیں کہلاتی تھیں۔

ان زمینوں پر حکومت کے حصے کی رقم یا محصول کتنا مقرر کیا جائے اس کا فیصلہ تجربہ کار اور مہارت رکھنے والے لوگ کھڑی فصل کی قیمت کے اندازہ سے کرتے تھے اور اسی بنیاد پر حکومت اور محصول دینے والے کے درمیان معاملہ طے پا جاتا۔ ایک دوسرا طریقہ یہ تھا کہ گزشتہ برسوں کی پیداوار کی بنیاد پر قیمت کا اندازہ لگا لیا جاتا تھا اور اسی حساب سے حکومت کے حصے کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ اس کے لیے زمین کی پیمائش ضروری تھی جسے مساحت کہا جاتا تھا۔ یہی طریقہ تھا جن کا سلطنت کے مختلف علاقوں میں رواج تھا اور ان ہی کے ذریعے حکومت/سلطنت کے حصے کی رقم یا قیمت مقرر کی جاتی تھی۔

سلطان علاء الدین خلجی کے عہد تک بٹائی کا رواج عام تھا کیونکہ برنی کے بیان کے مطابق اس نے پیمائش کا طریقہ اختیار کیا۔ غیاث الدین تغلق نے اس کو بدل کر بٹائی کو ترجیح دی لیکن کہیں کہیں پیمائش کا طریقہ بھی جاری رہا۔ پیداوار پر محصول کی شرح کیا تھی اس سے متعلق دستیاب شہادتوں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قطب الدین ایبک نے پیداوار کا پانچواں حصہ مقرر کیا تھا۔ علاء الدین خلجی کے عہد میں اس میں اضافہ کیا گیا۔ دوآب میں اس نے بعض انتظامی اور زرعی ضرورتوں کے تحت شرح محصول بڑھا کر پیداوار کا نصف کر دی تھی، جبکہ دوسری جگہوں پر پیداوار کا 1/3 لیا جاتا رہا۔ حکومت کے واجبات نقد اور جنس دونوں شکلوں میں لیے جاتے تھے۔ علاء الدین خلجی نے جب اشیا کے نرخ مقرر کیے اور سرکاری گودام اور ذخیرے قائم ہوئے تو اس نے دوآبہ کے علاقہ میں حکومت کا محصول جنس کی شکل میں وصول کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ محمد بن تغلق نے اپنے پیشرو کی مقرر کی ہوئی شرح کو جاری رکھا لیکن دوآبہ کے علاقہ میں جہاں کے لوگوں کو وہ آئے دن کی بغاوتوں کی سزا دینا چاہتا تھا اس نے اضافہ کیا جو کہیں پانچ اور کہیں دس فیصد تھا۔ سلطنت دہلی نے فصلوں کی مکمل یا جزوی خرابی کے لیے مراعات دی تھیں۔ برنی نے بٹائی کے طریقے کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس کی وجہ سے آفات ارضی و سماوی کا لحاظ رکھنا یا ان زمینوں میں جن سے پیداوار ہوتی ہے اور جن سے پیداوار نہیں ہوتی امتیاز کرنا ضروری نہیں رہا۔

محصولات

دہلی سلطنت میں زکوٰۃ، جزیہ، خراج، جزاری، گھرائی، چرائی وغیرہ جیسے محصول لیے جاتے تھے۔ اس کے علاوہ مال غنیمت میں سے بھی حکومت کو ایک مخصوص حصہ ملتا تھا۔

زکوٰۃ: زکوٰۃ یہ مال پر ڈھائی فیصد تھی۔ زکوۃ سونے چاندی اور دوسرے مال پر اس وقت واجب ہوتی ہے جب اس کی مقررہ مقدار (نصاب) ایک شخص کی ملکیت میں سال بھر سے زیادہ رہے اور نصاب سے اوپر رہے تو اس پر ڈھائی فیصد زکوٰۃ واجب ہے۔ میر شاہ نے زکوٰۃ کو حکومت کے باضابطہ محاصل میں شامل کیا ہے جب کہ فقہ فیروز شاہی میں زکوۃ کے لیے ایک علاحدہ خزانے کا تذکرہ ہے۔

جزیہ: یہ ان غیر مسلموں پر لگایا جاتا ہے جو اسلامی ریاست کے شہری ہوں ان کو ذمی کہتے ہیں۔ ذمی اسلامی ریاست میں فوجی خدمات سے بری تھے اس لیے ان کو ایک مقررہ رقم ادا کرنی پڑتی تھی۔ جزیہ عورتوں بچوں اور ضعیفوں سے نہیں لیا جاتا تھا بلکہ غربا بھی اس سے مستشنیٰ تھے۔ برہمنوں اور پنڈتوں سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا تھا، جزیہ کی رقم زیادہ نہ تھی اور سلطنت میں سب سے کم استطاعت رکھنے والا طبقہ دس تنکہ، متوسط طبقہ بیس تنکہ، اور مالدار طبقہ چالیس تنکہ ادا کرتا تھا۔ چونکہ دہلی سلطنت اسلامی ریاست نہیں تھی، اس لیے اس کو جزیہ وصول کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔

خراج: خراج کو دو قسموں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے:

- **خراج وظیفہ:** خراج وظیفہ جو نقد اور جنس کی شکل میں رقبے کی وحدت پر پیداشدہ فصلوں کی اقسام کے مطابق مقرر کی جاتی ہیں۔
- **خراج مقاسمہ:** پیداوار کے ایک خاص حصے کو لینے کے طریقہ کو خراج مقاسم کہتے ہیں۔

ان ٹیکسوں کے علاوہ بہت سے چھوٹے چھوٹے محصول بھی بعض سلاطین کے زمانہ میں وصول کیے جاتے تھے مثلاً جزاری (ذبح کیے جانے والے جانوروں پر) چرائی وغیرہ (مویشیوں کی چرائی پر)۔ ان میں سے بہت سے محصول ہندوستان میں پہلے سے رائج تھے مسلمانوں نے ان کو جاری رکھا لیکن فیروز شاہ کے عہد میں شرعی قوانین سے جواز نہ ملنے کی وجہ سے انہیں بند کر دیا گیا۔

مال غنیمت: . جنگ میں جو مال ہاتھ لگے اسے "غنیمت" کہتے ہیں۔ قانوناً ایسے تمام مال کو جمع کرنا چاہیے اور اس کا پانچواں حصہ (خمس) مملکت کے لیے علیحدہ کر دینا چاہیے۔ باقی کو تمام سپاہوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ سلطان یا سپہ سالار کے لیے یہ جائز ہے کہ وہ اپنی پسند کا کوئی جانور یا تلوار یا کوئی اور چیز اپنے استعمال کے لیے غنیمت کی تقسیم سے قبل الگ کر لے۔ اسے "صفیہ" کہتے ہیں اور تقسیم کے وقت اسے شمار نہیں کیا جاتا۔ جو حصہ بیت المال میں داخل ہوتا ہے وہ قانوناً "خمس" کہلاتا ہے۔ سلطنت دہلی میں بتدریج یہ طریقہ رائج ہو گیا کہ سپاہیوں میں پانچواں حصہ تقسیم کیا جاتا اور 4/5 حصہ بیت المال میں رکھ لیا جاتا۔ فیروز شاہ کے علما نے اسے خلاف شرع قرار دیا اور اس نے پرانے طریقے کو پھر قائم کر دیا۔ جب غنیمت تقسیم ہوتی تھی تو ایک سوار سپاہی کو پیادے کے مقابلے میں دوگنا اور بعض اوقات تین گنا مال دیا جاتا تھا۔

21.5 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

مرکزی نظام حکومت میں سب سے اہم سلطان ہوا کرتا تھا۔ وہ انتظامیہ کا محور، فوج کا سپہ سالار اور عدالتی معاملات میں منصف اعلیٰ ہوتا تھا۔ نظام حکومت کو بحسن وخوبی چلانے کے لیے سلطان کو بہت سے افسران مدد دیتے تھے، جن کو سلطان منتخب کرتا تھا۔ افسران جو سلطان کی مدد کیا کرتے تھے ان میں وزیر کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل تھی۔

دہلی سلطنت کے نظم ونسق کو چلانے کے لیے دیوان وزارت، دیوان رسالت، دیوان عرض اور دیوان انشاء جیسے اہم محکمے قائم تھے۔ وزیر کا محکمہ دیوان وزارت کہلاتا تھا اس کا تعلق مالیات سے ہوتا تھا۔ محکمہ مالیات یا نظام مالگزاری کے تحت عشری اور خراجی زمینوں سے حکومتی آمدنی کا تعین، تشخیص اور اور وصولیابی کو انجام دیا جاتا تھا۔ دیوان رسالت کے ذریعہ مذہبی اور دینی امور انجام پاتے تھے۔ اس کا صدر

صدر الصدور کہلاتا تھا۔ دیوان عرض کا سر براہ عارض ممالک ہوتا تھا۔ یہ فوجی معاملات کے نظم و نسق کا ذمہ دار تھا۔ دیوان انشاء خط و کتابت کا شعبہ تھا۔ خطوط اور پیغامات بھیجنے کا کام اسی کے تحت ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ سلطنت کے نظم و نسق کے لیے وکیل در، امر حاجب، برید خاص، برید ممالک، قاضی ممالک اور امیر داد نام کے عہدے یا شعبے بھی تھے۔ ڈاک، پولیس اور خفیہ نظام بھی تھا جس کی مدد سے حکومتی کام کاج کو بہتر طریقے سے انجام دیا جاتا تھا۔

21.6 کلیدی الفاظ (Keywords)

وزیر تفویض	:	ایسا وزیر جسے اپنا جانشین مقرر کرنے کے علاوہ لا محدود اختیارات حاصل ہوں۔
وزیر تنفیذ	:	ایسا وزیر جو صرف سلطان کے احکام کی تعمیل کا ذمہ دار ہے۔
مشرف ممالک	:	پوری سلطنت کا محاسب (اکاؤنٹنٹ جنرل)
مستوفی ممالک	:	حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والا افسر (آڈیٹر جنرل)
دیوان وقوف	:	خرچ کے کاغذات کو تیار کرنے والا شعبہ
دیوان مستخرج	:	وصول کیے گئے اضافی محصول کی دیکھ بھال کرنے والا شعبہ
دیوان امیر کوہی	:	نظام مال گزاری اور زراعت کی ترقی سے متعلق شعبہ
عارض ممالک	:	فوج کی بھرتی، سپاہیوں کے معائنے، تنخواہ کی ادائیگی اور محکمہ رسد کا ذمہ دار ہوتا تھا۔
مال غنیمت	:	جنگ میں حاصل ہونے والا مال
شریعت	:	اسلامی قانون
دبیر	:	منشی
مساحت	:	زمین کی پیمائش

21.7 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

21.7.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دہلی سلطنت کا عہد حکومت بیان کیجیے۔
2. قانوناً دہلی سلطنت کس کا ایک حصہ تھی؟
3. کس دہلی سلطان نے خلیفہ کا منصب خود اختیار کر لیا؟
4. خطبہ اور سکے کس چیز کا مظہر سمجھے جاتے تھے؟
5. مملکت کا سر براہ اور اس کی افواج کا سپہ سالار اعظم کون تھا؟

6. مسلم سیاسی مفکرین کے مطابق کتنے قسم کے وزیر ہوتے تھے؟
7. سلطنت دہلی کی تاریخ میں اچھا منتظم لیکن سب سے کم پڑھالکھاوزیر کون تھا؟
8. دیوان رسالت کے ذریعہ کون سے امور انجام پاتے تھے؟
9. محتسب کاکام کیا تھا؟
10. علاالدین خلجی نے بازاروں پر نگاہ رکھنے کے لیے کسے مقرر کیا؟

21.7.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. سلطان کے مرتبہ اور اختیارات کو متعین کیجیے۔
2. دیوان رسالت پر ایک مختصراً نوٹ لکھیں۔
3. دیران عرض سے کیا مراد ہے؟اس کے دائرہ کار متعین کیجیے۔
4. درج ذیل عہدیداروں کے کیا کام تھے

ا۔ مشرف ممالک ۲۔عارض ممالک ۳۔ برید ۴۔ قاضی الممالک

5. مال غنیمت پر ایک مختصر نوٹ لکھیں۔

21.7.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. وزیروں کے محکموں پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔
2. سلطان کے مرتبے اوراس کے اختیارات پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
3. محکمہ مال گذاری کے کام کاج کا تفصیلی تجزیہ کیجیے

21.8 مزید مطالعہ کے لیے تجویز کردہ کتابیں

1. R.P. Tripathi: Some Aspect of Muslim Rule in India
2. Ishtiaq Hussain Qureshi: The Administration of the Sultanate of Delhi
3. ہریش چندرورما؛ مدھیہ کالین بھارت جلدا(750-1540)دلی یونیورسٹی
4. پروفیسر ستیش چندرا؛ عہد وسطیٰ کا ہندوستان (سلطنت سے مغل عہد تک) حصہ اول دہلی سلطنت

اکائی 22۔ نظم ونسق: صوبائی حکومت

(Administration: Local Government)

اکائی کے اجزا

22.0 تمہید
22.1 مقاصد
22.2 اقطاع داری نظام
22.3 صوبائی ومقامی حکومت
22.3.1 صوبیدار یا والی
22.3.2 برید
22.3.3 دیوان
22.3.4 شق
22.3.5 پرگنہ
22.3.6 مقامی عہدیدار
22.4 ذرائع آمد ورفت
22.5 امن وامان
22.6 اکتسابی نتائج
22.7 کلیدی الفاظ
22.8 نمونہ امتحانی سوالات
22.8.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
22.8.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
22.8.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
22.9 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

22.0 تمہید (Introduction)

عہد سلطنت میں صوبائی علاقائی حکومتوں کے ڈھانچے اور طریقہ کار کے متعلق بہت کم معلومات موجود ہیں۔ ابتدا میں سلطنت خود ایک لچک دار ڈھانچے کی شکل میں تھی جو متعدد فوجی کمانوں (علاقوں) پر مشتمل تھی۔ کمان دار اپنے اپنے علاقوں میں ہندو سرداروں کو زیر نگیں کرنے اور ان سے اپنی فوج کے اخراجات پورے کرنے کے لیے رقمیں حاصل کرنے میں مصروف رہتے تھے۔ ایسے حالات میں پوری قلمرو میں شہری انتظامیہ کا تصور بڑا مشکل تھا۔ خلجی عہد میں ہمیں والی اور مقطی کے نام نظر آتے ہیں جو ان ٹکڑوں کے کمانڈر اور منتظم ہوتے تھے جنہیں اقطاع یا ولایت کہا جاتا تھا۔ ان الفاظ کے لیے جو اصطلاح استعمال کی جا سکتی ہے وہ صوبہ ہے اور ان کا سربراہ گورنر کہلاتا تھا۔ گورنر اور مقطی کے اختیارات حالات کی مناسبت سے مختلف ہوتے تھے۔ دہلی کی وسیع سلطنت انتظامی سہولتوں کے لحاظ سے متعدد ولایتوں، اقلیموں اور اقطاع میں تقسیم کی گئی تھی۔ یہاں کے حاکموں کو والی یا مقطی کہا جاتا تھا، صوبہ کی اصطلاح کا رواج بعد میں ہوا۔ آسانی کے لحاظ سے مورخین نے ولایتوں، اقلیموں اور اقطاع کے لیے (Province) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ہم بھی جب اس اصطلاح کو استعمال کریں گے تو اس سے مراد وہی حصے ہونگے جن کا ذکر فارسی ماخذ میں اقلیم، ولایت یا اقطاع کے تحت کیا گیا ہے۔ صوبوں کی تعداد سلطنت کی وسعت کے لحاظ سے بدلتی رہی ہے۔ گورنر (والی یا مقطی) اپنے صوبہ میں فوجی اور انتظامی معاملات کا مکمل اختیار رکھتا تھا۔ صوبہ کا انتظام قریب قریب اسی طریقہ اور طرز پر ہوتا تھا جو مرکز میں تھا۔ اس دور میں گورنر کے اختیارات بہت وسیع تھے، رسل و رسائل کے ذرائع اس قدر کم اور کم رفتار تھے کے دور دراز کے علاقوں میں بڑے گورنر جن کے وسائل زیادہ ہوتے تھے کم و بیش نیم خود مختار حکمران بن جاتے تھے۔ لکھنوتی یعنی بنگال کے گورنر کی مثال اس سلسلہ میں پیش کی جا سکتی ہے۔ وہ دہلی سے دور بھی ہوتا تھا اور اس کی ولایت بھی وسیع تھی چنانچہ اس کو مرکز کے خلاف بغاوت میں سہولت تھی، یہی سبب تھا کہ علاءالدین خلجی نے ابتدا میں دکن کی ریاستوں کو ان کے قدیم حکمرانوں کے ہی سپرد کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ان حکمرانوں کے اختیارات بہت وسیع تھے، گورنروں کے جملہ اختیارات سے متعلق تاج المآثر کا مصنف حسن نظامی لکھتا ہے کہ وہ ایک اعلی عہدیدار ہوتا تھا جس سے یہ امید کی جاتی تھی کہ وہ حکومت کے جملہ ملازمین کی نگرانی کرے گا جن میں فوجی بھی شامل ہیں۔ اس کام میں اس کو بہت احتیاط سے کام لینا پڑتا تھا تا کہ وہ شجاعت و سخاوت کی ان روایات کو قائم رکھ سکے جن کے ذریعہ ابدی نیک نامی حاصل ہوتی ہے۔ گورنر کے فرائض سلطان کی مخصوص پالیسیوں کے پیش نظر کم زیادہ ہوتے رہتے تھے، لیکن اس کا اہم ترین فرض یہ تھا کہ مرکز کی پالیسی کو عملی شکل دینے کی ہر کوشش کرے۔

22.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- دہلی سلطنت میں اقطاع نظام کے بارے میں جان سکیں گے۔
- دہلی سلطنت میں صوبائی و مقامی نظم و نسق کا تجزیہ کر سکیں گے۔

- انتظامی عہدیداروں جیسے والی، برید، دیوان وغیرہ کے بارے میں جان سکیں گے۔
- انتظامی تقسیم جیسے، اقطاع، شق، پرگنہ وغیرہ کے بارے میں سمجھ سکیں گے۔
- صوبوں میں آمد و رفت اور امن وامان کے قیام میں انتظامیہ کے کردار کا جائزہ لے سکیں گے۔

22.2 اقطاع داری نظام

التتمش نے سلطنت دہلی کے حکومتی ڈھانچے کو ایک شکل دی، اس نے اقطاع، فوج اور سکوں کا انتظام کیا۔ التتمش نے نظام حکومت میں جو اصلاحات کیں ان میں اقطاع داری نظام کی حیثیت ایک محور کی تھی۔ اقطاع کے لفظی معنی ایک ٹکڑے کے ہوتے ہیں۔ اسلامی فقہ کی اصطلاح میں قابل منتقلی زمینی محصول کا عطیہ (Transferrable Land Revenue Assignment) اقطاع کہلاتا تھا۔ اس کا مطلب حکمراں کی جانب سے کسی فرد کو زمین کا محصول عطا کرنا ہے جو کبھی بھی واپس لیا جاسکتا ہے۔ ماوردی دو قسم کے اقطاع کا حوالہ دیتا ہے:

- اقطاع تملیک، جو کھیتی باڑی والی یا بنا کھیتی باڑی والی یا پھر کانوں والی زمین پر مشتمل تھی۔
- اقطاع استغلال کا تعلق وظائف یا بھتوں سے ہوتا تھا۔

سیاسی اور معاشی اداروں کی ترقی میں اقطاع کی ایک طویل اور دلچسپ تاریخ ہے۔ اس کا وجود اسلام کے ابتدائی زمانہ سے ہی ہے۔ دہلی کے ابتدائی ترک سلاطین نے اس ادارے کا استعمال خصوصاً ہندوستانی سماج سے جاگیردارانہ نظام کے خاتمہ کے لیے اور سلطنت کے دور دور تک پھیلے ہوئے حصوں کو ایک ہی مرکز سے جوڑ دینے کے لیے کیا۔ اس کے ذریعہ رسل و رسائل کے سلسلے کی مشکلات پر قابو پایا جاسکا اور نئے نئے مفتوحہ علاقوں سے مال گزاری اکٹھا کرنا ممکن ہوا۔ اس سے سلطنت کے تمام حصوں میں نظم وضبط کا قیام بھی ممکن ہوسکا۔

اقطاع داری نظام کے تحت جو اقطاع دیے جاتے تھے وہ دو قسم کے ہوتے تھے۔

- چھوٹے اقطاع جن کے ساتھ کسی طرح کی انتظامی ذمہ داری متعلق نہ تھی اور نہ ہی مرکزی خزانہ کو جواب دہی کرنا پڑتی تھی۔ چھوٹے اقطاع داروں کو صرف عسکری خدمات کے عوض زمین کے کسی حصہ کی مال گزاری کی وصولی کی اجازت تھی۔
- بڑے اقطاع (صوبے) جو باحیثیت لوگوں کی نگرانی میں دیے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ انتظامی ذمہ داری بھی متعلق تھی اور اقطاع دار سے یہ توقع رکھی جاتی کہ وہ اپنے علاقہ میں نظم وضبط بنائے رکھے اور ہنگامی حالات میں مرکز کو فوجی دستے بھیجے۔

التتمش نے ترکوں کو بڑے پیمانے پر اقطاع دیے۔ اس کا مقصد مقبوضہ علاقوں پر سخت کنٹرول رکھنا اور ہندوستان کے جاگیردارانہ نظام کا استیصال کرنا تھا۔ اقطاع داری نظام میں ایسے عناصر موجود تھے جو جاگیردارانہ خصوصیات اختیار کر سکتے تھے، اس لیے التتمش نے سختی سے اقطاع داروں کے اپنی جڑیں جما لینے کی روک تھام کی اور جاگیردارانہ موروثی نظام کو رد کر دیا۔ جاگیرداری کے برخلاف اقطاع کو نہ تو باپ دادا کی جائیداد سمجھا جاسکتا تھا نہ ہی مقطی ایک اقطاع سے دوسرے اقطاع میں منتقلی سے انکار کر سکتا تھا۔

اقطاع کی بناء اس اصول پر تھی کہ جو زمین بیکار پڑی ہے اسے لوگوں میں تقسیم کر دیا جائے تا کہ زراعت کو ترقی ہو اور پیداوار بڑھے۔ لیکن اقطاع کا تعلق محض زمین کی آباد کاری سے نہیں تھا بلکہ اس کا تعلق نظم و نسق، عمل داری اور سیاسی ضروریات سے بھی تھا۔ اگرچہ فتوحات اور انتظامی و فوجی ضروریات کی وجہ سے اقطاع کے اصول پر مختلف طریقے سے عمل کیا جاتا تھا، لیکن اس کا حتمی مقصد بہر حال یہ تھا کہ زمین غیر آباد نہ پڑی رہے اور اس کی زرعی پیداوار میں اضافہ ہو۔

اقطاع کو زیادہ تر عسکری وں ہی کے لیے موزوں سمجھا جاتا تھا۔ جب تک اقطاع دار مملکت کی خدمت انجام دیتے، اقطاع کی آمدنی انہیں کو ملتی تھی۔ ان کی موت پر اقطاع پھر مملکت کو منتقل ہو جاتی تھی۔ رہے ان کے ورثاء تو انہیں دوسرے ذرائع سے کچھ وظیفہ دے دیا جاتا تھا۔ اقطاع دار کے بیمار پڑنے پر اور کام کے لائق نہ ہونے پر کچھ گذارا بھتہ مقرر کر دیا جاتا البتہ اقطاع دار کو نہ زمین کی ملکیت کا حق پہنچتا تھا اور نہ ہی وہ اسے وارثوں کو منتقل کر سکتا تھا۔

22.3 صوبائی اور مقامی حکومت

ضیاء الدین برنی کے مطابق جب تک دہلی سلطنت میں جنوبی علاقہ شامل نہیں تھا، سلطنت میں کل بیس صوبے تھے۔ حالانکہ مغل سلطنت کے صوبوں کے مقابلے میں یہ چھوٹے تھے۔ محمد بن تغلق کے عہد میں شہاب الدین عمری کے مطابق صوبوں کی کل تعداد 24 تھی، جس میں مالا بار تک پورا ملک تقسیم تھا۔ صوبے کے علاوہ ضلع یا تعلقہ وغیرہ جیسی چھوٹی اکائیوں سے متعلق کوئی مستند معلومات دستیاب نہیں ہیں، البتہ پرگنہ صدی اور چوراسی کا ذکر ملتا ہے۔ صدی سو گاؤں کے مجموعے کو کہتے تھے جہاں چودھری، عامل یا محصول وصول کرنے والے مقرر کیے جاتے تھے۔ خوط اور مقدم کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مقامی انتظامیہ بھی موجود تھی۔

نظم و نسق کی سہولت کے لیے سلطنت کو کئی اکائیوں میں تقسیم کیا گیا تھا، سب سے بڑی اکائی صوبہ یا اقطاع تھی۔ ان کی تعداد متعین نہیں تھی بلکہ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ سبھی اقطاع میں ایک جیسی انتظامی ساخت بھی نہیں تھی۔ ابتدا میں فاتح، فوجی سپہ سالار کو مفتوحہ علاقوں کا نظم و نسق سونپ کر اس علاقہ کو اقطاع کی شکل دے دیا کرتے تھے۔ سلطنت کی توسیع کے ساتھ ہی اقطاع کے علاوہ صوبے بھی بنائے گئے جیسے بنگال، گجرات، جونپور، مالوہ اور کچھ دکن کی ریاستیں وغیرہ۔ اس وجہ سے اقطاع اور مقطی سے زیادہ اہم صوبیدار، والی، ناظم یا نائب سلطان ہو گئے اور یہی پورے صوبے کے مالک ہوا کرتے تھے۔

22.4 صوبے دار یا والی

صوبیدار یا والی پوری ریاست کے مالک ہوا کرتے تھے۔ مرکز کا کنٹرول ان پر ہوتا تھا لیکن اندرونی معاملات میں انہیں پوری خود مختاری حاصل تھی۔ یہ اپنی فوج رکھتے تھے اور محصول کی وصولی کرتے تھے۔ صوبے میں نظم و ضبط اور امن و امان بنائے رکھنا ان کی ذمہ داری ہوتی تھی۔ یہ سلطان کو معاشی اور فوجی مدد بھی فراہم کرتے تھے۔ سلطان کی اجازت سے نئے علاقوں پر حملہ کر کے اسے فتح بھی کر سکتے تھے۔ طاقتور

سلطان تو ہمیشہ ان صوبے داروں کو اپنے کنڑول میں رکھتے تھے لیکن مرکزی طاقت کے کمزور پڑتے ہی اکثر یہ صوبے دار بغاوت کر دیا کرتے تھے۔

والی کا درجہ مقطی سے زیادہ بلند ہوتا تھا، کیوں کہ مقطی ہر صوبے دار کے لیے استعمال ہوتا تھا جب کہ والی کی اصطلاح صرف ان صوبے داروں کے لیے مخصوص تھی جو غیر معمولی اختیارات رکھتے تھے۔ صوبے دار کی ذمہ داریوں کا اندازہ ہم فیروز شاہ کی درج ذیل ہدایات سے لگا سکتے ہیں جو اس نے سندھ کے صوبے دار فتح خاں کو دی تھیں:

- انتظامیہ کے اعلی عہدیدار کی حیثیت سے کام کرنا۔
- رعایا کی حفاظت کرنا اور ان کے مفادات کی پاسبانی کرنا۔
- علما اور مذہبی لوگوں کی مدد کرنا۔
- فوج کو خوش اور مطمئن رکھنا۔
- صوبائی دیوان (شعبہ مالیات) کے کام کی نگرانی کرنا۔
- کسانوں کو استحصال اور ظلم سے محفوظ رکھنا۔
- سرکاری عہدیداروں کے کام کی نگرانی کرنا۔

فیروز شاہ نے یہ بھی ہدایات دی تھیں کہ صوبوں کے حکام تجارت کی ہمت افزائی کریں اور عام فلاح و بہبود کو ترقی دیں۔ والی ایسے عہدیدار ہوتے تھے جنہیں سلطان ان کے صوبوں میں متعین کرتا تھا اور ان کا تبادلہ، برخاستگی یا سزا اس کی مرضی پر موقوف ہوتی تھی۔ وہ اپنے صوبوں کا انتظام سلطان کے زیر احکام کرتے تھے اور وزارت مالیات کا ان پر سخت مالی انضباط ہوتا تھا۔ مور لینڈ کا یہ استدلال صحیح ہے کہ اس قسم کے عہدیدار کسی طرح جاگیر دارانہ نوعیت کے نہیں ہوتے تھے بلکہ خالصتاً نوکر شاہی کے سیدھے سادھے رکن ہوتے تھے۔

22.5 برید

ایک برید یا جاسوس افسر بھی صوبے میں متعین ہوتا تھا کہ وہ سلطان کو حالات سے باخبر رکھے۔ سلطان کے برید جو تمام سلطنت میں مختلف مقامات پر تعینات ہوتے تھے، اسے خبریں بھیجا کرتے تھے۔ سلطنت میں غیر ملکیوں کی آمد، خاص دلچسپی کے امور، مختلف عہدیداروں کے اعمال، بازاری گپ شپ سے متعلق خبریں برید دیتے تھے۔ برید سے قریبی تعلق رکھنے والا طریقہ گماشتوں اور جاسوسوں کا تھا جو مرکزی حکومت کو تمام واقعات سے باخبر رکھتا تھا۔ جہاں تک خبر رسائی کا تعلق ہے غیر ملکی سیاح سلاطین دہلی کے انتظامات خبر رسانی کی تعریف وتوصیف میں رطب اللسان ہیں۔ ابن بطوطہ کہتا ہے کہ شاہی ڈاک کے ذریعے پانچ دن میں سندھ کے خطوط دہلی پہنچ جاتے تھے، حالانکہ عام مسافر اس کو پچاس دن میں طے کرتے تھے۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ خبریں دو طریقوں سے پہنچائی جاتی تھیں، ایک گھڑ سواروں کے ذریعہ اور دوسرے ہرکاروں کے ذریعہ۔ پہلے طریقے کے لیے ہر چار کروہ (کوس) پر گھوڑے بدلے جاتے تھے۔ ہرکاروں کو لیے ہر چوتھائی کروہ پر ایک اڈہ ہوتا تھا۔ ہر اڈے پر تین چھپرے ہوتے تھے جن میں پہلے سے آدمی تیار بیٹھے رہتے تھے کہ خط آئے اور اسے لے کر دوسری چوکی تک

تیزی سے دوڑ جائیں۔ دوڑنے والا ہرکارہ ایک لاٹھی لیکر چلتا تھا جس کے دوسرے سرے پر گھنگرو بندھے ہوتے تھے۔ ان گھنگروؤں کی آواز سے معلوم ہو جاتا تھا کہ ہرکارہ پہنچ رہا ہے۔ ایسے دس دوڑنے والے جنہیں ''دھاوے'' کہتے تھے ہر چوکی پر رکھے جاتے تھے۔ دھاووں کی یہ ڈاک گھوڑوں کی ڈاک سے زیادہ تیز ہوتی تھی، اسے الاغ کہتے تھے۔

محمد بن تغلق نے ہرکاروں کی ڈاک کے علاوہ ایک اور طریقہ کار بھی منظم کیا جس سے علامتی اشاروں کو بڑی سرعت کے ساتھ منتقل کیا جا سکتا تھا۔ بڑے بڑے شہروں کے درمیان نقار خانوں کا ایک سلسلہ قائم کیا گیا تھا جس کے ذریعے خطرے کا ڈنکا اگر کسی دور دراز سرحد پر بجتا تھا تو بڑی تیزی سے سلطان تک پہنچ جاتا تھا۔ یہ امر مشتبہ ہے کہ ڈاک سے نجی خطوط بھی جاتے تھے مگر یہ امر یقینی ہے کہ جو سپاہی فوجی مہمات پر جاتے تھے وہ اپنے خاندانوں کے ساتھ خط و کتابت کر سکتے تھے۔ ڈاک سے قریبی تعلق رکھنے والا ایک طریقہ گماشتوں اور جاسوسوں کا تھا جو مرکزی حکومت کو تمام واقعات سے باخبر رکھتا تھا اس کا اثر مقامی عہدیداروں پر بہت اچھا ہوتا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ ان کے اعمال سلطان اور اس کے وزرا سے پوشیدہ نہیں رہیں گے۔

22.6 دیوان

ہر صوبے میں ایک دیوان ہوتا تھا جسے آسانی کے لیے خواجہ کہتے تھے اور جس کا تقرر سلطان، وزیر کی سفارش پر کرتا تھا وہ عموماً ایک ماہر محاسب ہوتا تھا اس کا فرض یہ ہوتا تھا کہ حسابات رکھے اور راجدھانی کو مکمل گوشوارے بھیجتا رہے۔ وزیر کا محکمہ ان ہی گوشواروں کی بنا پر مقطی سے تمام حساب کتاب طے کرتا تھا۔ سرکاری طور پر دیوان (خواجہ) حاکم صوبہ کے ماتحت ہوتا تھا مگر براہ راست سلطان کی طرف سے اس کے تقرر اور وزیر کے ساتھ اس کے روابط کے باعث وہ بڑا ذی اقتدار ہوتا تھا اور اس کی موجودگی حاکم صوبہ کے اختیارات پر ایک بندش کا کام دیتی تھی۔ ابن بطوطہ نے ایک صوبے میں کسی امیر کے ساتھ ایک والی الخراج کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہو سکتا کہ اول الذکر حاکم صوبہ ہے اور موخر الذکر خواجہ۔ ابن بطوطہ نے دیوان کے لیے والی کا لفظ استعمال کیا ہے اس بات کا مظہر ہے کہ اس کے اختیارات وسیع تھے، بعض اوقات حاکم صوبہ کا ایک نائب بھی ہوتا تھا جسے سلطان مقرر کرتا تھا۔

22.7 شقیں

مور لینڈ لکھتا ہے کہ چودھویں صدی کے دوران (شق) کا لفظ ان اصطلاحات کے لیے استعمال ہونے لگا تھا جن کا ترجمہ میں نے ''صوبہ'' کے لفظ سے کیا ہے مگر قرین قیاس یہ ہے کہ ہندو سرداروں کا اقتدار ختم ہونے اور براہ راست انتظام کے نشوونما پانے پر اصلی صوبے بہت زیادہ بڑے ثابت ہوئے۔ اور ان میں سے بعض صوبوں کو چھوٹے چھوٹے انتظامی علاقوں میں تقسیم کر دیا گیا مثلاً محمد بن تغلق نے دکن کی ولایت کو چار شقوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اسی سلطان نے دوآب کے صوبے میں بغاوت کو جس طرح فرو کیا تھا اس پر برنی کہتا ہے کہ شق داروں اور فوجداروں کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ باغیوں کو لوٹ لیں اور گرفتار کر لیں۔'' اس سے یہ ظاہر ہے کہ اس صوبے میں متعدد شق دار تھے اور اگر

وہ انتظامی عہدے دار تھے تو لازماً ان کی متعدد شقیں ہو نگی۔ دو آب براہ راست مرکزی حکومت کے ماتحت تھا اس لیے شق دار غالباً سب سے بڑے عہدیدار تھے جنہیں بغاوت کو ختم کرنے کا حکم دیا جا سکتا تھا۔

برنی نے شق کے لفظ کو انتظامی وحدت کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس کے علاوہ قطب الدین ایبک کے زمانے سے بڑی ولایتیں چھوٹی چھوٹی وحدتوں میں منقسم چلی آتی تھیں جنہیں، ''طرف'' کہتے تھے۔ صوبوں کی پرانی اور نئی تقسیم چودھویں صدی کے دوران شقیں کہلائی جانے لگیں۔ جب بہلول لودھی نے کمپل، پٹیالی، شمس آباد، سکیٹ، کوئل، مارہرہ اور جلالی کے پرگنے سلطان حسین شرقی سے فتح کیے تو اس نے ان میں سے ہر پرگنے میں ایک شق دار مقرر کیا۔ اب معلوم ہوتا ہے کہ شق کا ادارہ کبھی عام طور پر چلن میں نہیں تھا اور صرف حد سے زیادہ بڑے صوبے ہی اس قسم کی اکائیوں میں تقسیم ہوتے تھے۔ چھوٹے صوبے اور بڑی بڑی ولایتوں کی شقیں، سرکاروں کے نام سے موسوم کی جانے لگیں۔ شق دار ایک صوبے کے حصے کا ناظم ہونے کے باعث نئی انتظامیہ میں پرگنے کا سربراہ ہو گیا۔ والی اور مقطی قدرتاً غائب ہو گئے۔

22.8 پرگنہ

صوبے سے چھوٹی وحدت شق اور سرکار کے بعد پرگنہ تھی جسے مور لینڈ نے قصبے کے مترادف بتایا ہے۔ جو پرانے معنٰی کے حساب سے دیہات کا مجموعہ ہوتا تھا۔ اس کے بعد کی تقسیم میں جو آخری اکائی ہوتی تھی وہ دیہات تھی۔ ابن بطوطہ کے مطابق پرگنہ تقریباً سو دیہاتوں پر مشتمل ہوتا تھا۔ پرگنے میں ایک چودھری ہوتا تھا جو ہندوؤں کا سربراہ ہوتا تھا اور ایک متصرف ہوتا تھا جو محصول وصول کرتا تھا۔ برنی نے متصرف کو عامل کہا ہے اور اسی کے ساتھ مشرف، محاصل، گماشتوں، سرہنگوں اور دفاتر کے عملے کا بھی ذکر کیا ہے۔ مشرف معائنہ کرنے والا عہدے دار ہوتا تھا جو فیصلوں کو دیکھتا تھا اور حکومت کا حصہ متعین کرتا تھا۔ محصل کسانوں سے محصول جنس اور نقد کی صورت میں بھی وصول کرتا تھا۔ گماشتہ جو کسی کی طرف سے کسی کے کام کے لیے متعین ہوتا تھا اور سرہنگ موجودہ دور کے چپراسیوں کی طرح کسانوں یا مقدموں پر سرکاری احکام یا سمن تعمیل کراتے تھے۔ برنی کارکنان کا لفظ بھی استعمال کرتا ہے جو پرگنہ سطح پر کام کرتے تھے۔ کارکن وہ محرر ہوتے تھے جو حسابات رکھتے تھے۔

22.9 مقامی عہدیدار

جب محمد بن قاسم نے سندھ کو فتح کیا تو شہریوں اور دیہاتیوں کو اس کی اجازت دے دی گئی تھی کہ وہ محصول وصول کرنے والوں کو خود مہیا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے علاقوں اور محاصل کا انتظام ہندوؤں کے ہاتھوں میں تھا۔ قطب الدین ایبک نے اسی روایت کو جاری رکھا اور تمام سلاطین دہلی اسے قائم رکھتے رہے۔

حکومت کا معاملہ کسان سے دیہات (گاؤں) کے سربراہ کی معرفت ہوتا تھا جسے 'مقدم' یا 'مکھیا' کہتے تھے۔ مقدم کی اصطلاح مشہور اشخاص اور دیہات کے سربراہ دونوں کے لیے ہوتی تھی۔ 'مکھیا' ایک ہندو خطاب ہے اور اس کا ذکر فارسی کی تاریخوں میں کہیں نہیں ہے مگر یہ

اب بھی اتر پردیش میں استعمال ہوتا ہے اور مسلمانوں کے عہد سے پہلے سے جاری ہے۔

محاسب یا پٹواری اراضی کے محصول کے کاغذات رکھتا تھا۔ ارتھ شاستر میں اسے 'گوپ' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔ خوط اور بلاہر دیہاتی سماج کے دو انتہائی جزو ہوتے تھے۔ خوط کی اصطلاح برنی نے استعمال کی ہے۔ بلاخ مین نے بلاہر کے لیے یہ لکھا ہے وہ ادنیٰ ذات کے لوگ ہوتے تھے۔ مور لینڈ کے مطابق خوط اس ہندو سردار کو کہتے ہیں جو سلطان کی رعیت ہوتا تھا۔ اسی طرح رائے اور رانا باج گزار ہوتے تھے جو خود مختار علاقوں پر حکومت کرتے تھے اور سلطان کو مقررہ باج ادا کرتے تھے، مگر خوط محض کارندے ہوتے تھے جو حکومت کے زیر انتظام علاقوں کے محاصل کے تعین اور وصول یابی میں مدد دیتے تھے۔

مسلم حکومت کے آغاز سے ہی مقدموں اور خوطوں کو بڑی مراعات حاصل تھیں اور وہ بڑے آرام و آسائش کی زندگی بسر کرتے تھے۔ لیکن علاء الدین خلجی نے ان مراعات کو واپس لے لیا کیونکہ یہ لوگ بغاوت کے وسائل جمع کرنے میں اپنی دولت کا استعمال کرتے تھے۔ سلطان غیاث الدین تغلق نے اپنے عہدیداروں کو ہدایت کی کہ وہ خود خوطوں اور مقدموں کی زبردست ذمے داری کے پیش نظر ان سے چرائی یا خراج کا مطالبہ نہ کریں۔

خوط ایک یا ایک سے زیادہ گاؤں کا زمیندار ہوتا تھا اور مقدم گاؤں کا مکھیا ہوتا تھا۔ پٹواری بھی ایک دیہی افسر تھا کیونکہ علاء الدین خلجی نے عاملوں اور متصرفوں کی دھوکا دھڑی کی تحقیق کے لیے پٹواریوں کے حساب کتاب کے کھاتوں کی چھان بین کی تھی اور انہیں سخت سزائیں دی تھیں۔ اس طرح ایک بنیادی یا ابتدائی قسم کا نظام گاؤں کی حد تک موجود تھا۔ عدل وانصاف سے متعلق صوبوں میں سرگرمیاں مرکزی حکومت کے ڈھانچے کے مطابق تھیں۔ صوبوں میں قاضی اور صدر کی عدالتیں تھیں۔ کوتوال کا کام حالات اور نظم و نسق بنائے رکھنا تھا۔ دیہی سطح پر یعنی گاؤں میں دیوانی اور افراد سے متعلق معاملات کی سنوائی گرام سبھا کرتی تھی۔

22.10 ذرائع آمد و رفت

سلاطین دہلی کو یہ احساس تھا کہ بغیر اچھے راستوں اور سڑکوں کے ملک پر اچھی طرح سے کنٹرول ممکن نہیں ہو سکتا اس لیے قطب الدین ایبک نے جن مقطیوں کا تقرر کیا تھا ان کا ایک فرض یہ بھی تھا کہ وہ سڑکوں کی حفاظت کریں۔ التتمش اور بلبن نے جنگلوں کو کاٹ کر سڑکیں بنائیں تاکہ اندرون ملک میں آمد و رفت آسان ہو اور سرداروں کے لیے بغاوت کرنا مشکل ہو جائے۔ علاؤالدین خلجی نے سڑکوں کی حفاظت کے لیے پر زور تدابیر اختیار کی تھیں۔ غیاث الدین تغلق نے اسی حکمت عملی پر عمل کیا اور محمد بن تغلق کے عہد میں ابن بطوطہ کو ملک میں طویل سڑکوں کا جال بچھا ہوا ملا۔ دھار اور دہلی کے درمیان شاہراہ کا فاصلہ 24 دن کی مسافت تھا اور تمام راستے میں 'کروہ مینار' بنے ہوئے تھے۔ ہندوستان کے بڑے بڑے دریا آمد و رفت کا ایک اہم ذریعہ تھے۔ دریائی آمد و رفت اور نقل و حمل کی حفاظت ایک دریائی پولیس کرتی تھی جو میر بحر کے ماتحت تھی۔

مسلمانوں کے آنے سے قبل شمال اور جنوب کے علاقے علاحدہ علاحدہ تھے۔ان کے درمیان آمدورفت اور تجارت وغیرہ کا سلسلہ بہت کم تھا۔ بہت سے علاقوں میں علاءالدین خلجی کی فوجوں نے اکثر راستے پہلی مرتبہ طے کیے تھے لیکن اس کے بعد آمدورفت کا سلسلہ برابر بڑھتا رہا۔ محمد بن تغلق کے عہد میں اس نے بہت ترقی کی۔

22.11 امن وامان

آمدورفت کے راستوں اور مواصلات کو ڈاکوؤں سے محفوظ رکھنا پڑتا تھا۔ ہندو سردار مسافروں اور تاجروں کو لوٹ لیا کرتے تھے۔ صوبوں کے حکام امن وامان قائم رکھنے کے ذمہ دار ہوتے تھے۔ فن حرب کے اعتبار سے اہم مقامات پر قلعے تعمیر کیے جاتے تھے اور وہاں کوتوالوں کو تعینات کیا جاتا تھا تاکہ وہ راستوں کی حفاظت کریں اور چوروں کو سزادیں۔ بعد میں یہ کوتوال فوج دار کہے جانے لگے۔ دوسرے مقامات پر تھانے قائم کیے گئے جن میں فوجی سپاہیوں کی ٹکڑیاں ہوتی تھیں۔امن قائم رکھنے کے لیے باغی قبائل کے درمیان جنگجو مسلمانوں کو بسایا جاتا تھا۔ مثلاً بلبن نے مسلمانوں کے لیے ایسی بستیاں ہندوؤں کے مستحکم علاقے کمپیل، پٹیالی اور بھوج پور میں بسائیں اور یہاں پر قلعے اور مسجدیں تعمیر کرائیں۔اس کی وجہ سے مشرقی ہندوستان کو جانے والی سڑک فیروز شاہ کے عہد تک آمدورفت کے لیے محفوظ رہی۔ خسرو علاءالدین کے عہد کے متعلق خزائن الفتوح میں لکھتا ہے کہ ''وہی چور جو اس سے قبل دیہات کو آگ لگاتے تھے اب چراغ جلا کر شاہراہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر کسی مسافر کا کوئی دھاگے کا ٹکڑا کھو جاتا ہے تو اس نواح کے باشندے یا تو اسے تلاش کرکے دیتے ہیں یا اس کی قیمت ادا کرتے ہیں۔''

خسرو کے الفاظ میں ''دریائے سندھ کے منبع سے لیکر ساحل بحر تک کوئی شخص چور، ٹھگ یا ڈاکو کا نام بھی نہیں سنتا تھا۔'' امن وامان کی یہ کیفیت قطب الدین مبارک شاہ کے ماتحت بھی بغیر کسی کوشش کے جاری رہی۔ محمد بن تغلق کے عہد میں امن وامان ضرور ختم ہو گیا تھا لیکن فیروز شاہ نے ایک بار پھر امن بحال کیا لیکن زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ بعد کے ادوار میں شرقی سلطانوں اور سید اور لودھی حکمرانوں نے امن وامان قائم کرنے کی کافی حد تک کامیاب کوششیں کیں تھیں، لیکن پورے شمالی ہند میں مکمل امن وامان شیر شاہ کے عہد میں جا کر ہی قائم ہوا۔

22.12 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

اس اکائی کے مطالعے سے طلبا کو یہ معلوم ہوا کہ صوبائی حکومت، مرکزی حکومت کا حصہ ہوتی تھی۔ صوبے کا حاکم یا مقطی سلطان کا نمائندہ اور صوبائی حکومت کا سربراہ ہوتا تھا۔ صوبائی شعبہ جات، مرکزی شعبوں یا محکموں کی نقل ہوتے تھے۔ صوبائی محکموں کی نگرانی عموماً دارالحکومت سے کی جاتی تھی، مگر دور دراز کے صوبے یا وہ صوبے جہاں مشکلات پیش آتی تھیں وہ اپنے محکموں کا انتظام خود کرتے تھے۔ مقامی حکومت کی اکائی دیہات یا گاؤں ہوتا تھا جس میں ایک مکھیا (مقدم) اور ایک جمع خرچ لکھنے والا (پٹواری) ہوتا تھا۔ دیہات کو ملا کر پرگنے بنتے

تھے اور پرگنوں کو ملا کر شقیں بنتی تھیں۔ مقامی نظم ونسق زیادہ تر مقامی لوگوں کے ہاتھوں میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ فوجی اہمیت کے مراکز پر محافظ فوجیں متعین کر کے اور جنگجو مسلم سپاہیوں کی نوآبادیاں بسا کر امن وامان قائم رکھا جاتا تھا۔

22.13 کلیدی الفاظ (Keywords)

والی/مقطی	:	صوبے دار یا گورنر، صوبے کے فوجی اور انتظامی معاملات ان کے اختیارات میں ہوتے تھے۔
اقطاع	:	قابل منتقلی زمینی مالگذاری کا عطیہ جو موروثی یا مستقل نہیں ہوتا تھا۔
اقطاع تملیک	:	مزروعہ یا غیر مزروعہ یا پھر کانوں والی زمین
اقطاع استغلال	:	وظیفوں یا بھتوں سے متعلق زمین جس کی آمدنی ان کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔
متصرف	:	محاصل وصول کرنے والا۔ برنی نے متصرف کو عامل کہا ہے۔
مشرف	:	فصلوں کا معائنہ کرنے والا عہدیدار
برید	:	اطلاع وخبر دینے والا
پٹواری	:	قدیم ہندوستان میں اسے گوپ کہا جاتا تھا۔ گاؤں کی زمین کا حساب کتاب رکھنے والا۔
الاغ	:	تیز رفتار دوڑنے والے ہرکاروں یا دھاووں کی ڈاک
بلاہر	:	چھوٹے اور نچلے درجے کے کسان
چودھری	:	100 گاؤں یا پرگنے کا پرمکھ
خوط	:	گاؤں کا مقامی افسر۔ مال گزاری وصول کرنے والا
مقدم	:	مکھیا، گاؤں کا پردھان

22.14 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

22.14.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. والی کسے کہتے ہیں؟
2. اقطاع کسے کہتے ہیں؟
3. اقطاع تملیک کسے کہتے ہیں؟
4. اقطاع استغلال کسے کہتے ہیں؟
5. متصرف کسے کہتے ہیں؟
6. مشرف کسے کہتے ہیں؟

7. برید کسے کہتے ہیں؟

8. پٹواری کسے کہتے ہیں؟

9. الاغ کسے کہتے ہیں؟

10. بلاہر کسے کہتے ہیں؟

22.14.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. صوبائی حکومت کا سربراہ کون ہوتا تھا۔

2. اقطاع کسے کہتے ہیں مختصر نوٹ لکھیں۔

3. مقامی حکومت کی دو اہم اکائیوں پر نوٹ لکھیں۔

4. صوبائی سطح پر دیوان کے دائرہ کار کو متعین کریں۔

5. درج ذیل کی تعریف لکھیں۔

۱۔ شق ۲۔ مقدم ۳۔ پٹواری ۴۔ مقطی یا والی

22.14.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. اقطاع داری نظام پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

2. صوبائی اور مقامی حکومت پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

3. مقامی عہدیداروں کے کام کاج کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

22.15 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

1. R.P. Tripathi: Some Aspect of Muslim Rule in India.

2. I.H.Qureshi: The Administration of the Sultanate of Delhi

3. ہریش چندر ورما، مدھیہ کالین بھارت جلد 1 (750-1540) دلی یونیورسٹی

4. پروفیسر ستیش چندر، عہد وسطیٰ کا ہندوستان (سلطنت سے مغل تک) حصہ اول، دہلی سلطنت۔ این سی پی یو ایل۔ نئی دہلی

5. پروفیسر رادھے شیام، مدھیہ کالین پرشاسن، سماج اِوم سنسکرتی الہ آباد

اکائی 23۔ بہمنی سلطنت: سیاست، سماج اور معیشت

(Bahmanis: Polity, Society & Economy)

اکائی کے اجزا

23.0 تمہید
23.1 مقاصد
23.2 سیاسی پس منظر
23.2.1 بغاوت کا آغاز
23.3 فتوحات اور استحکام
23.3.1 پہلا دور
23.3.2 دوسرا دور
23.4 بہمنی سلطنت
23.4.1 قیام، استحکام اور توسیع
23.5 سیاسی نظام
23.5.1 مرکزی اور صوبائی انتظامیہ
23.5.2 فوجی تنظیم
23.6 معاشی نظام
23.7 سماج اور ثقافت
23.8 بہمنی سلطنت کا زوال
23.8.1 زوال کے اسباب
23.9 اکتسابی نتائج
23.10 کلیدی الفاظ

23.11 نمونہ امتحانی سوالات
23.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
23.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
23.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
23.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

23.0 تمہید (Introduction)

دکن میں سلطنت دہلی کے اثرات علاء الدین خلجی کے زمانے سے داخل ہونا شروع ہوئے جب اس نے دکن کی ریاستوں کو اپنا باج گزار بنایا تھا، لیکن اس نے اسے دہلی سلطنت میں شامل نہیں کیا۔ محمد بن تغلق کے عہد میں جنوبی ہندوستان باقاعدہ دہلی سلطنت کا حصہ بنا۔ حالانکہ یہ صورت حال بہت دنوں تک قائم نہیں رہی اور جلد ہی دکنی صوبے دہلی کے کنٹرول سے آزاد ہو گئے۔ دکنی صوبے بھلے ہی خود مختار ہو گئے تھے لیکن ان کی بنیاد ان امیروں کے ذریعے ڈالی گئی جو دہلی سلطنت کے پروردہ تھے۔ انہوں نے جو نظام حکومت قائم کیا وہ دہلی سلطنت کے نظم و نسق کا ہی عکس تھا۔ بہمنی سلطنت بھی ایک ایسی ہی دکنی سلطنت تھی جو سلطنت کے امیر علاؤالدین حسن گنگو بہمنی نے قائم کی تھی۔ اس باب میں ہم بہمنی سلطنت کے قیام، استحکام اور عروج وارتقا سے متعلق گفتگو کریں گے۔ اس کے علاوہ بہمنی حکمرانوں کی فتوحات، ریاستی نظم و نسق اور سماجی اور معاشی حالات کا بھی مطالعہ کریں گے۔

23.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- بہمنی سلطنت کے آغاز وارتقا پر بحث کر سکیں گے۔
- بہمنی سلطنت کی توسیع اور عروج کا جائزہ لے سکیں گے۔
- بہمنی سلطنت کے انتظامی ڈھانچے سے واقف ہو سکیں گے۔
- بہمنی حکومت کے سماجی اور معاشی حالات کو جان سکیں گے۔
- بہمنی سلطنت کے زوال پر گفتگو کر سکیں گے۔

23.2 سیاسی پس منظر

بہمنی سلطنت ان علاقوں پر مشتمل تھی جو پہلے تغلق سلطنت کا حصہ تھے۔ محمد بن تغلق نے ان دکنی علاقوں کے لیے ایک اچھا نظم حکومت قائم کیا تھا۔ ان مفتوحہ علاقوں کے لیے الغ خاں کو نائب حکومت یا وائسرائے مقرر کیا تھا۔ تمام علاقے کو ولایتوں یا صوبوں میں تقسیم

کیا گیا تھا جن میں سب سے اہم جاج نگر (اڑیسہ)، مرہٹ (مہاراشٹر)، تلنگانہ (آندھرا پردیش، تلنگانہ)، بیدر (کرناٹک)، کمپلی (کرناٹک) اور دوار سمدر (کرناٹک) شامل تھے۔ اس کے علاوہ مالوہ بھی دکن کے گورنر کے تحت کر دیا گیا۔

ہر صوبے کو کئی شقوں میں تقسیم کیا گیا اور ہر شق کو ہزاروں اور صدوں میں تقسیم کیا گیا تاکہ محصول کی وصولی میں آسانی ہو۔ ان عہدہ داروں کو ولی، شقدار، امیران ہزارہ اور امیران صدہ کہا جاتا تھا۔ اس نئی تنظیم میں سب سے طاقتور عہدہ نائب حکومت یعنی وائسرائے کا ہوتا تھا جو تمام دکنی صوبوں کا حکمراں تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس کے بعد سب سے زیادہ بااختیار امیران صدہ ہوتے تھے جن میں سے ہر ایک کے تحت 100 دیہات ہوا کرتے تھے۔ ان تمام بہترین نظم و نسق کے باوجود تغلق سلطنت مندرجہ ذیل وجوہات کی بنا پر کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

- سلطنت کے مرکز سے دوری
- جغرافیائی نشیب و فراز
- والی اور دیگر عہدے داروں کے غیر معمولی اختیارات

23.2.1 بغاوت کا آغاز

اس ضمن میں امیران صدہ کا خاص کردار رہا ہے جنھوں نے دکن کو تغلق حکومت سے آزاد کرنے کی دانستہ کوششیں کیں۔ یہ عہدے دار جو اعلیٰ حسب و نسب سے تعلق رکھتے تھے اور سیاسی اقتدار اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے تھے۔ یہ اپنے علاقوں کی رعایا سے سیدھے تعلقات بنا رہے تھے اور ان علاقوں کو ہمیشہ اپنے قبضے میں رکھنا چاہتے تھے۔ یہ ایک طرح کی کھلی بغاوت تھی۔ محمد بن تغلق نے جنوب میں ان باغیانہ سرگرمیوں کو دور کرنے کے لیے انہیں سختی سے کچلنا چاہا لیکن یہی چیز تغلق حکمرانوں کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئی۔ ہم ان تمام حالات کا مختصراً جائزہ لیں گے اور دیکھیں گے کہ کس طرح ایک نئی اور آزاد سلطنت کو عروج حاصل ہوا۔

1372ء میں سب سے پہلی بغاوت ساگر (گلبرگہ) میں ہوئی جو بہاء الدین گرشاسپ کی قیادت میں اور مقامی بااقتدار عہدیداروں یعنی امیران صدہ کی ملی بھگت سے ہوئی۔ اس بغاوت کو بھلے ہی کچل دیا گیا لیکن تغلق حکومت نے اقتدار کو مضبوط کرنے کے لیے ایسی جگہ کو راجدھانی بنانے کی ضرورت محسوس کی جہاں سے ان جنوبی صوبوں میں پنپ رہے باغیانہ رجحان کو بہتر طریقے سے دبایا جا سکتا تھا۔ چنانچہ محمد بن تغلق نے 1328ء میں دیوگیر یعنی دولت آباد کو اپنی سلطنت کی راجدھانی بنایا۔ یہ حکمت عملی بھی ناکام ہو گئی کیوں کہ جن امرا کو وہاں متعین کیا گیا وہ بہت جلد ہی بغاوت پر آمادہ ہو گئے۔ اس سے مرکزی حکومت کے اقتدار پر مزید چوٹ پہنچی۔ سب سے پہلی کامیاب بغاوت مالابار کے گورنر نے 37-1336 نے کی اور اسی کے ساتھ بیدر کے گورنر نے بھی بغاوت کر دی لیکن ان دونوں بغاوتوں کو سختی سے دبا دیا گیا۔

محمد بن تغلق نے یہ محسوس کر لیا کہ جن قابل اعتماد امرا کو اس نے دکن میں حکومت کو مضبوط کرنے بھیجا گیا تھا، ان سے ہی اسے خطرہ لاحق ہو گیا۔ چنانچہ اس نے امیروں کی ایک نئی جماعت کو ان کی جگہ لینے کے لیے بھیجا لیکن یہ حکمت عملی بھی کامیاب نہ ہو سکی کیوں کہ امیران صدہ کافی مضبوط اور نہایت نافرمان ہو چکے تھے۔

ان بغاوتوں کے نتیجے میں سال 1344ء کے دوران، دہلی سلطنت کو دکن سے مطلوب مالگذاری میں غیر معمولی کمی آنے لگی۔ اس صورت حال پر قابو پانے کے لیے محمد بن تغلق نے دکن کے علاقوں کو چار شقوں میں تقسیم کیا اور علاقائی نو مسلموں کو ان کا حاکم مقرر کیا جن کو برنی نے ''نئے نوابوں'' کا نام دیا۔

محمد بن تغلق کی اس نئی تنظیم کو ''امیران صدہ'' نے پسند نہیں کیا۔ 1345ء میں گجرات کے امراء نے ایک سازش کے تحت دہلی کی حکومت کے خلاف بغاوت کردی۔ محمد بن تغلق نے اس بغاوت میں امیران صدہ کی ملی بھگت کو محسوس کیا اور دکن کے والی کو حکم دیا کہ وہ رائچور، گلبرگہ اور بیجاپور کے امراء کو بھروچ میں سرزنش کے لیے طلب کرے۔ امیران صدہ نے سخت سزاؤں کا اندازہ کرلیا تھا، اس لیے بجائے حاضر ہونے کے انہوں نے اپنی ''خود مختاری'' کا اعلان کردیا اور دولت آباد کے امیر نصیر الدین اسمٰعیل شاہ کو اپنا سلطان تسلیم کرلیا۔ اس طرح دولت آباد کے بعد گلبرگہ وہ بڑا علاقہ تھا جس پر نئی سلطنت کی بنیاد رکھی گئی۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ دہلی سلطنت کی مخالفت میں راجپوت، دکنی، منگول، گجراتی امراء کے ساتھ ساتھ وہ افواج بھی شامل تھیں جنہیں تنجور کے راجا نے بھیجا تھا۔ اسمٰعیل شاہ جو محمد بن تغلق کے قہر وغضب سے واقف تھا اس نے حسن گنگو (علاءالدین حسن بہمن شاہ) کو باغیوں کا قائد اور نئی سلطنت کا حکمراں بنانا تسلیم کیا تاکہ بغاوت کی ناکامی کے نتیجے میں وہ اس کے نتائج سے کچھ حد تک بچ سکتا تھا۔ یہ بغاوت بھی ناکام ہو جاتی اگر محمد بن تغلق شمالی ہند کی بغاوتیں دبا کر دکن کی طرف بذات خود آجاتا لیکن باغیوں کی خوش قسمتی رہی کہ آنے والے سالوں میں سلطان شمالی ہند سے کبھی فارغ نہیں ہو پایا اور اسی بغاوت کو دبانے کے سلسلے میں جب وہ سندھ میں تھا کہ وہیں اس کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح سال 1347ء میں بہمنی سلطنت کی بنیاد قائم ہوئی۔ یہ نئی سلطنت دکن کے کافی بڑے علاقے پر مشتمل تھی جو آئندہ 150 سال تک جنوب میں ایک عظیم سیاسی طاقت بنی رہی۔

23.3 فتوحات اور استحکام

بہمنی سلطنت کی سیاسی ترقی کو ہم دو ادوار میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

- پہلا دور (1347ء تا 1422ء) جب بہمنی سلطنت کا مرکز گلبرگہ تھا۔
- دوسرا دور (1422ء تا 1538ء) گلبرگہ کی جگہ بیدر کو راجدھانی بنانے کے بعد جاری رہا۔

بیدر کو نہ صرف مرکزیت حاصل تھی بلکہ وہ علاقہ زرخیز بھی تھا لیکن اسی دور میں ہم دیکھتے ہیں کہ آفاقیوں اور دکنی امراء کے درمیان کئی تنازعات اپنے عروج پر پہنچے۔

23.3.1 پہلا دور (1347ء تا 1422ء)

اس دور میں بہت سی بڑی فتوحات عمل میں آئیں۔ چنانچہ کوٹگیری آندھرا میں، کندھار مہاراشٹر میں، کلیانی کرناٹک میں اور بھونگیر تلنگانہ کے علاقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ ساگر کھیم پھاوی، ملکھر، سیڑم (گلبرگہ)، منارام، اکاکوٹ، مہندری (مہاراشٹر) اور مانڈو (مدھیہ پردیش) بھی بہمنی حکومت کے فرمان بردار بن گئے۔ اس طرح بہمنی حکمرانی شمال میں مانڈو تک، جنوب میں رائچور تک، مشرق میں

بھونگیر تک اور جنوب میں دریائے تنگ بھدرا تک پھیل گئی تھی۔ وجے نگر کے رائے یا حکمراں بہمنی سلطنت کے لیے اس دور میں بڑے حریف ثابت ہوئے۔ ایک لڑائی میں اگرچہ تلنگانہ کے ریڈی راجاؤں سے گولکنڈہ حاصل کرلیا گیا لیکن وجے نگر کے حکمرانوں سے جنگ میں کوئی فیصلہ نہیں ہوسکا اور تنگھبدرا دوآب دونوں طاقتوں کی مشترکہ سرحد بنا رہا۔

چودہویں صدی کے آخر میں بہمنی سلطنت نے گوا کو وجے نگر کے حق میں کھودیا لیکن ایک اور مہم میں کھرالا کے رائے کو شکست دی جس کی پشت پناہی وجے نگر، مالوہ اور خاندیش کے حکمراں کررہے تھے۔ تلنگانہ میں عجیب صورتحال تھی جہاں راجمندری کے ویلما وجے نگر کی ریاست کے حامی تھے وہیں تلنگانہ کے ویلما بہمنی حکومت کے طرفداری کررہے تھے۔ جب بہمنی سلطنت نے تلنگانہ میں پیش قدمی کرنے کی کوشش کی تو آندھرا کے ویلما حکمرانوں نے ان کو روک دیا لیکن بہمنی سلطنت نے تلنگانہ کے ویلماؤں کی مدد حاصل کرکے اپنا پلہ بھاری کرلیا۔ اس طرح انہوں نے اپنی حکومت کی توسیع کو جاری رکھا۔ 15ویں صدی کے اولین دور میں اہم بات یہ ہوئی کہ ویلماس جو پہلے بہمنی سلطنت کے طرفدار تھے اب اپنی وفاداریاں وجے نگر کی ریاست سے منسوب کرچکے تھے۔

23.3.2 دوسرا دور (1422ء تا 1538ء)

اس دور میں بہمنی حکومت کا دارالخلافہ گلبرگہ سے تبدیل ہوکر بیدر قرار پایا جو مرکزیت اور سیاسی حکمت عملی کے اعتبار سے بھی موزوں تھا۔ اس کے علاوہ یہ سہ لسانی مرکز بھی جہاں مرہٹی، کنڑی اور تلگو زبانیں بولی جاتی تھیں۔ اس دور میں بھی بہمنی اور وجے نگر سلطنتوں کے درمیان ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کشمکش برابر جاری رہی۔ اسی دور میں وارنگل بہمنی سلطنت کا ایک حصہ بن گیا۔ مالوہ اور گجرات کی آزاد ریاستوں کو بھی بہمنی طاقت کا سامنا کرنا پڑا۔ حالانکہ مالوہ کی ریاست کمزور ثابت ہوئی لیکن گجرات نے دو تین مہمات کے باوجود بہمنی سلطنت سے ہار نہیں مانی۔ نتیجتاً خاندیش اور بہمنی سلطنت کے درمیان اتحاد عمل میں آیا تاکہ گجراتی سلطنت کا مقابلہ کیا جاسکے۔

1444ء تا 1536ء کے درمیان متعدد جنگی ٹکراؤ ہوئے۔ پہلی مرتبہ تو بہمنی سلطنت کو شکست اٹھانی پڑی لیکن مشہور مورخ فرشتہ کے مطابق دوسری جنگ بہمنی سلطنت کے لیے بہت فائدہ مند ثابت ہوئی۔ سنگمیشور اور خاندیش کے راجاؤں کو فرمانبردار بنالیا گیا۔ دراصل گجرات کی شکست کی اصل وجہ خود بہمنی سلطنت کا اندرونی خلفشار تھا۔ یہ جھگڑا دکنی اور آفاقی امرا کے درمیان عدم اتحاد کی وجہ سے تھا۔ دکنی امراء نے بہمنی سلطنت کے مفادات کو اہمیت نہیں دی اس لیے خاندیش کے خلاف مہم کے دوران ان کو دور رکھا گیا جس کے بہمنی سلطنت پر بہت غلط اثرات مرتب ہوئے۔ چنانچہ جب 1446ء میں جب کھیرالا اور کونکن کے راجاؤں کی سرکوبی کے لیے دکنی اور آفاقی امراء کو بھیجا گیا تو بہمنی سلطنت کو شکست سے دوچار ہونا پڑا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب محمود گاواں نے بہ حیثیت وزیر بہمنی حکومت میں اپنی اہمیت کو اجاگر کیا۔ اڑیسہ کے حکمراں نے تلنگانہ کے راجا سے اتحاد کرکے بہمنی سلطنت پر حملہ کردیا لیکن محمود گاواں نے اس حملہ کو ناکام بنادیا۔ اسی دوران مالوہ کے حکمران نے بھی چند بہمنی علاقوں جیسے بیدر وغیرہ کو فتح کرنے کی کوششیں کیں لیکن اس کو پسپا ہونا پڑا۔ حالانکہ اس جنگ میں مالوہ کے حکمراں کو گجراتی سلطنت کی مدد حاصل تھی۔

اسی طرح ریاست مالوہ کی ایک اور مہم کو بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ محمود گاواں نے ہبلی، بیلگام اور بکل کوٹ بھی فتح کر لیا۔ اس طرح بمبئی اور کرناٹک کا کافی کچھ حصہ بہمنی سلطنت کے زیر اقتدار آگیا اور یوں محمود گاواں کی قابل قدر رہنمائی میں بہمنی سلطنت اڑیسہ سے شروع ہو کر گوا اور کونکن کے ساحل تک پھیل گئی تھی۔ آخر کار محمود گاواں جن کا تعلق آفاقیوں سے تھا، دکنی امراء کے بغض و عناد کا شکار ہو گیا اور قتل کر دیا گیا۔ اس کا قتل بہمنی سلطنت کے لیے تباہ کن ثابت ہوا اور اس کا شیرازہ بکھر تا گیا۔ وجے نگر ریاست کے خلاف لڑائیوں نے 1538ء تک جا کر رہی سہی حیثیت کو بھی ختم کر دیا اور بہمنی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ سلطنت 5 ریاستوں یعنی بیدر، احمد نگر، بیجاپور، برار اور گولکنڈہ کی ریاستوں میں بنٹ گئی۔ اس کے بعد کی تاریخ ان پانچ ریاستوں کے باہمی جنگ و جدل کی کہانی ہے، جس دوران وجے نگر ریاست ایک طاقتور سلطنت میں تبدیل ہو گئی اور دکن کی یہ پانچ ریاستیں اس کے سامنے کوئی بڑی چنوتی نہیں کھڑی کر سکتی تھیں۔

23.4 بہمنی سلطنت (1347ء تا 1527ء)

23.4.1 قیام، استحکام اور توسیع

عہد وسطیٰ میں بہمنی سلطنت جنوبی ہندوستان کی ایک اہم مسلم ریاست تھی۔ یہ ریاست دکن کے شمال میں دریائے کرشنا سے ملحقہ علاقوں پر محیط تھی۔ محمد بن تغلق کی پالیسیوں کے نتیجے میں دکن کے حالات بگڑنے لگے۔ رفتہ رفتہ شورشوں اور بغاوتوں نے سر اٹھانا شروع کیا جس کے نتیجہ میں دکن اور جنوبی ہندوستان میں خود مختار ریاستیں قائم ہوئیں۔ مغربی دکن میں اسماعیل شاہ کی قیادت میں افغانی امراء نے اقتدار سنبھال لیا۔ بعض مسلم مؤرخین کا یہ خیال ہے کہ اسماعیل شاہ دولت آباد (ایلورہ کے آس پاس کا علاقہ) کے ایک قبیلہ کا سردار تھا جو محمد بن تغلق کے ماتحت تھا۔ بہر حال 3 اگست 1347ء کو ترک امیر علاءالدین حسن بہمن شاہ گنگو کے ذریعے سلطنت بہمنیہ کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا سلسلہ نسب بہت ممکن ہے تاجک یا ایرانی نسل سے تھا۔ اس نے محمد بن تغلق کے خلاف بغاوت کی اور تغلق حکومت کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھایا۔ جیسا کہ کہا گیا حسن گنگو جو ایک افغانی عہدے دار تھا اس نے بہمنی سلطنت کی مضبوط بنیاد رکھی۔ بہمنی حکومت دراصل محمد بن تغلق کی غلط حکمت عملی اور غیر دانشمندانہ دکن پالیسی کا نتیجہ تھی جس نے تغلق حکومت کو نہ صرف کمزور کیا بلکہ صوبائی عہدے دار بھی بغاوتوں پر آمادہ ہو گئے کیوں کہ وہ دہلی سے جنوب کے اس دور دراز علاقے کو نظم و ضبط کو سنبھالنے میں ہمیشہ ناکام رہا۔

ناصر الدین اسمٰعیل شاہ جس نے دہلی سلطنت کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ ظفر خاں حسن گنگو کے حق میں دستبردار ہو گیا جس نے علاءالدین بہمن شاہ کا لقب اختیار کر کے بہمنی حکومت کے تخت کو رونق بخشی۔ اس کا یہ انقلاب نہایت کامیاب ہا چونکہ دکن میں ایک آزاد اور مستحکم حکومت وجود میں آئی جن میں موجودہ کرناٹک، مہاراشٹر اور آندھر پردیش کے کئی علاقے شامل تھے جو دہلی سلطنت کے جنوبی صوبوں پر مشتمل تھی۔ بہر حال، بہمنی سلطنت نے بڑی خوبی کے ساتھ دکن کی صوبائی ریاستوں کو متحد کر کے ایک مضبوط حکومت قائم کر دی۔

دکن کے نائب مملکت جس کا نام ظفر خاں تھا اس نے محمد بن تغلق کے مقرر کردہ افغان امراء کے ساتھ مل کر دکن پر قبضہ کیا۔ اگرچہ سلطان محمد بن تغلق ان کی وفاداریوں کو شک کی نظر سے دیکھ رہا تھا اور ان باغیوں کی سرکوبی کے لیے ایک فوج کو بھی بھیجا تھا لیکن اس سلطانی

فوج کو بھی شکست ہوئی اور بہمنی اقتدار مزید مستحکم ہو گیا۔

مؤرخ فرشتہ کے مطابق پہلے حسن دہلی کے ایک برہمن نجومی گنگو کا ملازم تھا اور اسے سونے کا سکوں سے بھرا ہوا ایک برتن ملا تھا جسے وہ اپنے آقا کے پاس لے گیا۔ گنگو برہمن نے اسی وقت حسن سے پیشین گوئی کی کہ وہ ایک دن ایک بڑی سلطنت کا حکمراں بنے گا۔ اس نے حسن سے یہ وعدہ لیا کہ جب حسن حکمراں بنے تو اپنے نام کے ساتھ اس کے نام کو جوڑ کر رکھے۔ حسن نے گنگو سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی اس بات کو ہمیشہ یاد رکھے گا۔ حکمراں بن کر اس نے اپنے نام میں اپنے پرانے مالک کا نام جوڑ دیا اور حسن گنگو بہمنی کہلایا۔

ایک دوسری روایت یہ بھی ہے کہ حسن نے اپنے آپ کو ایرانی بادشاہ بہمن شاہ کے نسب سے ہونے کا دعوی کیا ہے۔ اس نے گلبرگہ کو ریاست کا صدر مقام بنایا۔ 1422ء میں بہمنی سلطان احمد شاہ نے گلبرگہ کی جگہ بیدر کو حکومت کی راجدھانی قرار دیا۔ اس طرح گلبرگہ 1397ء سے 1422ء تک سلطنت کی راجدھانی رہا۔

جنوبی ہندوستان کے اکثر سلاطین علاء الدین کی دکنی مہم (1303ء تا 1306ء) سے اپنا سلسلہ جوڑتے ہیں۔ بہمنی سلطنت، دراصل غیر مستحکم اور متعدد لڑائیوں کے ایک دور کے بعد قائم ہوئی جس نے جنوبی ہندوستان میں ایک مستحکم مسلم حکومت کا درجہ حاصل ہوا۔ محمد بن تغلق کے دور کا افغانی جنرل ظفر خاں نے دہلی کو فوجوں کو شکست فاش دے کر دکن میں ایک خود مختار مسلم حکومت کی بنیاد رکھی۔ اپنے عہد شباب میں وہ ایک برہمن کے یہاں نوکری کیا کرتا تھا اور اس مہربان برہمن نے اس کے شاندار مستقبل کی پیشن گوئی بھی کی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے بہمنی کا لقب اختیار کیا اور اس کے جانشینوں نے بھی اسی لقب کو اپنے شاہی نام کا جز قرار دیا۔

بہمنی سلطنت کی جنگوں کی وسعت مہاراشٹر اور کرناٹک سے آگے تک پائی جاتی ہیں لیکن مؤرخ فرشتہ اس کو یک طرف بتلاتا ہے اور مسلم فتوحات کا ذکر کرتا ہے اور شکستوں سے دامن بچاتا ہے۔ چنانچہ 1368ء میں وجے نگر کے دوسرے بادشاہ بکا (1350ء تا 1379ء) کو محمد شاہ بہمنی (1358ء تا 1375ء) کے ہاتھوں کو کئی بار شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ اس طرح مسلم اقتدار پہلی مرتبہ دریائے تنگبھدرا کو پار کر کے کرناٹک کے علاقوں میں قائم ہوا۔ فرشتہ 1350ء میں وجے نگر کے حدود میں بندرگاہ گوا اور بیلگام کے قلعے اور بعض دیگر مقامات کا ذکر نہیں کرتا جو وجے نگر ریاست کا حصہ تھے۔ جنگلات اور پہاڑوں پر واقع قلعے جو دریائے کرشنا اور تنگ بھدرا کے درمیان موجود تھے وہ قدرتی طور پر وجے نگر ریاست کو کسی دشمن کے حملوں سے محفوظ رکھے ہوئے تھے۔

اپنی فوجی طاقت کے عروج کے زمانہ میں بہمنی سلطنت کی وسعت اور اقتدار دیکھنے لائق تھا جو تقریباً نصف دکن پر مشتمل تھا۔ جنوب میں تنگ بھدرا سے شمال میں اڑیسہ تک مشرق میں مسولی پٹنم سے لے مغرب میں گوا تک پھیلی ہوئی تھی۔ بہمنی ریاست پر کوئی چودہ سلاطین نے حکومت کی لیکن ان میں علاء الدین بہمن شاہ، محمد شاہ اول اور فیروز شاہ بہمنی بہت اہمیت کے حامل تھے۔ احمد ولی شاہ نے گلبرگہ سے تبدیل کر کے بیدر کو سلطنت کی راجدھانی بنایا۔ بہمنی حکمراں محمد شاہ سوم کی حکمرانی کے دور میں بہمنی سلطنت اپنی طاقت کے عروج پر پہنچی اور بحیرۂ عرب کے ساحل سے خلیج بنگال تک پھیل گئی۔ مغرب میں اگر یہ گوا سے بمبئی تک پھیلی ہوئی تھی تو شمال میں اس کی سرحدیں کا کی ناڈا سے

دریائے کرشنا کے دہانے تک پہنچ گئیں۔ محمد شاہ سوم کی یہ کامیابی دراصل محمود گاواں کی مشاورت اور غیر معمولی خدمات کا نتیجہ تھیں۔

محمود گاواں کی رہنمائی میں بہمنی سلطنت انتہائی بلند مقام پر پہونچ گئی۔ محمود گاواں نے ۱۴۵۸ء سے ۱۴۸۱ء یعنی تقریباً سال بہ حیثیت وزیر اعظم تین بہمنی بادشاہوں کی شاندار خدمات انجام دیں۔ وہ ایک ایرانی سوداگر تھا۔ جو ۴۲ سال کی عمر میں ہندوستان آیا تھا اور بہمنی سلطنت کی ترقی کے لیے اپنی خدمات انجام دیں۔ وہ ہمیشہ ایک وفادار درباری کی حیثیت سے اپنے آپ کو منوایا۔ جہاں وہ ایک سادہ زندگی گزارنے کا قائم تھا وہیں بہت رحم دل بھی واقع ہوا تھا۔ وہ بڑا صاحب علم بھی تھا۔ اس کو ریاضی میں بڑی مہارت حاصل تھی۔ اس نے وقف کے تحت بیدر میں ایک درس گاہ کی بنیاد ڈالی تھی۔ جو مدرسہ محمود گاواں کی حیثیت سے آج بھی مشہور ہے۔ اس کے علاوہ وہ ایک بہترین فوجی حکمت عملی کا حامل بھی تھا۔ چنانچہ اس نے وجے نگر حکومت کے خلاف کامیاب لڑائیاں کیں۔ اڑیسہ سے لے کر بحر ہند تک مملکت کو توسیع دی اور کونکن، گوا اور کرشنا اور گوداوری کے درمیان علاقوں کو بھی فتح کیا۔

23.5 سیاسی نظام

23.5.1 مرکزی اور صوبائی انتظامیہ

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بہمنی سلطنت نے دہلی سلطنت کے نظام کی ساخت کی نقل کی ہے۔ اگرچہ سلطان کو سلطنت کے تمام معلومات پر حکمران قرار دیا گیا۔ لیکن اس کے باوجود وکیل (وزیر اعظم)' وزیر، بخشی (خزانہ دار) اور قاضیوں کے عہدے قائم کیے گئے۔ اس کے علاوہ دبیر (معتمد)، مفتی (شرعی معاملات کے لیے)، کوتوال اور محتسب (اخلاقی نظام کی نگہبانی کرنے والا) اور منہیانوں (جاسوس) کو نہ صرف ملک کے ہر گوشے میں بلکہ محمد شاہ کے دور میں دہلی میں بھی انہیں متعین کیا گیا۔

سلطنت کی نئی تنظیم کے سلسلے میں محمد شاہ بہمنی اول کے دور میں اس کو چار اطراف یا صوبوں میں تقسیم کیا گیا یعنی دولت آباد، بیدر، برار اور گلبرگہ۔ صوبے کے حاکم کو طرفدار کہا جاتا تھا۔ چونکہ گلبرگہ سب سے اہم صوبہ تھا، اس لیے اس صوبے کے لیے نہایت باعتماد لوگوں میں سے کوئی حاکم منتخب کیا جاتا تھا جس کو میر نائب (وائسرائے) بھی کہا جاتا تھا۔ اس کی حیثیت دوسرے صوبوں کے طرفداروں سے زیادہ نمایاں ہوتی تھی۔ بعد میں سلطنت کے حدود میں جیسے جیسے توسیع ہوتی چلی گئی، نئے صوبے قائم کیے گئے۔ محمود گاواں نے سلطنت کو آٹھ اطراف میں تقسیم کیا لیکن سلطنت کے مرکزی علاقوں کو سلطان کی راست نگرانی میں رکھا گیا جن کو "قصر سلطانی" کا نام دیا گیا۔

اگرچہ بہمنی سلطنت نے عباسی خلافت کو تسلیم کیا تھا لیکن انہوں نے خود مختاری اور آزادی کے ساتھ حکومت کی۔ اولین حکمران بہمن شاہ کو حکومت کے نظم و نسق کی نئی تنظیم کی فرصت اس لیے نہیں ملی کیوں کہ وہ زیادہ تر مختلف لڑائیوں میں الجھا رہا۔ اس لیے صوبائی گورنروں جن کو طرفدار کہا جاتا تھا، وہی سلطنت کے انتظام و انصرام کے ساتھ ساتھ فوجی اختیارات کو بھی حکومت کے استحکام کے لیے استعمال کرتے تھے۔ طرفدار ہی اپنے اپنے صوبوں کے محصول کو وصول کرتے تھے اور صوبائی فوج کی تنظیم کو بھی روبہ عمل لاتے تھے۔ ان کے اختیارات میں فوجی اور غیر فوجی عہدے داروں کا تقرر بھی شامل تھا۔ بعض مرتبہ ممتاز طرفداروں کو وزیر کا درجہ بھی دیا گیا۔

جب سلطنت کے حدود میں توسیع ہوتی چلی گئی تو وزیر اعظم محمود گاواں نے چار صوبوں کو تقسیم کرکے ان کی تعداد آٹھ کر دی۔ محمود گاواں نے صوبائی گورنروں کی طاقت کو محدود کرنے کے لیے ہر صوبے کے ایک علاقہ کو سلطان کی راست نگرانی میں رکھا گیا جس پر مرکزی حکومت کا کوئی نمائندہ مقرر کیا جاتا تھا۔ صوبوں کو ''اطراف'' میں تقسیم کیا گیا پھر ''اطراف'' کو ''سرکار'' میں تقسیم کیا گیا اور ''سرکار'' کو آخر نظم ونسق کی سہولت کی خاطر ''پرگنہ'' میں تقسیم کیا گیا۔ اور دیہات کو حکومتی تنظیم کی سب سے نچلی اکائی قرار دیا گیا۔

ریاست کا سربراہ تو ''سلطان'' ہی ہوا کرتا تھا جس کو تمام عاملانہ مقننہ اور عدلیہ کے اختیارات حاصل تھے۔ قانونی اختیارات لامحدود تھے۔ یہاں تک بعض بادشاہوں نے اپنے آپ کو ''خدا کا نمائندہ'' تصور کرنا شروع کر دیا تھا لیکن عملی طور پر ایسا نہیں تھا چونکہ طاقت ور وزراء اور امراء کی مشاورت ومداخلت سلطان کے لیے مائع تھی۔

حکومتی انتظام کو چلانے کے لیے کئی وزراء اس کے مددگار ہوا کرتے تھے۔ چنانچہ وزیر اعظم کو۔ ''وکیل السلطنت''، مالی امور کے لیے ''امیر الجملہ'' اور خارجی امور کے لیے ''وزیر اصراف'' مقرر تھے۔ اس کے علاوہ دو اور وزراء ''وزیر الکل'' اور ''پیشوا'' بھی تھے لیکن انہیں کوئی ذمہ داری نہیں دی گئی تھی۔ بعض مرتبہ صوبوں کے حاکم طرفداروں کا بھی بحیثیت وزیر تقرر کیا گیا۔ عدلیہ کے اعلی عہدہ دار کو سلطان کے بعد کا درجہ دے کر ''صدر الجبار'' کہا گیا۔ قانونی معاملات کے علاوہ وہ مذہبی امور اور خیراتی کاموں کی بھی نگرانی کیا کرتا تھا۔

بہمنی سلطنت کو اپنی پڑوسی ہندو ریاستوں سے مسلسل جنگ کرنا پڑتی تھی۔ اس لیے ضروری تھا کہ ایک ہنگامی اور مستند فوج کو ہمیشہ تیاری کی حالت میں رکھے۔ اس فوج کے سربراہ کو ''امیر امراء'' کہا جاتا تھا جس کا درجہ سلطان کے بعد سب سے اعلی تھا۔ سلطان نے اپنے لیے شخصی محافظ بھی رکھے تھے جنہیں ''خاصہ خیل'' کہا جاتا تھا۔ بہمنی سلطنت نے توپ بردار فوج کے ساتھ ساتھ، گھوڑ سوار فوج، پیادہ فوج اور جنگی ہاتھیوں کے دستہ پر مشتمل تھی۔

شہاب الدین محمد اول نے فوج میں منصب داری نظام کو متعارف کروایا۔ اس نظام کے تحت فوجی عہدے داروں کو ان کے منصب اور مرتبے کے مطابق جاگیریں عطا کی گئیں تاکہ فوجیوں کے اخراجات کی بھرپائی ہو سکے۔ اسی طرح بعض غیر فوجی عہدے داروں کو بھی منصب اور جاگیریں عطا کی گئیں اور تنخواہیں مقرر کیں۔

لیکن ان جاگیرداروں کو مرکزی حکومت کو اپنی آمدنی اور اخراجات کا گوشوارہ پیش کرنا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ قلعہ داروں کو بھی راست مرکزی حکومت کے لیے جواب دہ بنایا گیا تھا۔

سلاطین، منصب دار اور دیگر امراء اور اشراف، بڑے تزک واحتشام کے ساتھ زندگی گزارتے تھے جس سے بہمنی سلطنت کی خوشحالی کا پتہ چلتا ہے لیکن عام لوگوں کی زندگی کے معیار کے بارے میں کوئی شہادت نہیں ملتی۔ جیسا کہ ہندوستان کے دیگر علاقوں میں اس دور میں رعایا کی زندگی سادہ تھی، شاید اسی طرح کا معیار بہمنی سلطنت میں بھی عام آدمی کا تھا۔

بہمنی سلطنت نے جنوبی ہند میں اسلامی ثقافت کی ترقی میں بھی مددگار ثابت ہوئی تھی۔ چنانچہ نہ صرف شمالی ہند بلکہ ممالک سے بھی کئی علماء اور مبلغین نے سلطنت میں اپنا مقام پیدا کیا۔ کئی حکمرانوں نے محققین کے ساتھ ساتھ مذہبی علماء کی بھی سرپرستی کی۔ بہمنی سلطنت بکھر جانے کے باوجود کئی صوفیاء محققین اور فن کاروں وغیرہ کی اعانت کی اور کئی مدراس و عمارتیں تعمیر کیں اور جنوبی ہند میں مسلم ثقافت کو فروغ دیا۔

ہندو حکمرانوں سے مسلسل لڑائیوں نے بھی بہمنی سلطنت کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ جنوب میں سیاسی اور ثقافتی قیادت کے قیام میں اپنا حصہ ادا کرے۔ اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ بہمنی حکومت نے جنوبی ہندوستان میں ایک طویل مدت تک سیاسی اور ثقافتی ارتقا کو عملی جامہ پہنایا۔

23.5.2 فوجی تنظیم

فوج کو بھی منظم کیا گیا اور کمانڈران چیف کو عہد کا نام اب ''امیر الامرا'' ہو گیا۔ یہ فوج زیادہ تر پیادہ فوج اور گھوڑ سوار فوج اور ہاتھیوں پر مشتمل تھی۔ حکمرانوں نے اپنی حفاظت کے لیے شخصی محافظین کا ایک دستہ بھی رکھا تھا جس کو ''حاصل خیل'' کہا جاتا تھا۔ محمد شاہ اول کے کوئی چار ہزار شخص محافظین تھے۔ اس کے علاوہ سِلاح دار بھی ہوا کرتے تھے بادشاہ کے شخصی ''اسلحہ خانہ'' کی نگرانی کرتے تھے۔ ضرورت پڑنے پر ''برداران'' کو فوجی دستوں کو آگے بڑھنے کی ہدایت دی جاتی تھی۔ ''بر برداران'' دراصل ایسے فوجی عہدے داروں پر مشتمل تھا جن کو فوج میں نئی بھرتی کا اختیار بھی حاصل تھا۔ بہمنی فوج ایک انتہائی خاص خوبی یہ تھی کہ دوبارہ اور دیگر آتشیں اسلحہ کو استعمال کرنے لگی تھی جس سے ان کو فوجی فوقیت بھی حاصل ہو گئی تھی۔

نیکولو کونٹی جو اٹلی کا ایک سیاح تھا اور بہمنی سلطنت کا 15 ویں صدی میں دورہ کیا تھا۔ اس کے مطابق فوج تیر، کمان، تلوار، ڈھال اور دور پھینکے جانے والے نیزے استعمال کیا کرتی تھی۔ اس کے علاوہ آتشی دھاکہ کرنے والی مشنیں بھی استعمال کی جاتی تھیں جو میزائل کی طرح آتشی گولوں کو داغ کر ایک حصار قائم کر دیتے تھے۔ ڈوارتے باربوسا نے جو 1517ء میں ہندوستان آیا تھا، اسی طرح کے تاثرات قلم بند کیے ہیں کہ بہمنی فوج میں گرز، تیر کمان اور جنگی کلہاڑیاں جنگ کے دوران استعمال کی جاتی تھیں۔ وہ مزید کہتا ہے کہ گھوڑ سوار اونچی زین سے گویا اپنے آپ کو باندھ کر بڑی جانفشانی کے ساتھ تلوار بازی اور تیر اندازی کرتے تھے۔

ویسے محمود گاواں نے فوجی نظم و نسق کو ایک خاص نظام کے تحت کر ہی چکا تھا۔ اس نظم سے پہلے طرفداروں کو یہ اختیارات حاصل تھے کہ وہ قلعہ داروں کا تقرر بھی کر سکتے تھے۔ گاواں نے صرف ایک ہی قلعہ کو ایک طرفدار کی تحویل میں دیا اور دیگر قلعوں کو مرکزی حکومت کے تحت کر دیا۔ رشوت ستانی کی روک تھام کے لیے اس نے ہر عہدے دار کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ ۵۰۰ فوجیوں کو ایک مقررہ مشاہرہ اپنی جانب سے ادا کرے۔ اگر محصول نقد رقم کی صورت میں وصول کیا جائے تو وہ بھی اسی تناسب کے ساتھ داخل خزانہ ہوتا کہ فوجیوں کے اخراجات کی تکمیل ہو۔

23.6 معاشی نظام

محمود گاواں نے یہ احکام جاری کیے تھے کہ تمام اراضیات کی منظم طریقہ پر پیمائش کی جائے اور ہر دیہات اور شہر کے حدود کا بھی تعین کیا جائے۔اس طرح محمود گاواں کو راجا ٹوڈر مل سے اس معاملہ میں سبقت بھی حاصل ہو جاتی ہے۔ان اقدامات سے شاہی خزانہ مالا مال ہونے لگا۔

سب سے پہلے تو یہ کیا گیا کہ سلطنت کی مجموعی آمدنی کا ایک تخمینہ لگایا گیا اور امراء اشراف کی رشوت ستانی پر روک لگائی گئی۔اس طرح سلطنت کی آمدنی میں اضافہ ہونے لگا۔

بہمنی سلطنت میں تجارت اور معیشت کا کاروبار بہت عروج تھا۔ نکیٹنین جو ایک روسی سیاح تھا اور ۱۴۶۹ء تا ۱۴۷۴ء دکن آیا تھا۔ اس نے بیدر کی معاشی حالات پر کافی معلومات فراہم کی ہیں۔اس کے مطابق گھوڑوں، کپڑوں، ریشم اور سیاہ مرچ کی خرید وفروخت بہت زیادہ ہوا کرتی تھی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ تجارت کی غرض سے لوگ دس دس دن تک ایک جگہ جمع ہو جاتے تھے۔اس کے علاوہ مصطفی آباد، دابول بندرگاہ کو ایک تجارتی مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔دابول کی بندرگاہ نہ صرف ہندوستانی علاقوں سے جڑی ہوئی تھی بلکہ آفریقی بندرگاہوں سے بھی اس کا رابطہ تھا۔ چنانچہ عرب، خراساں اور ترکستان سے اعلی نسل کے گھوڑوں کو درآمد کیا جاتا تھا۔لیکن یہ تجارت اور معاشی کاروبار ہندو تاجروں کے ہاتھ میں تھا۔مشک اور پشمینہ (اون) چین سے درآمد کیا جاتا تھا۔

23.7 سماج اور ثقافت

بہمنی سلطنت کی سماجی ساخت، بین الاقوامی طرز کی تھی جس میں ہندو، مسلم، ایرانی، عرقی اور دیگر بیرونی ممالک جیسے حبش اور پرتگال کے لوگ بھی ۱۶ ویں صدی کے اولین دور میں بہمنی ریاست میں آنے لگے۔اس متنوع سماج کی یعنی مختلف اقوام پر مشتمل سماج کی اہمیت اس وقت بڑھ جاتی ہے جب ہم بہمنی سماج کی لسانیاتی ساخت پر نظر ڈالتے ہیں کہ اس ریاست میں فارسی، مراٹھی، دکنی، کنڑی اور تلگو زبانیں ہر خطے میں بولی جاتی تھیں۔

وسیع معنوں میں دیکھا جائے تو بہمنی سماج میں دو ہی طبقے تھے۔ نکیتن کے مطابق ایک طبقہ تو غرباء کا تھا تو دوسرا امراء اشراف کا طبقہ تھا جو نہایت ہی دولت مند تھا۔اس کا کہنا ہے کہ امراء چاندی سے سجے ہوئے گدوں کی بگیوں میں سواری کرتے تھے جن کو زربفت سے آراستہ گھوڑے کھینچتے تھے۔یہی نہیں بلکہ تین سو گھوڑ سوار اور پانچ سو پیادہ سپاہی اور دس مشعل بردار بھی ہوا کرتے تھے۔

نکیتن نے وزیر اعظم محمود گاواں کے بارے میں لکھتا ہے کہ اس دستر خوان پر کوئی پانچ سو افراد کھانا کھاتے تھے اور اس کے محل حفاظت کے لیے کوئی سو مسلح دستے تیاری کی حالت میں رہتے تھے۔اس بیان کے برعکس عام رعایا غریب ہی تھی۔اگرچہ نکیتن نے صرف دو طبقات کا ذکر کیا ہے لیکن ایک اور طبقہ بھی تھا جو سوداگروں کا طبقہ کہلاتا تھا۔

بہمنی حکمرانوں نے صوفیاء کی بھی بڑی عزت و تکریم کی ہے۔ابتدا تو یہ اولیاء کرام مذہبی تبلیغ کے سلسلہ میں خلجی اور تغلق کے عہد میں دکن آچکے تھے۔نوزائدہ بہمنی حکومت کو صوفیاء اور اولیاء کی سرپرستی ضروری تھی تاکہ سلطنت کی قانونی حیثیت مسلمہ ہو جائے۔جو مشائخین بہمنی سلطنت میں تشریف لائے تھے ان کا تعلق زادہ تر چشتیہ، قادریہ اور شطاریہ سلسلہ سے تھا۔بیدر سلسلہ قادریہ کا ایک اہم مرکز بن کر ابھرا۔حضرت شیخ سراج الدین جنیدی سب سے پہلے صوفی گزرے ہیں جنہیں بہمنی سلطنت کی شاہانہ سرپرستی حاصل رہی۔چشتیہ سلسلہ کے اولیاء کا نہایت ہی احترام و اکرام کیا گیا۔حضرت سید محمد الحسینی گیسودراز جو چشتیہ سلسلے کے معروف بزرگ تھے 1402ء تا 1403ء کے دوران گلبرگہ تشریف لائے۔سلطان فیروز شاہ بہمنی نے حضرت کے لیے انعام میں کئی گاؤں عطا کیے تاکہ آپ خانقاہ کے علمی و تبلیغی کام جاری رکھ سکیں۔بعد کے دور میں سلطان فیروز شاہ اور حضرت گیسودراز میں احمد شاہ کی جانشینی کے بارے میں اختلاف ابھرا جس کے باعث حضرت کو گلبرگہ چھوڑنا پڑا۔

آفاقیوں کی ایک بہت بڑی تعداد جب بہمنی سلطنت میں در آئی تو فضل اللہ کے زیر اثر شیعہ طبقہ کو بھی قدم جمانے کا موقع ملا۔احمد شاہ اول نے تقریباً تیس ہزار تنکے عراق میں کربلا کے سیدوں کو روانہ کیے تھے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیعہ مذہب کی طرف جھکاؤ رکھتا تھا۔اس کے علاوہ احمد شاہ سوم کا ایک بہت ہی بااثر وزیر بھی شیعہ مسلک سے تعلق رکھتا تھا۔

یہی نہیں بہت سی ہندو تہذیب کی روایتیں بھی بہمنی دربار میں اپنا اثر ثابت کر رہی تھیں۔فیروز شاہ بہمنی (1397ء تا 1422ء) نے وجے نگر کے شاہی خاندان کی ایک لڑکی سے شادی کی تھی جس کے باعث ہندو مسلم یکجہتی کو فروغ ملا۔یہ فسانہ محبت بھی مشہور ہے کہ سلطان فیروز ایک ہندو فقیر کے بھیس میں وجے نگر گیا تھا۔

مزید برآں اعراس کی تقاریب میں بھی ہندو رعایا شرکت کرتی تھی۔یہی نہیں عرس کے دوران لنگیت طبقے کے سربراہ جن کو جنگم کہتے تھے اپنے خاص طریقہ سے اولیاء کے عرس میں حصہ لیتے تھے اور یعنی ناقوس (شنکھ) کو بھی استعمال کرتے تھے۔دلچسپ بات یہ تھی کہ جنگم مسلمان مشائخین کی طرح جبہ اور درویشانہ چار گوشہ ٹوپی بھی پہنتے تھے۔

23.8 بہمنی سلطنت کا زوال

23.8.1 زوال کے اسباب

- خانہ جنگی:۔ بہمنی سلطنت میں ہم مستقل طور پر خانہ جنگی کے عناصر کو محسوس کرتے ہیں۔چنانچہ 18 بہمنی حکمرانوں میں سے تقریباً 12 اندرونی خانہ جنگی میں الجھے رہے اور اپنے داخلی دشمنوں سے نپٹ نہیں سکے۔
- کسی وراثتی قانون کی عدم موجودگی:۔ایک حکمران کی موت کے بعد تخت شاہی کے کئی دعویدار پیدا ہو جاتے تھے۔ظاہر ہے اس طرح ہمیشہ وراثت شاہی کے لیے ہمیشہ کش مکش و کھینچ تان جاری رہتی تھی۔

- دواہم گروہ:۔ بہمنی سلطنت کی داغ بیل ڈالنے میں ان امراء کا بڑا کردار تھا جو ایران اور ترکی سے آئے تھے اور یہاں سکونت اختیار کرلی تھی۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو یہاں کے باشندہ تھے اور انہوں نے مذہب اسلام کو قبول کرلیا تھا۔ چنانچہ وہ بھی چاہتے تھے حکومتی نظم ونسق میں ان کو برابر کا حصہ ملے۔اس طرح دکنی امیروں اور باہر سے آنے والے یعنی آفاقی امراء کے درمیان ایک تنازعہ ہوا کرتا تھا۔
- مذہبی انتہا پسندی کی روش:۔ بہمنی سلطنت کے بعض مسلم حکمرانوں نے ہندو طبقات کے ساتھ انتہائی نفرت کا اظہار کیا تھا جب کہ رعایا کی زیادہ تعداد ہندوؤں پر مشتمل تھی۔
- ناقص خارجہ پالیسی:۔ بہمنی سلاطین اپنی پڑوسی ریاستوں جیسے مالوہ، خاندیش، گجرات، تلنگانہ اور وجے نگر سے ہمیشہ لڑائیوں میں الجھے رہے اور اور ایک ٹھوس سیاسی سرحد قائم نہیں کرسکے۔
- صوبائی گورنروں کے غیر معمولی اختیارات:۔ صوبائی گورنروں کو یہ اختیارات دیے گئے تھے کہ وہ محصول کی جمع بندی کریں اور اپنی اپنی فوجوں کو مستحکم کریں لیکن جب کبھی کوئی کمزور بہمنی سلطان تخت پر آیا وہ اپنی خود مختاری کا اعلان کردیتے تھے۔
- امراء کا پر تعیش طرز زندگی:۔روسی سوداگر نکیتن جس نے بیدر میں تقریباً چار سال 1470ء سے 1474ء تک قیام کیا تھا، اپنے مشاہدہ میں یہ بتلاتا ہے کہ امراء کا طرز زندگی عیش و عشرت اور امیرانہ دبدبے کا آئینہ دار تھا جب کہ عوام غربت اور سخت مشکلات سے دوچار تھے۔اس کے علاوہ ایک عام آدمی کو بہمنی حکمرانوں کی مسلسل لڑائیوں میں الجھے رہنے کے نتائج کو بھی جھیلنا پڑا۔

23.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

15 ویں صدی کے اواخر میں جب بہمنی سلطنت کا زوال کا آغاز ہونے لگا تو وہ کئی ریاستیں میں بنٹ گئی۔ان ریاستوں کے حکمراں سابقہ بہمنی کے صوبائی گورنر یا طرفدار تھے۔اس طرح احمد نگر، بیجاپور، برار، گولکنڈہ اور بیدر کی دکنی سلطنتوں کی بنیاد پڑی۔اس طرح بہمنی سلطنت کئی ٹکروں میں تقسیم ہو کر پانچ مسلم حکومتوں کے قیام کا باعث بنی۔

1. عادل شاہی حکومت: 1489ء میں قائم ہوئی اور اس کا صدر مقام بیجاپور تھا۔ جس کو سلطنت عثمانیہ کے سلطان احمد دوم کے لڑکے نے قائم کیا تھا۔ بعد میں یہ مغل شہنشاہ اورنگ زیب کے دور (1688) میں مغل سلطنت میں شامل کرلی گئی۔ شیواجی کا والد شاہ جی بھونسلے اسی حکومت کا ملازم تھا۔
2. قطب شاہی سلطنت: قطب شاہی سلطنت کی بنیاد 1521ء میں ایک ترکمان جنگجو امیر نے رکھی اور یہ بھی 1688ء میں مغلوں کے قبضے میں چلی گئی۔
3. نظام شاہی حکومت: یہ حکومت 1490ء میں وجے نگر ریاست کے ایک باغی نو مسلم برہمن نے احمد نگر کو راجدھانی بنا کر قائم کی جو 1636ء میں مغل شہنشاہ شاہ جہاں کی ماتحتی میں چلی گئی۔

4. عماد شاہی ریاست : ایلچپور کو راجدھانی بنا کر اس ریاست کو بھی وجے نگر کے ایک نو مسلم نے 1484ء میں قائم کیا جو بعد میں 1572ء میں احمد نگر سلطنت میں ضم ہوگئی۔

5. برید شاہی حکومت : برید شاہی حکومت کو جس کی راجدھانی بیدر تھی 1490ء اور 1498ء کے دوران ایک ترک یا جارجیا کے امیر نے قائم کیا تھا۔ بیدر کے قلعہ پر 1657ء میں مغل شہنشاہ اورنگ زیب نے قبضہ کر لیا تھا۔

مختلف چھوٹے چھوٹے خطوں میں بعض آزاد حکومتیں 1609ء تک برقرار رہیں۔ تمام مذکورہ بالا پانچ ریاستوں میں قطب شاہی سلطنت ہی ایک ایسی اہم اور مضبوط حکومت رہی جس کو آندھرا کی تاریخ میں اہم ترین سمجھا جاتا تھا۔

خلاصہ کلام میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ درحقیقت امیران صدہ ہی اس سلطنت کو قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ تشکیل حکومت کے دور میں بہمنی سلاطین ہمیشہ وجے نگر، مالوہ اور تلنگانہ کے حکمرانوں سے نبرد آزما رہے۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کس طرح آفاقیوں اور دکنی امراء کے درمیان رنجشیں اور لڑائیاں بہمنی حکومت کے زوال کا سبب بنیں۔ جہاں تک حکومتی نظم ونسق کی نوعیت کا معاملہ ہے، ہم اسے سلطنت دہلی کے انتظامیہ کے مماثل ہی پاتے ہیں۔ البتہ دکن میں عہدوں کے لیے نئی لفظی ترکیبیں یا اصطلاحات وضع کی گئیں۔ ویسے زمینوں کی پیمائش کے لیے محمود گاواں کی اصلاحات بھی ہمیں متوجہ کرتی ہیں۔

23.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

آفاقی	=	یہ لفظ "آفاق" سے بنا ہے جس کے معنی کائناتی ہوتے ہیں=لیکن یہاں آفاقی سے مراد و نووارد لوگ تھے جو ایران، عراق، ترکستان، شمال مغربی ایشیاء جیسے تاجکستان وغیرہ سے آئے تھے۔
امیران ہزارہ	=	وہ امراء جو ایک ہزار دیہاتوں پر حکمراں تھے۔
دکنی	=	دکن کے اشراف
درویش	=	خانقاہی بزرگ یا اولیاء
اقلیم	=	ایک صوبہ کی اکائی
انعام	=	بغیر کسی محصول کے کچھ زمینوں کا مالک بنا دینا
جنگم	=	لنگیت طبقہ کا سربراہ
خانقاہ	=	صوفیاء کا مرکز جہاں تصوف کی تعلیم دی جاتی تھی
خاصہ خیل	=	سلطان کے ذاتی محافظوں کا دستہ
ملک التجار	=	سوداگروں کا سربراہ
نائب سلطنت	=	دکن کا وائسرائے

مور	=	مسلم
شِق	=	انتظامی علاقہ جو ایک ضلع کے برابر ہوا کرتا تھا
شق دار	=	شق کا حکمراں (یا ضلعی عہدے دار)
سلاح دار	=	اسلحہ خانہ (ہتھیاروں وغیرہ) کا سربراہ
طرف دار	=	صوبائی گورنر

23.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

23.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. دولت آباد کا قدیم نام کیا تھا؟
2. بہمنی سلطنت کے بانی کا نام بتایئے۔
3. بہمنی سلطنت کے علاقے اس سے پہلے کس سلطنت کا حصہ تھے؟
4. بہمنی سلطنت کی راجدھانی کا نام بتایئے؟
5. تغلق سلطنت کن تین وجوہات سے کمزور ہو رہی تھی؟
6. امیران صدہ کون تھے؟
7. ساگر کہاں واقع ہے؟
8. ساگر کی بغاوت کا قائد کون تھا؟
9. بہمنی سلطنت کی ترقی کو کتنے ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں؟
10. بہمنی سلطنت سے الگ ہوئی پانچ ریاستوں کا ذکر کیجیے۔

23.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. بہمنی سلطنت کے بانی کے بارے میں ایک نوٹ لکھیے۔
2. بہمنی حکمرانی میں فوجی انتظام کس طرح کا تھا؟
3. بہمنی معاشی نظام یا طرز معیشت پر بحث کیجیے۔
4. بہمنی سلطنت کے زوال کے کیا اسباب تھے، بیان کیجیے۔
5. محمود گاواں نے حکومتی نظم و نسق اور فوجی تنظیم میں وہ کونسی بڑی تبدیلیاں کی تھیں؟

23.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. بہمنی سلطنت کے عروج اور استحکام پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔
2. بہمنی سلطنت کے نظم ونسق کے بارے میں تفصیلات لکھیے۔
3. بہمنی سلطنت کی معاشرتی اور ثقافتی صورتحال پر تفصیل سے روشنی ڈالیے۔

23.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

---

1. Nikantha Shastri : *A History of South India*
2. Haig, Sir Thomas Wolseley (1925). *The Cambridge History of India* (Volume III). Cambridge University Press.
3. Sherwani, Haroon Khan (1946). *The Bahmanis of the Deccan*.
4. Yazdani, Ghulam (1947). *Bidar, Its History and Monuments*.

اکائی 24۔وجے نگر ریاست: سیاست، سماج اور معیشت

(Vijayanagara: Polity, Society & Economy)

اکائی کے اجزا

24.0 تمہید

24.1 مقاصد

24.2 وجے نگر سلطنت

24.2.1 سلطنت کا قیام

24.3 سیاسی تاریخ

24.4 کرشنا دیورائے

24.5 سلطنت کا زوال

24.6 غیر ملکی سیاحوں کے بیانات

24.7 وجے نگر حکومت کی نوعیت

24.7.1 عسکری یا جنگی ریاست

24.7.2 ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ریاست

24.7.3 جنوبی ہند میں ہندو دفاع کا آخری قلعہ

24.8 انتظامی، سماجی اور معاشی حالات

24.8.1 انتظامیہ

24.8.2 محصول نظام

24.8.3 کسانوں کی حالت

24.8.4 تجارت اور زراعت

24.9 اکتسابی نتائج

24.10 کلیدی الفاظ
24.11 نمونہ امتحانی سوالات
24.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات
24.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات
24.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات
24.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں

24.0 تمہید (Introduction)

دہلی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی وجے نگر اور بہمنی سلطنتوں کا عروج شروع ہوا جن میں وجے نگر سلطنت کا اقتدار کرشنا کے جنوب میں رامیشورم تک پھیلا ہوا تھا۔ وجے نگر سلطنت پر کئی حکمراں خاندانوں نے حکومت کی۔ ان میں سنگم، سالو، تلوا اور اراوید و خاندان نے وجے نگر سلطنت پر کم و بیش 200 سال تک حکومت کی۔ سنگم دور میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور تلوا دور میں یہ اپنے عروج کو پہنچی۔ اراویڈو خاندان کی حکومت کے دوران اس کا مکمل زوال ہو گیا۔ پہلے تین خاندان کی حکومت کے دوران اس کی راجدھانی وجے نگر تھی جس کے بعد چوتھے خاندان کے دور میں راجدھانی پینو گونڈہ کو بنایا گیا۔ وجے نگر سلطنت کو اپنی شروعات سے ہی اپنی ہمعصر طاقتوں سے لڑنا پڑا۔ ان میں سب سے اہم اڑیسہ کے گجپتی حکمراں، بہمنی سلطنت کے سلطان، مدورائی سلطنت اور یورپی طاقت پرتگالی تھے۔ تلنگانہ کے ریڈی اور آندھرا کے ویلما موقع پرست تھے جو کبھی بہمنیوں کی طرف تو کبھی وجے نگر کی طرف سے لڑتے تھے۔ آندھرا کے ویلما تو دو حصوں میں بنٹ گئے تھے جن میں پہلا دھڑا جنگ میں بہمنی سلطان کے ساتھ تھا تو دوسرا حصہ وجے نگر کے رائے کی طرف سے لڑ رہا تھا۔

متواتر جنگوں کے باوجود حدودِ سلطنت میں امن وامان اور قانون برقرار رہا اور وجے نگر سلطنت مستحکم رہی، جس کے نتیجے میں یہاں تجارت اور بیوپار پوری طرح پھلے پھولے۔ بہت سے حکمرانوں نے زراعت کی طرف توجہ دی اور دارالحکومت اور دوسرے بڑے شہر آباد کیے اور ان میں شاندار عمارتیں بنوائیں۔ کئی حکمراں فن اور ثقافت کے بھی بڑے سرپرست گزرے۔

جب تک بہمنی سلطنت مضبوط اور متحد رہی اس کے سلطان وجے نگر کے رایوں کو اپنے باجگذار کے طور پر سمجھتے تھے اور کئی مرتبہ انہیں شکست دے کر ان کی راجدھانی میں بھی داخل ہو چکے تھے۔ پندرھویں صدی کے آخر میں اندرونی خانہ جنگی اور محمود گواں جیسے قابل وزیر کے قتل کے بعد بہمنی سلطنت کے ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے۔ اس کا فائدہ وجے نگر ریاست نے اٹھایا اور جنوب کی سب سے عظیم طاقت بن گئی۔ یہ عروج کچھ ہی دن کا تھا۔ عظیم حکمران کرشنا دیو رائے کے 1530 میں آنکھ بند کرتے ہی وجے نگر کے حکمراں نایکوں کے ہاتھ میں کھلونا بن گئے۔ ان نایکوں میں سب سے اہم رام راج تھا جو بہمنی سلطنت کی جانشیں ریاستوں کو آپس میں لڑا کر اپنی طاقت میں اضافہ کرتا رہا۔ اس کی

یہی پالیسی اس کے زوال کا سبب بنی۔ گولکنڈہ کے قطب شاہی حکمران نے اس کی نیت بھانپ لی اور اس کی پہل پر بیجاپور، گولکنڈہ اور احمد نگر کا ایک فوجی اتحاد عمل میں آیا۔ 1565 میں تالی کوٹا کی جنگ میں ان نئے اتحاد کے ہاتھوں وجے نگر سلطنت کی شکست فاش ہوئی اور اس کی راجدھانی وجے نگر کو کھنڈر میں تبدیل کر دیا گیا۔ وجے نگر کے اکثر علاقے کو ان بہمنی ریاستوں نے آپس میں بانٹ لیا۔ چوتھے حکمراں خاندان نے نئی راجدھانی پینو گونڈہ سے کچھ اور عرصے حکومت کی جس کے بعد اس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ یہی وہ وقت تھا جب ہندوستان میں ایک یوروپی طاقت یعنی پرتگالی داخل ہوئے اور انہوں نے اپنی بہتر اور ترقی یافتہ بحری بیڑے کے بل پر سمندر راور اس کے آس پاس کے سرحدی علاقوں پر اپنا تسلط جما کر بحری تجارت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کی۔ جنوبی ہند کے کسی حکمراں نے اس نئے خطرے کی طرف توجہ نہیں دی اور نہ ہی بحری بیڑے کو مضبوط کرنے پر زور دیا۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ نوآبادیت کی اس لہر کو سمجھ نہیں سکے جو عنقریب سارے ملک ہندوستان کو اپنی آغوش میں لینے والی تھی۔

24.1 مقاصد (Objectives)

اس اکائی کے مطالعے کے بعد آپ

- وجے نگر سلطنت کے قیام اور اس کی سیاسی تاریخ کے بارے میں جان سکیں گے۔
- عظیم حکمراں کرشنا دیورائے کے کارناموں اور فتوحات کو جان سکیں گے۔
- اس سلطنت کے بارے میں غیر ملکی سیاحوں کے بیانوں پر روشنی ڈال سکیں گے۔
- وجے نگر حکومت کی نوعیت کے بارے میں جان سکیں گے۔
- وجے نگر حکومت کے انتظامی، سماجی اور معاشی حالات کا تجزیہ کر سکیں گے۔

24.2 وجے نگر سلطنت

24.2.1 سلطنت کا قیام

مورخوں میں وجے نگر سلطنت کی ابتدا کے بارے میں اتفاق نہیں ہے۔ اس سلطنت کے قیام میں ہری ہر اور اس کے بھائی بکا نے جو اہم کردار ادا کیا اُسے تو عام طور پر تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس خاندان کی اس سے پہلے کی تاریخ واضح نہیں ہے۔ عام روایت کے مطابق یہ دو بھائی پانچ بھائیوں کے ایک خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور وارنگل کے کاکتیاؤں کے جاگیر دار رہ چکے تھے۔ اس کے بعد انہوں نے آج کے کرناٹک میں کامپلی کے حکمرانوں کے یہاں خدمات انجام دیں جہاں یہ آہستہ آہستہ وزیروں کے عہدوں تک ترقی کر گئے۔ پھر جب ایک مسلم باغی کو پناہ دینے کے سلسلے میں محمد بن تغلق نے کامپلی پر حملہ کر کے اُسے فتح کیا تو یہ دونوں بھائی گرفتار ہوئے اور قیدیوں کی طرح دہلی بھیج دیے گئے۔ یہاں یہ مسلمان ہو گئے۔ کچھ دن بعد کامپلی میں ترک حکومت کے خلاف بغاوت ہوئی اور اسے فرو کرنے کے لیے ان دونوں بھائیوں کو ہی کامپلی بھیجا گیا۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے اسلام چھوڑ کر پھر اپنا پرانا مذہب اختیار کیا اور خود بھی بغاوت میں شامل ہو گئے۔ بہر طور موجودہ دور کے بہت

سے مورخ اس روایتی بیان کو تسلیم نہیں کرتے۔اُن کے مطابق ان کی وارنگل میں خدمات انجام دینے کی بھی بہت کم شہادت موجود ہے اور نہ اس کے بعد قید ہونے اور مذہب کی تبدیلی کی کوئی ثبوت ملتا ہے۔ان کے مطابق ہری ہر اور بکا کرناٹک کے اُن 75 نائکوں میں سے تھے جنہوں نے ترک سلطنت کے خلاف بغاوت کی تھی اور یہ شیو بھکتوں کے ایک مضبوط اور طاقتور خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ مورخ اس بات کو بھی نہیں مانتے کہ اس خاندان کا آندھرا سے پہلے کوئی تعلق موجود تھا۔ بہرحال اس اختلاف سے قطع نظر ہمارے لیے جو چیز اہم ہے وہ یہ ہے کہ وجے نگر کے حکمرانوں نے اپنے انتظامی ڈھانچے کی تشکیل میں صرف تامل علاقے کے چول حکمرانوں سے متاثر نہیں ہوئے بلکہ تیلگو علاقے کے کاکتیہ اور کنڑ علاقے کے ہوئسال حکمرانوں کی روایات اور طریقہ کار کو بھی اپنایا۔اس طرح یہ صرف صوبائی حکمراں یا سردار نہیں تھے بلکہ ان کی حیثیت پورے جنوبی ہندوستان کے ایک نمائندے کی تھی۔

24.3 سیاسی تاریخ

جنوبی ہندوستان میں تغلق حکومت کے خاتمے سے بڑی پیچیدہ سی صورتِ حال پیدا ہوگئی۔ میسور کے ہوئسال جیسے کچھ باقی ماندہ حکمراں کسی نہ کسی صورت میں برقرار رہے اور کچھ نئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں اُبھر آئیں۔ان میں سب سے اہم مدورائی کی سلطنت، وارنگل کے ویلما ریاست اور تلنگانہ کی ریڈی ریاست تھی۔ کچھ عرصے بعد وجے نگر کے شمال کی طرف بہمنی سلطنت قائم ہوئی۔ یہ حکمراں متواتر ایک دوسرے سے برسرپیکار رہتے تھے یا جب جب ضرورت محسوس ہوتی تھی کسی کے ساتھ صلح کر کے مل جاتے تھے۔ چنانچہ مدورائی کے سلطان کے خلاف جنگ میں ہوئسال کے حکمراں بلال سوم کو شکست ہوئی اور 1342 میں اسے قتل کردیا گیا۔ان حالات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہری ہر اور اس کے بھائیوں نے اپنے علاقے کی توسیع شروع کردی اور جلد ہی پوری ہوئسال ریاست ان کے قبضے میں آگئی۔اس کے بعد مدورائی کی سلطنت سے ان کی طویل کشمکش کا سلسلہ شروع ہوگیا اور آخر 1377 تک انہوں نے مدورائی کی سلطنت کا بھی خاتمہ کردیا۔ وجے نگر کی حکومت اب جنوب میں رامیشورم تک پہنچ گئی جس میں کیرالہ کے کچھ وہ حصے شامل تھے جو پہلے مدورائی سلطنت میں تھے۔اس سے پہلے ہری ہر تنگ بھدرا کے کنارے اپنا نیا دارالسلطنت وجے نگر قائم کرچکا تھا لیکن دوسری روایت یہ ہے کہ یہ شہر اس کے بھائی بکا نے قائم کیا تھا جو 1365 میں اپنے بھائی کا جانشین ہوا تھا۔بکا نے 1377 تک حکومت کی۔

وجے نگر کو شمال میں ابھرتی ہوئی بہمنی سلطنت کا سامنا کرنا تھا جس کے بادشاہوں کو کبھی کبھی وارنگل کے ویلما حکمرانوں اور تلنگانہ کے ریڈی حکمرانوں کی حمایت بھی حاصل ہوجاتی تھی جو وجے نگر کی ابھرتی ہوئی طاقت سے خوفزدہ رہتے تھے اور بہمنی سلطنت کو ایک توازن برقرار رکھنے والی طاقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

بہمنی سلطنت کو ایک افغان امیر علاءالدین حسن نے 1347 میں قائم کیا تھا جس کا خاندان علاءالدین خلجی کے یہاں ملازم تھا اور وہیں اس نے ترقی پائی۔ فرشتہ کی سترھویں صدی میں بیان کی ہوئی روایت کے مطابق حسن ایک برہمن گنگو کی خدمات انجام دیتے ہوئے منظر عام پر آیا اور اسی لیے وہ حسن گنگو کے نام سے جانا جاتا تھا۔ بہرحال اس کا یہ بیان کہاں تک صحیح ہے اس کا علم نہیں ہے۔ تخت نشینی کے بعد علاء

الدین نے اپنے خاندان کو باحیثیت اور باو قار بنانے کی غرض سے اس کی جڑی ایرانی ہیر و اسفندیار اور بہمن سے جوڑنے کی کوشش کی اور اپنے نام کے آگے "بہمن شاہ" کا لقب اختیار کر لیا۔ اسی لقب کی وجہ سے یہ سلطنت بہمنی کہلائی جانے لگی۔

بہمنی سلطانوں اور وجے نگر کے حکمرانوں کے مفادات تین بالکل مختلف اور واضح علاقوں میں ایک دوسرے سے ٹکراتے تھے۔

1. تنگ بھدرا دوآب میں
2. کرشنا، گوداوری ڈیلٹا میں
3. مراٹھواڑا میدانی علاقے یعنی کونکن میں

تنگ بھدرا دوآب کرشنا اور تنگ بھدرا دریاؤں کے درمیان واقع علاقے میں ہے۔ اپنی دولت اور معاشی ذرائع کی وجہ سے یہ پہلے بھی مغربی علاقے کے چالوکیہ حکمرانوں اور چول خاندان کے حکمرانوں کے درمیان جھگڑے کی جڑ رہا تھا، اس کے بعد یہ یادو حکمرانوں اور ہوئسال حکمرانوں کے درمیان بنائے مخاصمت رہا، کرشنا گوداوری کے تھالے پر قبضہ قائم رکھنے کی جدوجہد جو بہت زرخیز علاقہ تھا اور اس میں کئی بندرگاہوں کی موجودگی کی وجہ سے اس پورے وسیع علاقے کی غیر ملکی تجارت پر بھی یہیں سے گرفت رکھی جاتی تھی، کبھی کبھی تنگ بھدرا دوآب علاقے کے لیے جدوجہد سے جُڑ جاتی تھی۔ اسی وجہ سے اس علاقے کے حکمراں اپنی حفاظت کی غرض سے کبھی بہمنی سلطانوں سے مل جاتے تھے اور کبھی وجے نگر کے حکمرانوں سے جہاں تک مراٹھا علاقے پر قبضے کا سوال تھا یہ جھگڑا کونکن علاقے اور ان علاقوں سے تعلق رکھتا تھا جو کونکن تک پہنچنے کا راستہ تھا۔ کونکن سمندر اور مغربی گھاٹ کے درمیان ایک پتلی سے پٹی کا علاقہ ہے۔ اس کی سب سے اہم بندرگاہ گوا، جنوبی ہندوستان کی حکومتوں کے لیے بے حد اہمیت کی حامل تھی۔

بہمنی اور وجے نگر کی سلطنتوں کے درمیان فوجی جھڑپیں ان دونوں سلطنتوں کے قیام کے دوران لگ بھگ پورے عرصے جاری رہیں۔ ان کے اثرات متعدد رخوں میں نظر آتے تھے۔ ان سے دونوں سلطنتوں کے فوجی روپ کا بھی اندازہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی ان جنگوں کو مذہبی رنگ بھی دے دیا جاتا تھا۔ بہر حال حقیقت یہ ہے کہ مختلف سلطنتوں کا گٹھ جوڑ مذہبی سے زیادہ سیکولر انداز پر ہی ہوتا تھا۔ حالانکہ یہ خود کو ہندو مفادات کا محافظ کہتے تھے مگر وجے نگر حکمرانوں نے مسلمان گھوڑ سواروں کا ایک دستہ رکھنے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں کہ اس سے پہلے ان کی جنگ ہوئسال ہندو حکمرانوں سے رہی تھی۔ بعد میں اڑیسہ کے گنج پتی حکمرانوں نے وجے نگر پر حملہ کر کے اس کے کچھ علاقوں پر قبضہ کر لیا، جس کے نتیجے میں بہمنی۔ وجے نگر کا آپسی معاہدہ اور ساتھ ہو گیا اور دونوں نے مل کر گجپتی حکمرانوں کا مقابلہ کیا۔ بہت عرصے تک وارنگل کے حکمراں بھی وجے نگر سے مقابلے کے لیے بہمنی حکمراں کے ساتھ ملے رہے مگر اس کشمکش کا مذہبی پہلو بھی پوری طرح نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی وجہ سے وجے نگر اور بہمنی حکمرانوں کے درمیان جنگوں میں تلخی کچھ اور بڑھ جاتی تھی، جس کے نتیجے میں جنگ کے علاقوں میں تباہی و بربادی بھی زیادہ ہوتی تھی اور ان خاص علاقوں اور اس کے گرد و نواح میں جان و مال کا خاصا شدید نقصان بھی ہوتا تھا۔ دونوں اپنے دشمن کے علاقوں کو لوٹتے تھے اور شہر اور گاؤں کو پھونک دیتے تھے۔ مردوں، عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر

انہیں غلام بنا کر بیچ دیتے تھے اور مذہب کے نام پر کتنے ہی بربریت کے مظاہرے کرتے تھے۔

تنگ بھدرا دوآب کے لیے سب سے پہلی جنگ 1356 میں ہوئی جب بہمنی فوجوں نے رائے چور پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضے میں کر لیا، مگر اگلے سال ہی ہری ہر نے اسے چھین کر پھر اپنے علاقے میں شامل کر لیا۔ ان دونوں کے درمیان یہ جھڑپیں متواتر ایک چکر کے سے انداز میں جاری رہیں۔ اس طرح 1367 میں بکا نے وارنگل کے حکمراں سے مل کر ان علاقوں کو واپس لینے کا منصوبہ بنایا جو پہلے بہمنی سلطنت نے اپنے قبضے میں کر لیے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے جب بکا اول نے تنگ بھدرا دوآب کے نزاعی علاقے کے چھوٹے سے قلعے پر حملہ کیا تو وہاں کے پورے محافظی دستے کو قتل کر دیا، صرف ایک آدمی بچا۔ جب اس واقعے کی اطلاع بہمنی سلطان کو ملی تو وہ بھڑک اٹھا اور یہ عہد کر کے اس طرح بڑھا کہ جب تک ایک لاکھ ہندو نہ قتل کر دے گا اپنی تلوار کو میان میں نہ رکھے گا۔ برسات کے موسم اور وجے نگر کی فوجوں کی مزاحمت کے باوجود اس نے تنگ بھدرا دریا کو پار کیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ کوئی بہمنی سلطان بذاتِ خود وجے نگر کی سرحد میں داخل ہوا تھا۔ اس جنگ کے نتیجے کے متعلق کئی طرح کے بیان ملتے ہیں۔ فارسی ماخذوں کے مطابق وجے نگر کے حکمراں کو شکست ہوئی اور اسے جنگلوں میں روپوش ہونا پڑا۔ ان جنگوں میں دونوں فریقوں کی طرف سے توپوں کے استعمال کو بھی بیان کیا جاتا ہے۔ بہر طور پر بہمنی سلطان فیصلہ کن فتح حاصل نہ کر پایا اور یہ جنگ مہینوں تک کھنچتی رہی جس کے دوران بڑے پیمانے پر مرد، عورت، بچے قتل ہوئے۔ آخر میں کسی نہ کسی طرح ایک ڈھیلا سا معاہدہ کیا گیا، جس کی رو سے پچھلی صورتِ حال کو بحال کیا گیا اور نتیجے میں دوآب کے دونوں فریق حصے دار قرار دیے گئے۔ ایک غیر واضح وعدہ یہ بھی کیا گیا کہ آئندہ جنگوں میں کوئی غیر مسلح اور بے یار و مددگار قسم کے لوگوں کو قتل نہیں کرے گا۔ بہر حال، آنے والی جنگوں میں اس معاہدہ کا مشکل سے ہی کوا اثر نظر آیا۔

جنوب میں مدورائی سلطنت کے خاتمے نے وجے نگر کے حکمراں ہری ہر دوم (1377 تا 1404) کو یہ موقع فراہم کر دیا کہ اُس نے شمال مشرق اور مغرب میں آگے بڑھنے کی پالیسی بنائی۔ جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں شمال مشرقی حصے میں بہت سی چھوٹی چھوٹی ہندو فرمانروایاں تھیں۔ ان کے شمال میں اڑیسہ کا حکمراں اور دوسری طرف بہمنی سلطان، اس علاقے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ حالانکہ وارنگل کے حکمراں نے دہلی کے خلاف جدوجہد میں حسن گنگو کی مدد کی تھی لیکن اس کے جانشینوں نے وارنگل پر حملہ کر کے کولاس کا مضبوط قلعہ اور گولکنڈہ کا پہاڑی قلعہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا۔ اس وقت وجے نگر جنوب میں اتنا پھنسا ہوا تھا کہ اس کی طرف سے کوئی مداخلت نہ ہوئی۔ بہمنی سلطان نے گولکنڈہ کو اپنی سلطنت کی حد مقرر کر دیا اور یہ وعدہ بھی کیا کہ نہ وہ خود نہ اس کے جانشین وارنگل کے اور کسی علاقے میں مداخلت کریں گے۔ اس معاہدے پر اعتماد کی مہر کے لیے وارنگل کے حکمراں نے بہمنی سلطان کو قیمتی ہیرے جواہرات سے مرصع ایک تخت بھی نذر کیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ تخت اصل میں محمد بن تغلق کو پیش کرنے کے لیے تیار کرایا گیا تھا۔ بہمنی سلطنت اور وارنگل کا یہ معاہدہ اور میل جول پچاس برس سے زیادہ برقرار رہا۔ تنگ بھدرا دوآب پر وجے نگر کی طرف سے حملہ نہ ہونے اور بہمنی سلطنت کی اس علاقے میں بڑھتی ہوئی طاقت اور جارحیت کو نہ روک سکنے کا ایک اہم سبب یہ معاہدہ ہی تھا۔

عہدِ وسطیٰ کے مورخوں نے بہمنی اور وجے نگر کے حکمرانوں کی جنگوں کو بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے۔ بہر حال یہ ہمارے لیے کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتیں۔ دونوں فریقوں کی پوزیشن کم و بیش ایک سی ہی رہی۔ جنگوں میں کبھی ایک کا پلڑا بھاری ہو جاتا تھا کبھی دوسرے کا۔ ہری ہر دوم نے بہمنی اور وارنگل کی ملی جلی طاقت کا بھی مقابلہ کیا اور اپنی پوزیشن برقرار رکھی۔ اس کی سب سے اہم فتح یہ تھی کہ اس نے مغرب میں بہمنی سلطنت سے بیلگام اور گوا چھین لیا، اس نے سری لنکا کے شمالی حصے کی طرف بھی ایک مہم روانہ کی۔

کچھ عرصے کی سیاسی کشمکش کے بعد ہری ہر دوم کے بعد دیورائے (22-1404 تخت نشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی شروع میں تنگ بھدرا دوآب کے لیے ایک اور جنگ ہوئی۔ اس میں بہمنی سلطان فیروز شاہ کے ہاتھوں اسے شکست ہوئی اور اسے دس لاکھ ٹن، موتی اور ہاتھی تاوان کے طور پر ادا کرنے پڑے۔ اُسے سلطان سے اپنی لڑکی کی شادی بھی کرنی پڑی اور جس کے جہیز میں دوآب میں بانکاپور کا علاقہ دیا گیا تاکہ آئندہ اس سلسلے میں کوئی قضیہ یا تناؤ پیدا نہ ہو۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام اور شان و شوکت کے مظاہرے کے ساتھ ہوئی۔ جب فیروز شاہ بہمنی بارات لے کر وجے نگر کے پاس پہنچا تو دیوا ریا خود پوری شان و شوکت سے شہر کے باہر آکر اس سے ملا۔ شہر کے دروازے سے محل تک، دس کلو میٹر کے پورے راستے پر طلائی، مخمل اور ساٹن کے کپڑے اور دوسری قیمتی چیزیں بچھائی گئیں۔ دونوں بادشاہ شہر کے مرکزی حصے سے اپنے اپنے گھوڑوں پر سوار ساتھ ساتھ چلے۔ دیوا رایا کے رشتے دار سواروں کے دستے کے ساتھ پیدل دونوں بادشاہوں سے آگے آگے چلے اور شادی کی تقریبات تین دن چلیں۔

حقیقت میں جنوبی ہند میں یہ پہلی سیاسی شادی نہیں تھی۔ اس سے پہلے گونڈوانا کے کھیر لا علاقے کا فرنروا امن و امان حاصل کرنے کی غرض سے فیروز شاہ بہمنی سے ہی اپنی لڑکی کی شادی کر چکا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہزادی فیروز شاہ کی سب سے منظورِ نظر ملکہ تھی۔ بہر حال یہ شادیاں بھی امن و امان کو برقرار نہ رکھ سکیں۔ کرشنا گوداوری تھالے کے مسئلے نے وجے نگر، بہمنی سلطنت اور اڑیسہ کے درمیان دوبارہ اختلافات کھڑے کر دیے۔ ریڈی سلطنت میں اختلال پیدا ہونے کے بعد دیورائے اور وارنگل کے حکمراں نے اس سلطنت کو آپس میں بانٹ لینے کا معاہدہ کر لیا۔ بہمنی طاقت سے وارنگل کی علیحدگی نے دکن میں اقتدار کے توازن میں پھر تبدیلی پیدا کر دی۔ نتیجے میں دیورائے کو ایک موقع مل گیا اور اس نے فیروز شاہ بہمنی کو تباہ کن شکست دے کر اپنی مرکزی حکومت کو دریائے کرشنا کے دہانے تک بڑھا لیا۔

بہر حال، دیورائے نے رفاہ عامہ کے کاموں کو نظر انداز نہیں کیا۔ اس نے تنگ بھدرا پر ایک باندھ تعمیر کیا جس کی مدد سے اس نے ایک نہر شہر تک پہنچائی اور یہاں کی پانی کی قلت کے مسئلے کو حل کیا۔ اس سے آس پاس کے علاقوں کی آبپاشی بھی ہوتی تھی، چونکہ پتہ چلتا ہے کہ اس نہر سے اس کے محصول میں 3,50,000 پرداؤ کا اضافہ ہوا۔ اس نے دریائے ہری درا پر آبپاشی کے لیے ایک بند تعمیر کیا۔

کچھ دن کی سیاسی کشمکش کے بعد دیورائے دوم (46-1425) تخت نشین ہوا جو اس خاندان کا سب سے بڑا بادشاہ مانا جاتا ہے۔ اپنی فوج کو مضبوط بنانے کے لیے اس نے اس میں زیادہ تعداد میں مسلمانوں کو داخل کیا۔ فرشتہ کے بیان کے مطابق دیورائے دوم نے محسوس کیا کہ بہمنی فوج کی بالادستی ان کے زیادہ مضبوط اور توانا گھوڑوں اور بہت بڑی تعداد میں بہت اچھے تیر اندازوں کی وجہ سے ہے۔ اس لیے اس نے

2000 مسلمانوں کی فہرست تیار کی، ان کو جاگیریں دیں اور اپنے تمام ہندو سپاہیوں اور افسروں کو ہدایت کی کہ وہ ان سے تیر اندازی کا فن سیکھیں۔ وجے نگر کی سلطنت نے مسلمانوں کی بھرتی کوئی نہیں نہیں تھی، کیونکہ دیورائے اول کے لیے بیان کیا جاتا ہے کہ فرشتہ کا بیان ہے کہ دیورائے دوم 60,000 ہندو ماہر تیر انداز، 80,000 گھوڑ سوار اور 2,00,000 کی پیدل فوج جمع کی تھی۔ یہ شمار مبالغہ آمیز ہو سکتا ہے۔ بہر حال ایک بڑی سوار فوج رکھنے سے حکومت کے مالی ذرائع پر کافی بوجھ پڑنا یقینی ہے کیونکہ اچھے گھوڑے صرف درآمد کے ذریعے حاصل ہوتے تھے اور عرب، جن کی اس تجارت پر گرفت تھی، ان سے گھوڑوں کی زیادہ قیمت لیتے تھے۔

اپنی فوج کے ساتھ دیورائے دوم نے 1443 میں تنگ بھدر دریا پار کیا اور مدکل اور بانکاپور وغیرہ کے ان علاقوں کو پھر حاصل کرنے کی کوشش کی جو کرشنا دریا کے جنوب میں تھے اور گذشتہ زمانے میں بہمنی سلطنت کے قبضے میں پہنچ گئے تھے۔ تین سخت جنگوں کے بعد فریقین پھر پچھلی ہی حالت پر برقرار رکھنے کے لیے ہی تیار ہوئے۔

سولہویں صدی کے ایک پرتگالی مورخ کا بیان ہے کہ کوئلون، سری لنکا، پولی کٹ، پیگو، تینا سیرم (برما) اور ملایا کے فرمانروا دیورائے دوم کو خراج دیتے تھے۔ بہر طور اس میں شبہ ہے کہ وجے نگر کے حکمراں سمندر میں بھی اتنے طاقتور تھے کہ پیگو اور تنا سیرم علاقوں سے پابندی سے خراج وصول کر لیتے ہوں۔ شاید اس کے بیان سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ان جگہوں کے حکمراں وجے نگر سے تعلق قائم رکھتے تھے اور ان کی رضا خوشنودی حاصل کرنے کے لیے تحفے تحائف بھیجتے تھے۔ سری لنکا پر بہر طور کئی بار حملہ ہوا تھا جو ایک مضبوط بحری فوج کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا تھا۔

24.4 کرشنا دیورائے

دیورائے دوم کے انتقال کے بعد سلطنت میں کچھ عرصے کشمکش اور اختلال رہا۔ تخت سلطنت کے دعوے کے درمیان خانہ جنگیاں شروع ہوئیں۔ بہت سی جاگیریں اس دوران خود مختار ہو گئیں۔ رائے کا اقتدار و حکومت سُکڑ کر صرف کرناٹک اور مغربی آندھرا کے کچھ حصوں تک باقی رہ گیا۔ کچھ عرصے بعد تختِ سلطنت کو راجا کے وزیر سالووا نے چھین لیا۔ اس طرح پہلے شاہی خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔ سالووا نے داخلی امن وامان قائم کر کے ایک نئے شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی لیکن یہ سلطنت بھی زیادہ عرصے باقی نہیں رہی۔ اس کے بعد نئے خاندان جسے تُلووا کہا جاتا ہے کی بنیاد کرشنا دیورائے (30-1509) نے رکھی، جو خود ہی اس خاندان کی سب سے بڑی شخصیت تھا۔ کچھ مورخوں نے اسے وجے نگر کے تمام حکمرانوں میں سب سے بڑا مانا ہے۔ کرشنا دیو کو صرف اندرونِ ملک ہی امن وامان اور استحکام نہیں قائم کرنا تھا بلکہ اسے وجے نگر کے دیرینہ مخالفوں اور دشمنوں کو بھی بھگتنا تھا۔ ان میں بہمنی سلطنت کی جانشین حکومتیں اور اڑیسہ کے گجپتی بھی شامل تھے۔ گجپتیوں نے وجے نگر کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے پرتگالیوں کی طرف بھی توجہ کرنی تھی جن کی طاقت رفتہ رفتہ اس علاقے میں مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔ پرتگالی اپنی بحری بالادستی کو وجے نگر کی چھوٹی چھوٹی ساحلی ریاستوں کو ڈرا دھمکا کر اُن سے سیاسی اور معاشی فائدے حاصل کرنے میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یہ رائے کی غیر جانب داری کو خریدنے کی بھی کوشش کر چکے تھے جس کے بدلے میں انہوں نے

بیجاپور کے قبضے سے گوا کو آزاد کرانے اور گھوڑوں کی سپلائی کا مکمل اجارہ دے دینے کی بھی پیش کش کی تھی۔

سات سال تک چلنے والی جنگوں کے بعد کرشنا دیو اول نے اڑیسہ کے حکمراں کو دریائے کرشناتک کے تمام علاقے وجے نگر کو واپس کر دینے پر مجبور کر دیا۔ اتنی مضبوطی حاصل کر لینے کے بعد کرشنا دیو نے تنگ بھدرا دوآب کی واپسی کی جدوجہد کو پھر سے شروع کر دیا۔ اس کے نتیجے میں دو پرانے حریفوں بیجاپور اور اڑیسہ میں ضرورت کے تحت ایک معاہدہ اور گٹھ جوڑ بھی ہوا۔ کرشنا دیو نے اس مہم کے لیے بڑی زبردست تیاریاں کیں۔ اس جنگ کو اس نے سب سے پہلے رائچور اور مدکل پر یلغار سے شروع کیا۔ اس جنگ میں بیجاپور کے حکمران کو 1520 عیسوی میں بری طرح شکست ہوئی۔ اُسے دریائے کرشنا کے دوسری طرف دھکیل دیا گیا اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا سکا۔ وجے نگر کی فوجیں مغرب میں بیلگام بھی پہنچیں۔ بیجاپور پر قبضہ کیا اور کئی دن تک اُسے لوٹا اور معاہدے سے پہلے گلبرگہ کو بھی تباہ کیا۔

اس طرح کرشنا دیو کے دور میں وجے نگر جنوب کی سب سے مضبوط طاقت بن گئی۔ بہر طور اپنی پرانی رنجشوں اور دشمنیوں کا بدلا لینے کے شوق میں جنوب کی طاقتوں نے عام طور پر اُس خطرے کی طرف سے آنکھیں بند رکھیں جو ان کو اور ان کی تجارت کو پرتگال کی ابھرتی ہوئی طاقت سے پہنچنے والا تھا۔ چول خاندان اور شروع کے وجے نگر کے حکمرانوں کے برخلاف انہوں نے بحری فوج کی نشوونما پر بہت کم توجہ دی۔

اس دور میں وجے نگر کے حالات کو بہت سے غیر ملکی سیاحوں نے بیان کیا ہے۔ اٹلی کے پائس نے، جس نے کرشنا دیو کے دربار میں کئی سال گزارے تھے، کرشنا دیو کی شخصیت کی بڑی شاندار تصویر کھینچی ہے۔ اس کا بیان ہے کہ ''وہ ایک عظیم حکمراں ہے اور کافی عدل و انصاف والا انسان ہے۔ اُن چند اوقات کے علاوہ جب اس پر غیظ و غضب کے دورے پڑیں'' اُسے اپنی رعایا سے محبت تھی اور اپنے عوام کی خوشحالی کی خواہش اور لگن اس کے یہاں ایک مثالی حیثیت رکھتی تھی۔

کرشنا دیو عظیم معمار بھی تھا۔ اُس نے وجے نگر کے پاس ایک شہر تعمیر کرایا اور ایک بہت بڑا تالاب کھدوایا جو آبپاشی کے کام بھی آتا تھا۔ یہ تیلگو اور سنسکرت میں خداداد غیر معمولی قابلیت کا عالم تھا۔ اُس کی بہت سی تحریروں میں اب صرف ایک تیلگو تحریر، ملکی سیاست پر، اور سنسکرت میں ایک ڈرامہ موجود ہیں۔ تیلگو ادب میں اس کے عہد سے ایک نیا دور شروع ہوا جس میں سنسکرت کی نقل کے بجائے تیلگو میں آزادانہ تحریریں تخلیق ہونی شروع ہوئیں۔ اس نے تیلگو، کنڑ اور تامل شاعروں کی سرپرستی کی۔ باربوسا، پائس اور نونیز جیسے غیر ملکی سیاح اس کے انتظامیہ کی چستی اور اس کی سلطنت کی خوشحالی کا بھی کافی ذکر کرتے ہیں۔ اُس کا اہم ترین کارنامہ اپنے دور میں عوام میں رواداری اور آپسی میل جول کا ماحول پیدا کرنا تھا جو اس کے دور میں عام تھا۔ باربوسا کا قول ہے: ''بادشاہ نے اتنی آزادی دی ہوئی ہے کہ کوئی شخص خواہ کسی بھی عقیدے کا ہو، اپنے عقائد کے مطابق زندگی گزار سکتا ہے اور جہاں چاہئے آزادی سے آجا سکتا ہے۔ نہ اُسے کسی کی ناراضگی یا ناخوشگواری برداشت کرنی ہوتی ہے اور نہ کوئی اس سے یہ سوال کرتا ہے کہ وہ عیسائی ہے، یہودی ہے، مسلمان ہے یا کافر ہے۔'' باربوسا نے کرشنا دیو کے عدل و انصاف اور اس کے دور میں مساوات کی بھی تعریف کی ہے۔

24.5 سلطنت کا زوال

کرشنا دیو کی موت کے بعد اُس کے عزیزوں میں جانشینی کے لیے کھینچ تان شروع ہو گئی کیونکہ اس کے سارے لڑکے کم عمر تھے۔ آخر سدا شورائے 1543 میں تخت نشین ہوا جس نے 1567 تک حکومت کی۔ مگر اقتدار کی اصلی طاقت مجلسِ ارباب ثلاثہ (تین افراد کی کمیٹی) کے ہاتھوں میں تھی اور ان میں بھی رام راج سب سے اعلیٰ حیثیت کا مالک تھا۔ رام راج اپنی حکومت کے مفاد میں مختلف مسلمان حکمرانوں کو ایک دوسرے سے الجھائے رکھنے میں کامیاب رہا۔ اُس نے پرتگالیوں سے ایک ایسا بیوپاری معاہدہ کیا جس کے تحت بیجاپور کو گھوڑوں کی سپلائی بالکل رُک گئی۔ جنگوں کے ایک متواتر سلسلے میں اُس نے بیجاپور کے حکمراں کو مکمل شکست دی اور گولکنڈہ اور احمد نگر کے حکمرانوں کو بھی بری طرح ہرایا۔ ایسا لگتا ہے کہ رام راج کا مقصد اس سے زیادہ کچھ نہیں تھا کہ اِن تینوں ریاستوں کی طاقت میں ایک ایسا توازن بنائے رکھے جس کا فائدہ وجے نگر کو ملتا رہے۔ بالآخر ان تینوں طاقتوں نے مل کر 1565 میں تالی کوٹا کے پاس بنی ہٹی کے مقام پر بیجاپور کو شکستِ فاش دی۔ اِسے جنگ تالی کوٹا، یا، راکھشی تنگاڈی، کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں 1,00,000 وجے نگر کے فوجی قتل ہوئے۔ وجے نگر بُری طرح لوٹا اور تباہ کیا گیا اور کھنڈر کر کے چھوڑ دیا گیا۔

بنی ہٹی جنگ کو عام طور پر وجے نگر کے عظیم دور کے خاتمے کی علامت مانا جاتا ہے حالانکہ یہ حکومت لگ بھگ سو سال تک کسی نہ کسی طرح کھنچتی رہی لیکن اس کی سرحدیں متواتر سکڑتی چلی گئیں اور اس کے حکمراں جنوبی ہندوستان کے سیاسی معاملات میں کوئی قابل ذکر حیثیت کے مالک نہ رہے۔

وجے نگر کے حکمرانوں میں بادشاہ کی حیثیت کافی اعلیٰ تصور کی جاتی تھی۔ سیاست پر اپنی کتاب میں کرشنا دیو رائے نے بادشاہ کو مشورہ دیا ہے کہ ”بڑی احتیاط اور اپنی طاقت کے مطابق ہمیں حق کی حفاظت اور بدی کی سرزنش کا کام انجام دینا چاہئے اور جو کچھ تم دیکھو یا سنو اس کی طرف سے کبھی لاپرواہی نہ برتو۔“ اُس نے بادشاہ پر یہ ذمہ داری بھی عائد کی تھی کہ ”اپنی رعایا پر میانہ روی سے محصول عائد کرو۔“

24.6 غیر ملکی سیاحوں کے بیانات

لائق حکمرانوں کے یکے بعد دیگرے سلسلے کے ساتھ وجے نگر حکومت پندرھویں صدی کے پہلے نصف حصے میں سب سے مضبوط اور خوشحال سلطنت کی شکل میں ابھری۔ بہت سے سیاح جو اس دور میں وجے نگر آئے انہوں نے اس شہر اور ملک کا بڑا تفصیلی بیان چھوڑا ہے۔ اٹلی کا سیاح، نکولو کونٹی، جو 1420 میں یہاں آیا اس نے اس شہر کے لیے لکھا ہے کہ ”شہر کا محیط 60 میل ہے۔ اس کی دیواریں پہاڑوں تک ملا دی گئی ہیں اور پوری وادی کو نیچے تک گھیرے ہوئے ہیں...اس شہر میں نوّے ہزار لوگ اسلحہ اٹھانے کے قابل موجود ہیں۔ ان کا بادشاہ ہندوستان کے تمام بادشاہوں میں سب سے طاقتور حکمراں۔“ فرشتہ کا بھی بیان ہے کہ ”بہمنی خاندان کے شہزادے صرف بہادری میں اُن سے بالادست تھے ورنہ طاقت واقتدار، دولت اور ملک کی وسعت میں بیجانگر (وجے نگر) کے راےاُن سے بہت آگے تھے۔“

عبدالرزاق جس نے ہندوستان اور اس سے باہر بہت سفر کیا تھا اور دیورائے دوم کے دربار میں سفیر تھا، اس نے لکھا تھا: ''اس موخر الذکر بادشاہ کے زیر حکومت علاقے میں تین سو بندرگاہیں ہیں، جن میں سے ہر ایک کالی کٹ کے برابر ہے اور خشکی میں اس کی حدودِ سلطنت تین مہینے کی مسافت کے برابر ہیں۔'' تمام سیاح اس بات پر متفق ہیں کہ ملک پوری طرح گنجان آباد تھا اور اُن میں بہت سے شہر اور گاؤں تھے۔ عبدالرزاق کا بیان ہے کہ ''دیہی علاقے کا بڑا حصہ بہت اچھا مزروعہ اور بہت زرخیز ہے۔ فوج کی تعداد گیارہ لاکھ ہے۔''

عبدالرزاق وجے نگر کو اپنی آنکھوں سے دیکھے اور کانوں سے سنے شہروں میں سب سے اچھے شہروں میں ایک مانتا ہے۔ شہر کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ''اِسے اس انداز سے بنایا گیا ہے کہ سات گڑھیاں اور اتنی ہی دیواریں ایک دوسرے کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں۔ ہرات شہر کے بازار کا دس گنا حصہ کا رقبہ۔'' محل سے شروع کرکے اس مین چار بازار تھے ''جو بے حد لمبے اور چوڑے تھے۔'' ہندوستانی دستور کے مطابق لوگ اپنی ذات یا پیشے والوں کے ساتھ شہر کے ایک حصے میں رہتے تھے۔ مسلمان بھی اپنے مقررہ حصے میں زندگی گزارتے تھے۔ بازاروں اور بادشاہ کے محل میں بھی ''نہریں اور بہتے ہوئے چشمے دیکھے جاسکتے تھے جن کے پتھر گھسے ہوئے اور چکنے ہوتے تھے۔'' اس کے بعد کا ایک اور سیاح کہتا ہے کہ یہ شہر روم سے بھی بڑا تھا، جبکہ روم اس وقت مغربی دنیا کے سب سے بڑے شہروں میں ایک شہر تھا۔

وجے نگر کے بادشاہوں کی دولت کی بھی بہت شہرت تھی۔ عبدالرزاق نے اس روایت کا بھی ذکر کیا ہے کہ ''بادشاہ کے محل میں کئی لمبی لمبی کوٹھریاں ہیں جو ٹھوس سونے چاندی سے بھری ہوئی ہیں۔'' دولت جمع کرنا بادشاہوں کی دیرینہ روایت تھی، لیکن یہ ذخیرہ کی ہوئی دولت بازار میں گردش نہیں کرتی تھی اور بسا اوقات غیر ملکی حملوں کا سبب بھی بنتی تھی۔

24.7 وجے نگر حکومت کی نوعیت

24.7.1 عسکری یا جنگی ریاست

وجے نگر حکومت کس طرز کی تھی اس سلسلے میں بھی مورخین میں کافی بحث مباحثہ آیا ہے۔ نیل کنٹھ شاستری اسے عسکری یا جنگی ریاست سے قریب ترین کہتے ہیں۔ اُن کا یہ خیال وجے نگر کے ایک حکمراں کے اس نظریے پر مبنی ہے کہ کسی سلطنت کی آمدنی کو چار حصوں میں تقسیم کیا جانا چاہئے: ایک حصہ مختلف قسم کے کاموں میں دو حصے، یعنی نصف، جنگ میں اور بقیہ کو غیر معمولی صورتِ حال کے لیے محفوظ رکھنا چاہئے۔ اُس نے 'امارم' سسٹم پر بھی زور دیا ہے۔ امارم رکھنے والے 'نایک' کو جسے زمین کا ایک حصے دے دیا جاتا تھا، ایک مقررہ تعداد سپاہیوں، گھوڑوں اور ہاتھیوں کی رکھنی ہوتی تھی جو حکمراں کی خدمات کے لیے ہوتے تھے اور نایک کو بادشاہ سے وفادار رہنے کا عہد کرنا پڑتا تھا۔

وجے نگر بھی اسی حد تک عسکری ریاست تھی جتنی اور دوسری ریاستیں جنہیں ہر لمحے جنگ کے لیے تیار رہنا پڑتا تھا۔ اپنے مسلم مخالفوں سے کامیابی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہنے کی بڑی وجہ یہ حقیقت تھی کہ انہوں نے صرف سواروں کی جنگ کے انداز کو ہی نہیں اپنایا تھا بلکہ، جیسا کہ ہم نے دیکھا، انہوں نے اپنی فوج میں ایک بڑی تعداد مسلم گھوڑسوار تیر اندازوں کی بھی رکھی تھی۔ وجے نگر کے حکمراں ایک کافی

بڑی باقدہ فوج مستقل طور پر تیار رکھتے تھے، جسے نقد تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس طرح پرانے دستور طریقوں کو اپنائے رہنے کے ساتھ ساتھ وجے نگر کے حکمراں نے کچھ نئے طریقوں کو بھی اپنانے کی کوشش کی تھی۔

24.7.2 ٹکڑوں میں بنٹی ہوئی ریاست

اس سلسلے میں بھی اختلافِ رائے ہے کہ آیا وجے نگر حکومت نیم خود مختار قسم کے فوجی سرداروں اور کچھ علاقائی سرداروں، نایکوں، کا ایک نیم منظم قسم کا گٹھ جوڑ تھی یا دہلی سلطنت کے ماڈل پر ایک باقاعدہ مرکزی حکومت والی ریاست تھی۔ اس سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جنوب کے امارم نظام کو ہم کسی طرح ترکی کے 'اقطاع' نظام کے برابر نہیں رکھ سکتے۔ نایک اپنے حکمراں کی خدمت میں غلاموں یا ماتحتوں کے روپ میں نہیں ابھرے تھے جس صورت میں حکمراں کو پورا اختیار ہوتا تھا کہ وہ جہاں اور جب چاہے انہیں منتقل کردے یا بالکل معزول کردے۔ نایک اپنے تمام اختیار اور طاقت کے ساتھ موروثی حق رکھتے ہوئے اپنے علاقے کے مالک و مختار ہوتے تھے۔ گو کہ وہ اپنے حکمراں کی وفاداری اور خدمت انجام دینے کا وعدہ کرتے تھے، کیونکہ حکمراں اُن کی حیثیت کو قانونی جواز بخشتا تھا لیکن وہ اپنا داخلی انتظامیہ خود چلاتے تھے اور اپنی آمدنی کا صرف ایک حصہ حکمراں کو ادا کرتے تھے۔ بیان کیا جاتا ہے کہ وجے نگر حکومت میں 200 نایک تھے۔ حکمراں اُن پر گرفت رکھنے کی کوشش کرتا تھا مگر انہیں معزول یا برخواست نہیں کر سکتا تھا۔ جنوب اور مغربی، کچھ دور افتادہ علاقوں میں چند علاقائی حکمراں بھی تھے جنھوں نے وجے نگر کی فرمانروائی کی بالا دستی (سوزرینٹی) تو قبول کرلی تھی مگر اپنے علاقے پر انہیں کی حکومت برقرار تھی۔ اس طرح وہ علاقہ جس پر وجے نگر کے حکمراں براہِ راست حکومت کرتے تھے پوری سلطنت کے مقابلے میں یقیناً بہت چھوٹا رہا ہوگا۔ حکومت کے انتظامیہ کو چلانے کے لیے وزیروں کی ایک روایتی کاؤنسل کے علاوہ جس کا سربراہ 'پرادھنی' کہلاتا تھا، ایک مرکزی دفتر یا سیکریٹریٹ بھی ہوتا تھا جس میں بہت بڑی تعداد میں کلرک (کایستھ) کام کرتے تھے۔ عبدالرزاق کے بیان کے مطابق حکمراں کے محل کے پاس ایک دیوان خانہ تھا جو بہت وسیع و عریض تھا اور چہل ستون (چالیس کھمبا) ہال جیسا لگتا تھا، اور اس میں سرکاری ریکارڈس رکھے جاتے تھے اور یہیں کارکن یا کلرک بیٹھ کر کام کرتے تھے۔ بہر طور حکومت کے انتظامیہ کے طریقہ کار کے بارے اور اس علاقے کی وسعت کے بارے میں بہت کم معلومات موجود ہیں جو براہِ راست مرکز کے زیرِ انتظام تھا۔

24.7.3 جنوبی ہند میں ہندو دفاع کا آخری قلعہ

وجے نگر حکومت کو ہندو قدامت پرستی اور کٹرپن کا گڑھ بھی کہا گیا ہے۔ چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس حکمراں اپنی توجہ اور بہت سا وقت مندروں اور مٹھوں کی تعمیر اور مرمت میں صرف کرتے تھے اور خود کو ویدوں کے محافظ اور ان کی راہ پر چلنے والے کہلائے جانے پر فخر محسوس کرتے تھے۔ یہ برہمنوں پر خصوصی نظر کرم رکھتے تھے جنھیں صرف محصول معاف زمینیں ہی نہیں دی جاتی تھیں بلکہ انہیں قلعوں اور فوجوں کا کمانڈر بھی مقرر کیا جاتا تھا۔ برہمنوں کو دی جانے والی ذمے داریاں اور اُن کا اہم سیاسی کردار فی الحقیقت حکمرانوں کی مذہبی تحریک وجذبات پر مبنی نہیں ہوتے تھے بلکہ اصل میں انہیں طاقتور کنٹر نایکوں کی طاقت کے خلاف ایک توازن قائم رکھنے کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ بادشاہ مذہبی معاملات میں تنگ نظر نہیں ہوتے تھے۔ حالانکہ بنیادی طور پر یہ شیو بھکت تھے مگر یہ دوسرے ہندو فرقوں سے کسی قسم کی تفریق و امتیاز

نہیں برتتے تھے۔ انہوں نے جین دھرم کی بھی سرپرستی کی۔ عیسائی مشنریاں جو جنوبی ہندوستان میں قائم ہوگئی تھیں انہیں کام کرنے اور ہندوؤں کا مذہب تبدیل کرانے کی بھی آزادی تھی۔ مسلمان سپاہی جو فوج میں بھرتی کیے گئے تھے انہیں نماز ادا کرنے کی اجازت تھی اور عام طور پر ہندو مسلمان سپاہیوں میں اچھے تعلقات رہتے تھے۔ اس سلسلے میں نارواداری کے جس بدترین واقعے کی مثال دی جاسکتی ہے وہ یہ تھا کہ 1469 میں وجے نگر کے حکمراں ملک ارجن رانا نے اُس شدید غصے میں کہ بھٹکل کے تاجروں نے گھوڑے بہمنی حکمراں کے ہاتھ بیچ دیے تھے، شہر کی ساری مسلم آبادی کو جڑ بنیاد سے اکھاڑ پھینکنے کا حکم دے دیا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ 10,000 مسلمان قتل کیے گئے اور بچے کھچے لوگ گوا کی طرف بھاگ گئے۔ اس کی اس غلطی اور جرم کا بہمنی حکمراں کی طرف سے ردِ عمل اس صورت میں ہوا کہ بیلگام اور اس کے اطراف کا علاقہ وجے نگر کی حکومت کے ہاتھ سے نکل گیا۔

24.8 انتظامی، سماجی اور معاشی حالات

24.8.1 انتظامیہ

وجے نگر سلطنت میں بادشاہ کے وزیروں کی ایک کاؤنسل ہوتی تھی جس میں سلطنت کے بڑے بڑے امراء شامل ہوتے تھے۔ پوری سلطنت 'راجیہ' یا 'منڈلم' (صوبوں) میں تقسیم تھی، ان کے نیچے 'ناڈو' (ضلع) ہوتے تھے، 'استھل' (تعلقہ یا سب ڈسٹرکٹ) اور 'گرام' (گاؤں) ہوتے تھے۔ بہر حال، چول دور کی دیہی 'اپنی حکومت' کی روایت وجے نگر دور میں خاصی کمزور ہوگئی۔ موروثی نائکوں کے اُبھرنے سے اِن دیہی حکومتوں کی تحریک اور آزادی سلب ہوگئی۔

24.8.2 محصول نظام

اس بات کا بھی بہت کم اندازہ ہے کہ کسانوں کو اپنی فصل کی پیداوار کا کتنا حصہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ ایک کتبے کے مطابق محصولوں کی شرحیں حسب ذیل تھیں:۔

1. سردیوں میں ہونے والے کوروائی (ایک قسم کا چاول) کا ایک تہائی حصہ
2. تِل، راگی اور گھوڑے کے دانے کا ایک چوتھائی حصہ
3. باجرہ اور خشک زمینوں میں اگائی جانے والی فصلوں کا چھٹا حصہ

اس طرح مختلف قسم کی فصلوں کے لیے شرحیں مختلف ہوتی تھیں۔ زمین، طریقہ زراعت اور آبپاشی کے ذریعوں کی بنیاد پر بھی محصول مختلف ہوتا تھا۔ محصول کے علاوہ بھی اور کئی طرح کے محصول ہوتے تھے جیسے اِملاک ٹیکس، پیداوار پر بِکری ٹیکس، پیشوں کا ٹیکس، فوجی اخراجات کے لیے ادائیگی (جنگ کے دوران)، شادی پر محصول وغیرہ۔ سولھویں صدی کا سیاح نکیتن کہتا ہے: ''زمین لوگوں سے بھری پُری ہے مگر دیہی علاقوں میں لوگ بہت پریشان اور بدحال ہیں جبکہ امراء عیش و عشرت میں مگن ہیں اور بے حد خوشحال ہیں۔''

24.8.3 کسانوں کی حالت

وجے نگر سلطنت میں کسانوں کی حالت کے بارے میں اتفاق نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر سیاحوں کو اس علاقے کی دیہی حالت کی کوئی خاص واقفیت نہیں تھی اور انہوں نے اپنے بیانات میں اس کا ذکر بہت معمولی انداز میں کیا ہے۔ مجموعی طور پر یہی فرض کیا جاسکتا ہے کہ اُن کی عام حالت پہلے جیسی ہی تھی اور اس میں کوئی خاص تبدیلی پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اُن کے گھر وہی چھپرے کے ہوتے تھے جس میں چھوٹا سا دروازہ ہوتا تھا۔ وہ عام طور پر ننگے پیر چلتے پھرتے تھے اور کمر سے اوپر کچھ نہیں پہنتے تھے۔ اعلیٰ طبقے کے لوگ کبھی کبھی قیمتی جوتے پہن لیتے تھے اور سر پر پگڑی باندھتے تھے مگر یہ لوگ بھی کمر سے اوپر کا حصہ نہیں ڈھکتے تھے۔ ہر طبقے کے لوگوں کو زیور پہننے کا شوق تھا اور وہ انہیں ''اپنے کانوں، گردن اور بازوؤں پر'' پہنتے تھے۔

24.8.4 تجارت اور زراعت

وجے نگر حکومت میں تجارت اور زراعت دونوں پھلی پولیں۔ جیسے جیسے دیہی 'مقامی حکومت' کا زوال ہوا تو ہر علاقے میں ایک طاقتور زمرہ ابھرا جس نے اپنی اس مضبوط حیثیت کو زیادہ اور بہتر آبپاشی کے ذرائع حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا اور زیادہ ادائیگی کرکے زراعت کو ترقی دی۔ بہت سے مندر جنہیں محصول معاف گاؤں ملے ہوئے تھے، انہوں نے بھی اپنے ذرائع کو اِسی کام میں استعمال کیا۔

وجے نگر حکومت کے دور میں شہری زندگی کی نشوونما ہوئی اور تجارت پھلی پھولی۔ مندروں کے ارد گرد کئی شہر اُبھر آئے۔ مندر بہت بڑے بڑے تھے اور یاتریوں کو 'پرسادم' کے لیے کھانے پینے کے سامان، دیوی دیوتاؤں کے لیے 'بھوگ' اور پجاریوں کی ضرورتوں کا سامان فراہم کرنا ضروری تھا۔ مندروں کے پاس بہت دولت تھی اور یہ ملک کی اندرونی اور بحری دونوں تجارتوں میں حصہ لیتے تھے۔ اس طرح، متواتر جنگوں کے سلسلے کے باوجود، چودھویں اور سولہویں صدی کے درمیان جنوبی ہندوستان میں تجارت اور شہر کاری میں ترقی ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ زراعت بھی پھلی پھولی۔ اس کا اثر اس دور کی ثقافتی زندگی کی ترقی میں بھی محسوس ہوا۔

24.9 اکتسابی نتائج (Learning Outcomes)

دہلی سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی وجے نگر اور بہمنی سلطنتوں کا عروج شروع ہوا جن میں وجے نگر سلطنت کا اقتدار کرشنا کے جنوب میں رامیشورم تک پھیلا ہوا تھا۔ وجے نگر سلطنت پر کئی حکمراں خاندانوں نے حکومت کی۔ ان میں سنگم، سالو، تلوا اور اراوید و خاندان نے وجے نگر سلطنت پر کم و بیش 200 سال تک حکومت کی۔ سنگم دور میں اس کی بنیاد رکھی گئی اور تلوا دور میں یہ اپنے عروج کو پہنچی۔ اراویڈو خاندان کی حکومت کے دوران اس کا مکمل زوال ہو گیا۔ پہلے تین خاندان کی حکومت کے دوران اس کی راجدھانی وجے نگر تھی جس کے بعد چوتھے خاندان کے دور میں راجدھانی پینو گونڈہ کو بنایا گیا۔ وجے نگر سلطنت کو اپنی شروعات سے ہی اپنی ہمعصر طاقتوں سے لڑنا پڑا۔ ان میں سب سے اہم اڑیسہ کے گجپتی حکمراں، بہمنی سلطنت کے سلطان، مدورائی سلطنت اور یورپی طاقت پرتگالی تھے۔ تلنگانہ کے ریڈی اور آندھرا کے ویلما موقع پرست تھے جو کبھی بہمنیوں کی طرف تو کبھی وجے نگر کی طرف سے لڑتے تھے۔ آندھرا کے ویلما تو دو حصوں میں بنٹ

گئے تھے جن میں پہلا دھڑا جنگ میں بہمنی سلطان کے ساتھ تھا تو دوسرا حصہ وجے نگر کے رائے کی طرف سے لڑ رہا تھا۔

24.10 کلیدی الفاظ (Keywords)

دریائے کرشنا	جنوبی ہند کا ایک عظیم دریا
رامیشورم	تامل ناڈو میں انتہائی جنوبی سرے پر ایک شہر
وجے نگر	موجودہ ہمپی اور وجے نگر سلطنت کی راجدھانی
پینو کونڈہ	وجے نگر کی دوسری راجدھانی جو آندھرہ کے اننت پور میں واقع ہے۔
تالی کوٹا	راکشسی تانگڑی یا بنی ہٹی
کامپلی	کرناٹک کی سرحد پر واقع ایک مقام

24.11 نمونہ امتحانی سوالات (Model Examination Questions)

24.11.1 معروضی جوابات کے حامل سوالات (Objective Answer Type Questions)

1. وجے نگر سلطنت کی حدود بتایئے۔
2. وجے نگر سلطنت نے کتنے سال حکومت کی؟
3. وجے نگر سلطنت پر کتنے خاندانوں نے حکومت کی؟
4. کرشنا دیو رائے کی موت کب ہوئی؟
5. تالی کوٹہ کی جنگ کب ہوئی؟
6. وجے نگر کی دوسری راجدھانی کا نام بتایئے۔
7. عام روایت کے مطابق وجے نگر کے حکمراں کس کے باجگذار رہ چکے تھے؟
8. مدورائی سلطنت کا خاتمہ کب ہوا؟
9. وجے نگر کی تین دشمن طاقتوں کا نام بتایئے۔
10. وجے نگر سلطنت کا بانی کون تھا؟

24.11.2 مختصر جوابات کے حامل سوالات (Short Answer Type Questions)

1. ٹکڑوں میں بنٹی ہوئی ریاست پر ایک مختصر نوٹ لکھیے۔
2. ہندو دفاع کے نظریے کا مختصر جائزہ لیجیے۔

3. عسکری یا جنگی ریاست پر ایک نوٹ لکھیے۔

4. محصول نظام کا مختصر تجزیہ کیجیے۔

5. تجارت اور زراعت کے حالات پر روشنی ڈالیے۔

24.11.3 طویل جوابات کے حامل سوالات (Long Answer Type Questions)

1. وجے نگر کی سیاسی تاریخ پر ایک تفصیلی مضمون لکھیے۔

2. کرشن دیورائے پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔

3. انتظامی اور سماجی و معاشی حالات کا تفصیلی تجزیہ کیجیے۔

24.12 مزید مطالعے کے لیے تجویز کردہ کتابیں (Suggested Books for Further Reading)

---

1. Asher, Catherine B.; Talbot, Cynthia (2006).*India Before Europe*. Cambridge: Cambridge University Press.
2. Eaton, Richard M. (2006). *A social history of the Deccan, 1300–1761*: eight Indian lives. Cambridge, Cambridge University Press.
3. Kulke, Hermann; Rothermund, Dietmar (2004). *A History of India* (4th ed.). Routledge.
4. Nilakanta Sastri, K. A. (2002). *A history of South India from prehistoric times to the fall of Vijayanagar*. New Delhi, Oxford University Press.
5. Sewell, Robert (2011). *A Forgotten Empire (Vijayanagar).* New Delhi: Asian Educational Services.
6. Stein, Burton (1989). *The New Cambridge History of India: Vijayanagara*. Cambridge University Press.
7. Talbot, Cynthia (2002). *Precolonial India in Practice:Society, Region and Identity in Medieval Andhra.* New York: Oxford University Press.
8. Vanina, Eugenia (2012). *Medieval Indian Landscapes Space. Time.Society.Man*. Delhi: Primus Books.

نمونہ پرچہ امتحان

Directorate of Distance Education نظامت فاصلاتی تعلیم
Bachelor of Arts بیچلر آف آرٹس
Subject Code : BAH301CCT
Subject : History of India Mid 8th Century to Early 16th Century A.D.
پرچہ: تاریخ ہندوستان: آٹھویں صدی عیسوی کے وسط سے سولہویں صدی کی ابتدا تک
3rd Semester Examination ، تیسرا سمسٹر امتحان
Time : 3 hours   وقت : 3 گھنٹے   Marks : 70   نشانات : ۷۰

ہدایات

یہ پرچہ سوالات تین حصوں پر مشتمل ہے: حصہ اول، حصہ دوم، حصہ سوم۔ ہر جواب کے لیے لفظوں کی تعداد اشارۃً ہے۔ تمام حصوں سے سوالوں کا جواب دینا لازمی ہے۔

1۔ حصہ اول میں 10 لازمی سوالات ہیں جو کہ معروضی سوالات ہیں۔ ہر سوال کا جواب لازمی ہے۔ ہر سوال کے لیے 1 نمبر مختص ہے۔ (1 0 x 1 =10 Marks)

2۔ حصہ دوم میں 8 سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی پانچ سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً دو سو (200) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 6 نمبرات مختص ہیں۔ (5x6=30 Marks)

3۔ حصہ سوم میں پانچ سوالات ہیں۔ اس میں سے طالب علم کو کوئی 3 سوالوں کے جواب دینے ہیں۔ ہر سوال کا جواب تقریباً پانچ سو (500) لفظوں پر مشتمل ہے۔ ہر سوال کے لیے 10 نمبرات مختص ہیں۔ (3x10=30 Marks)

حصہ اول

سوال : 1

i. مگدھ کے زوال کے بعد کس شہر کو عروج حاصل ہوا؟

ii. اینلز آف راجستھان (Annals of Rajasthan) کے مصنف کون ہیں؟

iii. پال ریاست کا بانی کون تھا؟

iv. کنیا کبج کا جدید نام بتائیے۔

v. راشٹر کوٹوں کے اصلی وطن کا نام بتائیے۔

vi. اجمیر شہر کا بانی کون تھا؟

vii. پراشر کے مطابق شودروں کا کھانا کھانے سے کیا ہوتا ہے؟

viii. منہاج سراج کی تصنیف کا نام بتایئے۔

ix. دہلی سلطنت کا پہلا افغان حکمران کون تھا؟

x. اشراف اور اذلاف کون تھے؟

حصہ دوم

2. پال ریاست کی ابتدا کا سیاسی پس منظر بیان کیجیے۔
3. دلی سلطنت کی پہلی مسلم خاتون سلطان کون تھی؟
4. علاءالدین خلجی کے مالگزاری نظام کی وضاحت کیجیے۔
5. خضر خان کب اور کیسے دہلی کا حکمراں بنا، وضاحت کیجیے۔
6. دہلی سلطنت میں کپڑے کی صنعت پر ایک نوٹ لکھیے۔
7. بھکتی تحریک پر اسلام کے اثرات پر نوٹ لکھیے۔
8. اقطاع کسے کہتے ہیں مختصر نوٹ لکھیں۔
9. ہندو دفاع کے نظریے کا مختصر جائزہ لیجیے۔

حصہ سوم

10. گووندا سوم کے عہد حکومت پر ایک تفصیلی مضمون قلم بند کیجیے۔
11. سلطان محمود کی ہندوستانی مہمات پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
12. سلطان محمد بن تغلق کی راجدھانی منتقلی کے اسباب و وجوہات بیان کیجیے۔
13. دہلی سلطنت میں علم وادب کے ارتقا پر ایک تفصیلی مضمون تحریر کیجیے۔
14. بہمنی سلطنت کے عروج اور استحکام پر ایک تفصیلی مضمون قلمبند کیجیے۔

Notes/اہم نکات

Notes/اہم نکات